# خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو

ساحر لکھنوی

برصغیر پاک و ہند میں شیعیت کے عظیم ترین محسن، بارھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم

سید الفقہاء الاعلام استاد الکل فی الکل

آیۃ اللہ العظمیٰ حضرت غفرانمآب علیہ الرحمہ

(مولوی سید دلدار علی نقوی طاب ثراہ)

۱۱۶۶ھ تا ۱۲۳۵ھ

غفرانمآب حجتِ حق آیۂ الٰہ
مہر شرف مجدد اسلام دیں پناہ
(عزیز لکھنوی)

ندید چشم فلک مثل آں مجددِ دیں
کہ شاہداند بفضل و بزرگیش اعدا
(مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی مجتہد)

---

حامی دیں ماحیِ کفر و ضلال سرگروہ عالمانِ باکمال
علم سے جس کے عمل توام ہوا دین جس کے زور سے محکم ہوا
لکھنؤ اب سبزوارِ ہند ہے دمبدم افزوں بہارِ ہند ہے
(مرزا جعفر علی فصیح، مثنوی نان و نمک)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

ایک علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالہ

# خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو

## (ماؔہر سے ساؔحر تک)

ساؔحر لکھنوی

# کوائفِ کتاب

نام کتاب : خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو (ماہرؔ سے ساحرؔ تک)
مصنف : ساحرؔ لکھنوی (سید قائم مہدی)
دانش منزل، اے ۱۳/۴۴، گلشنِ اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰
فون: ۴۸۱۷۱۹۵

کمپوزنگ : جاوداں لیزر کمپوزرز
۲۸۔ ایچ، رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد، کراچی

ناشر : آثار و افکار اکادمی (پاکستان)
باشتراکِ ادارۂ طلوعِ افکار، کراچی و مرثیہ فاؤنڈیشن، کراچی

طابع : ماس پرنٹرز کراچی
سرورق : حضرت غفراں مآب، بانیِ خانوادۂ اجتہاد۔ عمل: دلاور مرزا صاحب
سنہ اشاعت : ۲۰۰۳ء (۱۴۲۴ھ)
قیمت : چھ سو روپے (۶۰۰)
ملنے کا پتہ : (۱) ادارۂ طلوعِ افکار، کراچی
۲۸۔ ایچ، رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد، کراچی
(۲) آثار و افکار اکادمی (پاکستان)
دانش منزل، اے ۱۳/۴۴، گلشنِ اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

# ترتیبِ کتاب

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

# ہدیۂ انتساب

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء جمیع شہدائے کربلا علیہم السلام کے حضور بصد عجز غلامانہ جن کے عظیم ایثار اور قربانیوں، بے مثل شجاعت و سرفروشی اور انتہائے مظلومیت کے بیان کے طفیل اردو زبان رثائی ادب عالیہ کی دولت سے مالا مال ہوگئی۔

برصغیر کے مجتہد اول حضرت غفراں مآب مولانا سید دلدار علی صاحب علیہ الرحمہ بانی خانوادۂ اجتہاد کے نام جو خود اور ان کی اولاد معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نظر کردہ تھی اور انھوں نے علم و ادب کے ایسے چراغ روشن کیئے جن کو جہل و جاہلیت کی آندھیاں بجھا نہیں سکتیں اور جن کے نام آسمانِ علم و ادب پر رشد و ہدایت کے آفتابِ عالمتاب بن کر انشاء اللہ قیامت تک جگمگاتے رہیں گے۔

خاندانِ اجتہاد کے ان عظیم المرتبت شعراء کے نام جنھوں نے اپنی زندگیاں مدح و مصائبِ شہدائے کربلا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذکر اور اس کی ترویج و اشاعت میں صرف کردیں اور نہایت اعلیٰ پائے کے مرثیوں سے رثائی ادب کے طرۂ دستار فضیلت اور تاج سرِ افتخار کو ایسے ایسے جواہرِ فکر و فن اور بحرِ سخن کے گہر ہائے آبدار و درِ شہوار سے سجایا کہ نگاہیں چکاچوند ہوگئیں۔

خدا رحمت کند آں شاعران پاک طینت را

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یا علی مدد

# آثار و افکار اکادمی (پاکستان) کراچی کی چھٹی فخریہ پیشکش

الحمدللہ کہ آثار و افکار اکادمی (پاکستان) ماہنامہ "طلوع افکار" کراچی کے اشتراک سے حضرت ساحر لکھنوی کا ایک نہایت اہم علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالہ "خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو (ماہر سے ساحر تک)" اکادمی کی چھٹی کتاب کے طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ یہ مقالہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ رثائی ادب کے محققین نے اس موضوع پر کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی اور کسی یونیورسٹی نے اس پر کوئی تحقیقی کام نہیں کروایا۔ اس طرح یہ ایک اچھوتا اور منفرد موضوع ہے۔ جس پر ساحر صاحب نے بھرپور تحقیق کے ساتھ رثائی ادب کے شائقین سے علم و ادب کے اس عظیم خاندان کے عظیم مرثیہ گو شعرا کو متعارف کرا کے بے مثال خدمت انجام دی ہے اور رثائی ادب میں ایک شاندار اضافہ کیا ہے۔ اس لیئے یہ مقالہ پیش کرنا اس اکادمی کے لیئے اعزاز بھی اور افتخار بھی۔

ہمیں امید ہے کہ اردو ادب کے شائقین عموماً اور رثائی ادب کے دلدادہ حضرات خصوصاً اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور ساحر صاحب کے اس کارنامہ پر ان کو داد دیں گے۔

یہ اکادمی علم و ادب کے فروغ اور صاحبانِ علم و ادب کی پذیرائی اور ان کی خدمات کے اعتراف کے لیئے اپنے امکان بھر جو مخلصانہ اور بے لوث خدمات انجام دے رہی ہے،

وہ ملت جعفریہ کے عوام و خواص سب کی طرف سے بھرپور تعاون اور ہمت افزائی کی متقاضی ہیں۔ اس لیئے افرادِ قوم سے ہماری دردمندانہ گزارش ہے کہ اس اکادمی سے دامے درمے قدمے اور سخنے تعاون فرمائیں۔ اکادمی کی رکنیت حاصل کریں اور ہر طرح کی مالی امداد سے اس کو مستحکم فرمائیں تاکہ ہم اپنے مقاصد کو بہتر سے بہتر طور پر انجام دیتے رہیں۔ مولائے علم انشاء اللہ ان خدمات کو قبول فرمائیں گے۔

آپ کے تعاون کے لیئے شکرگزار

**انتظامیہ**

آثاروافکار اکادمی (پاکستان)
کراچی

## تشکر

اس کتاب میں شامل بعض تصاویر امتداد زمانہ سے بہت خراب ہو چکی تھیں مگر میرے خویش عزیزی حسین حیدر زیدی سلمہ نے اپنے چچازاد بھائی جناب شبیہ حیدر زیدی مالک ZAIDI'S فوٹو گرافراز سے کمپیوٹر کے ذریعے صاف کروا کے اس قابل بنوادیں کہ وہ کتاب میں شامل کی جاسکیں۔ میں اس کے لیئے عزیزی حسین حیدر زیدی سلمہ اور جناب محترم شبیہ حیدر زیدی صاحب کا بطور خاص شکرگزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ZAIDI'S کے کاروبار کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین (ساحر لکھنوی)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# شجرۂ طیبہ حضرت غفرانمآب علیہ الرحمۃ بانیٔ خانوادۂ اجتہاد

**امام علی نقی علیہ السلام**

- امام حسن عسکری علیہ الصلوٰۃ والسلام
  - امام محمد بن حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام (امام زمانہ صاحب العصر والزمانؑ)
- حضرت سید جعفر الزکی
  - سید طاہر محمد صاحب
  - سید محمد حمزہ صاحب
  - سید ابوطالب صاحب
  - سید ابویعلی صاحب
  - سید ابوعلی صاحب
  - سید علی صاحب
  - سید نجم الدین صاحب
  - سید شرف الدین صاحب
  - سید علیم الدین صاحب
  - سید [illegible] الدین صاحب
  - سید تاج الدین صاحب
  - سید خضر صاحب — سید زکریا صاحب — سید جلال الدین صاحب
  - سید ابراہیم صاحب
  - سید محمود صاحب
  - سید مصطفیٰ صاحب
  - سید طالب صاحب
  - سید براہیم صاحب
  - سید عبدالہادی صاحب — سید محمد معین صاحب
  - مولانا سید دلدار علی صاحب غفرانمآب علیہ الرحمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سپاسِ بے پایاں

سب سے پہلے شکر واجب ہے اس خدائے بزرگ و برتر کا جس نے اپنی شان میں خود فرمایا ہے کہ "الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان"۔ اسی نے لوح و قلم کو خلق کیا۔ اسی نے مجھ جیسے ذرۂ ناچیز اور بندۂ حقیر سے یہ کام لینا چاہا اور یہ حوصلہ عطا فرمایا کہ میں اپنی ہمہ بے مائگی کے باوجود یہ کتاب لکھوں۔ اسی نے غیر محسوس طریقہ پر میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ میں اسی کے بھروسہ پر اتنا بڑا کام کرنے کا عزم کرلوں۔ اسی نے یہ توفیق بھی عطا فرمائی کہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں ورنہ مجھ جیسے کم سواد و کم نظر میں یہ صلاحیت کہاں تھی۔ لہٰذا لاکھ لاکھ شکر ہے اس پروردگار کا جس کا شکر ادا کرنے سے زبانیں قاصر ہیں اور جس کے احسانات کا شمار انسانی طاقت سے باہر ہے۔

اس کے بعد شکر لازم ہے اس پیغمبر آخر الزماں محبوب کبریا جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جس کو نبی اُمّی کہا گیا مگر خدا کے بعد اس سے زیادہ صاحب علم اور کوئی نہیں جس نے اپنے آپ کو علم کا شہر اور اپنے جانشین اور خلیفۂ برحق صاحب "نہج البلاغہ" اور خطیب منبر سلونی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس شہر کا در کہا، وہ جس کی فصاحت و بلاغت حد اعجاز سے بڑھی ہوئی اور جس کا علم زمین و آسمان پر محیط ہے۔ انھیں ذوات مقدسہ کا کرم ہے کہ مجھ جیسے جہل مجسم کو حرف شناس کیا، میرے دست بے ہنر کو قلم عطا کیا اور مجھ کو اس قابل کیا کہ میں ان کی مدح و منقبت کے گہر ہائے آبدار دامن قرطاس پر بچھاؤں اور ان کی عظمت کے قصیدے ان کی بارگاہ میں نذر گزاروں۔ انھیں کے فضل و کرم سے یہ کتاب لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی جو انھیں کے مداحوں کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ زبان میں تی

طاقت کہاں کہ ان ذوات مقدسہ کا شکر ادا کر سکے جیسا کہ شکر ادا کرنے کا حق ہے۔
اور پھر ادائے شکر ضروری ہے کربلا کے ان عظیم شہیدوں کا جنھوں نے اپنی بے مثال شہادتوں سے نہ صرف حق کا بول بالا کیا اور ذہن انسانی کو جلوہ گاہ انوار حق و صداقت بنا کر اس میں اجالا کیا بلکہ دنیائے ادب کو ان جواہر پاروں سے بھی مالا مال کیا جو سلام، نوحے اور مرثیوں کی صورت میں آسمانِ شعر و ادب پر آفتاب و ماہتاب کی طرح ضوفشاں ہیں۔ انھیں سے اردو شاعری کو وہ اوج و وقار حاصل ہوا جس کے سامنے دوسری اصناف سخن ہیچ ہو گئیں اور عالمی ادب کے شہ پارے کم حقیقت ہو گئے۔ اردو کے شعراء نے انھیں اپنے خون دل سے تخلیق کیا اور مدح و رثاء کے ایسے بے بہا خزانے جمع کر دیے جن کا کوئی مثل و نظیر نہیں۔
یہ مقالہ، یہ کتاب ایسے ہی مرثیہ نگاروں کے ذکر پر مشتمل ہے جن کو ان خدمات کا صلہ انشاء اللہ انھیں شہیدوں کی بارگاہ سے ملے گا۔ انھیں کی خدمت میں ان کے مرثیہ نگاروں کا یہ تذکرہ اس عاجزانہ دعا، مانہ گزارش کے ساتھ پیش کر رہا ہوں

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ادائے شکر کے بعد شکریہ کی منزل ہے ان کرم فرماؤں کے لیے جن کی نگارشات سے میں نے اکتساب فیض کیا اور جن کی عملی مدد سے میں اس کتاب کو مکمل کرنے کے قابل ہوا۔ ان میں سب سے پہلے جناب محترم شمس الادب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی کا اسم گرامی آتا ہے۔ میں نے نہ صرف ان کی کتابوں سے واقعات اخذ کیے بلکہ اس کتاب کے آغاز سے تکمیل تک ان سے رہنمائی حاصل کی جس کے بغیر یہ مقالہ لکھنا میرے لیے ممکن نہ ہوتا۔ خداوند تعالیٰ ان کو ذہن کی بیداری کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے اور ان کا سایہ اہل خاندان کے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔ ان کے بعد حضرت مہذب لکھنوی مرحوم کا نام نامی و اسم گرامی ہے جنھوں نے خانوادۂ اجتہاد کے بعض مرثیہ گو شعراء کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کے چند مرثیے شائع کر کے انھیں محفوظ کر دیا۔ ان کا یہ احسان ہے تمام مذہب پر بھی اور اس خانوادہ پر بھی جس کا اعتراف نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔

خداوند تعالیٰ ان کی روحِ پُرفتوح کو اس کا ثواب جاریہ اور اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اور شکر گزار ہوں جناب محترم گرامی قدر سبط محمد نقوی صاحب مدظلہ العالی کا جنھوں نے بعض مفید اور ضروری معلومات فراہم فرمائیں۔ وہ لکھنؤ کے ایک معروف صاحب علم اور صاحبِ قلم دانشور ہیں۔

ان کے علاوہ شکر گزار ہوں معظمہ و محترمہ جناب بیگم شمس الحسن تاج (مرحوم) کا جنھوں نے بڑی تلاش و جستجو اور محنت شاقہ سے بعض ضروری مضامین اور مرثیوں کے علاوہ ضروری معلومات جمع کیں اور لکھنؤ سے مجھ کو ان کی نقول ارسال فرمائیں جن کے بغیر یہ مقدمہ نامکمل اور ناقص رہتا۔ وہ رشتہ میں میری بہن ہیں اس لیئے ان کا شکریہ ادا کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے لیکن کسی کی محنت کی داد نہ دینا اور کرم فرمائی کا اعتراف نہ کرنا بھی اچھا نہیں۔ ان کے اس عملی تعاون کے ساتھ ساتھ اس مقدمہ کی تکمیل کے لیئے ان کی دعائیں بھی شامل حال رہیں۔ خداوند تعالیٰ معصومینؑ کے صدقہ میں ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ صد دو صد سال سلامت رکھے۔ آمین

قومی و ملی شہرت کے مصور اور بحیثیت سابق صاحب بیاض انجمن ظفر الایمان کربلائی ادب سے بہت گہرا تعلق رکھنے والے جناب محترم مرزا اور مرزا صاحب قبلہ میرے پُرخلوص شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے بعض تصاویر کو فنی مہارت کے ساتھ قلمی شکل دے کر اور اس کتاب کا خوب صورت سرورق ڈیزائن کر کے اس کے صوری حسن کو چار چاند لگا دیئے۔ خداوند تعالیٰ انھیں صحت و تندرستی کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے اور ان کی ان تخلیقی خدمات کا سلسلہ جاری رہے۔ آمین۔

میرے برادر خُرد عزیزی سید ثابت حسین عرف حضور نواب سلمہٗ بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے لکھنؤ اور دوسرے مقامات سے متعلقہ معلومات فراہم کرنے میں بہت کاوش کی۔ خدا ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔

اپنے چچا زاد بھائی حسین افسر سلمہٗ کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنے والد بزرگوار

اور میرے عمِ محترم نواب سید افسر حسین صاحب افسرؔ اعلی اللہ مقامہٗ کا مرثیہ مجھ کو لکھنؤ سے بھجوایا۔

میں شکر گزار ہوں حضرتِ نیرؔ اسعدی اور حضرتِ سعید حیدر سعیدؔ کا جن کے عطا کیئے ہوئے مرثیوں کے ذخیرے سے حضرتِ نیرؔ اسعدی نے میری گزارشاتِ پیہم پر مہربانی فرما کر میرے بزرگوں کے تین مرثیے مجھ کو عطا فرمائے جو میرے لیئے نعمتِ غیر مترقبہ ہیں اور جن سے میں نے اس مقالہ کے لیئے استفادہ کیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان دونوں حضرات کے اس کرم کا شکریہ ادا کرسکوں۔ خداوند تعالیٰ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے صدقہ میں ان کو اس کا اجر عطا فرمائے اور انھیں صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔ آمین۔

آخر میں احقر صد شکر ہیں محترمہ نازشکیل نوازش رضا صاحب اور محترم جناب حسین انجمؔ صاحب جنھوں نے اس کتاب کے متعلق اپنی رائے کا تحریری طور پر اظہار فرمایا۔ یہ دونوں مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔

میری دعا ہے کہ خدائے عزوجل رثائی ادب کی خدمت کرنے والے تمام حضرات کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، مظلوموں کے مظالم کو بے نقاب کرنے اور معصوم کی مظلومیت اور مصائب کے موثر بیان سے پتھر دلوں کو پگھلانے کی توفیق عطا کرے اور وہ بارگاہ شہدائے کربلا سے اس کا اجر دنیا میں بھی پائیں اور آخرت میں بھی۔ آمین۔

گدائے درِ مولائے علمؑ

ساحرؔ لکھنوی

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# یہ کتاب

یہ کتاب مرثیہ گو شعراء کے ایک اہم خاندان یعنی خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ نگاروں کا تفصیلی تعارف کروانے کے مقصد سے لکھی گئی ہے۔ ان شعرائے کرام کا تذکرہ تمام نقد نگاروں نے ادھار رکھا بلکہ سرے سے ان کو نظر انداز کیا اور آج تک ان پر کوئی تحقیقی کام منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اس طرح اردو مرثیہ کا ایک بہت بڑا خاندان اور اس کے عظیم مرثیہ نگاروں کا رثائی ادب کے شائقین سے تعارف تک نہ ہو سکا۔ یوں نہ صرف ان کی حق تلفی ہوئی بلکہ اردو مرثیہ اور مرثیہ گویوں کا ہر تذکرہ ناقص اور نامکمل رہا۔ مختلف مرثیہ گو شعراء کے تذکروں میں کہیں کہیں ان میں سے کسی کا نام اشارۃً آ گیا ہے اور بس۔ صرف حضرت مہذب لکھنوی نے انجمن محافظ اردو لکھنؤ کی طرف سے شائع کی جانے والی اپنی دو کتابوں 'اذکارِ محسن' اور 'اسرارِ محسن' میں خاندان اجتہاد کے چند مرثیہ نگاروں کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کا ایک ایک مرثیہ بھی شائع کیا۔ یہ رثائی ادب پر ان کا بڑا احسان ہے۔ خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعراء کا بیشتر کلام تلف ہو گیا ہے۔ حضرت مہذب نے چند مرثیے شائع کر کے انھیں محفوظ کر دیا ورنہ شاید وہ بھی تلف ہو جاتے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے مقالہ 'مرثیہ بعد انیس' میں خاندان اجتہاد کو مرثیہ نگاروں کے چوتھے خاندان اور قصر رثاء کے چوتھے ستون کی حیثیت سے متعارف کروایا جس کی بدولت رثائی ادب کے شائقین اس خاندان سے مختصر طور پر متعارف ہوئے۔ ان چار خاندانوں میں

۱۔ خاندانِ انیس

اس کتاب کی ضخامت کو محدود رکھنے کے خیال سے بہت زیادہ بند درج کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

یہ مقالہ لکھنے کے لیئے بڑی تحقیق و جستجو کی ضرورت تھی۔ تحقیق کا ماخذ گزشتہ کتابیں ہوتی ہیں مگر جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں اس خاندان کے مرثیہ گو شعراء پر کوئی تحریری کام دستیاب نہیں ہے۔ تحقیق کا دوسرا ذریعہ خاندان کے بزرگ ہوتے ہیں جن سے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میں نے ایسے وقت میں اس کام کا بیڑا اٹھایا جب سوائے دو بزرگوں کے کوئی باقی نہیں رہا۔ ان میں سے ایک شمس الادباء جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس قبلہ مدظلہ العالی ہیں، دوسرے محسن الملت جناب محترم مولانا سید محمد محسن صاحب قبلہ مجتہد کی ذات گرامی ہے۔ آخرالذکر کی صحت اس قابل نہیں کہ ان سے اس سلسلہ میں کوئی مدد لی جا سکتی۔ جناب محترم مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ کو خاندان کے متعلق بہت کچھ معلومات ہیں اور ان سے مجھے اس مقالہ کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی۔ انھوں نے اپنی معروف کتابوں "تاریخ لکھنؤ" اور "لکھنؤ کی شاعری" میں بعض مرثیہ گو شعراء کے بہت مختصر سے حالات بھی لکھے ہیں لیکن کوئی فرد واحد پورے خاندان کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی رکاوٹ میری ڈھائی تین سالہ بیماری بھی ہے جس کی نوبت بیشتر تشویش ناک رہی اور مجھے صاحب فراش کر دیا۔ جسمانی طور پر میں اس قابل نہیں رہ گیا کہ مختلف کتب خانوں میں جا کر کتابیں تلاش کرتا، تحقیق کرتا اور ایسے حضرات سے ملتا جن کے یہاں خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعراء کے مرثیے اور دوسرا کلام موجود ہونے کا گمان ہے۔

ان سب وجوہ نے اس مقالہ کی تیاری کو بہت مشکل بنا دیا تھا۔ میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کتابوں میں بے بنیاد اور ہوائی باتیں یا دل سے گڑھی ہوئی چیزیں درج کی جائیں، اس لیئے ایک ایک بات کی تصدیق کے واسطے میں ماخذ کے حوالے دیتا ہوں تاکہ تحریر کی صداقت مشتبہ نہ ہو۔ چنانچہ ان رکاوٹوں کے باوجود اور اپنی علمی بے بضاعتی، کم نظری اور تحقیق و تنقید کے ہنر سے نابلد ہونے کے باوصف میں نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا۔ تحقیق

وتدقیق کے نقطۂ نظر سے میں نے کم وبیش ڈیڑھ دوسو کتب وجرائد، اخبارات اور مخطوطات کو کھنگالا اور تقریباً ڈیڑھ سو مطبوعات، مخطوطات، جرائد واخبارات اور مکتوبات سے جتنی بھی معلومات دستیاب ہوسکیں ان سے استفادہ کیا۔ اس کا اندازہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس مقالہ میں کم وبیش بارہ[۱۲] سو معروف وغیر معروف شخصیات وغیرہ کے نام آئے ہیں جن میں سے بیشتر کے نام بار بار آئے ہیں جن کا اشاریہ صفحات کے حوالوں کے ساتھ مرتب کرنا بھی بہت دشوار ہے۔ بہر حال اس طرح خدا کے فضل اور مولا کے کرم سے یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

جن مرثیہ گو شعراء کے بارے میں کوشش کے باوجود تفصیلی حالات دستیاب نہ ہوسکے ان کے مختصر تعارف کے ساتھ مختصر تذکرے آخر میں درج کردیئے۔

میری ان محنتوں کا ثمر اب اس کتاب کی صورت میں رثائی ادب کے شائقین اور اہل نقد ونظر کے سامنے ہے۔ اس کے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتے ہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن تمام کوششوں کے باوجود اس میں کچھ اسقام ہوسکتے ہیں۔ اس لیئے قارئین کرام مجھ کو میری کوتاہیوں سے مطلع فرمائیں تو شکرگزار ہوں گا۔

ممنونِ کرم

گدائے درِ مولائے علم

ساحر لکھنوی

فروری ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر شکیل نوازش رضا

# مرثیہ اور ساحر

سے تنقید بھی کی ہے۔ اگرچہ محققین کی تنقید بہت زیادہ وقیع اور پر اثر نہیں ہوتی لیکن ساحر لکھنوی کے یہاں یہ خوبی موجود ہے۔ وہ اچھے محقق کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ نقاد بھی ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی تنقید کا انداز قدیم اور روایت پسند نقادوں جیسا ہے۔ میں اس کتاب کے عنوان سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے اس کتاب کا عنوان ''خانوادۂ اجتہاد کے شعرا'' ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس تصنیف میں تقریباً تمام شعرا کے مختلف اصناف سخن میں دستگاہ رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے اور مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ یہ تمام شعرا دوسری اصناف میں بھی درک رکھتے تھے اور ان میں سے بعض بہترین قصیدہ گو، غزل گو، منقبت نگار اور نعت گو بھی تھے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ قاری اور اس معرکۃ الآرا تصنیف کے درمیان حائل رہوں۔ اس لیے اس مختصر سے مضمون کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ میں نے اس کتاب کو پہلی بار دیکھنے کے بعد ختم [illegible] ساحر لکھنوی سے عرض کیا تھا اور وہ یہ کہ ''ساحر لکھنوی چاہے مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے اس درجے پر نہ پہنچ سکیں جس کا حق ہے لیکن ان کو یہ تصنیف بلاشبہ دنیائے ادب میں محققین اور مورخین میں انھیں ایک بلند مرتبے پر فائز کرے گی اور ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے ان کی یہ تصنیف کافی ہے۔

پھر نہ معلوم کیوں انھوں نے کتابوں کی اشاعت اور اشاعت شدہ کتابوں پر انعامات اعلانات سے ادارہ کا دل ڈالا اور ایک دن اپنے بعض قریبی دوستوں کو اپنے علم کدے پر یاد فرمایا۔ سہ پہر کا وقت تھا گفتگو کے درمیان اچانک ملازمہ نے انواع و اقسام کی اشیائے ناشتہ سے میز کو سجا دیا۔

”ارے حضرت یہ کیا، اس قدر زحمت کیوں فرمائی ایک پیالی چائے بہت ہے“۔ ہم سب نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا۔

اس اول ملاقات کے بعد ہر دو دن بعد کسی معین مدت پر گفتگو کے لیے بموجب ارشاد ہم سب ان کے یہاں جمع ہوتے اور ہر دفعہ لکھنوی تکلفات کے ساتھ ہماری خاطر و مدارات کی جاتی اور ہر دفعہ سب حضرات جو بہت شوق سے ان چیزوں سے انصاف فرماتے وہی روایتی فہمائش کے الفاظ ادا کرتے۔ ایک دفعہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ساحر صاحب کو مخاطب کر کے کہا ”حضرت آپ ان فہمائش کے الفاظ پر نہ جائیے گا یہ سب خانہ داری ہے۔ یہاں آتے وقت ہم سب کے دل میں آپ کے یہاں کی پر تکلف لکھنوی اشیائے خورد و نوش سے لطف اندوزی کا خیال ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو جاری رکھیے ہم ہمیشہ ان شاء اللہ اسی آمادگی و رغبت سے حاضر ہوتے رہیں گے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آغاز و انعقاد کا ہی ادارہ کا نام تجویز ہوا اور اس ادارہ نے واقعی بعض بڑے مفید کام کیے مثلاً ہر سال تازہ شائع شدہ کتابوں پر نقد انعامات، اسناد اور نشانات خصوصی کا اعطا اس کے بنیادی فرائض میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی خدمات کا اعتراف اور جرائد و اخبارات کا اعتراف خدمات مع نقد رقوم اور نشان امتیاز وغیرہ یہ جلسہ کم از کم ڈھائی ڈھائی روپے کے بجٹ کا ہوتا ہے اور اس سے وہ [illegible] بھی این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کے مصداق حضرت ساحر تنہا فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا اس سے بھی زیادہ اہم بالشان کام علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت ہے۔ اب تک اس ادارہ سے چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن میرے نقطہ نظر سے اس ادارہ کا اردو کی

تاریخ ادب میں رہتی دنیا تک زندہ رہ جانے والا کارنامہ ساحر لکھنوی کی ضخیم تحقیقی کتاب "خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو ماہر سے ساحر تک" ہے۔ تقریباً آٹھ سو صفحات کی اس کتاب میں رثا سے متعلق خاندان اجتہاد کے شعرا کے حالات، خدمات اور کمالات کو بڑی کاوش، جستجو اور تحقیق سے قلمبند کیا ہے۔ ساحر لکھنوی کی یہ تصنیف ان کے رثائی کلام کی طرح ان کے نام کو تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ یہ کتاب نہ صرف تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے بلکہ اس کا انداز بیان نہایت علمی و ادبی ہونے کے باوصف حد درجہ دلچسپ، رواں اور دلنشین ہے اور اس کی عبارت لکھنؤ کی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی وہ زبان ہے جس پر ساحر لکھنوی کو غیر معمولی قدرت و دسترس حاصل ہے۔ اس اعتبار سے عصر حاضر کی بڑی سے بڑی تحقیقی کتاب بھی اس تصنیف لطیف کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ صاحبان ذوق کے لیے یہ نعمت غیر مترقبہ ہے اور زبان و ادب اور تحقیق و کاوش کا اعلیٰ مذاق پیدا کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے موضوع پر تا حال یہ واحد مستند کتاب ہے اور خانوادۂ اجتہاد پر ساحر لکھنوی کی بڑی سند ہو جاتا ہے۔

جن کی تحریروں پہ پڑتی ہے بصد حسرت نگاہ
جن کا اک اک لفظ ہے ناظر سے اپنے دادخواہ
ہیں جناب ساحرِ معجز بیاں لاریب و شک
منقبت گوئی کے سلطاں، مرثیے کے بادشاہ

زیر نظر کتاب تحریر فرما کر حضرت ساحر لکھنوی نے یہ ثابت فرما دیا ہے کہ نظم کی طرح اعلیٰ درجے کی نثر بھی ان کی قلمرو میں شامل ہے۔

ہندوستان کا جو ہندو مسلم کلچر کا آمیزہ ہے۔ اس میں ہندو کلچر غالب ہے۔ مثلاً ہندوؤں میں دولھا سہرے پگڑی اور [illegible] پر باندھا جاتا ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] کا [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] رخصت ہوتی ہے۔ مرثیے میں یہ [illegible] [illegible] ہے۔

پہنچے یوں خیمے کے نزدیک شہنشاہ زماں
لاش نوشاہ کے ہمراہ عجب تھا ساماں
شادیانوں کی صدا تھی کہ بلند آہ و فغاں
ساتھ تھے حسرت و حرماں کے براتی گریاں
پیٹتی سینہ و سر باد بہاری آئی
خوں میں ڈوبی ہوئی دولھا کی سواری آئی

در پہ خاموش کھڑی تھی جو بنے کی مادر
لاش آتے ہوئے دیکھی تو ہوا دل مضطر
جا کے خیمے میں یہ رانڈوں سے کہا رو رو کر
بی بیو! میں تمھیں شادی کی یہ دیتی ہوں خبر
عیش و راحت کی کوئی آن میں رات آتی ہے
دھوم سے میرے پر ارماں کی برات آتی ہے

کہہ دے کوئی کہ جلو خانے میں بچھے بستر
بیٹھیں آرام سے، راحت سے براتی آ کر
بچھے یوں بھی کوئی دولھا کے لیے مسند زر
بہنیں آتی نہیں کیوں ڈالے آنچل سر پر

شکل اختیار کر لی ہے۔ مختلف تحریکوں کے زیر اثر مرثیہ میں سے پہلے رزمیہ کو خارج کیا گیا کہ
ہم کو تو رزم آموز نہیں، لیکن اب بیان کا زمانہ نہیں ہے، ان کا بیان تضیعِ اوقات ہے
وغیرہ وغیرہ۔ پھر تحریک چلی کہ مرثیہ کو کردار نگاری اور مرقع نگاری سے پاک کیا جائے، پھر کہا
گیا کہ مرثیہ کا جو بنیادی مفہوم اور مقصد تھا یعنی بین مصائب اس کو بھی مرثیہ سے خارج کیا
جائے کیونکہ مرثیہ رونے رلانے کے لیے نہیں ہوتا صرف کردار پیدا کرنے کے لیے
ہوتا ہے۔ گویا شروع سے لے کر آخری عہد تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں مرثیہ نگاروں
نے مرثیہ کو رونے رلانے کا ذریعہ بنا کر مرثیے کو ایک عبث اور بے مصرف کام بنایا اور اپنی
قیمتی زندگیاں اس قسم کے بے کار کاموں میں ضائع کر دیں۔ بہرحال اس کے بعد تازہ ترین
تحریک یہ چلی کہ مرثیے کو امام باڑوں سے نکالو، یعنی موجودہ صورت میں اس کا جو چھوٹا سا
بہت حلقہ سامعین اور ناظرین کا باقی رہ گیا ہے اسے بھی ختم کیا جائے۔ اس کا ظاہری مقصد یہ
ہے کہ مذہبی شاعری سے مرثیہ کو امام باڑوں سے محدود سامعین سے منقطع طور پر نہیں
نکالا جائے بلکہ سامعین تک اسے پہنچایا جائے جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مرثیوں کی
بات سمجھ سکیں۔ یہ فکر کس حد تک تعمیری یا تخریبی ہے اس پر تبصرہ کرنے کی مجھے ضرورت
نہیں ہے۔

قدیم و جدید مرثیہ کی بحث اب تلخ ہوتی جاتی ہے اس لیے میں اس بحث میں بھی نہیں
پڑوں گا۔ قدیم و جدید کے حوالے سے برصغیر کے ایک نہایت معتبر ادیب، نقاد اور دانشور
جناب ڈاکٹر شارب ردولوی، جو سابق یونیورسٹی دہلی نے میرے مجموعہ مراثی آیات درد پر
تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

> "مرثیے کے لیے جدید و قدیم اور روایتی و غیر روایتی کی اصطلاحیں مجھے
> ہمیشہ ہی غیر ضروری سی محسوس ہوتی ہیں اس لیے کہ مرثیہ صرف مرثیہ ہے، اور
> وہ مرثیہ نہیں ہے تو خواہ اسے جدید کا نام دیا جائے یا قدیم کا، روایتی کہا جائے یا غیر روایتی
> وہ میری تشویش کا مضمون نہیں ہے۔" ([illegible])

میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے نقطۂ نظر کو ایک مثبت اور تعمیری سوچ کا حامل سمجھتا ہوں اور پوری طرح اس سے متفق ہوں۔

مرثیہ اور مسدس کی بحث میں دہلی کے ایک معروف ادیب و نقاد جناب فاروق بخشی نے حضرت مہدی نظمی کے مجموعۂ مراثی 'مظلومِ کربلا' کے پیش لفظ 'عرضِ مرتب' میں ایک سچے کی بات کہی ہے جو یہ ہے:

"مرثیہ پہچانا جاتا ہے تو اپنی ہیئت سے جو میر ضمیر، میر خلیق اور میر انیس مرحوم نے کمال دانائی سے وضع کی ہے۔ بعد کے مرثیہ گو شعراء نے مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں باغ و بہار و ساقی نامہ ایسے موضوعات کے لیے بعض گنجائشیں ضرور پیدا کیں لیکن انھوں نے مرثیہ کی خوب صورت عمارت میں شکست و ریخت یا توڑ پھوڑ کا وہ عمل شروع نہیں کیا جو اس زمانے سے بعض شاعروں کی عادت اور وتیرہ بن گیا ہے۔ وہ اپنی منظومات کو جو مسدس کی صورت رکھتی ہیں، مرثیہ کہے جانے پر خدا جانے کیوں اصرار کرتے ہیں۔ شاید انھیں یہ خدشہ ہے کہ لفظ 'مرثیہ' کو شاعری کا جو وقار حاصل ہے وہ ان کی منظومات کو مسدس کہے جانے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا"۔ (ص ۵)

اس تبصرے میں جناب فاروق بخشی نے جو بہار اور ساقی نامہ کا ذکر کیا ان کے بارے میں برسبیل تذکرہ یہ عرض کردوں کہ مرثیوں میں یہ اضافے اکثر ہدفِ تنقید و اعتراضات رہے ہیں مگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ ان میں مرثیت کا ہونا ضروری نہیں جو مرثیوں کے اور بھی کئی حصوں میں نہیں ہوتی مگر یہ بھی کربلائی روح سے ہم کنار ہوتے ہیں اور مرثیہ کی فضا سے الگ نہیں ہوتے۔ جہاں جہاں ان میں کربلائی تعلق نہیں دکھائی دیتی وہاں مدحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ جلوہ گر ہوتی ہے۔ بیانِ رزم ہو یا بیانِ مدح، واقعات کی تصویر کشی ہو یا شاعر کے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار، یہ شاعرانہ طاقتوں اور تخیل کی ترجمانوں کا بڑا حسین مرقع ہوتے ہیں اور بیانیہ نظم میں شاعری کے امکانات کو بڑی وسعت

دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مرثیہ کا یہ حصہ بڑا وجد آور ہوتا ہے۔ اس میں مجاز بھی ہوتا ہے اور حقیقت بھی، محاکات بھی ہوتے ہیں اور تشبیہات و استعارات کے ساتھ کنائے بھی، کبھی کبھی غم انگیز اشارے بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر "ساقی نامہ" کی یہ بیت ملاحظہ ہو

نہ دے مجھے تو کروں گا نہ رشک اے ساقی   یہ شوق بھر دے سبیلِ دمشق اے ساقی

اسی طرح قبل بند حضرت حُر کی یہ ابیات ملاحظہ ہوں

لے جاؤں کیا نبی کے نواسے کے واسطے   دے جام تین روز کے پیاسے کے واسطے

اور مدح میں

جرأت نہیں ہے شاہ سے جو کاسۂ فقیر کا   منہ دیکھتا ہے جام جناب امیر کا

اس کا وہ جام وارثِ خوانِ خلیل سے   جو سرد ہو ہوائے پرِ جبرئیل سے

اور رزمیہ میں انھیں کی بیت ہے:

بجھ سکے نہ ذرا بھی کوئی دم پیکار   یہ موجِ شوق بدن میں ہے خوں بھری تلوار

مدح میں حضرت جاوید کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں

انگلیاں پانچ ہیں اور ایک ہتھیلی پہ ہے جام   پنجتن کی نہ محبت ہو تو پینا ہے حرام

یہ خانوادہ اور اس کے مرثیے فکری اور فنی طور پر کیا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بارے میں برصغیر کے نامور ادیب، نقاد اور دانشور جناب سید شریف الحسن نقوی، سابق معتمد عمومی اردو اکادمی دہلی نے اپنے ایک مضمون مشمولہ "اردو مرثیہ" مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی مطبوعہ دہلی میں اس رائے کا اظہار کیا ہے:

"جہاں تک رزمیہ عناصر کا تعلق ہے ان میں کمی آجانے سے مرثیے کے فنی مرتبہ کو ضعف پہنچا ہے۔ اسی طرح محاکات کی جو فضا اور جذبات نگاری کا جو انداز قدیم مرثیہ گویوں کے ہاں ملتا ہے جدید رنگ کے مرثیہ نگاروں سے کچھ زیادہ کامیاب نمونے پیش نہیں کر سکے اور اس ضمن خاص میں وہ اپنے پیش رو مرثیہ نگاروں سے بہت پیچھے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جدید

مرثیہ میں ان عناصر کی کمی فنی تقاضہ یا اصلاحی جذبہ کا نتیجہ نہیں۔ اسے جدید مرثیہ نگاروں کی تن آسانی یا عجز شاعرانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جدید مرثیہ اپنی بعض خوبیوں کے باوجود خاص فنی نقطۂ نظر سے قدیم مرثیے کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا"۔ (ص ۳۶۳)

ہوسکتا ہے کہ میری یہ معروضات بعض قارئین کرام کے اذہان عالیہ پر بار ہوں مگر میں نے یہ باتیں اپنے اس مقالے کے ابتدائیہ کے طور پر لکھی ہیں جو خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعراء کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ان شعراء کے کام کا دور تقریباً ڈیڑھ سو سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا رنگ سخن کلاسیکی ہے اس لئے کلاسیکی مرثیہ کی طرف قارئین کے ذہنوں کو منتقل کرنے کے لئے یہ مختصر سی گفتگو ضروری تھی۔ اور وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اس لئے جدید مرثیہ کا ذکر بھی آگیا ورنہ میرا مقصد جدید و قدیم مرثیہ پر کسی قسم کی بحث کرنا نہیں تھا۔ امید ہے کہ جن حضرات کو میری یہ تحریر ناگوار گزرے وہ مجھے فراخدلی سے کام لیتے ہوئے معاف فرمادیں گے۔

گدائے در مولائے علم

ساحر لکھنوی

میں نے سید العلماء، مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ طاب ثراہ کے انتقال پر ایک شخصی مرثیہ بعنوان 'علم و عمل' میں ان حالات پر روشنی ڈالی تھی

نجف میں، مشہد و قم کی فضا میں آٹھ پہر
اس آسماں پہ چمکتے تھے کتنے شمس و قمر
مگر نہ تھا کوئی ہندوستاں میں علم کا در
جہاں سے نور ہدایت کا پاتے اہلِ نظر
دیارِ ہند کو تاریکیوں نے گھیرا تھا
یہاں ہر ایک طرف جہل کا اندھیرا تھا

تھے اس دیار میں کہنے کو پیروانِ علی
تھے اجتہاد سے ناواقف اہلِ ہم سبھی
کوئی فقیہ تھا ایسا نہ مجتہد کوئی
بتاتا ان کو جو احکام فقہی و شرعی
بس اتنا تھا کہ نبیؐ و علیؑ کو مانتے تھے
عوام دین کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے

تھے اپنی قوم میں رائج طرح طرح کے رسوم
تھی شیخ سدو و احمد کبیر کی اک دھوم
نمازِ جمعہ سے بیگانہ، فقہ سے محروم
نہ رازدانِ شریعت، نہ آشنائے علوم
تھے غرق کچھ تو ادھر صوفیت کے ساغر میں
پھنسے تھے کچھ ادھر اخباریت کے چکر میں

ع یکایک آ گیا قدرت کو رحم ملت پر

یعنی ١١٦٦ھ میں ایک شب جمعہ نصیرآباد یوپی میں جناب سید دلدار علی کی ولادت

ہوئی۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرم نے ''رودِ کوثر'' میں عیسوی سنہ ولادت ۱۷۵۳ء لکھا ہے۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام سید محمد معین تھا۔ تیئیس... واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یوں اولادِ رسولؐ میں آپ نقوی سادات میں سے تھے۔ اب جو

یکایک آ گیا قدرت کو رحم ملت پر
کرن امید کی تاریکیوں میں آئی نظر
اس آفتاب کو لے کر ہوئی طلوع سحر
ہے جس کی روشنی برِصغیر میں گھر گھر
جسے سب اہلِ نظر آفتاب کہتے ہیں
اس آفتاب کو غفراں مآب کہتے ہیں

یہ آفتاب جو اک شمع سا ہوا روشن
یہ ایک پھول جو مہکا مثالِ مشکِ ختن
حصولِ علم کی دل کو لگی ہوئی تھی لگن
گیا نجف کو جو یہ پھول، یہ چراغِ وطن
ہوائے باغِ ''سلونی'' ملی گلاب ہوا
نجف کی خاک سے چمکا تو آفتاب ہوا

## حصولِ علم کی لگن:

شمس العلماء مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ اپنی کتاب 'ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ' میں لکھتے ہیں:

''قدرت نے ان کو حساس دل، دقیق نظر، انقلابی ذہن، آہنی عزم اور پُرتاثیر زبان عطا کی تھی، وہ بچپنے سے بردبار، سنجیدہ اور غور و فکر کے عادی تھے اور شیعیت کی اس زبوں حالی پر غور کرتے رہتے تھے۔ دیہات کی زندگی، کھیتی باڑی کا مشغلہ تھا اور معمولی تعلیم تھی۔ تاریخ و سیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک

دن وہ اپنے کھیتوں کے قریب درخت کے نیچے کھڑے تھے کہ ایک روشنی پیدا
ہوئی اور آواز آئی دلدار علی جاؤ اور علم دین حاصل کرو۔ حقیقت میں یہ ان کے
دل کی آواز تھی جسے وہ سوتے جاگتے سنا کرتے تھے۔ آخر گھر بار چھوڑ کر نکل
کھڑے ہوئے"۔ (ص ۳)

سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ طاب ثراہ اپنے رسالہ جناب حضرت غفراں
مآب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کر کے سندیلہ میں شارح مسلم ملا
حمد اللہ کے صاحب زادہ ملا حیدر علی سے، الہ آباد میں سید غلام حسین دکنی سے،
رائے بریلی میں مولوی باب اللہ تلمیذ ملا حمد اللہ سے صرف و نحو، معانی و بیان
وغیرہ اور علوم عقلیہ منطق و فلسفہ و ریاضی کی تکمیل کی۔ پھر فیض آباد تشریف
لے گئے اور وہاں بحر العلوم مولوی عبد العلی صاحب سہالوی سے بعض مسائل
عقلیہ پر مباحثہ ہوا۔ وہاں سے لکھنؤ تشریف لائے۔ اس وقت یہاں نواب
آصف الدولہ مرحوم کی حکومت تھی اور نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں
کا اقتدار تھا۔ انھیں احساس ہوا کہ ہندوستان میں اب تک کوئی شیعہ عالم ایسا
نہیں ہوا جو درجہ اجتہاد پر فائز ہو۔ اس طرح خداوند عالم نے ان کو جناب
غفراں مآب کی ایسی امدادی توفیق عطا فرمائی کہ آپ تکمیل علم کے لیے عتبات
عالیات کی طرف روانہ ہو گئے۔

## تکمیل علم اور مراجعت:

پہلے عراق پہنچے اور کربلائے معلی میں صاحب ریاض آقائے سید علی طباطبائی
اور آقا سید مہدی موسوی شہرستانی نیز خود ان بزرگوں کے استاد، استاذ
اکبر آقا باقر بہبہانی سے اور نجف اشرف میں بحر العلوم آقا سید مہدی طباطبائی
سے علم فقہ و اصول اور علم حدیث کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ۱۱۹۴ھ میں

مشہد مقدس (ایران) کی طرف رخ کیا اور جناب سید محمد مہدی ابن سید
ہدایت اللہ اصفہانی سے اکتساب علوم کیا اور بعد تکمیل مراجعت فرماتے ہوئے
ہندوستان پہنچے۔ مرزا حسن رضا خاں کی خواہش سے لکھنؤ میں قیام فرمایا اور
سلسلہ تصنیف و تدریس و تبلیغ شروع کیا۔ چند ہی سال کے اندر چند کتابیں
تصنیف کر کے عراق بھیجیں اور مذکورۂ بالا اساتذہ نے اجازات روانہ
فرمائے"۔

حضرت غفراں مآب نے لکھنؤ میں قیام کے بعد ان مقاصد کی تکمیل کے لیے
اقدامات کیے جو ان کا مقصد حیات تھے اور جن کے لیے انھوں نے اتنی زحمتیں اٹھائی
تھیں۔ اس غرض سے انھوں نے:

(۱) شیعیان برصغیر کو فقہی مسائل سے آگاہ کرنے، مذہب امامیہ کی صحیح تعلیمات سے
روشناس کرنے اور معاملات زندگی شادی بیاہ، مرنا جینا، دفن و کفن، حقوق اللہ و حقوق العباد،
نیز عبادات میں نماز و روزہ وغیرہ کے بارے میں احکام شریعت سے آگاہ کرنے کا انتظام
کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے متعدد شاگردوں کو ضروری تعلیم و تربیت کے بعد
ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بھیجا کہ وہ مقامی شیعوں میں دین کی تبلیغ کر کے ان کی اصلاح
کریں۔ اس کے نتیجہ میں سارے ہندوستان میں شیعیت کی لہر دوڑ گئی، ہر جگہ شیعہ بحیثیت
ایک قوم کے نظر آنے لگے جن کے نام، مذہبی رسوم، اخلاق، طرز معاشرت، معیار فکر،
زاویۂ نظر، تعلیم اور لٹریچر سب الگ ہو گیا اور وہ ایک مستقل قوم بن گئے۔ یوں ہندوستان کی
قوموں میں اپنی علمی اور تمدنی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔

جناب غفراں مآب کے اس کارنامے کے متعلق جناب مفتی محمد عباس صاحب اعلی اللہ
مقامہ نے اپنی معروف کتاب ظل ممدود میں شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی، صاحب جواہر کے
یہ الفاظ درج کیے ہیں جن کا حوالہ جناب مولانا شمس صاحب قبلہ مدظلہ نے اپنی کتاب
'ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ' میں دیا ہے:

''زندہ کرنے والے مذہبی رسوم کے، آباد کرنے والے اس کی منزلوں کے، وہ ماہتاب جس کا طلوع گمراہوں کی ہدایت، وہ شہسوار جن کے ہاتھ میں اسلام کا رایت، جن کی نگہداری میں اسلام کے ستون سربلند ہوئے''۔

(''ظل ممدود'')

مفتی محمد عباس صاحب جناب غفراں مآب کے صاحب زادوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں

''اے رفعت و بلندی کے مالک، اے ورع و تقویٰ کی جائے پناہ، اے ہدایت کے نور، اے آفتاب روز، آپ کے سبب سے ہماری سرزمین پر شریعت حضرت محمد مصطفیٰ ظاہر ہوئی۔ اگر آپ نہ ہوتے اے میرے سرداران ملت، تو ہمیں خبر بھی نہ ہوتی کہ ہمارا دین و مذہب کیا ہے۔ کیا کہنا آپ لوگوں کا کہ جو شخص آپ کی زیارت کرے وہ ہدایت پا جائے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کو کثیر علم کا مالک بنایا تاکہ رگڑ دیئے کو دشمنوں کی۔ میرا فخر ہے کہ میں ہدایت حاصل کرنے والا ہوں اس یگانۂ عصر امام سے''۔

(''رطب العرب''، ص۸۲)

علامہ کنتوری لکھتے ہیں:

''بلاشبہ ہمارے اس ہادی دین نے وہی کام کیا جو مدینہ میں ان کے جد نامدار نے۔ اس خاندان کے دشمن بدخواہ ہمیشہ روسیاہ رہیں گے''۔

(''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ''، ص۱۶)

## جناب غفراں مآب کے دوسرے اہم کارنامے:

سید العلماء، مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ لکھتے ہیں

''جناب غفراں مآب نے ایک طرف موعظ و نصیحت سے داخلی اصلاح فرمائی اور ان سب رسوم (احمد بیہ کی گائے اور شیخ سدو کا بکرا وغیرہ) کا قلع قمع

کیا اور دوسری طرف دوسرے فرقوں کے علماء کا مقابلہ کیا۔ اس وقت ایک محاذ شیعیت کے خلاف اہل سنت کا تھا، دوسری طرف صحیح تعلیمات شریعت کے خلاف اخباریت کا تھا، تیسرا اب مغز صوفیت کا جس کے نتیجہ میں پیری مریدی کا زور تھا اور احکام شریعۃ سے قطعی بے پروائی برتی جاتی تھی۔ جناب غفراں مآب نے تن تنہا ان تمامی ذدوں پر مقابلہ کیا۔

(۲) شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب 'تحفۂ اثنا عشریہ' کے ہر باب کا جواب لکھا۔ تفصیل ان کی تصنیفات کے ذیل میں لکھی جائے گی۔

(۳) اخباریت کا زور توڑنے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ان کی مایۂ ناز کتاب 'فوائد مدنیہ' کی ردلکھ کر ان پر بڑی شدید ضرب لگائی۔ اس کے جواب میں خبریین کی طرف سے ''معاول العقول'' لکھی گئی جس کا جواب جناب غفراں مآب نے اپنے بعض شاگردوں کی طرف سے ''مطارق'' کے نام سے تحریر فرمایا اور آخر ہندوستان سے اخباریت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

(۴) صوفیت کے مقدمہ میں ''شہاب ثاقب'' لکھی جس میں صوفیہ کے اصلی خدو خال کو بالکل بے نقاب کر کے پیش کر دیا اور مواعظ و تبلیغات کے ذریعہ صوفیت کا زور اس طرح توڑ دیا کہ آج سوائے سندھ اور پنجاب کے دور دراز کے مقامات کے جہاں تک تبلیغی آواز نہیں پہنچ سکی تھی برصغیر کے دوسرے علاقوں میں شیعوں کے اندر پیری مریدی، خانقاہوں اور اولیاء کے مزارات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

(۵) جناب غفراں مآب کا ایک اور بڑا اور اہم کارنامہ نماز جمعہ و جماعت کا قیام ہے۔ ان سے پہلے شیعوں میں نماز جمعہ و جماعت نہیں ہوتی تھی۔ ۱۳ر رجب ۱۲۰۰ھ کی مبارک تاریخ کو جناب غفراں مآب کی اقتداء میں پہلی نماز جماعت ہوئی اور ۲۷ر رجب کو پہلی نماز جمعہ۔ آپ نے نماز جمعہ کے وجوب پر ایک استدلالی کتاب بھی لکھی۔

(۶) عزائے حسینؑ کی ترویج و اشاعت میں بھی پورا انہماک صرف کیا۔ اس سلسلہ

میں دو کتابیں بھی تحریر فرمائیں اور عملی طور پر لکھنؤ میں ایک امام باڑہ تعمیر کیا جو امام باڑہ غفران مآب کے نام سے مشہور ہے۔ وہ خود اور ان کی اولاد اور خاندان اجتہاد کے دوسرے ارکین بھی اسی امام باڑہ میں مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ نصیرآباد میں بھی ایک امام باڑہ تعمیر کروایا جس کے اب صرف آثار باقی رہ گئے ہیں۔

(۷) ان کاموں کے علاوہ تصنیف و تالیف کا اتنا کام کیا اور اتنی اہم اور مستند کتابیں لکھیں کہ جن کا جواب نہیں ہے۔ ان کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

(۸) اپنے بے شمار شاگردوں اور طالبانِ علم کی تدریس و تربیت بھی ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں جہاں کہیں بھی علم ہے اس کی انتہا غفران مآب طاب ثراہ تک ضرور ہوتی ہے۔

ان تمام خدمات میں سے ہر ایک میں جتنا کام غفران مآب نے بذاتِ خود کیا ہے وہ کسی ایک شخص کی پوری زندگی کا کارنامہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ ان تمام خدمات کو مجموعی حیثیت سے بوقتِ واحد انجام دینا بغیر مخصوص تائید و توفیقِ الٰہی کے خیال میں نہیں آ سکتا۔ (جناب غفران مآب)

وہ درس اور وہ تصانیف، وہ فروغِ عزا
رسومِ بد کی وہ اصلاح، فقہ کا اجرا
وہ صوفیت ہو کہ اخباریت کا ہو فتنا
ہر اک محاذ پہ باطل سے وہ جہاد ان کا

یہ اتنے کام اور اک ذات، اس کو کیا کہیے
بس ایک جذبہ و ہمت کا معجزا کہیے

("علم اور علماء" از ساحر لکھنوی)

## تصانیف:

جناب غفران مآب نے اپنی تصانیف کے ذریعہ علم و تحقیق کے دریا بہا دیے ہیں اور

رونق افزائے محفل ہیں۔ وسط میں (اشاعرہ) شاعرہ اور معتزلہ کا گروہ مع اپنے تلامذہ اور اتباع کے جن میں حافظ نظام، ابوالہذیل علاف بلخی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ ایک گوشہ میں ملا صدرالدین شیرازی مع اسفار اور شارح مواقف مع اپنی تصنیفات کے تشریف فرما ہیں۔ دوسرے گوشہ میں شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری اور علامہ فضل بن روزبہان مع احقاق الحق اور ابطال الباطل کے حاضر ہیں۔

صدر نشین بزم قدس جناب غفران مآب علیہ الرحمہ ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں عنان کمیت قلم ہے اور وہ اس میدان تحقیق میں جولاں ہو رہے ہیں۔ آپ کی تحقیق اتنی کامل، آپ کی نظر اتنی وسیع ہے کہ آپ سے فیصلہ و تمام علماء مانے ہوئے ہیں۔ آپ پر مجال نہیں کہ کوئی اعتراض کر سکے اور آپ کی تحقیق کو رد کر سکے"۔ ([illegible] غفران مآب نمبر)

عراق کے مشہور عالم شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر الکلام لکھتے ہیں:

"مرآۃ العقول، الملقب بہ عماد الاسلام جس کے مصنف ہیں اسلام کے رکن اعظم اور خلق خدا کی حجت، جنھوں نے عقل کو اپنی موشگافیوں سے حیران کر دیا اور عقلی شبہوں کو اپنی فکر و نظر کے ستاروں سے روشن کر دیا، جن کے انواع علوم کی حدیں معین کرنے سے اجناس و فصول قاصر ہیں اور جنھوں نے تحریر کی مشکل شکلوں کو اپنے بیان کے منطق کے ذریعہ سے واضح کیا۔ تمام خلق خدا کے مرکز اور انواع عقول عشرہ[1] کے مد مقابل گیارھویں عقل"

(ماخوذ از "ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ"، ص ۸)

---

(۱) فلاسفہ یونان قائل ہیں کہ اللہ کی مخلوق بلاواسطہ عقل اول ہے اور عقل اول نے عقل ثانی کو پیدا کیا اور عقل ثانی نے عقل ثالث کو یونہی دس عقل تک سلسلہ پہنچا اور سب پیدا ہوئے پھر انھیں عقل و افلاک کی شرکت سے تمام کائنات وجود میں آئی

۲۔ شہاب ثاقب: یہ تقریباً چار سو صفحات کی کتاب صوفیہ کی رد میں ہے جس میں ان کے اقوال و اعمال پر شدید تنقید کی گئی ہے اور ان کے کفریات و مزخرفات پر بہت تیز روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ ذوالفقار: حضرت غفراں مآب نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے مختلف ابواب کے جواب میں پانچ عظیم الشان کتابیں لکھیں جن میں اصول درایت کی بنیاد پر علمی، منطقی اور نقلی دلائل سے تحفہ کے مندرجات کی رد کی۔ ان میں سے ایک ''ذوالفقار'' ہے جو تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے بارھویں باب کی رد ہے۔

۴۔ صوارم الالٰہیات۔ یہ تحفۂ اثنا عشریہ کے باب الٰہیات کی رد ہے۔

۵۔ حسام الاسلام۔ یہ تحفہ کے باب نبوت کا جواب ہے۔

۶۔ خاتمۂ کتاب صوارم: یہ اثبات امامت میں ایک علیحدہ رسالہ ہے۔

۷۔ احیاء السنۃ۔ یہ تحفہ کے مبحث معاد و رجعت کی رد ہے۔

۸۔ رسالۂ غیبت: یہ بھی شاہ عبدالعزیز کے اقوال کی رد ہے۔

۹۔ اساس الاصول۔ یہ اخباریین کی مایۂ ناز کتاب 'فوائد مدنیہ' مصنفہ محمد امین استرآبادی کی رد ہے۔

۱۰۔ مواعظ حسینیہ۔ یہ جناب غفراں مآب کے ان مواعظ کا مجموعہ ہے جو قیام جمعہ و جماعت کے بعد آپ نے ارشاد فرمائے تھے۔

۱۱۔ شرح حدیقۃ المتقین: مولانا محمد تقی مجلسی علیہ الرحمہ کی کتاب الصوم کی فارسی میں شرح ہے۔ اصل کتاب بھی فارسی میں ہے۔

۱۲۔ شرح حدیقۃ المتقین۔ کتاب الزکوٰۃ۔

۱۳۔ رسالہ درباب نماز جمعہ۔ یہ نماز جمعہ کی اہمیت پر ہے۔

۱۴۔ حاشیۂ صدرا: یہ فلسفہ کی مشہور کتاب شرح ہدایت الحکمت مصنفہ صدر المتالہین

شیرازی کا حاشیہ ہے جس کی مدح و ثناء جناب سید محمد مرتضی فلسفی نونہروی نے "معراج معقول" میں اپنے استاد مولوی عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کی زبانی اس طرح کی ہے "جب میں جناب غفراں مآب کے حاشیہ صدرا کو دیکھتا ہوں تو متاخرین فلسفہ پر ان کو ترجیح دیتا ہوں"۔

۱۵۔ رسالہ مثناۃ بالتکریر: یہ بحث صدرائی بہت مشہور ہے۔ اس رسالہ میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۶۔ منتہی الافکار: صاحب قوانین کے مضامین کا علمی جائزہ۔

۱۷۔ اثارۃ الاحزان علی القتیل العطشان: عربی میں حالات سید الشہداء میں ہے جس میں کتب معتبرہ سے واقعہ کربلا کو درج فرمایا ہے۔

۱۸۔ مسکن القلوب عند فقد المحبوب: آپ کے نہایت عزیز فرزند مولانا سید مہدی نے ۱۲۳۱ھ میں رحلت فرمائی۔ ان کے انتقال سے جناب غفراں مآب کو شدید صدمہ ہوا۔ انھیں تاثرات میں یہ کتاب تحریر فرمائی۔ اس میں حالات حضرت سید الشہداء بھی خاص انداز میں درج کیے ہیں۔ جناب سید مہدی صاحب کے انتقال کے کوئی چار سال کے بعد ۱۲۳۵ھ میں ۶۹ سال کی عمر میں حضرت غفراں مآب علیہ الرحمہ نے بھی اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ شاعروں نے متعدد تاریخ ہائے وفات کہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

"ستونِ دیں بزمیں اوفتاد وا ویلا"

(۱۲۳۵ھ)

مولانا ہدایت حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے "شجرۂ طیبہ" میں آپ کی تاریخ انتقال ۱۹؍ رجب ۱۲۳۵ھ لکھی ہے۔ اس کتاب کا تاریخی نام "نجوم تواریخ" ہے

۱۹۔ اجازۂ جناب سلطان العلماء طاب ثراہ: یہ وہ اجازہ ہے جو آپ نے اپنے فرزند اکبر سید محمد صاحب طاب ثراہ کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ اس میں روایت و درایت سے

بہت سے مباحث کے علاوہ اپنے اساتذہ کے مختصر حالات بھی تحریر فرمائے ہیں، نیز آخر میں بیش قیمت وصایا ہیں۔

۲۰۔ رسالہ در جواب محمد سمیع صوفی۔

۲۱۔ رسالہ ارضین عربی۔ اس میں مختلف طرح کی زمینوں کے شرعی احکام استدلالی طور پر تحریر فرمائے ہیں۔

۲۲۔ رسالہ ذہبیہ سونے چاندی کے برتنوں کے احکام۔

۲۳۔ رسالہ دررد نصاریٰ۔

۲۴۔ مطارق: یہ اساس الاصول کے جواب میں مرزا محمد امین استرآبادی مقتول کی کتاب معاول العقول کا جواب ہے جو بعض تلامذہ کے نام سے لکھا گیا تھا۔

۲۵۔ رسالہ دراد عیہ کفن۔

یہ ایک عظیم الشان عظیم المرتبت اور گراں مایہ کتابیں ہیں جو علم و تحقیق کا شاہکار ہیں۔ آپ کے ان علمی اور تحقیقی کارناموں کے پیش نظر بڑے بڑے جید علماء و فقہاء نے آپ کو زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ چنانچہ "حیات فردوس مکاں" میں علامہ شیخ احمد یمنی شیروانی کا یہ قول درج ہے:

"آپ کی مہارت علم اصول میں جعفری۔ آپ کا احاطہ فروع میں یوسفی، آپ کی درایت فہم حدیث میں باقری، آپ کی تحریر و تقریر حقائق کی پردہ دار اور دقیق نکتوں کو واشگاف کرنے والی ہے۔ کون آپ کی ہمسری کرسکتا ہے۔ اگر علامہ حلی ہوتے تو آپ کی اقتداء کرتے، اگر مجلسی اور مفید آپ کے مفید مجالس درس میں حاضر ہوتے تو بحار الانوار کو آپ کے دریائے علم کے پہلو میں حقیر سمجھتے۔ اللہ اکبر، کس قدر علوم و فنون میں آپ کا حصہ بلند اور مقام رفیع ہے"۔ (بحوالہ حل مجموعہ مصنفہ جناب مفتی میر محمد عباس صاحب)

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب مرحوم

تتمہ درالعقیان فی تراجم الاعیان میں اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں

'انھوں نے تلمذ حاصل کیا خدا کی اس نشانی سے جو تمام
عالموں کا رب ہے۔ وہ ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے مملکت
ہندوستان میں دین کو زندہ کیا اور بدعت و جاہلیت کے آثار کو
محو (باطل) کیا، یعنی مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی۔'

(منقول از حیات فردوس مکاں)

"حقیقت میں خداوند تعالیٰ سے جو علم کا سرمایہ ملا تھا اس کا تقاضہ یہی تھا کہ ان کا
علم ان کا عزم ان کی ہمت اور ان کی سیرت ائمہ اہل بیت کا پرتو ہو۔ یہی
اوصاف ان کے علمی کارناموں کی جان ہیں۔ اگر ان کا علم، ان کی بلند نظر، ان
کی عمیق فکر فوق البشر نہ ہوتی تو ہندوستان کی شیعیت کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔
ان کی بلند نظر ہر خامی کو دیکھتی تھی خواہ وہ کہیں ہو۔"

(ماخوذ از "ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ" ص ۹)

آج کے بعض جہلاء کہتے ہیں کہ خاندان اجتہاد میں تحقیق کا کوئی کام نہیں ہوا۔ ظاہر
ہے کہ اپنی جہل کی بدولت وہ تحقیق سے ان عظیم الشان کارناموں اور ان کی تعریف و
توصیف میں جید علماء و فقہاء کے ان اقوال اور تحریروں سے بے خبر ہیں

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(اگر چمگادڑ کو دن کی روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا تو اس میں آفتاب کا کیا قصور ہے)۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب رود کوثر میں جو اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور
علمی تاریخ ہے ہندوستان میں شیعیت کے فروغ کے عنوان کے تحت مختلف علاقوں کے شیعہ
علماء کا حال بھی لکھا ہے۔ لکھنؤ کے شیعہ علماء کے ذیل میں لکھتے ہیں

"شیعہ علماء میں سب سے مشہور مولانا دلدار علی صاحب تھے۔"

عقلی اور منطقی اعتبار سے غلط ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے علاوہ جناب حافظ بشیر احمد غازی آبادی نے بھی اپنے ایک مقالہ 'یادوں کے چراغ' میں کراچی کے ایک اخبار کی اشاعت مورخہ ۲۸ر جنوری ۱۹۶۷ء میں اس واقعہ کو شاہ عبد العزیز دہلوی کی طرف منسوب کیا تھا جس پر سراج الدولہ کالج کے ایک طالب علم سید حضور اکبر نے اخبار 'اسد' لاہور مورخہ ۱۸ر مارچ ۱۹۶۷ء میں حافظ صاحب موصوف سے استفسار کیا کہ جناب والا نے شاہ صاحب کے کس تذکرہ سے یہ واقعہ سپرد قلم کیا ہے۔ مگر حافظ صاحب نے متانت انگیز خاموشی اختیار کی۔ (''تاریخ سلطان العلماء'' ص ۱۱۹)

ایک اور صاحب جناب امداد حسین کاظمی نے بھی مندرجہ کسی حوالہ کے بغیر اسے شاہ صاحب سے منسوب کیا مگر جناب زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ نے لکھا کہ یہ ہمارا خاندانی واقعہ ہے، اس کو کاظمی صاحب کے علم و ادراک سے کیا تعلق۔ (''تاریخِ سلطان العلماء'' ص ۱۱۹)

مزید برآں یہ کہ جناب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ نے جناب سلطان العلماء کے مناظروں کے واقعات ان کے قابل فخر فرزند تاج العلماء جناب مولوی سید علی محمد صاحب طاب ثراہ کی کتاب 'احتجاج علوی' سے اخذ کیئے جو آج سے سوا سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر ماخذ میں 'ظل ممدود' اور 'اوراق الذہب' جیسی کتابیں شامل ہیں جو جناب سلطان العلماء کی زندگی میں یا اس سے قریب تر زمانہ میں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے اس واقعہ سے متعلق کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ اس اعتبار سے بھی اس واقعہ کو شاہ عبد العزیز کی طرف نسبت دینا غلط، غیر منطقی اور بلا جواز ہے۔

لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی نے اپنے ایک مضمون مشمولہ 'مضامین عزیز' مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی رودولوی میں جناب غفراں مآب کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

''(جناب غفراں مآب) رہِ اسلام پر جس کا مقدس نام آفتاب کی طرح

پر روشنی ڈال رہا ہے۔ شیعی دنیا اس بات پر متفق ہے کہ بارھویں صدی میں ہندوستان کی سرزمین پر پہلا شخص ہے جس نے دین کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ لکھنؤ کی ابتدائی حالت لوگوں کی نگاہ میں ہے۔ آصف الدولہ کا دور، شراب اور بھنگ کا عروج اور ضروریات دین کی بے خبری جاننے والے جانتے ہیں۔ تاریخی صفحات پر بھی عجیب و غریب واقعات درج ہوں۔ میں مرنے والوں کی روحوں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اس قدر بدعت کے نیست و نابود کرنے کا سہرا غفران مآب کے سر ہے۔ آصف الدولہ کے دور میں [illegible] کا جلوہ پیدا کرنے والا یہی شخص ہے۔" (ص ۵۰)

## مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ کا خراجِ تحسین:

جہاں جید علمائے دین و فقہائے شرع متین نے حضرت غفران مآب علیہ الرحمہ اور ان کے عظیم فرزندوں کو بے مثال خراجِ تحسین اور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہیں مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ نے بھی اس خاندان کی مدح و ثنا کی ہے۔ "دفتر ماتم" کی پہلی جلد کا پہلا مرثیہ جس کا مطلع ہے "[illegible]" [illegible] ہے۔ اس مرثیہ میں مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ نے دو چار بند نواب امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی خوش اخلاقی، عدل و داد و انصاف [illegible] اور عوام سے اظہار [illegible] اور مذہب کا رنگ دینے کے حوالے سے ان کی مدح کی ہے۔ اس کے بعد حضرت رضوان مآب سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ علیہ الرحمہ اور ان کے چھوٹے بھائی سید العلماء سید حسین صاحب قبلہ علیین مکاں کی مدح میں کئی ایک بند شامل ہیں۔ یہ مرثیہ انھوں نے حضرت سلطان العلماء کی موجودگی میں پیش کیا تھا۔ چند بند ہدیہ قارئین ہیں۔

نواب امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی تعریف میں

خارِ جفا سے راستوں کو صاف کر دیا

نوشیرواں کو قائلِ انصاف کر دیا
بس عینِ عدل قاف سے تا قاف کر دیا
دنیائے دوں و تاج اشراف کر دیا
چہرہ ستم کا ہے نظری اہلِ دید میں
اب ظلم چھپ کے بیٹھا ہے قبرِ یزید میں

ہر شب ہے روزِ عید، عجب روزگار ہے
انصاف سربلند ہے، کیا تاجدار ہے
اقبال یارِ شہر ہے، کیا شہریار ہے
اس لطف پہ یہ رحمتِ پروردگار ہے
عالم وہ ہیں کہ قدرتِ رب آشکار ہے
ہاتھوں سے جن کے مذہب حق پائیدار ہے

سلطان العلماء اور سید العلماء کی مدح میں

اول جنابِ مجتہد العصر والزماں
بسم اللہِ صحیفۂ آیات عز و شاں
خضرِ زمانہ، مرجعِ سادات و مومناں
سلطانِ عالماں، سندِ معنی و بیاں
چشم و چراغ مجلسِ عالم جمال میں
خاص الخلاصہ بنی آدم کمال میں

پیش علی و ختم رسلؐ جدِ امجد است
اسمش جناب حضرت سید محمد است
در راستی چو حرفِ نخستین ابجد است
بالانشین منبر و ایوان و مسند است

ایمن شداست شہر ز طورِ جمالِ او
اے من فدائے نورِ چراغِ کمالِ او

ناجی وہی ہے ان سے جسے اعتقاد ہے
وہ اعتقاد شیعوں کو زاد المعاد ہے
ارشاد وہ بجا ہے کہ اللہ شاد ہے
خیرالجہاد ان کے لیئے اجتہاد ہے

شیعوں کو کہیئے قبلہ شناس اس بیان سے
کہتے ہیں ان کو قبلہ و کعبہ زبان سے

بعد ان کے سیدالعلماءؒ مجمع علوم
خاصانِ ذوالجلال میں کالبدرفی النجوم
اک طبع پاک اور شغلِ نیک کا ہجوم
اس پر بھی ہے دفورِ نوازش علی العموم

دنیا کے فخر، دین کی بھی زیب و زین ہیں
وجہ حسن یہ ہے کہ سمی[1] حسین ہیں

معنیٔ علم و لفظِ حیا ، آیۂ کرم
تقویٰ ، زہد ، عدل ، ورع ، سر سے تا قدم
انصاف کھا رہا ہے مرے قول پر قسم
مطلوب دادِ نظم ہے نے شہرۂ رقم

واقف ہے کبریا کہ دروغ و ریا نہیں
مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں

(۱) [illegible]
[illegible]
مرثیہ تھا غفراں مآب اور ان کی اولاد امجاد کا۔

اس کے بعد تقریباً سولہ بند اور ہیں۔ (''تاریخ لکھنؤ'' از مولانا محمد باقر شمس، ص ۴۶۵)

اسی طرح حضرت مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ کے نامور شاگرد مشیر (شیخ گوہر علی) نے جناب سلطان العلماء کے سب سے چھوٹے بھائی جناب سید العلماء مولوی سید حسین صاحب علیین مکان کے انتقال پر ایک مرثیہ کہا اور کمال یہ کیا کہ صرف دو دن میں ایک طویل مرثیہ کہہ کر ان کے سوم کی مجلس میں مرزا دبیر کے اشارہ پر پیش کیا۔ مجلس میں جناب سلطان العلماء بھی تشریف فرما تھے۔ مرثیہ میں انھوں نے جناب سید العلماء کے صفات حمیدہ اور خرق عادات نظم کیے تھے۔ اس مرثیہ کی ایک بیت میں مشیر نے بھائی کے غم میں سلطان العلماء کی اشک باری کی تصویر یوں کھینچی

آنسو رواں تھے غیرت الیّن کے لیے
شبیرؑ یونہی روئے تھے عباسؑ کے لیے

اس ایک بیت ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مشیر مرثیہ گوئی میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ میر افضل حسین ثابت نے ''دربار حسینؑ'' (ص ۱۸) ذیلی نگارش میں یہ واقعہ تحریر کر کے یہ لکھا ہے کہ خاندانِ اجتہاد نے اس مرثیہ کی یہ قدر دانی فرمائی تھی کہ یہ مرثیہ ایک بیاض میں نقل کر کے کتب خانۂ جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب قبلہ میں بحفاظت رکھا گیا تھا اور تمام علمائے کرام نے اس نظم کو پسند فرمایا تھا۔

## جناب غفراں مآب اور ان کی اولاد کی روحانی عظمت و بزرگی:

جناب غفراں مآب کی علمی عظمت و جلالت کا مختصر حال اوپر درج کیا گیا۔ وہ علم و عمل کے اعتبار سے جن بلندیوں پر فائز تھے، روحانیت کے اعتبار سے بھی ایسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ عظمت و بزرگی کے حامل تھے جو ذیل کے واقعات سے ثابت ہے:-

(۱) قیام نصیر آباد کے زمانہ میں تین دن تک یہ غیبی آواز سننا کہ ''دلدار علی، جا اور علمِ دین حاصل کر''۔ یہ روحانیت کی پہلی منزل تھی جس کے آگے وہ بلند تر منزلیں تھیں جن پر ان کو اور ان کی اولاد کو منجانب اللہ فائز ہونا تھا۔ انھوں نے اس ہدایت پر عمل کیا جس کی وجہ سے پورے برصغیر میں شیعیت کی تاریخ ہی بدل گئی۔

(۲) جناب غفراں مآب کے پہلے فرزند سلطان العلماء جناب سید محمد صاحب کی ولادت پر امام زمانہ نے خواب میں آپ سے فرمایا کہ تمھارا یہ فرزند میری کفالت میں رہے گا۔ اللہ اکبر، عالم شیعیت بلکہ عالم انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس میں کسی معصومؑ نے کسی بھی غیر معصوم کی اولاد کی کفالت کی ذمہ داری خود لی ہو۔ صرف ایک واقعہ شیخ مفیدؒ سے متعلق ہے جس میں آپ نے خواب میں دیکھا کہ سیدہ فاطمۃ الزہراؑ دو بچوں کو لے کر تشریف لائی ہیں اور ان سے فرماتی ہیں کہ میرے ان فرزندوں کو اپنی نگرانی میں لے لو۔ اور دوسرے دن ایک معظمہ بالکل اسی طرح دو بچوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے ان کے پاس تشریف لائیں اور ان کو ان کی نگرانی میں دے دیا۔ یہ دونوں بچے سید رضی جامع نہج البلاغہ اور ان کے بڑے بھائی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ تھے مگر یہ واقعہ بھی جناب سلطان العلماء کے واقعہ کے برابر نہیں ہے۔

(۳) جناب غفراں مآب نے اپنے تین بیٹوں کے نام بالترتیب سید محمد، سید علی اور سید حسن رکھے۔ چوتھے بیٹے کا نام سید مہدی رکھا۔ اس پر آپ نے خواب میں امام حسینؑ کی زیارت کی جو فرما رہے تھے کہ تم نے اس بیٹے کے نام میں ترتیب کیوں بدل دی۔ انھوں نے عرض کیا کہ میں اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ اس کے بعد کسی اور اولاد کی امید نہیں، اس لیے اس کو آخری اولاد سمجھ کر آپ کے سلسلے کے آخری معصوم کے نام پر اس کا نام رکھ دیا۔ امام حسینؑ نے فرمایا کہ نہیں، اس کے بعد تمھارے یہاں ایک بیٹا اور ہوگا، اس کا نام میرے نام پر رکھنا (''شجرۂ طیبہ'' از مولوی ہدایت حسین صاحب)۔ اللہ اکبر، ہندوستان یا عراق و ایران کے کسی بڑے سے بڑے فقیہ و مجتہد و مرجع کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ البتہ قرآن مجید میں ملتا ہے کہ فرشتہ حضرت زکریاؑ کے پاس حاضر ہوا اور ان کو ایک بیٹے کی بشارت دی جس پر انھوں نے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری زوجہ بھی بوڑھی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے یہاں کوئی اولاد ہو۔ ملحوظ رہے کہ جناب زکریاؑ کو بشارت دینے کے لیے فرشتہ آیا تھا، کوئی امام یا پیغمبر نہیں۔ چنانچہ جناب سید مہدی کے بعد

الذہب‘‘ میں یہ عبارت لکھی ہے:

’’اگر آپ عہدِ رسولؐ میں ہوتے تو آپ کے فضائل میں کوئی آیت ضرور اترتی اور ابوذر و سلمان پر آپ کو فضیلت دیتے۔ آپ کے تمام افعال و عادات عبادت تھے۔

یہ مفتی میر عباس صاحب کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ ’اوراق الذہب‘ کی اصل عبارت یہ ہے:

’لو کان فی ومن جـــــــــــــــــــــــدہ رسول الانس لایرل انه فی مدحه شیءٌ من القران وسمصساہ جدہ علیٰ ابی ذر و سلمانؑ۔

مولانا میر حامد حسین صاحب لکھتے ہیں:

’علمائے متکلمین میں سب سے افضل، فقہائے مجتہدین میں سب سے اکمل، سارے اور تمام مومنین کے مولا و آقا، وقت کے فرد خدا کی تائید ان کے ساتھ ہے۔‘ (رسالہ تقیہ)

عراق کے مشہور عالم حجۃ الاسلام مولانا علی تقی طباطبائی ان کی کتابوں سے متاثر ہو کے لکھتے ہیں:

’دائرۂ عقل کے مرکز، آسمانِ علم کے قطب، اربابِ فضل کے راس و رئیس، زمانہ میں یکتا اور وحید۔‘ (ظل ممدود)

حجۃ الاسلام سید علی حائری مصنف ’ضوابط الاصول‘ فرماتے ہیں

’ملک اسلام کے قطب، دائرۂ عزت و احترام کے نقطہ، بدر تمام احکام شرعیہ کا دارومدار ان کی ذات پر ہے۔ مسائل حکمیہ کو انھوں نے زندہ کر دیا اور علم و حکمت میں روح پھونک دی، شریعت کی بنیادوں کو قائم کیا اور ہدایت کے راستوں میں چراغ روشن کر دیئے۔‘ (ظل ممدود)

شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی مصنف 'جواہر الکلام' فرماتے ہیں

'ایسے علامہ جن کا نظیر نہیں معقول و منقول، فروع و اصول جن کی
ذات میں جمع ہیں، فقہاء و مجتہدین کے فخر، اسلام کے مددگار، عراق و
ایران و ہندوستان کے مومنین کے آقائے اعظم''۔ (اصل مدد)

('ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ'' از مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ)

سب سے چھوٹے صاحب زادہ سید العلماء سید حسین صاحب علیین مکاں اعلم دنیا تھے۔ پانچوں بھائیوں میں جناب سلطان العلماء اور جناب سید العلماء علم و اجتہاد میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ دوسرے صاحب زادہ جناب سید علی صاحب طاب ثراہ کا کارنامہ اردو میں قرآن مجید کی پہلی تفسیر ہے جس کا نام ''توضیح المجید'' ہے۔ تیسرے صاحب زادہ سید حسن صاحب کا کارنامہ اردو میں علم کلام کی پہلی کتاب 'باقیات الصالحات' ہے۔ پھر ان کے بیٹوں اور پوتوں میں بے شمار علماء و فقہاء و مجتہدین موجود تھے جن کے اسمائے گرامی جناب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے ''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ'' میں درج کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب (۲) مفسر قرآن مولانا سید علی صاحب (۳) فقیہ اہل بیت مولانا سید حسن صاحب (۴) سید العلماء مولانا سید حسین صاحب (پسران غفران مآب) (۵) صفوۃ العلماء منصف الدولہ شریف الملک مولانا محمد باقر صاحب (۶) خلاصۃ العلماء مولانا سید محمد مرتضی صاحب (۷) مولانا محمد صادق صاحب (۸) مولانا سید عبداللہ صاحب (۹) ملک العلماء مولانا بندہ حسین صاحب (۱۰) مولانا سید علی اکبر صاحب (پسران سلطان العلماء) (۱۱) عمدۃ العلماء مولانا سید محمد ہادی صاحب (نبیرۂ غفران مآب) (۱۲) زین العلماء عضد الدین مولانا علی حسین صاحب (۱۳) ممتاز العلماء فخر المدرسین مولانا محمد تقی صاحب (۱۴) زبدۃ العلماء مولانا علی نقی صاحب (پسران سید العلماء سید حسین صاحب)۔ ان کے علاوہ حضرت غفران مآب کے چوتھے فرزند جناب مہدی:

حالات میں خاندانِ اجتہاد کے علماء نے اردو زبان کی ایسی خدمت کی جو مثالی ہے۔ چنانچہ حضرت غفرآں مآب علیہ الرحمہ کے دوسرے بیٹے جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ نے پہلی مرتبہ اردو میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں علمی اور دینی کتابیں لکھنے کا آغاز قرآن مجید کی تفسیر سے ہوا۔ اس سے پہلے اردو میں کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر کا نام 'توضیح المجید' ہے۔ یہ تفسیر ایسی بے مثال ہے جیسی کوئی اور تفسیر نہیں۔ دو جلدوں میں یہ ضخیم تفسیر مکتبۃ العلوم ناظم آباد کراچی میں موجود ہے۔ عہد شاہی میں یہ آٹھ جلدوں میں شائع کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات سے مختلف جلدوں میں مختلف اوقات میں شائع ہوئی۔ اس لائبریری کے ناظم اعلیٰ جناب محترم مولانا مرزا محمد جعفر صاحب قبلہ نے مجھ کو بتایا کہ اس میں قرآن مجید کی آیات کے حوالہ سے معصومینؑ اور اہل بیتِ رسولؐ کے ایسے وجوہ اور فضائل ہیں جو کسی اور تفسیر یا کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتے۔ اس کے علاوہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ نے قاعدۂ جمل اور علم جفر کے اعتبار سے بھی کئی آیات کا جائزہ لے کر ایسے ایمان افروز علمی نکات بیان کیے ہیں جن کا جواب نہیں۔ میں نے 'اردو میں قرآن مجید کی پہلی تفسیر' کے موضوع پر تین مضامین مطبوعہ ماہ نامہ 'خیر العمل' لاہور اور 'ذوالفقار' پشاور مورخہ ستمبر ۲۰۰۱ء تا جنوری ۲۰۰۲ء میں مستحکم دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا سید علی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کی ''توضیح المجید'' نہ صرف شیعہ تفاسیر میں بلکہ عالم اسلام کے تمام فرقوں میں اردو زبان میں سب سے پہلی تفسیر ہے۔ اس سے پہلے کسی فرقہ میں اردو میں تفسیر نہیں لکھی گئی۔

میری بڑی تمنا تھی کہ اس میں سے ایک ایک پارہ کی تفسیر آثار و افکار اکادمی (پاکستان) کی جانب سے شائع کی جائے مگر اس کے لیے بڑی محنت اور بڑا وقت درکار تھا۔ تفسیر کی زبان دو سو برس پرانی ہے۔ اس لیے اس میں کثرت سے ایسے الفاظ اور انداز استعمال ہوئے ہیں جس کو آج سمجھنا بہت دشوار ہے اس لیے ضروری تھا کہ اس کی زبان میں تبدیلی کر کے زمانہ حال کے مطابق کر دی جائے تاکہ لوگوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ

زبان اور ادب او خاندان اجتہاد جتنا فخر کریں کم ہے۔ اس کے علاوہ شعر و ادب میں بھی اس خاندان نے شعرا نے زبردست نام پیدا کیا۔ خصوصاً مرثیہ گوئی میں ان کی تخلیقات طرۂ تاج فضیلت کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ اس صنف سخن میں ان کے تذکروں پر مشتمل ہے۔

# غفرانمآب کے مورث اعلیٰ کی ہندوستان آمد اور فتوحات

میں نے گزشتہ اوراق میں حضرت غفرانمآب کے مورث اعلیٰ کی ہندوستان آمد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا حالانکہ تذکرہ نگاری میں یہ ایک ضروری امر ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید نجم الدین سبزواری سالار مسعود غازی کے ساتھ سردار لشکر بن کر ہندوستان آئے اور اپنی فتوحات سے وہاں کے ظلمت کدہ میں نور توحید کے چراغوں سے اجالا کرنا شروع کیا۔ انھوں نے قلعہ ودیا نگر کو فتح کر کے اس کا نام جائے عیش رکھا جو رفتہ رفتہ کثرت استعمال اور دیہاتی زبان کے اثر سے جائس کہا جانے لگا۔ جناب سید نجم الدین کے اخلاف میں سے جناب سید ذکریا نے پناک پور فتح کیا اور اپنے جد جناب سید نصیر الدین کے نام پر اس کا نام نصیر آباد رکھا۔ انھیں دونوں علاقوں کو اپنا مستقر بنایا۔ اسی نصیر آباد میں حضرت غفرانمآب کی ولادت باسعادت ہوئی۔

نماز جمعہ و جماعت کا آغاز: یہ لکھا جا چکا ہے کہ لکھنؤ میں شیعہ نماز جمعہ و جماعت کا آغاز حضرت غفرانمآب نے فرمایا۔ چنانچہ تاریخ ''عماد السعادات'' میں غلام علی نے لکھا ہے:

> ''بانی جمعہ و جماعت در اثنا عشریان در لکھنؤ او (حضرت غفرانمآب) بودہ است۔ در ہیچ شہرے از شہرہائے ہندوستان نماز جمعہ و جماعت در مذہب امامیہ رائج نبود بلکہ کسے را گمان این ہم نبود کہ در ایران و بلاد عرب نماز جماعت در اثنا عشریان گزاردہ می شود''۔

جناب ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی اپنے مضمون بعنوان ''سید دلدار علی المعروف بہ غفرانمآب اعلیٰ اللہ مقامہ'' مطبوعہ ''وحدت اسلامی'' شمارہ ۱۲، ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۴ء میں لکھتے

ہیں کہ ''شاہ حسین مرزا اصفوی طوسی اپنے طویل منظومہ میں آپ کو قدیم ہندوستان کا پہلا امام جمعہ و جماعت قرار دیتے ہیں۔ اس بات کو عبدالحلیم شرر ''گزشتہ لکھنو'' میں نجم الغنی ''تاریخ اودھ'' میں اور شاہ حسین مرزا اصفوی طوسی ''تذکرۃ المحققین'' میں رقم کرتے ہیں''۔

حضرت غفرانمآبؒ کی بے تعصبی: ڈاکٹر سبط حسن رضوی مزید لکھتے ہیں کہ ''شیعہ سنی اتحاد پر آپ نے بہت زور دیا اور علمائے اہلسنت کے بہت سے باہمی جھگڑوں کو ثالث بن کے طے کیا''۔ ان کے غیر متعصب ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ باوجود یہ کہ آصف الدولہ اور ان کے جانشینوں نے سلطنت کے دینی امور کا کلی اختیار حضرت غفرانمآب اور ان کی اولاد کو دے دیا تھا مگر آپ نے حکومت سے متعلق تمام سنی افسران حتی کہ قاضیوں کو بھی ان کے عہدوں پر برقرار رکھا اور ان کے ساتھ ذرا بھی ایسا سلوک روا نہیں رکھا جیسا خود ہندوستان کی بعض سنی حکومتوں میں شیعوں کے ساتھ روا رکھا گیا جس کی ایک واضح مثال قاضی نور اللہ شوستری کی شہادت ہے جن کو محض شیعہ ہونے کے جرم میں بادشاہ وقت کے حکم سے شہید کیا گیا۔ خود شاہان اودھ تعصب سے پاک تھے۔ چنانچہ رام بابو سکسینہ نے ''روح ادب'' میں لکھا ہے کہ ''نواب تعصب مذہبی سے پاک تھا ور دربار میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ایک نظر سے دیکھے جاتے تھے''۔

ایک بڑا کارنامہ: حضرت غفرانمآب نے تبلیغ دین اور اصلاح مومنین کے سلسلہ میں دینی تربیت، فروغ علم، توفیق عبادات یعنی قیام نماز جمعہ و جماعت اور فروغ عزائے حسینؑ وغیرہ میں جو سعی بلیغ کی اس کے نتیجہ میں پنجتن پاک کی نسبت اور اسم محمدؐ کی برکت سے محراب و منبر و مسجد و مدرسہ و مجلس کو یکجا کر دیا۔ آپ ہی کے عہد میں بقول ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی ''ضیاء الابصار'' وہ پہلی کتاب اردو میں شائع ہوئی جس میں واقعہ کربلا کی معتبر روایات ملتی ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی موجود ہے۔ انہیں کے عہد میں مرزا محمد حسن قتیل جیسا فارسی کا بڑا اور اہم شاعر بھی موجود تھا جس نے

حضرت غفرانمآب کی رحلت ۱۲۳۵ھ سے صرف دو برس پہلے ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔

حضرت غفرانمآب کی علمی و دینی خدمات میں ایک بہت اہم اور یادگار کام یہ بھی ہے کہ آپ نے سرزمین لکھنؤ پر سب سے پہلے کتب خانہ قائم کیا جس کے بعد پھر دوسرے صاحبان علم بھی ادھر متوجہ ہوئے اور رفتہ رفتہ مزید کتب خانے قائم کیے جانے لگے۔ ڈاکٹر سبط حسن رضوی لکھتے ہیں کہ آپ کے کتب خانہ میں ایک پارۂ قرآن پاک مخطوطہ تھا جو امام حضرت علی ابن موسیٰ رضا کی طرف منسوب تھا اور ایک نسخہ "صحیفہ کاملہ" بخط شہید اول بھی موجود تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ "غفرانمآب کی اولاد میں اجتہاد آج بھی قائم ہے۔ ان کی اولاد میں بہت سے علماء و مجتہدین گزرے ہیں۔ آج بھی پاک و ہند، ایران و عراق، یورپ، افریقہ اور امریکہ میں ان کی اولاد اور ان کے شاگردوں کی اولاد اپنے کمالات علمی کا جوہر دکھا رہی ہے اور مذہب اسلام کی تبلیغ میں سرگرم عمل ہے"۔

## پاکستان میں حضرت غفرانمآب اور ان کی اولاد کے فیوض و برکات

ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی لکھتے ہیں کہ

"پاکستان کی سرزمین پر سب سے پہلے آپ کے خلف اکبر سید محمد (سلطان العلماء رضوانمآب) کے شاگرد علامہ سید ابوالقاسم رضوی فرخ آبادی لکھنؤ ترک کر کے لاہور آئے اور پھر نواب علی رضا خان قزلباش کے منشا سے نجف اشرف گئے اور شیخ مرتضیٰ انصاری اور علامہ اردکانی کے فیض سے سرفراز ہوئے اور بوقت مراجعت سرکار انصاری کی جانب سے اجازۂ اجتہاد حاصل کیا۔ واپسی پر لاہور میں موچی دروازہ میں مدرسہ قائم کیا اور سلسلۂ جمعہ و جماعت اور اہم تاریخوں پر محافل و مجالس کا سلسلہ شروع ہوا۔ علامہ سید ابوالقاسم رضوی کے شاگردوں میں مولانا سید محسن علی سبزواری، مولانا مومن علی، مولانا محمد فضل الدین، مولوی ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید گل محمد شاہ، علامہ سید حشمت علی اور خود علامہ ابوالقاسم رضوی کے فرزند شمس العلماء سید علی الحائری شامل ہیں۔ یہ اس علاقہ میں مکتب

غفرانمآب کے نمائندے کہے جاسکتے ہیں کیونکہ اس مکتب فکر کے استادوں سے شیعہ سنی سب یکساں طور پر فیضیاب ہوتے تھے۔ اس کے بعد ایک معتدل فکر سامنے آئی جس نے اتحادبین المسلمین کی ایک خوشگوار فضا دینی حلقوں میں پیدا کی"۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی نے A SOCIO-INTELLECTUAL HISTORY OF THE ISNA'ASHARI SHI'IS IN INDIA" Published in Canberra Australia in 1986. میں حضرت غفرانمآب اور ان کی اولاد و امجاد کے بارے میں بڑی تحقیق سے اور بڑی حد تک تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ یہ بہت اہم کتاب ہے۔ میں طوالت سے بچنے کے لیے اس سے اقتباسات درج نہیں کررہا ہوں۔ اس سے اہم نکات میں اس مختصر تعارف میں جگہ جگہ درج کرچکا ہوں۔ باقی تفصیلات کی یہ کتاب متحمل نہیں ہوسکتی۔ قارئین مذکورہ کتاب خود ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا تعارف تھا خانوادۂ اجتہاد اور بانی خاندان اجتہاد حضرت مولانا سید دلدار علی صاحب غفرانمآب علیہ الرحمہ اور ان کی اولاد امجاد کا۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰة والسلام علیٰ نبی الکریم وآلہ الطیبین والطاہرین۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# خانوادۂ اجتہاد میں شاعری کا آغاز

[illegible] فرمائی۔ مصرع تاریخ حسب ذیل ہے۔

"مزار و مدرسہ ہم جائے ماتم سبطین"

۲۳۳ھ (ثبر وحیبہ)

[illegible]

پیشۂ فقہی مسائل کو نظم کرنا ہے۔ ''تحفۃ العوام'' کی شیعی فقہی مسائل کی معروف و مقبول کتاب کے قدیم نسخوں میں جناب زین العابدین کے یہ اشعار موجود ہیں۔ جناب محترم شمس الادبا مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی کو چند اشعار ان میں سے زبانی یاد ہیں جو انھوں نے مجھ کو سنائے تھے۔ وہ درج ذیل ہیں:۔

## ۱۔ ترکِ نماز کے متعلق شرعی احکامات

نماز ایک جس شخص نے ترک کی    تو خون اس نے (گویا) کیا بے چھری
اگر دو نمازوں کا تارک ہوا    تو گویا کہ خون اک نبیؐ کا کیا
ہوئی تین وقتوں کی جس سے قضا    تو کعبہ کو اس شخص نے ڈھا دیا

ق

دیا چار وقتوں کو گر ہاتھ سے    تو ایسا ہے جیسے کہ اس شخص نے
زنا اپنی مادر سے ہفتاد بار    کیا عین کعبہ میں اے ہوشیار
جو تارک ہوا پانچ اوقات کا    بیاں کیا کروں اس کے حالات کا
ندا اس کو کرتا ہے یوں بے نیاز    کہ تو نے جو کی ترک میری نماز
ہوا میری طاعت سے بیزار تو    غضب کا ہوا اب سزاوار تو

## ۲۔ زنِ محیضہ کے احکامات

زنِ حائض کے سن لے اب احکام    خطِ قرآں کا مس ہے اس پہ حرام
اور نام خدا و نام رسولؐ    اور ائمہ جو حق کے ہیں مقبول
نہ لگاوے وہ ان کے نام کو ہات    ہے حرام اس پہ، دل سے سن لے یہ بات
اور پڑھنا بھی چار سوروں کا    ہے حرام اس پہ، دوں تجھے بتلا
اک الف لام میم سجدہ ہے    دوسرا حامیم (حٰم) سجدہ ہے
اور [illegible] تیسرا ہے بیان    چوتھی [illegible] ہے، تو جان

امید (۳) نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر (۴) جناب مولوی سید محمد کاظم صاحب عرف بندو صاحب جاوید (۵) جناب سید فرزند حسین صاحب ذاکر (۶) جناب مولوی سید محمد مصطفیٰ صاحب عرف لڈن صاحب خورشید (۷) جناب سید صادق علی صاحب عرف پھنگا صاحب حسین (۸) جناب مولوی سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب شاعر (۹) جناب سید ابن الحسن صاحب معروف بہ مہدی نقطی (۱۰) جناب سید محمد مہدی صاحب تاثیر نقوی (۱۱) جناب نواب سید افسر حسین صاحب افسر (۱۲) جناب مولوی سید سبط حسین صاحب (۱۳) جناب مولوی سید عسکری صاحب (۱۴) جناب مولوی سید زاہد حسن صاحب (۱۵) جناب بنے صاحب اختر (۱۶) جناب مولوی وجاہت حسین صاحب ناظم (۱۷) جناب حکیم سید علی آشفتہ (۱۸) جناب قتیل (۱۹) جناب سید ماجد حسین صاحب نجم (۲۰) یہ حقیر فقیر سید قائم مہدی ساحر لکھنوی۔ ان کے علاوہ (۲۱) مولوی سید کلب حسین صاحب کا نام گرامی جناب افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے "دربار حسینی" میں میر ضمیر اور مرزا دبیر کے شاگردوں میں درج کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ان میں سے جتنے حضرات کے تفصیلی حالات معلوم ہیں اور میں نے اس مقدمہ یا تذکرہ میں درج کیے ہیں ان میں سے کوئی دوسرے درجہ کا مرثیہ گو نہیں تھا۔ ان سب نے اپنے اپنے زمانہ میں مرثیہ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا اور ملک گیر شہرت حاصل کی۔ بیشتر اپنے وقت کے بڑے اساتذہ میں شامل تھے۔ سب کے انفرادی تذکروں میں ان کے امتیازات اور مرتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے یہاں بہت مختصر سے ساتھ ذکر کروں گا۔

(۱) حضرت ماہر کے متعلق حضرت عزیز لکھنوی نے لکھا ہے کہ میر انیس کی ٹکر کے مرثیہ گو تھے۔ حضرت مہذب لکھنوی نے لکھا ہے کہ حضرت تعشق ان کی خوش گوئی کے ایسے مداح تھے کہ اشعار کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

(۲) حضرت امید اپنے وقت کے بڑے اساتذہ میں شامل تھے۔

(۳) حضرت فاخر کا بحیثیت مرثیہ گو خاندان میں سب سے زیادہ اعتبار قائم تھا اور میر نفیس علی مقدمہ ... بہت ... سے ... ان کی تعریف فرماتے رہتے تھے۔

## حضرت غفرانمآب مرثیہ و حدیث خوانی

[illegible]

ہوگیا۔

(شجرہ طیبہ ص ۲۳)

حضرت ماہرؔ اجتہادی لکھنوی

(نواب میر مہدی حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ)

۱۲۶۴ھ تا ۱۳۲۵ھ

بشکریہ محترم جناب سید محمد تقی صاحب قبلہ ظلہ العالی
خلف زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ طاب ثراہ

لکھنؤ گلزار تھا، وہ جانِ گلشن اب کہاں
شاعری اک خاص فن تھی، ماہرِ فن اب کہاں
(حضرت مہذب لکھنوی)

☆☆☆

سرزمین ہند پر اب تک نہیں پیدا ہوا
آپ کا ایسا بلیغِ نکتہ داں، نازک خیال
(مولوی علی میاں کاملؔ کا حضرت ماہرؔ کو خراجِ تحسین)

صاحب نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ اودھ کی زوجہ تھیں۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد انھوں نے
حضرت غفران مآب کے پوتے اور مفسر قرآن بزبان اردو جناب مولوی سید علی صاحب قبلہ
کے فرزند مولوی سید کلب حسین صاحب سے عقد کر لیا تھا جن کی دو بیٹیاں ہوئیں، ایک
حضرت ماہر سے اور دوسری ان کے بھائی جناب مولوی سید جعفر حسین صاحب سے منسوب
ہوئیں ("شجرۂ طیبہ" معروف بہ "نجوم متوارثہ"، ص ۲۶)۔ یہ عقد ماہر صاحب کی زندگی کا
بہت اہم واقعہ تھا جس کی وجہ سے دنیوی اعزاز اور لباس فاخرہ ان کے زیب بدن
ہوا۔ اس عقد کے نتیجے میں تاج محل صاحبہ کے اصرار پر ماہر صاحب نے کربلائے معلی
میں عمارت تعمیر کرائی۔ تاج محل صاحبہ کی بڑی بیٹی کا عقد جناب ماہر کے منجھلے بھائی جناب
سید جعفر حسین صاحب سے ہوا تھا۔ اتفاقات زمانہ سے چند ہی دنوں کے بعد جناب
سید جعفر حسین صاحب کا انتقال ہو گیا، دوسری طرف جناب ماہر کی اہلیہ بھی انتقال کر گئیں۔
ان حالات کے پیش نظر بعد جعفر حسین صاحب کی بیوہ کا عقد ماہر صاحب سے کر دیا
گیا لیکن صرف آٹھ مہینے کے بعد مقامات مقدسہ کی زیارت کے دوران نجف اشرف میں
ان مخدومہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ماہر صاحب نے ایک اور عقد کیا اور لکھنؤ واپس
آ گئے۔

نواب تاج محل صاحبہ کے انتقال کے بعد ماہر صاحب کو دولت دنیا سے ایک خطیر رقم
ملی مگر ان کے بیٹے تاج محل صاحبہ کے بھائی سے ایک طویل عرصے تک مقدمہ بازی ہوتی رہی
اور لکھنؤ سے پریوی کونسل لندن تک ماہر صاحب نے مقدمہ لڑا اور آخر کامیاب ہوئے۔
جعفر حسین صاحب کی بیٹی جو تاج محل صاحبہ کی نواسی اور ماہر صاحب کی بھتیجی تھیں انھیں بھی
محروم الارث قرار دینے کی کوشش کی گئی مگر ماہر صاحب نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس
مقدمے کے نتیجے میں ماہر صاحب کو ایک دفعہ زہر دیا گیا اور کئی بار گولی مار کر قتل کرنے کی کوشش
کی گئی مگر دونوں مرتبہ محفوظ رہے۔ یہ بات ماہر صاحب کی خصوصیات میں سے ہے کہ انھوں
نے قانون کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور قانون کی کوئی کتاب ان کے زیر مطالعہ نہیں

کے علم کی شہرت تھی۔ عروض میں ان کی کتاب 'افادات' لاجواب و عدیم المثال تھی۔ مرثیہ گوئی میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ دوسری بیٹی جناب سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسینؔ سے منسوب ہوئیں۔ وہ حرف ناشناس ہوتے ہوئے باوجود مرثیہ گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ("اسرار محسن" 'ادبیات ماہرؔ')

## حضرتِ ماہرؔ کا حلیہ:

حضرت مہذبؔ لکھنوی نے "اسرار محسن" میں ان کی تصویر شامل کی ہے اور وہی تصویر ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی نے اپنی کتاب 'مضامین عزیزؔ' میں بھی شائع کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ماہرؔ دبلے، پتلے، چھریرے بدن کے حسین تھے۔ چہرے سے خاندانی وجاہت و شرافت اور وقار آشکار تھا۔ اس کتاب میں بھی ان کی تصویر شامل ہے۔

## مزاج واخلاق و عادات:

حضرتِ عزیزؔ لکھتے ہیں:

> "ماہرؔ صاحب نواب تاج محل صاحب کے خویش (داماد) تھے اور لکھنؤ کے ممتاز اہلِ دول میں ان کا شمار تھا مرثیہ و واقعات نے ان کو بھی بے خود نہیں کیا۔ ان کے خلق کا رہینِ منت ناچیز عزیزؔ بھی ہے۔ ہر شخص سے نہایت خلوص اور انکسار سے ملتے تھے۔ باطن بھی ان کا ظاہر کی طرح صاف تھا۔ کبھی کبھی اپنے مرثیے سنانے کے لیے ایک مخصوص صحبت کیا کرتے تھے جس میں اس ناچیز کو بھی یاد کرتے تھے"۔ ("مضامینِ عزیزؔ"، ص ۵۶)

جناب زبدۃ الحکماء سید آغا مہدی صاحب طاب ثراہ نے اپنی کتاب 'تاریخ لکھنؤ' میں لکھا ہے "ماہرؔ صاحب بہت بڑے منشی، مدبر، قانون داں اور بہادر انسان تھے" (ص ۱۶۱)۔ ان کی بہادری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ نواب تاج محل صاحب کی وراثت کے مقدمہ میں کئی مرتبہ ان کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی مگر ماہرؔ صاحب ان حملوں سے

خوف زدہ نہیں ہوئے اور متعلقہ معاملات میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

## احباب وقدردان:

خاندان تعشق کی ایک نامور فرد حضرت مہذب لکھنوی نے خود لکھا ہے

''جناب سید میرزا تعشق صاحب علیہ الرحمہ سے حضرت ماہر کے خاص تعلقات تھے۔ موصوف حضرت ماہر کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور خوش ہوتی سے یہ قائل تھے کہ اکثر وبیشتر رطب اللسان رہتے تھے''۔

(''اسرار غم''،''حیات ماہر'')

ماہر صاحب کے احباب میں اس وقت کے تمام بڑے بڑے اور نامور مرثیہ گو شامل تھے۔ مرزا اوج کے احباب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید سکندر آغا اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں

''مرزا اوج کے احباب اس وقت کے ہم عصر مرثیہ گو پیارے صاحب رشید، میر خورشید علی نفیس، سید محمد عارف، سید محمد ہادی وحید علی میاں کامل اور نواب سید مہدی حسین ماہر تھے جن سے ملاقات کرنے اور خیریت معلوم کرنے کی غرض سے کبھی مرزا اوج ان کے وہاں جاتے اور کبھی یہ حضرات ان کے گھر آتے تھے۔ چونکہ ان حضرات کی مزاجی کیفیت ایک سی تھی اس لیے آپس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ بات چیت ہوتی تھی۔ مرزا اوج نے ان سب حضرات کے ساتھ تاعمر بہت خوش گوار تعلقات رکھے اور کوئی واقعہ ایسا رونما نہیں ہوا جس سے دلوں میں کشیدگی یا کسی قسم کا تناؤ پیدا ہوتا''۔ (ص ۹۶)

## حضرت ماہر کا مجالس عزاء میں اہتمام:

حضرت مہذب نے لکھا ہے

''ماہر صاحب کی دولت کا سب سے بڑا حصہ عزائے حسین میں صرف ہوا۔ آپ کی مجالس کا اہتمام وانتظام اور خوش آمدی زبان زد خلق ہے۔

ایک عمارت جو اپنی نوعیت کی انوکھی عمارت ہے تعمیر کرائی تھی جس میں مجالس برپا کرتے تھے۔ گردشِ حالات سے وہ عمارت فروخت ہوگئی مگر خریدنے والے جناب محمد جواد صاحب، مالک نظامی پریس تھے جنھوں نے اس میں مجالس کا سلسلہ قائم رکھا"۔ ("اسرار کی" "ماہیت ماہر")

حضرت عزیز نے بھی ماہر صاحب کے مجالس عزاء کے ذوق وشوق کے بارے میں لکھا ہے کہ

"مرحوم کی یہ صفت اور حسنِ عقیدت قابلِ ذکر ہے۔ مجلسوں سے ان کو ایک خاص انہماک تھا۔ عشرۂ محرم میں جیسی مجلسیں حضرت ماہر کے یہاں ہوتی تھیں بہت کم اس قدر اہتمام اور خوش سلیقگی سے کسی رئیس کے یہاں ہوتی ہیں۔ وہ اہل مجلس کی خاص طور سے خدمت کرتے تھے۔ ہر گروہ سے ان کے اخلاق بہت وسیع رہتے تھے۔ ذاکر جب منبر پر جاتا تھا تو بوجہ ثقل سماعت منبر کے قریب جاکر بیٹھتے تھے اور بہت زیادہ روتے تھے۔ مجلس ختم ہونے کے بعد میں نے خود دیکھا ہے کہ رونے والے کے آنسو اپنے رومال میں پونچھتے تھے اور خود زار زار روتے جاتے تھے"۔ ("مضامین عزیز" ص ۵۵)

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی نے اپنی معروف کتاب "تاریخ لکھنؤ" میں حضرت ماہر کے یہاں کی مجالس کے اہتمام کے بارے میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجلسوں کا جو اہتمام مہدی حسین صاحب ماہر کرتے تھے وہ دنیا میں کہیں نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنا مکان اس طرح کا بنایا تھا جس طرح وہ مجلسیں کرنا چاہتے تھے۔ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ سے ان کا خیمہ کسی محلہ میں نصب ہوتا۔ یہاں ان کے آدمی اہل محلہ کی فہرست مرتب کرتے۔ سہ پہر کو اپنی چوکی پر وہاں جاتے۔ فہرست پیش کی جاتی۔ ہر شخص کے مکان پر

جا کر مجلس کا وعدہ دیتے۔ ۲۸ ذی الحجہ کو ہر شخص کے مکان پر برنی کی ہنڈی
مجلس کے حصے نام سے بھیج دی جاتی۔ پہلی محرم کو فرنگی محل کے پل سے ان کے
گھر تک قالینوں کا فرش بچھتا اور سیاہ جھنڈیاں لگائی جاتیں (ان کے مکان
میں) بائیں طرف کا کمرہ کفش خانہ (تھا) جہاں آنے والے جوتا اتارتے اور
ٹکٹ پاتے تھے۔ جس نمبر کا جوتا اسی نمبر کا ایک ٹکٹ جوتے میں رکھ دیا جاتا۔ داہنی
طرف کے کمرے میں مختلف سائز کی سیاہ شیروانیاں ٹنگی ہوتی تھیں۔ جو سیاہ
شیروانی پہن کے نہیں آتا تھا وہ اس کمرے میں جا کے اپنے سائز کی شیروانی
پہن کے اپنی شیروانی وہاں لٹکا دیتا تھا۔ اس کے بعد مجلس میں جاتا تھا۔ جب
چبوترے تک آ جاتے تھے تو ایک تختی سامنے آتی جس پر لکھا ہوتا "حقہ
ادھر" پھر دوسری تختی آتی "چائے ادھر" (گرمیوں میں شربت)۔ مجمع ہونے
کے بعد مجلس شروع ہوتی۔ ختم مجلس پر صحن میں دیواروں کی کھڑکیوں سے
مرثیے پڑھے جاتے۔ پھاٹک کے اندرونی کنارے پر ماہر صاحب آب
زمزم کی شیشی رومال پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے ہر شخص کے سامنے پیش کرتے
اور کل کا وعدہ دیتے۔ پھاٹک سے بیرونی دروازہ پر حصہ تقسیم ہوتا۔ طباق میں
پلاؤ، اس پر قورمہ کا پیالہ اور روغنی روٹی رومال سے بندھی ہوتی۔ شرفاء و روساء
حصہ اپنے ہاتھ میں لے جانا خلاف شان سمجھتے تھے۔ وہ کسی غریب لڑکے کو
دے دیتے تھے۔ چوبدار پر کھڑے رہتے تھے۔ وہ پانچ آنے کا ایک
حصہ خرید لیتے تھے"۔ (ص ۶۶۱)

ماہر صاحب کے یہاں کی مجلس، سامان عزا اور ان کی جدت طرازیوں کی طرف
زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب نے بھی اپنی کتاب "تاریخ لکھنؤ" میں اشارہ کیا
ہے۔ عبدالحلیم شرر نے "گذشتہ لکھنؤ" میں ان کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ "اودھ اخبار"
اور "تذکرہ وہاب" وغیرہ میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

## شاعری:

حضرت ماہر نہایت بلند پایہ شاعر تھے اور اتنے سچے شاعر تھے جنھوں نے زندگی کی آخری سانس لیتے ہوئے بھی ایک بے مثل رباعی کہی جس کا ذکر ان کی وفات کے سلسلہ میں آئے گا۔ وہ فطرتاً شاعر تھے۔ ان کا فن وہبی تھا، اکتسابی نہیں تھا۔ قدرت نے علماء وفقہاء سے اس عظیم خاندان یعنی خانوادۂ اجتہاد میں شعر و ادب کی عظیم شخصیتیں بھی پیدا کیں جن میں حضرت ماہر کی شخصیت نمایاں تھی۔

## تلمذ:

وہ شاعری میں منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے اور ان کے خاص خاص شاگردوں میں بھی ممتاز تھے۔ مختلف اصناف سخن پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ ان کا ذہن شعر و سخن کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان کی تخلیق کا منشاء ہی گویا یہ تھا کہ اسے اعلیٰ درجہ کی شاعری کا مخزن اور آئینہ دار بنا دیا جائے۔

حضرت ماہر کی شاعری کے متعلق ان کے عہد کے چند ممتاز شعراء کی آراء ملاحظہ ہوں:-

۱۔ مولوی علی میاں کامل جیسے استاد فن کا یہ شعر حضرت ماہر کے متعلق ہے

سرزمینِ ہند میں اب تک نہیں پیدا ہوا
آپ کا ایسا بلیغ نکتہ داں، نازک خیال

۲۔ پیارے صاحب رشید کا قول مشہور ہے کہ ماہر صاحب کے جیسے شعر کوئی کہہ نہیں سکتا۔

۳۔ حضرت عزیز نے لکھا ہے کہ ان کا مرتبہ انیس سے کم نہیں۔

۴۔ مولوی سید محمد مصطفیٰ صاحب عرف مولوی لڈن صاحب خورشید نے ''[illegible]'' میں خدائے لم یزل ولا یزال کی قسم کھا کے ان کی غزل گوئی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''میں نے تو اس طبیعت کا شاعر نہیں دیکھا''۔

۵۔ حضرت مہذب لکھنوی نے "اسرار محن" میں حیات ماہر پر اپنا مضمون اس شعر سے شروع کیا ہے:

لکھنؤ گلزار تھا، وہ جانِ گلشن اب کہاں
شاعری کے خاص فن تھی، ماہر فن اب کہاں

ماہر صاحب کی زبان دانی، فن شاعری میں مہارت اور ان کی عظمت اس سے ظاہر ہے کہ زبان و بیان کے اختلافی مسائل میں ان کا کلام بطور سند پیش کیا جاتا تھا۔

ماہر صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ مقدمہ بازیوں میں صرف ہوا۔ اس کے علاوہ بھی وہ مختلف مسائل، حوادث و معاملات زندگی میں الجھے رہے مگر شاعری جو ان کی فطرت میں رچی بسی تھی اسے کبھی نہ چھوڑا۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھے۔

جناب محمد احمد ہادی مرزا لکھنوی کے قول کے مطابق

"ماہر لکھنؤ کے مجلس میں کمالات فن کے قائل اغیار تسلیم کرتے ہیں۔ ماہر فن نے اپنی پختہ مشق سے دقیق مضامین کو حل کیا ہے۔ ان کے دماغ میں جب کسی مضمون کی شاخ پیدا ہوتی تھی تو اس شاخ سے ہزاروں کونپلیں اور ہر کونپل سے سیکڑوں پھول کھلتے چلے آتے تھے۔ بیل کی طرح ان کے خیالات بلندی کی طرف مائل ہوتے چلے جاتے تھے، مسدس کا ختم ہونا دشوار ہو جاتا تھا۔ آخر وہ اسے ادھورا چھوڑ دیتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ایک مضمون کو مدتوں نظم کرتے چلے جاتے اور ہر بحث کے نئے پہلو سے جس طرح زمین سے سوتوں سے پانی ابلتا ہے یا پہاڑ سے آبشار روانی کی طرح ان کے دماغ سے پے در پے مضامین پیدا ہوتے چلے جاتے تھے۔ میدان شاعری کے بڑے بڑے شہسواروں کے مقتدر بنتے تھے۔" (... ص ۵۵)

## مرثیہ گوئی

بقول حضرت مہذب لکھنوی

"ماہر صاحب نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی میں صرف کیا۔ ان کے مرثیوں کا حصہ غزلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا۔ مرثیہ گوئی میں کیفیت یہ تھی کہ جیسے مضامین کا ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہو۔ طبیعت کہیں پر رکتی نہ تھی اور خیالات پر بندھ باندھا نہیں جاتا تھا۔ آپ مرثیہ گویوں کی صف میں ایک لاجواب مداح مان لیے گئے تھے"۔

حضرت مہذب لکھنوی نے "اذکارِ سخن" (ص ۱۰۱) پر نواب سردار صاحب سردار لکھنوی کے حالات میں لکھا ہے:

"لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیسوں میں تین شخص ایسے گزرے ہیں جن کو مرثیہ گوئی سے خاص رغبت رہی ہے۔ ایک نواب سید اصغر حسین صاحب فاخر، دوسرے نواب میر مہدی حسین صاحب ماہر اور تیسرے نواب سردار صاحب سردار۔ ان حضرات نے رئیسانہ زندگی اور امیرانہ مشاغل کے باوجود مدحِ آلِ رسولؐ میں اپنا عزیز وقت بھی کافی صرف کیا اور اپنی دولت کا بیشتر حصہ عزائے امامِ مظلوم کی نذر کر دیا"۔ ("اذکارِ سخن" ص ۱۰۱)

ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے "رزم نگارانِ کربلا" میں صنفِ مرثیہ میں ادب العالیہ کے نقاش کی حیثیت سے انیس و دبیر کے بعد کے شعراء میں حضرت ماہر اور حضرت فاخر کے اسمائے گرامی بھی درج کیے ہیں۔ اس کے علاوہ "مرثیہ بعد انیس" میں انھوں نے عزیز لکھنوی کا یہ قول بھی درج کیا ہے

"اگر ماہر کا کلام انیس کے نام سے پیش کر دیا جائے تو پڑھنے والا غالباً مشکوک نہ ہوگا"۔

ڈاکٹر طاہر کاظمی نے اپنی کتاب 'معاصرین مرزا دبیر' میں لکھا ہے کہ مہدی حسین صاحب ماہر، باقر حسین دراک اور آغا حسین امانت وغیرہ اس دور کے اہم مرثیہ گو شاعر ہیں جن کا کلام باوجود کوشش کے حاصل نہ ہو سکا حالانکہ انھوں نے اس کتاب میں حضرت

مہذب لکھنوی کی کتاب 'اسرارِ محن' اور 'اذکارِ محن' کا حوالہ دیا ہے۔ ماہر صاحب کا ایک مرثیہ ''اسرارِ محن'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ امید ہے کہ راقم نہ سہی، کوئی دوسرا ان کے کلام کو تفصیلی طور پر سامنے لائے گا۔ الحمدللہ کہ اس حقیر فقیر گدائے درِ مولا بے علم ماہر لکھنوی نے ان کی یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔

## ماہر صاحب کے مرثیوں سے کچھ مثالیں:

مرثیہ میں متعدد موضوعات ہوتے ہیں جو بیانِ واقعاتِ شہادت کے علاوہ شاعر کو اپنی زورِ طبیعت دکھانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایسے ہی مقامات پر شاعر کی قوتِ فکر، صلاحیتِ نظم، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی، جدتِ خیال اور زبان و بیان پر قدرت وغیرہ کا اظہار ہوتا ہے۔

### منظر نگاری:

انھیں میں مناظرِ قدرت کی عکاسی اور مصوری بھی ہے جو کلاسیکی مرثیوں کے چہروں میں خاص طور پر ضروری سمجھی جاتی رہی ہے۔ یہ شاعری کا ایک قوی عنصر ہے۔ ماہر صاحب کے مرثیوں میں منظر نگاری ایک اہم یا شان جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت عزیز فرماتے ہیں:

> ''جہاں تک میں نے خیال کیا ان کو اس اندازِ سخن کی مصوری پر بہت اچھی دستگاہ تھی۔ بڑے زوردار مصرعے نکالتے تھے اور اچھی تصویریں کھینچتے تھے''۔
>
> (''مضامینِ عزیز'' ص ۵۸)

### مرثیوں میں منظر نگاری اور تغزل:

حضرت عزیز لکھنوی نے درجِ ذیل تین بندوں کے لیے لکھا ہے کہ جنابِ قاسم کے حال کا مرثیہ ہے اور شادی کے حالات نظم کیے ہیں۔ ان تین بندوں میں اور خوبیوں کے

ساتھ منظر نگاری اور تغزل بھی پورے حسن کے ساتھ نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہوں

یہ ذکر تھا کہ جہاں میں دمِ سحر آیا
برات لے کے ستاروں کی خود قمر آیا
اخیر رات میں معشوق سیمبر آیا
سحر کے ہوتے ہی دولھا دلھن کے گھر آیا
چلی نسیم کہ دل میں کنا ریاں اتریں
ستارے چرخ سے ٹوٹے سواریاں اتریں

نظر فلک پہ سحر کے جب انتظام آئے
شفق کا باغ کھلا، وقت دورِ جام آئے
زبانِ بلبلِ شیدا پہ گل کے نام آئے
نسیم آنے لگی، وصل کے پیام آئے
نہ بلبلوں کو فقط لطفِ وصل ملتے تھے

اور مصرعہ ملاحظہ ہو — پھٹے جو دن تو شجر سے بھی پھول پھٹتے تھے

سبحان اللہ۔ محاورہ کو کس حسن سے استعمال کیا ہے۔

عروسِ صبح جو سلمائے بے حجاب ہوئی
شفق کے دور میں مست شراب ناب ہوئی
گلوں کے رخ پہ ہر اک پنکھڑی نقاب ہوئی
حیا یہ شرم سے سمٹی کہ آفتاب ہوئی
دراز کے وقت آئے، گھاتیں ہونے لگیں
جھکی جھکی گل و بلبل میں باتیں ہونے لگیں

ایک دوسرے مرثیہ سے فصیح اور بیان نئے بیان میں چند بند ملاحظہ ہوں۔ تغزل کے ساتھ ساتھ مناظر قدرت کی تصویر کشی بھی عروج پر ہے۔ زبان و بیان کا لطف مستزاد ہے

زمزموں سے میٔے منقار کہیں کھول اٹھنا
ایک کا ایک کی آواز پہ وہ بول اٹھنا
یہ بھی ہوتا تھا کبھی نیند جو لے اٹھتے تھے
اپنے نالوں کا جواب آپ ہی دے اٹھتے تھے

اس بند میں تغزل ملاحظہ کیجیے۔ چھٹا مصرع بے مثال ہے

پہلوئے گل میں وہ بلبل کا ترانہ ہر بار
پاتوں پاتوں میں وہ پھولوں کا ہنسنا ہر بار
وہ نشانوں کا سحر کے نظر آنا ہر بار
ٹوٹے تاروں کا وہ نزدیک سے جانا ہر بار
حسن تھا صبح میں بھی دیدۂ مہرو کی طرح
تارے ہاتھوں سے نکل جاتے تھے جگنو کی طرح

اس بند میں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ حسن تعلیل کا بھی جواب نہیں۔

لہر سبزے کی وہ کوسوں، وہ سحر نورانی
فرش تھے مخملی ابریشمی و کاشانی
آبِ فوارہ نہ گرتا تھا دمِ طغیانی

اور مصرع ہے:

تن کے خود دیکھتا تھا حسن کو اپنے پانی
آب نے کیسی دکھائی تھی روانی آخر
پھر گیا حسن پہ فواروں کے پانی آخر

اس بند میں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ چھٹے مصرع میں نزاکت خیال اور مضموں آفرینی بھی قابلِ داد ہے:

سرخ وہ رنگ شفق، وہ فلکِ زنگاری

طائروں کی وہ صدا نخل پہ باری باری
وہ ہر اک پھول پہ گلکاری و میناکاری
دیکھتا تھا جنھیں تھم تھم کے خود آبِ جاری
کس کی اب عقل میں ہر گل کا قرینہ آئے
پائے فوارہ پہ جب سر کا پسینہ آئے

دُرِ شبنم کے وہ پیشانیِ گل پر چھلکے
آنکھ نرگس کی بھلا دید میں کیونکر جھپکے
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا اور وہ بو کے بھبکے
اوس وہ ڈالی تو پتّے اور بھی پودے پھلکے
صبح ہوتے ہی زمیں عرش کے پائے کی طرح
یہ زمیں تھی کہ شجر بڑھتے تھے سائے کی طرح

حضرت ماہر کا یہ مرثیہ امام حسن کے حال میں ہے جس میں ۵۰۰ بند ہیں۔ ایک اور مرثیہ جناب قاسم کے حال میں ہے اس میں بھی ۵۰۰ بند ہیں۔ اسے 'سلطان المراثی' کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے مقالہ 'بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' میں لکھا ہے:

"مہدی حسین ماہر نے حضرت علی اکبر کے حال میں ۶۱۰ بندوں پر مشتمل طویل مرثیہ لکھا تھا جسے سلطان المراثی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے"۔

یہ تحقیق غلط ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں جناب قاسم کے حال میں حضرت ماہر کا مرثیہ ۵۰۰ بند پر مشتمل ہے، اسی کو "سلطان المراثی" کہا جاتا ہے نہ کہ جناب علی اکبر کے مرثیہ کو۔ چنانچہ لسان الشعراء مولانا سید والد حسین صاحب عرف مولوی بلن صاحب طاب ثراہ اعلی اللہ مقامہ نے ہفت روزہ 'صاحب' لکھنؤ کی ۱۹۵۰ء کی ایک اشاعت میں تحریر فرمایا ہے۔

''ایک مرثیہ فرمایا تھا جس کا نام 'سلطان المراثی' رکھا تھا۔ یہ ۵۰۰ بند کا تھا اور حقیقتاً اسی لقب کا مستحق تھا''۔

''سلطان المراثی'' کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

لگا کے ڈانڈ یہ کہتے تھے پانی پر ملاح
تجھی سے نورِ مسا ہے تجھی سے نورِ صباح
ترے ہی پاس ہے ہر بابِ بستہ کی مفتاح
تو ہی نے کشتیوں کو بحر میں کیا سیاح
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ بیڑا اپنا بھی
کرم ترا ہے تو بیڑا ہے پار اپنا بھی

وہ وقت صبح وہ دریا، وہ کشتیوں کا تھماؤ
وہ ناخدا کا یہ کہنا یہی رہے برتاؤ
ولی ولی کا وہ غل، وہ خلاصیوں کا جماؤ
علیؑ علیؑ وہی پھر، ہاں نکل چلی ہے ناؤ
عیاں ہے سب پہ جو حیدرؑ میں زورِ باری ہے
وہ در تھا کون سا جس پر سے فوج تاری ہے

''مضامین عزیز'' کی ایک ذیلی نگارش میں غالباً حضرت عزیز یا ''مضامین عزیز'' کے مرتب ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی کا یہ قول درج ہے کہ مندرجہ بالا دونوں بند امام حسنؑ کے مرثیہ کے ہیں جس کا مطلع ہے:

سحر کے حسن پہ جب طرہ آفتاب ہوا

مگر جناب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ کا فرمانا ہے کہ یہ جناب قاسمؑ کے حال میں مرثیہ سلطان المراثی کے بند ہیں۔

## ایک بند فوارہ سے متعلق:

دلوں کو سیر سے فواروں کی نہ کیوں ہو سرور
انھیں سے اچھے نظر آتے تھے خطوط نور
بہار باغ میں اُڑ اُڑ کے جاتے تھے تا دور
نہال جان کے جب ان پہ بیٹھتے تھے طیور
مزہ تو یہ ہے کہ ہر موئے دل پہ دورہ تھی
جو سیر آب میں تھی اس پہ بھی یہ طرہ تھی

حضرت عزیز یہ بند لکھ کر آگے لکھتے ہیں

"میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون آفرینی کے وقت ان کا سلسلۂ خیال
[illegible] ہو جاتا ہے۔ بہت سے بند فوارہ سے متعلق مختلف مرثیوں میں ہیں جن
کے بعض مصرعے یہاں لکھتا ہوں"۔

زمیں کو دھوتی تھی شبنم، فلک کو فوارے

یہ مصرع امامت کے سوال والے مرثیہ میں ہے۔

یہ جس کی فکر تھی اس کا دماغ کیسا تھا
نہاں آب تھی (تھے) جس میں وہ باغ کیسا تھا

"سلطان امرائی" سے تعریف آب میں دو بند نقل ہوں

صفا سے ماہیوں کا موئے پر بھی آئے نظر
یہ کیا کہ جنبشِ قلب و جگر بھی آئے نظر
جگر یہ کیا ہے، نفس کا اثر بھی آئے نظر
اثر یہ کیا ہے، خود اپنی نظر بھی آئے نظر
کچھ اس طریق سے آنکھوں کو راہ ملتی تھی
جو شے تھی تہ پہ وہ نظروں سے ہاتھ ملتی تھی

لطیف وہ کہ جو ہمراہ آب و تاب بڑھے
بڑھے نگاہ تو موجوں کا پیچ و تاب بڑھے
ملے اگر پرِ ماہی تو اضطراب بڑھے

مصرعے ملاحظہ ہوں

چھلک پڑے، جو ذرا موتیوں کی آب بڑھے
کمی کی شکل تھی وہ جس سے ہٹ گیا پانی

اور اب مصرع دیکھیے: جب آئی آنکھوں میں خنکی تو گھٹ گیا پانی

یہ مصرع غلو کی کیا ہی حسین مثال ہے۔

اور اب گرمی کے موضوع پر پانچ بند ملاحظہ ہوں

یہ حال ہو جو تپش کا تو اس کا کیا ہو حساب
گھرا تھا آب میں خود آفتاب عالمتاب
بنی تھی سوختہ ریشم ہر ایک موجِ آب
وہ داغ کے رہ گئی ماہی جو آئی زیرِ حباب
ثبوت کیوں نہ ہو دعوے کا اس گواہی پر
وہی ہیں داغ جو اب تک ہیں پشتِ ماہی پر

تپش سے غیر تھی حالت ہر اک حباب کی بھی
یہاں تلک کہ کٹوری بھی، موجِ آب کی بھی
شعاعِ مہر کی بھی، نورِ ماہتاب کی بھی
زبان پیاس سے نکلی تھی آفتاب کی بھی
ہر ایک نہر سے تھا فرق شانِ نہر میں بھی
پڑے تھے پیاس سے کانٹے زبانِ نہر میں بھی

سیہ وہ جل کے جو رنگت تھی ہر حباب کی بھی

رکی تھی سانس ہوا کی بھی، ہر حباب کی بھی
زبان پیاس سے اینٹھی تھی موجِ آب کی بھی
لگی تھی جان تری سے خود آفتاب کی بھی
مزاج حار تو کچھ اور بھی عذاب میں تھے
فلک پہ مہر تھا، پڑے شعاعِ آب میں تھے

اور مصرع ملاحظہ ہو

وہ دشت اور وہ گردوں کی آتش افشانی
فرات تھی کہ زمیں سے عرق کی طغیانی

سبحان اللہ۔ کیا اچھی تخئیل ہے۔

ہرے تھے نخل نہ سبزے کا رنگ تھا دھانی
غضب کی دھوپ سے تیغوں کا خشک ہے پانی
ثمر جو نخل میں ہے وہ گلِ فسردہ ہے
جب ہی سے ماہیِ جوہر ہر ایک مردہ ہے
تپش وہ آئی جو تھی متنِ تیغ میں بھی
لگی تھی جوہروں سے آگ جانِ تیغ میں بھی
نہ جوہروں سے ہو کیوں فرق شانِ تیغ میں بھی
پڑے تھے پیاس سے کانٹے زبانِ تیغ میں بھی
ملا بھی آب تو وہ جس سے دل ٹھہر نہ سکا
جو حلق خشک میں قبضوں کے بھی تر نہ سکا

یہ سارے بند شاعر کی قوت فکر، بلندیٔ تخئیل، خلاقیٔ مضامین، جدت خیال اور نزاکت احساس کے علاوہ حسن تغزل، لطافت بیان، فصاحت و بلاغت، بندشوں کی چستی، مصرعوں کی روانی اور تشبیہ و استعارات میں کمال فن کے مظہر ہیں۔ اس کے علاوہ فطرت کا مشاہدہ، جانوروں اور پرندوں کی عادات و نفسیات وغیرہ کے وسیع مطالعہ کا ثبوت بھی

آزادی سلب کرنے اور مختلف ریاستوں پر قبضہ کرنے کے بعد حکومت اودھ پر بھی قبضہ کر کے جانِ عالم نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ یوں تو سارے ہندوستان میں اپنی ریاستیں ختم ہو جانے سے اور انگریزوں کی غلامی میں آ جانے سے ایک حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی مگر اودھ خصوصاً لکھنؤ میں یاس و ناامیدی نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ واجد علی شاہ جیسے عوام و خواص سب کے محبوب ترین بادشاہ کی معزولی نے لوگوں کے دلوں کو مرجھا دیا تھا اور ہر شخص ماضی کی یادوں اور مستقبل کے اندیشوں سے مایوسی اور حرماں نصیبی میں مبتلا تھا۔ اہلِ لکھنؤ سب سے زیادہ متاثر تھے، نہ صرف اس لیئے کہ لکھنؤ اودھ کا دارالسلطنت تھا بلکہ اس لیئے بھی کہ اہلِ لکھنؤ بڑے شجاع، بہادر اور سپہ گری میں حاذق تھے۔ علمائے دین تک فنِ سپہ گری میں مشاق تھے اور اس فن کو شریف سمجھ کر حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہٗ "تاریخ لکھنؤ" (ص ۳۸۴) میں لکھتے ہیں:

> "اگرچہ مسلمانوں کی ملک گیری کا زمانہ ختم ہو چکا تھا مگر لکھنؤ میں سپہ گری ترقی کر رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام طور پر وضع میں داخل ہو گئی تھی۔ علماء، شعراء، اطباء اور دوسرا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس میں مہارت نہ حاصل کرتا ہو۔ خاندانِ اجتہاد کے علماء اس کو اپنا خاندانی فن سمجھتے تھے۔ سوائے علماء کے ہر شریف آدمی تلوار ضرور باندھتا تھا"۔

وہ لکھنؤ والے جن کی تہذیب کی اعلیٰ قدروں، چال ڈھال میں شائستگی و شرافت اور نشست و برخاست میں ادب و آداب وغیرہ کو انگریزوں نے اہلِ لکھنؤ کے حاسدوں کے ذریعہ نزاکت کا پیکر، مرزا پھویا، مولی کے پتے پر پاؤں پڑ جانے سے زکام میں مبتلا ہو جانے والے اور ایسی ہی بے شمار باتوں سے بدنام کیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، ان کی دلیری، شجاعت، سپہ گری کو چھپانا آسان ہو نہ سکا۔ فنِ سپہ گری میں ان کی مہارت کا اعتراف خود یورپی سیاحوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایک انگریز ولیم ہاورڈ رسل کے تاثرات جس نے اچھے دن دربار

کسی کا۔ یہ شاعر کی اپنی فکر اور مرثیہ کی ضرورت پر منحصر ہے۔

حضرت ماہر کے ایک مرثیہ سے اور مقامات کے علاوہ رزمیہ کے چند مقامات بھی ملاحظہ ہوں۔ مرثیہ کا مطلع ہے

گردوں پہ جب کھلا علم زرفشانِ صبح

یہ مرثیہ امام حسینؑ کے حال میں ہے اور ۱۴۷ بند پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ کو جناب مہذب لکھنوی نے انجمن محافظ اردو کی طرف سے مختلف شعراء کے مرثیوں کے مجموعہ اسرار محن میں شائع کیا تھا۔ اس مرثیہ میں سے رزمیہ کے تیور کے کچھ بند ملاحظہ ہوں جن میں زورِ بیان اپنے عروج پر ہے:

امام حسینؑ کی اعزہ و انصار کے ساتھ میدانِ جنگ کی طرف روانگی اور وہاں آمد

ڈیوڑھی پہ غل ہوا کہ شہِ خاص و عام آئے
خدامِ بارگاہ پئے اہتمام آئے
مثلِ نسیم جب فرسِ تیزگام آئے
پردہ اٹھا ، امامِ فلک احتشام آئے
نورِ جبیں سے دیدۂ بدخواہ کور تھا
ہرسو جہاں پناہ سلامت کا شور تھا

کیا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

گھوڑے پہ اس شکوہ سے سلطانِ دیں چڑھے
جس حسن سے کہ خاتمِ زر پر نگیں چڑھے
گھوڑوں پہ ناصرانِ امامِ مبیں چڑھے
گردوں کا رُخ کیے تھے وہ گھوڑے زمیں چڑھے

"زمیں چڑھے" کی ترکیب بالکل نئی اور قابلِ داد ہے۔

پردوں کی تھی صدا کہ یہ اڑنے میں طاق ہیں

کہتی تھی برق بھی کہ یہی تو براق ہیں

میداں کو جب سواریِ شاہِ ہدا چلی
غنچوں نے دیں چٹک کے صدائیں صبا چلی
جلدی میں یوں جہاد کو فوجِ خدا چلی

اور مصرع ہے کہ

جنگل میں مرکبوں کی ڈپٹ سے ہوا چلی

"مرکبوں کی ڈپٹ" حسنِ زبان کا خوب صورت نمونہ ہے۔

غنچوں کی طرح نقشِ قدم کھل کے رہ گئے
اٹھا غبار، دشت و جبل ہل کے رہ گئے

پہنچے جو اس شکوہ سے شہ رزم گاہ میں
[illegible]ت سپاہ کی نہ رہی نگاہ میں
باجے بجے نبرد کے جنگی سپاہ میں
تیر آئے فوجِ بادشہِ دیں پناہ میں

رخصت کے شور فوجِ شہِ دیں میں پڑ گئے
کھائے جو زخم، شیروں کے تیور بگڑ گئے

مرثیہ کے ایک اور مقام سے امام حسینؑ کی میدان کو روانگی کا اہتمام اور گھوڑے کی تعریف میں کچھ بند ملاحظہ ہوں:

خیمہ سے رن کو جب شہِ گلگوں کفن چلے
معراج کو رسولؐ سرِ انجمن چلے
تلوار تو لتے ہوئے شاہِ زمن چلے
خیبر کے در کو کھولنے خیبر شکن چلے

فرمایا، لاؤ، خضرِ راہوار ہوں

حکم الٰہ ہے کہ میں جلدی سوار ہوں

فرمایا پھر اشارے سے ، جلدی عقاب لاؤ
اک غل ہوا کہ توسنِ صرصر خطاب لاؤ
رخشِ گہر عنان و جواہر رکاب لاؤ
حضرت کھڑے ہیں دھوپ میں گھوڑا شتاب لاؤ

طبعِ جہاں پناہ دوعالم ملول ہے
کب سے پیادہ راکبِ دوشِ رسولؐ ہے

رشکِ نسیم و غیرتِ کبکِ دری کو لاؤ
سیاحِ ہفت گلشنِ نیلوفری کو لاؤ
ہاں ، جلد رہ روِ فلکِ اخضری کو لاؤ
برہم ہے طبعِ فخرِ سلیمانؑ ، پری کو لاؤ

دنیائے دوں نگاہ میں اندھیر ہو گئی
اتنی فرس کے آنے میں کیوں دیر ہو گئی

ان بندوں کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ ان بندوں میں امامؑ نے رہوار کے لیے کتنے القاب و خطاب دیے ہیں (۱) عقاب، (۲) توسنِ صرصر خطاب، (۳) رخشِ گہر عنان، (۴) جواہر رکاب، (۵) رشکِ نسیم، (۶) غیرتِ کبکِ دری، (۷) سیاحِ ہفت گلشنِ نیلوفری، (۸) رہ روِ فلکِ اخضری، (۹) پری۔ ان میں سے بعض القاب بالکل نئے ہیں جو پہلے نہیں لکھے گئے۔

اور اب گھوڑے کی تعریف میں کچھ بند:-

لو پاس آ کے ناز کیے وہ عقاب نے
آنکھوں میں لو ، قدم کو جگہ دی رکاب نے
دامن کمر میں بٹ کے رکھا لو جنابؑ نے

صرصر بھی سر پہاڑ سے ٹکرا کے رہ گئی

بالکل تھا رنگ بادِ بہاری کا پاؤں میں
غنچے چٹک رہے تھے قدم کی صداؤں میں
گلگوں چلا ریاضِ جناں کی ہواؤں میں
بھاگی نسیم باغ سے تاروں کی چھاؤں میں
شرمندگی سے آنکھوں کو پھیرے نکل گئی
اچھا ہوا، شمیم سویرے نکل گئی

بند آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ بلندیٔ تخیل، خلاقیٔ مضامین، لفظوں کا حسن، بندشوں کی خوبی اور نئی تشبیہیں اور تعبیریں، ہر رخ تعریف سے بالاتر ہے۔ غنچوں کا فرس کے قدموں کی آوازوں سے چٹکنا، نسیم کا تاروں کی چھاؤں میں شرمندگی کے احساس کے ساتھ باغ سے بھاگ جانا اور پھر "اچھا ہوا، شمیم سویرے نکل گئی"، ان سب باتوں پر ذوقِ سخن وجد کرتا ہے۔ ان مصرعوں کا کیا کہنا۔ داد نہیں دی جا سکتی۔ لطفِ زبان تو مستزاد ہے۔ اس کے علاوہ تغزل کا حسن اور رنگینی بھی "دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"۔

اللہ ری، تیزیاں کہ وہ باہر تھا آپ سے
اڑ جاتا تھا نسیم کے پاؤں کی چاپ سے
شعلہ کو کیوں حجاب نہ ہو اس کی تاپ سے
صحرا میں آگ لگ گئی تھی منہ کی بھاپ سے
اب یاں پہ ذکرِ سبزۂ صحرا گناہ ہے
سایہ جلا تھا یہ کہ ابھی تک سیاہ ہے

دوسرے مصرع میں گھوڑے کی تیزیٔ رفتار کے بیان میں یہ کہنا کہ نسیم کے پاؤں کی چاپ سے اڑ جاتا ہے، مبالغہ کی بڑی حسین مثال ہے۔ بیت میں حسنِ تعلیل سے سایے کے سیاہ

ہونے کی توجیہ بھی بالکل نئی اور کیف آور ہے۔ یہ سب باتیں شاعری کی قوت تخئیل اور خلاقی مضامین کی منھ بولتی مثالیں ہیں، خصوصیت کے ساتھ اوپر کے چار بند شاعری اور مضمون آفرینی کی حد کمال ہیں۔ حضرت ماہر کی شاعری کے یہ صفات صرف انھیں بندوں تک محدود نہیں ہیں۔ ان کی پوری شاعری اور سارے مرثیے انھیں کمالات شاعری کے آئینے ہیں۔

## دشمن کے سپاہی کا حلیہ:

عالی مرتبت جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی نے ''اردو مرثیہ میں ہجو'' پر ایک مستقل مضمون اپنی کتاب نقش آہنگ میں شامل کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں

> ''(مرثیہ نگار) جب مد مقابل فوج یزید کے پہلوان کا حلیہ بیان کرتا جس میں اس کے ڈیل ڈول، چال ڈھال، ہتھیار اور شجاعت کے اظہار میں لاف زنی وغیرہ کا اس انداز سے ذکر کرتا جس سے اس کی بہادری، جنگ آزمائی اور شمشیر زنی وغیرہ کی مہارت کا سکہ سامعین و قارئین کے دلوں پر بیٹھ جائے مگر دوسرے رخ سے اس کی ہجو کے پہلو بھی نکلیں۔ ہجو کا یہ لطیف انداز ہجو ملیح ہوتا ہے۔ اس طرح کی ہجو مرثیہ کے خصوصیات میں سے ہے جو عموماً کسی دوسری صنف سخن میں نہیں پائی جاتی''۔ (ص ۱۸۳)

حضرت ماہر کے مرثیے سے اس کی بھی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو موصوف نے اپنے مذکورہ مضمون میں درج کی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔ مگر اس سے پہلے امام حسین کی میدان جنگ میں آمد اور فوج یزید سے کسی کو مقابلہ کے لیے آنے کی دعوت دینے سے متعلق دو بند دیکھیے جن میں مختصر رزمیہ کا رنگ ہے۔

جس دم رہا نہ صبر دل بے قرار میں
آواز دی یہ حوصلۂ گیرودار میں
شیروں کو حد کا شاق ہے وقفہ شکار میں

تھا گنبد حدید کہ خود سر شریر
چہرے کی تھیں رگیں کہ جبل پر بنی تھی قیر
کف کی لب کبود سیہ رو پہ تھی لکیر
یا کوہ بے ستوں سے نمایاں تھی جوئے شیر
مونچھیں نہ تھیں سیاہ لب نابکار پر
جوڑا تھا اژدہے کا کہ بیٹھا تھا غار پر

وہ [illegible] جس سے [illegible] پڑے فیل سے
آنکھیں تھیں یا حباب تھے دریائے نیل سے
نیچے سے منہ کے بال تھے ریش طویل سے
دوزخ سے جا ملے تھے دوراہے سبیل کے
رخ وہ سیاہ جس کو جہاں میں دھواں کہیں
نتھنوں سے دو غار تھے جنھیں اندھے کنواں کہیں

[illegible] صاحب نے کئی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے جس کی خلاقی مضامین کا بین ثبوت ہے۔

اب [illegible] کی زبان سے رجز [illegible] کی ادا رزمی بھی [illegible] چاہیے۔ ملاحظہ ہو

بولا شقی، میں بار ہوں سر پر پہاڑ کے
خیبر سے لاکھ در ہوں تو پھینکوں اکھاڑ کے
جب نعرہ زن ہوا ہوں قدم رن میں گاڑ کے
بھاگے ہیں دیوزاد گریبان پھاڑ کے
دنیا میں دار ظلم و ضلالت کی نیو ہوں
جن بھاگتے ہیں سائے سے جس کے، وہ دیو ہوں

رستم کو مانتا نہیں میں وقتِ کارزار
تیغہ مرا وہ ہے کہ منوں کا ہے جس کا بار
ہوتا ہے بھوت مجھ پہ جو میداں میں سوار
ڈرتا نہیں خدا سے ، بشر کا ہے کیا وقار
بگڑا ہوں جب جہان کی حرص و ہوا سے میں
اکثر لڑا ہوں اپنی جگہ پر خدا سے میں

ہے کشت و خوں جہان میں سودائے سر مرا
آہن مرا ہے قلب تو پتھر جگر مرا
بن خانہ جنگیوں میں ہوا ہے بسر مرا
روشن چراغِ تیغ سے رہتا ہے گھر مرا
بے زخم کھائے چھوٹ گیا کون ساتھ سے
یاں تک کہ باپ قتل ہوا میرے ہاتھ سے

مانے ہوئے ہیں مجھ کو جوانانِ سرفراز
ہوں بچپنے سے دستِ دراز و زباں دراز
کیا مجھ میں اور سنگ و شرر میں ہو امتیاز
ہنگامِ ضرب کھلتے ہیں میرے بھی دل کے راز
پیاسے سے خاک لطف ہو تیغ آزمائی کا
ہوتے اگر علیؑ تو مزہ تھا لڑائی کا

سب جانتے ہیں قلزمِ آفت کا ہوں نہنگ
دل توڑتا ہے کوہ کا میرا ہر اک خدنگ
تجھ ایسے تشنہ کام سے کرتا نہ قصدِ جنگ
ایسا ہی امر تھا کہ گوارا کیا یہ ننگ

اک کام پر ولید کو مامور کر دیا
حاکم کے حکم نے مجھے مجبور کر دیا

مرثیہ میں جن پہلوؤں کی نشاندہی ہوئی ہیں جو دشمن کے قد و قامت، قوت و طاقت اور جنگجوئی
کے شوق سے بیان کرتے ہیں۔ امام حسین اس حد تک متاثر کرتی ہیں کہ وہ [illegible] امام حسین یا کسی
دوسرے مقام پر [illegible] حسین سے کسی اور مجاہد کی فتح بلکہ زندگی تک سے متعلق نفسیاتی طور پر
ایک طرح سے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس طرح کربلا میں ایسے موقعوں پر کئی مجاہدین
ماں یا بہن بیت ہے [illegible] تشویش مرثیہ نگاروں نے نظم کی ہے۔

ساقی نامہ

مرثیہ گو عموماً جنگ کے بیان سے پہلے ساقی نامہ نظم کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مرثیہ
میں بھی بیت کی موقع پر ساقی نامہ نظم کیا ہے اور بہت خوب نظم کیا ہے۔
ملاحظہ کیجیے

ہاں ساقیٔ سخن ، ہمہ تن گوش کر مجھے
جلد آفتاب رو سے ہم آغوش کر مجھے
دو چار جام دے کے نہ خاموش کر مجھے
کہتا ہوں صاف ہوش میں، بے ہوش کر مجھے
وہ جام دے کہ جس سے لڑائی کی سیر ہو
خُم کا بھلا ہو ، ساقیٔ مہوش کی خیر ہو

وہ مے پلا کہ قلب کو جس سے سرور ہو
گردِ ملال و کلفتِ ایام دور ہو
عیش و فرح ، نشاط و طرب کا وفور ہو
یہ سب تو ہو مگر مجھے غش بھی ضرور ہو
بے ہوش ہوں جو عشق میں اک آفتاب کے

چھینٹے بھی دے مجھے تو لہو کی شراب کے

ناواقف حضرات کے لیئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ مرثیوں اور منقبتی قصیدوں میں ساقی اور شراب کا جو ذکر ہوتا ہے اس سے وہ دنیوی شراب مراد نہیں ہوتی جو بد کردار اور پست سیرت اشخاص پیتے ہیں اور جس کو شریعت اسلامی نے حرام قرار دیا ہے۔ ان مدحیہ اصناف سخن میں ساقی و شراب کی جو اصطلاحیں اور علامتیں آتی ہیں وہ کبھی شراب طہور اور کبھی شراب تولا و مودت اور کبھی شراب معرفت کے معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یا جس طرح خود میں نے حضرت عباسؑ کی شان میں ایک قصیدہ کی بہاریہ تشبیب میں کہا ہے کہ:

| | |
|---|---|
| ایسے موسم میں جو واعظ کا ادھر سے ہو گزر | کچھ تعجب نہیں آ جائے جو نیت میں خلل |
| اس کے دل میں ہو اگر بادہ کشی کی خواہش | نہ یہاں ساغر صہبا ہے، نہ مے کی بوتل |
| مے جسے کہتے ہیں ہم وہ ہے مودت کی شراب | آشنا اس کے مزے سے نہیں ارباب دغل |
| مے کدہ کہتے ہیں ہم جس کو وہ ہے جذب عشق | اس میں آنے کو تو اے واعظ ناداں نہ مچل |
| لب پہ رندوں کے جو ہیں عشق و وفا کی لفظیں | ان کا مفہوم سمجھ، ان کے معانی نہ بدل |

ان مقامات پر ''ساقی'' سے مراد ساقی کوثر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوتے ہیں، ''شراب'' سے مراد وہی جو اوپر لکھ چکا ہوں۔ اسی طرح دوسری اصطلاحیں ایمان و معرفت کے استعارے ہیں جن سے مدحیہ شاعری میں ایک کیف، رنگینی اور شعریت پیدا ہوتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیئے پڑی کہ کوئی آٹھ دس سال پہلے جناب غلام حسین زیدی مرحوم نے جو ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ تھے مجھ ریڈیو کے صاحبان اقتدار کی طرف سے لکھ کر عید الضحیٰ کے موقع پر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی مدح

کس کو حاصل ہے یا یہ تینوں مضامین الگ الگ کس کس کی ایجاد ہیں۔ اگر شہرت کو معیار نہ بنایا جائے تو اس بارے میں فیصلہ کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔

رزم:

ساحر صاحب نے اس مرثیہ میں ساقی نامہ سے پہلے ولید کی لاف زنی کے بعد امام حسینؑ کی طرف سے جواب اور رجز کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔ یاد رہے کہ ولید کی لاف زنی میں یہ بیت بھی تھی:

پیاسے سے خاک لطف ہو تیغ آزمائی کا
ہوتے اگر علیؑ تو مزہ تھا لڑائی کا

جواب میں امام حسینؑ کی گفتگو اور رجز ملاحظہ فرمائیے

فرمایا، بس خموش ہو او مرتد و جہول
دعویٰ بے دلیل نہیں قابل قبول
کیونکر نہ تیرا اہل سفاہت میں ہو شمول
تیرے عنق پہ ڈال دی قامت کا تیرے طول
طول کلام جنگ میں دانش سے دور ہے
او بے خرد، یہ سب ترے قد کا قصور ہے

سرکش، ہمارے سامنے یہ لاف کے کلام
او سگ، نہ لے زبانِ نجس سے علیؑ کا نام
تیری تو کیا بساط ہے او نطفۂ حرام
جبریلؑ سے رکی نہیں اس شیر کی حسام
جان اس کو مغتنم کہ خدا کے ولی نہ تھے
چھ دن کی زیست تجھ کو کہ جہاں میں علیؑ نہ تھے

وہ شیرِ کردگار تھے اور تو ہے بزدلا

جتنے سمند تھے وہ اٹھائے ہوئے تھے سر
گھوڑوں پہ دیکھتے تھے کھڑے ہو کے بل شتر
منہ کو نشیمنوں سے نکالے تھے جانور
دیکھی نہ تھی جو آنکھ سے جنگ اس شکوہ کی
بیٹھے تھے جائے شیر بھی چوٹی پہ کوہ کی

ناری بڑھا فرس کو جو گرما کے ایک بار
نکلی ادھر بھی میان سے شمشیرِ آبدار
تھے محوِ سیر دور سے لشکر کے نامدار
آفت کا معرکہ تھا، قیامت کی کارزار
خالی تھا کوئی قلب نہ اس وقت درد سے
جانیں لڑی ہوئی تھیں ہزاروں نبرد سے

آیا جو پاس گھوڑے کے گھوڑا لڑائی میں
روباہ کو اسد نے جھنجھوڑا لڑائی میں
جب ہاتھ اس نے تیغ کا چھوڑا لڑائی میں
منہ پر پڑا تڑاق سے کوڑا لڑائی میں
پڑتی تھی نیلی جلد پہ جب روسیاہ کی
آتی تھی تازیانے سے آواز آہ کی

دہنی طرف جو آئے شہِ ارجمند پھر
کیا کیا الجھ کے رہا خودپسند پھر
جھنجھلا کے نابکار نے پھینکی کمند پھر
بچ کر نکل گیا فرسِ سربلند پھر
خالی گئی کمند جو یوں بدشعار کی

غل تھا یہ رن ہاتھ تھی نہ دلدل سوار کی

آفت کی کارزار تھی شیر و پلنگ میں
یہ فخرِ روزگار ، وہ یکتا تھا جنگ میں
گہ دانت پیسے شیردلی کی امنگ میں
چپکے سے آہ! جوڑ لیئے ہاتھ جنگ میں
یوں لڑ رہے تھے آپ بھی اس نابکار سے
غل تھا کہ شیر کھیل رہا ہے شکار سے

ظالم نے کی جو بے ادبی کچھ جدال میں
طاقت رہی نہ ضبط کی زہرا کے لال میں
جھپٹے مثالِ شیر درندہ جلال میں
ڈالا غضب میں ہاتھ کمر کی دوال میں
دکھلا کے شہ نے زور جناب امیر کو
پھینکا اٹھا کے زیں سے ہوا پر شریر کو

فی النار ہو گیا جو لعیں رزم گاہ میں
در آئے رخش چھیڑ کر حضرت سپاہ میں
تلوار برق بن گئی سب کی نگاہ میں
ہلچل ہوئی جنودِ ضلالت پناہ میں
دیکھا جو بھاگتے ہوئے ہر کینہ خواہ کو
جھانجھوں نے ہاتھ جوڑ کے روکا سپاہ کو

یہ مصرعہ [illegible] خوب صورت ہے [illegible]

اس بند کے ساتھ [illegible] جنگ اختتام کو پہنچی اور امام حسین نے فوج یزید پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ شیرانہ سے فوج یزید میں وہ بھگدڑ مچی کہ میدان سے قدم اکھڑ گئے تھے۔

کوسوں تلک سے چھائی چھائی غبار نے
مشتاق تھے جو رن میں پہاڑوں کی آڑ کے
ٹھہری نہ گردِ باد بھی خیمے اکھاڑ کے

اس بند کا چوتھا مصرع تخئیل کی بلندی اور خلاقی مضامین کی خوب صورت مثال ہے جس میں حسنِ تعلیل بھی ہے اور امام حسین کے غیظ و جلال کا تاثر بھی۔

اب دوسرا بند

سالم ہو جس کا تن کوئی ایسا جواں نہ تھا
تھا کون مرغِ روح جو بے آشیاں نہ تھا
سکتہ یہ تھا کہ خون بدن کا رواں نہ تھا
کوسوں بجز غبارِ علم کا نشاں نہ تھا
جنبش نہ تھی کمانِ خطا ساز کے لیے
پر تولتے تھے تیر بھی پرواز کے لیے

یہ پورا بند میدانِ جنگ کا ایک بہت خوب صورت اور پُر تاثر نقشہ کھینچتا ہے جیسے شاعر قلم و فوٹو گرافی کا کیمرہ بنا کر جنگ کے منظر کی تصویریں کھینچ رہا ہو۔ آخری بند کی بیت خصوصاً چھٹا مصرع جدتِ خیال کی وجہ سے بے مثال ہے۔

اور اب یہ بند ملاحظہ کیجیے اور شاعر کے کمالِ فن کی داد دیجیے

منھ سے زباں، زبان سے تھی گفتگو جدا
سینہ سے دل تو دل سے ہر اک آرزو جدا
گلشن سے پھول دور تھے، پھولوں سے بو جدا
تن سے رگیں جدا تھیں، رگوں سے لہو جدا
ذرّے سرِ ہوا نہ تھے دشتِ نبرد کے
صحرا کی دھوپ اڑتی تھی پردے میں گرد کے

یوں تو یہ پورا بند بے مثال ہے، تربیت میں ریگِ صحرا کے ذروں کا ہوا سے اڑنا اور سورج کی روشنی میں ان اڑتے ہوئے ذروں کا چمکنا، اس کے لیے یہ کہنا کہ

صحرا کی دھوپ اڑتی تھی پردے میں ذرے

شاعر کی نظر کی گہرائی، مشاہدہ کی قوت، تخیل کی بلندی کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ ایسے ہی مضامین الہامی ہوتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

(غالب)

یہ سب طرزِ فکر اور کیسا چھوتا نیا ہے۔ جزاک اللہ۔

اب یہ بند بھی ملاحظہ فرمائیے:

وہ بن، سوارِ دوشِ نبیؐ کی وہ چابکی
گرمی سے سانس آتی تھی منھ تک رکی رکی
بجلی بنی نگاہ اگر خاک پر جھکی
چلا رہی تھی دشت میں قرنا چکی چکی

گرمی سے تھے جو جان کے لالے پڑے ہوئے
دامن ہلا رہے تھے نشاں سب کھڑے ہوئے

فوجی نشان کے ہوتے ہوئے گرمی کی شدت میں دامن ہلانے سے تعبیر کرنا کتنی خوب صورت بات ہے۔ دامن ہلانے کا مقصد ہوا طلب ہونا یا امان طلب کرنا بھی ہے اس رخ سے بھی اس بیت کی معنویت پر غور کیجیے اور لطف اندوز ہوئیے اور گرمی کی شدت کے بیان کو دیکھیے:

چٹیل وہ بن، وہ دھوپ کی گرمی کہ الاماں
گردونِ دوں پہ تھا کرۂ نار کا گماں
تیغوں کی وہ چمک وہ ہر اک شعلہ کی سناں

کبریٰؑ سے میدان کی یہ الفاظ دیگر شہادت کے لیئے روانگی کی اجازت چاہتے ہیں۔ اس مقام سے ذیل کے بند ملاحظہ کیجیے:

اس دم عجب تھی شہؑ کو پریشانیِ حواس
پٹ پڑ وہ بن، وہ دھوپ، وہ گرمی، وہ لو، وہ پیاس
لاشوں بغیر اور نہ تھا کوئی آس پاس
آخر کو آئے خیمے میں ملنے بدرد و یاس
فرمایا، غیر شکر زباں آشنا نہ ہو
جلدی ملو بہن کہ مسافر روانہ ہو

افسوس کی جگہ ہے کہ تم اشک بار ہو
آلِ رسولؐ پاک کو یہ اضطرار ہو!
بولی بہن کہ دل کو بھی تو کچھ قرار ہو
مرنے کی کیا ٹھہر گئی؟ زینبؑ نثار ہو
مومن جہاں ہوں خط انھیں تحریر کیجیے
زینبؑ نثار ہو کوئی تدبیر کیجیے

فرمایا، صبر و شکر سے رتبے بلند ہیں
زیبا انھیں کو درد ہے جو درد مند ہیں
گھیرے ہوئے چہار طرف خود پسند ہیں
زینبؑ، حسینؑ قید ہے، راہیں بھی بند ہیں
بس بس تمھاری باتوں نے مارا حسینؑ کو
بے تیغ کھینچے اب نہیں چارا حسینؑ کو

ان بندوں میں امام حسینؑ کے صبر و شکر کی واضح تصویر نظر آتی ہے اور بہن کو جس طرح تلقین صبر کرنا

گزشتہ سارے مرثیہ نگاروں کی طرح حضرت ماہر نے بھی اپنے مرثیوں میں بیان مصائب پر پوری توجہ دی ہے۔ زیر نظر مرثیہ سے مصائب کے چند بند ملاحظہ ہوں

اب روئیں اہلِ مجلسِ ماتم پکار کے
روکی ہے شہؑ نے تیغ ہزاروں کو مار کے
آئے ہیں دھیان طاعتِ پروردگار کے
پھینکا ہے تن سے خود و زرہ کو اتار کے
فرماتے ہیں کہ دل متمنی ہے درد کا
آؤ کہ جنگجو حکم نہیں اب نبرد کا

لو، برچھیاں چلیں جگرِ چاک چاک پر
تیغیں بھی ٹوٹنے لگیں لو، جسمِ پاک پر
نیزا بھی لو، پڑا جگرِ دردناک پر
لو، زین سے حسینؑ گرے فرشِ خاک پر
جلتے ہیں زخمِ تن تپشِ آفتاب سے
آئے زمیں پہ، پاؤں جو نکلے رکاب سے

جلتی زمین ہوش میں لائی حسینؑ کو
آیا یہ دھیان فاطمہؑ کے نورِ عین کو
شبیرؑ، اب وداع کرو دل سے چین کو
اب تک ادا کیا نہیں خالق کے دین کو
لو ختم زندگی تہِ شمشیر ہو گئی
سجدے میں اے حسینؑ، بڑی دیر ہو گئی

خنجر کو تیز کرتا تھا واں شمرِ بے حیا
ناگاہ ابنِ سعدِ ستم گر نے دی صدا

اے شمر تھم ذرا کہ یہ ٹھیرا ہے مشورا
پامال زندگی میں ہو لاشِ شہِ ہدا
[illegible] وقت [illegible] نہ جائے [illegible] کا
آیا ہے حکم یہ ابھی ابن زیاد کا

اب روئیں مومنین، یہ مجلس اخیر ہے
وقت عزائے ابن شہ قلعہ گیر ہے
پامالی تن شہِ گردوں سریر ہے
نیچے سموں کے ابن جناب امیرؑ ہے
حالت یہ ہے جو زیست میں ابن بتولؑ کی
تھرا رہی ہے قبر جناب رسولؑ کی

سلطانِ دوجہاں کا یہ احوال دیکھیے
دم توڑتا ہے فاطمہؑ کا لال، دیکھیے
[illegible] دیکھیے
رن میں حسینؑ ہوتے ہیں پامال، دیکھیے
پُرخوں عبا ہے لاشۂ شہ پر پڑی ہوئی
بنتِ رسولؑ دیکھ رہی ہے کھڑی ہوئی

ماہر قتیل و کشتۂ خنجر ہوئے حسینؑ
افسوس، آب تیغ سے لب تر ہوئے حسینؑ
گلگوں قبائے عرصۂ محشر ہوئے حسینؑ
زینبؑ اسیر ہوگئیں، بے سر ہوئے حسینؑ
کیا لکھوں حال اس کے تن پاش پاش کا
سر نے بھی ساتھ چھوڑ دیا جس کی لاش کا

مرثیوں کی تعداد کا سیکڑوں تک پہنچنا مبالغہ نہیں ہے مگر میرے پیش نظر ان کے صرف دو مرثیے ہیں۔ ایک یہی جو حضرت مہذب نے ''اسرار محن'' میں شائع کیا اور ایک قلمی مرثیہ جو کسی کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

حضرت سے جب جدا پسرِ مجتبیٰ ہوا

یہ مرثیہ حضرت ابوالفضل العباسؑ کے حال میں ہے۔ اس کے بندوں کی تعداد ایک نقل میں ۱۸۶ ہے جبکہ دوسری نقل میں ۱۵۱ بند ہیں۔ غالباً کتابت کرنے والے نے اپنے پڑھنے کے لیے مرثیہ لکھا ہوگا اور اس کو مختصر کرنے کی نیت سے ۳۵ بند اس میں سے کم کر دیے ہوں گے۔

ان کے علاوہ قبلہ صاحب کے دو معرکہ آرا مرثیے ایک امام حسن مجتبیٰ کے حال میں اور دوسرا جناب قاسم کے حال میں ہے جو 'سلطان المراثی' کے نام سے مشہور ہے۔ ان دونوں مرثیوں میں پانچ پانچ سو بند ہیں۔ یہ دونوں مرثیے اور ان کے بعض دوسرے مرثیے بھی رثائی ادب پر کام کرنے والوں میں سے کسی نہ کسی کے پاس ہوں گے جن کی تلاش میری طویل علالت کی وجہ سے میرے لیے اب ممکن نہیں ہے۔ حضرت عزیز لکھنوی نے حضرت ماہر کے بارے میں اپنے مضمون میں ''سلطان المراثی'' کے کچھ اقتباسات درج کیے ہیں اور امام حسنؑ کے حال میں جو مرثیہ ہے اس میں سے بھی کچھ بند اقتباس کیے ہیں (''مضامین عزیز''، ص ۵۸)۔ معلوم نہیں اب وہ مرثیے کہاں ہیں۔ حضرت مہذب لکھنوی نے ''اسرار محن'' میں لکھا ہے کہ آپ کے بہت بڑے بڑے مرثیے دشمنانِ زبان و ادب کے پاس صندوقچوں میں بند ہیں جن کی کثیر قیمت مانگنے کی وجہ سے حاصل کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب انجمن محافظ اردو کسی نہ کسی طرح انھیں حاصل کر کے مستقل جلد شائع کرے گی مگر شاید ان کو اس میں کامیابی نہیں ہو سکی اس لیے کہ اس جلد کی اشاعت کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ لیکن یہ امر بدیہی ہے کہ حضرت مہذب کو علم تھا کہ یہ مرثیے کس کس کے پاس ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کچھ

لن ترانی سے کھلا ناز کا بھی راز مجھے
پردہ ہوتا تو سناتے نہ وہ آواز مجھے

رحمت سے دور ہوں تو کروں ترکِ معصیت
یوں بھی تو مشکل اے مرے پروردگار ہے

رحمت کے اعتماد پہ ساحر کیجئے گنہ
اب عفو وہ کرے نہ کرے اختیار ہے

کوئی ہے دل میں مگر آگ لگانے والا
آپ سے آپ جلے شمع یہ دستور نہیں

حشر میں ہوتا ہے جو کچھ وہ بجا ہوتا ہے
آپ آجائیں تو پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ہوا کے دم سے اتنا ہی اگر ہے تو غنیمت ہے
مرے بدلے مرے پر آتے جاتے ہیں نشیمن میں

یہی تو ہیں ادائیں قتل کرتی ہیں جو محفل کو
کہ خود بیٹھے ہیں اور تصویر پوشیدہ ہے دامن میں

کہاں وہ پھول، کہاں خفتگانِ خاک کے دل
خدا کسی کو تمھاری طرح جواں نہ کرے

ہیں جو محتاط وہ کہتے نہیں خاروں کو بھی خار
ڈر یہ رہتا ہے کہ وہ بھی تو زباں رکھتے ہیں

فصلِ بہار آئی ہے، صیاد، رحم کر
قیدی کوئی قفس میں ہمارے سوا نہیں

جان ڈالے قالبِ بے جاں میں گر قدرت تری
رنگ دوڑے خون بن کر پیکرِ تصویر میں

ہچکیاں نزع میں آتی ہیں، قصور ہے ترا
تو سنے یا نہ سنے ہم تو صدا دیتے ہیں

جاگے ہیں رات بھر وہ اسی اضطراب میں
وہ دیکھتا نہ ہو مری صورت کو خواب میں

بے خوف اس لیئے میں چلا ہوں سوئے جحیم
رحمت نہ تیری دیکھ سکے گی عذاب میں

بخش دو دل سے اگر آہ رسا آتی ہے
ٹوٹتا ہے کوئی شیشہ تو صدا آتی ہے

مجھ پہ کھلتا نہیں اے قافلۂ اشک رواں
دل دھڑکتا ہے کہ آوازِ درا آتی ہے

جلوہ گر ہو کے نگاہوں سے جو چھپ جاتا ہے
کچھ شرر میں نظر آتی ہے شرارت تیری

حشر میں آتے ہیں اس شان سے تیرے مجرم
قہر آگے ہے، پسِ پشت ہے رحمت تیری

عکس آئینہ میں جس طرح نظر آتا ہے
یوں مرے دل میں اتر آئی ہے صورت تیری

دو ہی چیزیں ہیں نہیں جن کا زمانے میں ثبات
موسمِ گل باغ کا، فصلِ جوانی آپ کی

جب سے آئی ہے جوانی نہیں دیکھا ہم نے
جاگ کر رات کٹی، صبح کو آرام کیا

حسن کی نیرنگیاں دیکھیں مگر سمجھے نہ یہ
شعبدہ تھا، سحر تھا، جادو تھا یا اعجاز تھا

روح کو تن میں نہ کیوں سوزِ الم ہو ماہرؔ — شمع ہر بزم میں جلنے کے لیے آتی ہے

فلک سمجھ نہ سکا برہم تو دم میں صحبت غم کی — اداسی ہی تو رونق تھی ہماری بزم ماتم کی

کون بڑھ سکتا، قیامت تھا قدِ دل جوئے دوست — ایڑیوں تک آ کے آخر رک گئے گیسوئے دوست

اف رے، جذبِ دل، اتر آئی شبیہ روئے دوست — میری نظروں سے جو آئینے نے دیکھا سوئے دوست

بے خودی سا بھی کوئی دہر میں دمساز نہیں — غم نہیں، عیش نہیں، سوز نہیں، ساز نہیں

گردشِ چشم یہ کہتی ہے کہ جاگے ہوں گے — سونے والوں کی تو آنکھوں کا یہ انداز نہیں

ہے یہی تازہ اسیری میں پھڑکنا جو مرا — یا قفس آج نہیں یا پرِ پرواز نہیں

ہم تو واقف بھی نہ تھے حشر سے، اس سر کی قسم — آپ آئے تو یہ سمجھے کہ قیامت آئی

گھر میں جب جا کے ہم پکارے کہا خوشی نے سب سے عاے [illegible] — جھکے ستوں نے کیے اشارے مکیں ہلاتے زمیں ہے

خبر یہ دیتی تھی بو ملگجے ڈوپٹہ کی — لٹا ہے گرد کے پردہ میں قافلہ دل کا

صیاد قیدِ زیست سے بھی میں تو چھٹ گیا — اب کیا تو دیکھتا ہے قفس کو اتار کے

یہ حد تھی میرے پھڑکنے کی بوستاں کے لیے — قفس کی تیلیاں لایا ہوں آشیاں کے لیے

اسی کو ہوش میں دیکھا اجڑتے آنکھوں سے — جہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کے لیے

میں جو آیا تو زمانہ میں بلا بھی آئی — بزم میں شمع کے آتے ہی ہوا بھی آئی

شمعِ وحدت کا میں بزمِ دہر میں پروانہ ہوں — ہے جنوں عینِ خرد جس کا میں وہ دیوانہ ہوں

جو آئینہ ہے وہ ترا صورت نما نہیں — یکتا تو وہ ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں

حضرت ماہرؔ کی غزل گوئی کے بارے میں جناب مولوی سید محمد مصطفی صاحب عرف لڈن صاحب خورشید نے اپنی مشہور و معروف کتاب 'افادات' میں اظہار خیال یوں کیا ہے۔ مولوی لڈن صاحب خورشید حضرت ماہرؔ کے داماد اور چچا زاد بھائی تھے۔ عالم دین ہونے کے ساتھ نامور غزل گو اور مرثیہ نگار شاعر تھے اور اپنے وقت میں لکھنؤ کے ان چیدہ اساتذہ میں شامل تھے جن کا فیصلہ شعر و سخن کے مسائل میں حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ عروض میں ان کو خاص مہارت تھی [illegible] مخصوص [illegible] کی کتاب 'افادات' [illegible] شامل [illegible] جناب [illegible] اپنی

## ماہر صاحب کا آخری زمانہ:

حضرت عزیز نے لکھا ہے:

"آخر وقت میں ثقل سماعت اور ضعف بصارت بہت ہو گیا تھا۔ دیکھنے اور سننے سے بڑی حد تک معذور ہو گئے تھے اس لیے مرثیے خود پڑھنا ترک کر دیئے تھے۔ سال میں چند مجلس کا سلسلہ بہر حال جاری رکھا تھا جن میں ان کے بڑے فرزند جناب نظیر حسین صاحب ان کے مرثیے پڑھتے تھے۔

میں نے ان مجلسوں میں کئی دیکھا کہ نظیر حسین صاحب اگر مرثیہ پڑھتے پڑھتے بھی رکے یا کبھی کسی مصرعے کے پڑھنے میں یا ادا کرنے میں سقم ہوا تو ماہر مرحوم اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور خود پڑھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کا جوش و خروش اور ان کا زور و شور دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ سننے والوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی۔ چونکہ دیکھنے سے معذور تھے، مرثیہ کو آنکھ سے لگا کے بہت وقت سے ساتھ چند حروف دکھائی دیتے تھے۔ تعریف کرنے والوں کی آوازیں نہیں سنتے تھے مگر اشاروں پر سلام کرتے جاتے تھے۔ جب کوئی متنبہ کرتا کہ فلاں شخص بہت تعریف کر رہا ہے تو اس کو خاص طور سے سلام کرتے اور شکریہ بجا لاتے تھے"۔ ("مضامین عزیز" ص ۵۶)

### آخری رباعی ماہر صاحب کی قادر الکلامی کا ثبوت:

ڈاکٹر سید سکندر آغا لکھتے ہیں کہ ماہر لکھنوی کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ آثار موت نمایاں ہونے اور ہچکی آنے پر ہوش و حواس کو برقرار رکھتے ہوئے ایک رباعی نظم کی

کیوں خوش نہ ہوں، دل شاد کیا ہے تو نے ۔۔۔ سو فکروں سے آزاد کیا ہے تو نے
آواز سے ہچکی کی یہ دیتا ہوں صدا ۔۔۔ حاضر ہوں اگر یاد کیا ہے تو نے

اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ (مراثی محمد جعفر اوج ص ۱۷۵)

یہ رباعی مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ نے اپنی "تاریخ لکھنؤ" میں لکھی ہے مگر ڈاکٹر سکندر آغا نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ (ص ۱۶۱)

## وفات:

حضرت مہذب لکھنوی نے "اسرار محن" میں لکھا ہے کہ حضرت ماہر کا انتقال غالباً ۱۹۰۴ء میں ہوا۔ یہ تاریخ صحیح نہیں ہے۔

حضرت عزیز لکھنوی نے ان کی تاریخ وفات ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ لکھی ہے جو عیسوی تقویم کے حساب سے ۲۹ مئی ۱۹۰۷ء ہوتی ہے۔

حضرت عزیز لکھتے ہیں:

"ہائے ان آنکھوں سے جو کچھ یہاں دیکھا تھا وہ سب خواب وخیال ثابت ہوا۔ ماہر کہاں اور ان کی سحر بیانی کہاں۔ ۱۶ ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ کو انھوں نے اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ یہاں مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا

ہم اپنی راہ آئے تھے، جاتے ہیں اپنی راہ
دنیا رہے، زمین رہے، آسماں رہے

اپنے جد امجد غفراں مآب کے امام باڑہ میں صدر کے حجرہ میں دفن کیے گئے مرحوم کی مجلس چہلم میں ہیچمداں نے ایک مرثیہ عرض کیا تھا جو ہدیۂ ناظرین ہے:

برکنار بحر چوں بردند نعش آنجناب
از عقیدت ہائے طبعش آب شد در اضطراب
زاں سپس آں ذرۂ مہر آشنائے بوتراب
زیر خاک آسودہ در گورابۂ غفراں مآب
سال فوتش را بحسن تعمیہ دادم نشاں

حضرت امید اجتہادی لکھنوی

۲۵ ۱۲ھ تا ۱۲۹۳ھ

حضرت امید اجتہادی لکھنوی

بشکریہ جناب محترم سید محمد تقی صاحب قبلہ
خلف زبدۃ العلماء مولانا سیّد آغا مہدی صاحب
قبلہ طاب ثراہ

انھوں نے تعلیم حاصل کی اور اخلاقِ حسنہ کی تربیت پائی۔ یوں بھی خاندان میں ہر طرف علم کا چرچا تھا۔ ایک ایسی علمی و ادبی فضا بن گئی تھی کہ خاندان ایک حوزۂ علمیہ معلوم ہوتا تھا۔ اس فضا میں پروان چڑھنے والوں کی استعدادِ علمی کا کیا پوچھنا۔ حضرت امید بھی ایک عالم دین تھے گو کہ مجتہد نہیں تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ عمامہ و عبا قبا زیب تن نہیں فرماتے تھے بلکہ چوگوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے جو اس زمانہ کے شرفا کا لباس تھا۔ بہر حال عالم دین ہونے کے اعتبار سے وہ علم کی بلند منزلوں پر یقیناً فائز ہوں گے۔ چونکہ ان کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں ملتے اس لیئے اسناد کے ساتھ ایسے سوالات کا جواب تلاش کرنا ممکن نہیں۔ لالہ سری رام کی ''خم خانہ جاوید'' ورخواجہ عبدالرؤف عشرت کی ''آب بقا'' میں ان کا ذکر ہے مگر تحقیقی اعتبار سے ان میں کوئی مفید مطلب بات نہیں ہے۔

## ذریعۂ معاش:

سلطان العلماء کی اولاد کو حکومت کی طرف سے سو روپیہ ماہوار حین حیاتی پنشن ملتی تھی۔ حضرت امید کو بھی ملتی تھی اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ (''لکھنو کی شاعری'' ص ۱۹۸)

## ازدواجی زندگی:

جناب مہدی حسین صاحب ماہر کی ہمشیرہ حضرت امید سے منسوب تھیں۔ حضرت ماہر اور حضرت امید ایک دوسرے کے سگے چچازاد بھائی بھی تھے۔ اس اعتبار سے حضرت امید کی اہلیہ بھی ان کی سگی چچازاد بہن ہوئیں۔

## اولاد:

حضرت امید کے صرف ایک فرزند جناب سید محمد کاظم صاحب تھے جو [illegible] کاظم صاحب جاوید کے عرف اور تخلص سے مشہور تھے ان کا شمار لکھنو کے نامور [illegible] میں ہوتا تھا۔ تفصیل خود ان کے حالات کے ذیل میں آئے گی

## حلیہ:

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ کے پاس حضرت امید کی ایک تصویر تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دبلے پتلے متوسط قد کے آدمی تھے اور چوگوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے جو اس زمانے کے شرفا کی وضع تھی۔ اب وہ تصویر ان کے پاس تو نہیں رہی مگر میں نے خدا کے فضل سے ان کی ایک تصویر جناب مولانا آغا مہدی صاحب کے خلف اکبر سے حاصل کی ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔

## مزاج اور اخلاق و عادات:

جناب مولوی سید محمد مصطفیٰ صاحب عرف لڈن صاحب خورشید نے "افادات" میں حضرت امید کے مزاج و اخلاق کے بارے میں لکھا ہے۔ "افادات" جناب مولوی سید محمد مصطفیٰ صاحب عرف لڈن صاحب خورشید کی مشہور و معروف تصنیف ہے۔ حضرت امید حضرت خورشید کے بڑے پیارے بھائی بھی تھے اور ان کے استاد بھی۔ اس لیے ان کی تحریر اعتبار سے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ میں حضرت امید کے مزاج و اخلاق کے بارے میں "افادات" کی کچھ عبارت یہاں درج کیے دیتا ہوں۔ ملاحظہ ہو

حضرت خورشید لکھتے ہیں

"(اپنے بڑے بھائی کے فوت ہونے سے) امید مرحوم کی خدمت میں خوب ہی احسان پیش آئے۔ گھر میں تو نہایت کلفتگی طبیعت کو رہتی تھی۔ ان کی خدمت میں پہنچتے ہی شگفتگی حاصل ہوتی۔ خدا جنت نصیب کرے عجب ظرف پایا تھا۔ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان، بچوں میں بچے۔ خوش بیان ایسے کہ محفل میں جہاں کوئی ذکر نکالا پھر ممکن نہ تھا کہ جہاں تک آواز پہنچے وہاں تک اہل مجلس سوا ان کے دوسری جانب رخ کریں۔ انھوں نے پہلے ہی روز ہماری ایسی باتیں کیں کہ دل اٹھتے وقت چپ ہوا اور اس طرح مہربانی

فرمائی کہ گھر کی یہ دہی بھلائی۔ علم قیافہ میں بھی کمال تھا۔ اکثر مجھے دیکھتے تھے تو اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ یہ لڑکا بڑا ذکی الطبع اور ذہین ہوگا۔ خدا کرے اسے شوق شعر گوئی کا ہو جائے تو دیکھنا کتنی جلدی ترقی کرتا ہے۔ اب نوحہ لے کر میرا جانا تھا کہ گویا ان کی مراد آ گئی''۔ (''انی وات''، ص ۱۲)

## حضرت امید کی پاکیزگی ذوق:

حضرت شاد عظیم آبادی نے ''ذکر شعراء'' میں حضرت امید کی نفاست و پاکیزگی ذوق کے بارے میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ میر انیس علیہ رحمہ کے ایک مرثیہ کے ایک بند میں 'تار' اور 'بار' قافیہ اور 'پہ دوڑے' ردیف نظم ہوئی۔ جس مجلس میں انھوں نے وہ مرثیہ پڑھا اس میں حضرت امید بھی شریک تھے۔ جب انھوں نے وہ بند پڑھا جس کے دو مصرعے یہ تھا

اس طرح رگِ ابرِ گہربار پہ دوڑے
جس طرح سے نغمہ کی صدا تار پہ دوڑے

امید صاحب نے کہا کہ واہ، کیا ردیف ہے۔ تعریف نہیں ہو سکتی۔ برسوں اس کے چرچے رہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ''نغمہ کی صدا'' اور اس کے تار پہ دوڑنے کو بھی غلط کہا تھا مگر یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت میر انیس نے خود یہ خیال فرمایا کہ اعتراض نغمہ کی صدا کے تار پر دوڑنے پہ ہے، ردیف کی طرف ان کی نظر نہیں گئی۔ چنانچہ کسی دوسری مجلس میں نغمہ کی صدا اور اس کا تار پہ دوڑنا انھوں نے ثابت کیا مگر ردیف کے بھونڈے پن پر خاموشی اختیار کر لی۔

جناب محترم سید علی احمد دانش صاحب نبیرۂ میر انیس نے بھی اپنی کتاب 'ادبی میراث' میں اس واقعہ کا اشارۃً ذکر کیا ہے مگر نہ معترض کا نام لکھا جس سے معلوم ہوتا کہ اعتراض کس نے کیا اور نہ ردیف کے ابتذال اور بھونڈے پن پر اعتراض کا حوالہ دیا۔ صرف نغمہ کی صدا کے تار پر دوڑنے کی جو وضاحت حضرت انیس نے فرمائی اس کے بارے میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ فارسی شعراء نے صدائے نغمہ کو اسی طریقہ پر نظم کیا ہے۔ اردو فارسی کی متبع ہے اور مثال میں فارسی کا ایک شعر پڑھا جس کا مصرع ثانی یہ ہے

## صدائے نغمۂ دود یہ بنگ تار تار ہا

بہر حال چونکہ شاد عظیم آبادی جیسے بڑے شاعر اور غیر جانب دار شخص نے "ذکر شعرا" میں اس واقعہ کو حضرت امید کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ردیف کے بھونڈے پن پر اعتراض کا ذکر کیا ہے اس لیئے ان کا فرمایا ہوا سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب علی محمد دانش صاحب قبلہ نے حضرت امید کے حوالہ سے ایک دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ میر صاحب قبلہ نے اپنا مرثیہ:

یہ زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا

پڑھا۔ اس میں ایک مصرع نظم فرمایا تھا:

پانی پہ قرق کھوتے ہو کیوں اپنی آبرو

چند لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ لفظ ساکن الاوسط نہیں ہے بلکہ متحرک الاوسط ہے۔ میر صاحب نے ناگواری کے طور پر جناب محمد جعفر امید کو متوجہ کیا اور فرمایا کہ آج سے میں اسے ساکن الاوسط بنائے دیتا ہوں اب کوئی بھی متحرک الاوسط نہیں بولے گا۔

جب بقول حضرت دانش حضرت امید نے کہا کہ نہ میں معترض ہوں نہ یہ میرا اعتراض ہے تو پھر میر صاحب کو یہ دھوکہ ہوا کہ اعتراض حضرت امید نے کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "تار پہ دوڑے" اور "بار پہ دوڑے" کی ردیف پر اعتراض حضرت امید ہی نے کیا تھا جس کی وجہ سے میر صاحب کو یہ احتمال ہوا کہ لفظ "قرق" پر بھی حضرت امید ہی نے اعتراض کیا ہوگا اس لیئے بطور خاص ان کو مخاطب کیا۔

## مرثیہ گوئی:

میں نے حضرت ماہر کے بیان میں لکھا ہے کہ وہ خاندان اجتہاد کے پہلے مرثیہ گو شاعر تھے۔ یہ بات بچپن سے میرے ذہن میں تھی۔ خاندانی بزرگوں کی گفتگو سے یہی تاثر قائم ہوا تھا۔ مگر اب جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی جو اس وقت خاندان اجتہاد کی بزرگ ترین شخصیت ہیں اور خاندان کے متعلق ان کی معلومات وسیع ہیں

ان سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ اس خاندان میں سب سے پہلا مرثیہ حضرت امید نے کہا تھا۔ یہ دو مختلف اور متضاد آراء ہیں۔ مگر چونکہ پہلی رائے کی تصدیق کرنے والا اب کوئی نہیں ہے اس لیئے حضرت شمس کی رائے کو ترجیح حاصل ہے۔ مگر اس بحث میں پڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے اس لیئے کہ حضرت ماہر اور حضرت امید دونوں آپس میں چچازاد بھائی تھے۔ حضرت ماہر کی ہمشیرہ حضرت امید سے منسوب تھیں اور حضرت امید بھی اس وقت لکھنؤ کے نامور اساتذہ میں شمار کیئے جاتے تھے۔ حضرت مہذب نے بھی ''اذکار محن'' میں لکھا ہے کہ جناب امید بھی اپنے دور کے مستند استاد تھے۔ اس لیئے پہلا مرثیہ ماہر صاحب نے کہا ہو یا امید صاحب نے اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے البتہ اہم بات یہ ہے کہ حضرت ماہر نے بے شمار مرثیے کہے جبکہ حضرت امید کے مرثیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مولانا شمس صاحب قبلہ نے ''لکھنؤ کی شاعری'' میں ان کے مرثیوں کی کل تعداد دو لکھی ہے۔ (ص ۱۹۸) ایک اعتبار سے یہ بات حیرت انگیز ہے اس لیئے کہ ان کا جو ایک مرثیہ دستیاب ہے اور امام علی ابن موسیٰ رضا کے حال میں ہے، وہ فکر وفن کے اعتبار سے اس قدر بلند پایہ ہے کہ اسے ان کا پہلا یا دوسرا مرثیہ کہنا ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ تخیل کی بلندی، جدت مضامین، بندشوں کی چستی، مصرعوں کی روانی اور بیان کا زور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو بعض بڑے بڑے مشق مرثیہ گو حضرات کے یہاں نظر نہیں آتا۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انھوں نے یقیناً اور بھی مرثیے کہے ہوں گے جو اب دستیاب نہیں ہیں۔ مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ نے اپنی ''تاریخ لکھنؤ'' میں امید صاحب کے مرثیوں کی تعداد تو نہیں لکھی مگر یہ لکھا ہے کہ امید نے مرثیے بھی کہے (ص ۲۰۸) اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ متعدد مرثیے کہے ہوں گے۔

اب ان کے واحد دستیاب مرثیہ کے بعض مقامات سے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:۔

ابتدا بند کے اس مرثیہ کا مطلع ہے ''فکر شاہ مشہد ذی احترام ہے''۔ مرثیہ امام رضا

اور جناب معصومۂ قم سلام اللہ علیہا کے حال میں ہے۔ ارضِ مشہد مقدس اور روضۂ امام رضا کے ذکر سے مرثیہ کا چہرہ کھلتا ہے۔ ابتدا کے تین بند ملاحظہ ہوں

فکرِ ثنائے مشہدِ ذی احترام ہے
وصفِ ریاضِ روضۂ رضواں مقام ہے
ہر فرد رشکِ گلشنِ دارالسلام ہے
ایک ایک بیت قدر میں بیت الحرام ہے

یا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔ تشبیہ کی داد نہیں دی جا سکتی۔

خامہ کا رکن خانۂ کعبہ خطاب ہے

لاجواب مصرع ہے۔ جزاک اللہ۔

پانی نہیں، دوات میں زمزم کا آب ہے

سبحان اللہ، کیا خوب صورت تشبیہ ہے۔

پورا بند اور بیت خاص طور سے ملاحظہ ہو:

لکھتا ہے بارگاہِ فلک جاہ کا حشم
شاخِ نہالِ طور قلم ہو پئے قلم
آئے سیاہیِ حجرالاسودِ حرم

دوسرے اور تیسرے دونوں مصرعے لاجواب ہیں۔ تیسرا مصرع تو بالکل نیا ہے، کیا کہنا۔

قبہ کا اوج صفحۂ گردوں پہ ہو رقم
توصیف یوں ہو روضۂ مینو سرشت کی
دنیا میں لوگ دیکھ لیں صورت بہشت کی

سبحان اللہ سبحان اللہ، کیا بیت ہے اور چھٹے مصرع کی بے ساختگی کا کیا کہنا۔

رفعت میں ارضِ پاکِ خراساں ہے آسماں
انجم کی طرح خاک کے ذرے ہیں زرفشاں

جادے نہیں یہ زمیں پہ اتری ہے کہکشاں

کیا اچھی تشبیہ ہے۔ سبحان اللہ۔

ہر نقشِ پا سے جلوۂ خورشید ہے عیاں

ایک ایک پہاڑ کہتا ہے میں کوہ طور ہوں

اٹھ اٹھ کے گرد کرتی ہے دعویٰ کہ نور ہوں

کیسی خوب صورت مصرع اور کیسی عمدہ تخیل ہے۔ واہ۔

اختصار کے خیال سے پورے پورے بند کے بجائے ایک دو بیتیں درج کر رہا ہوں۔

بیت ملاحظہ کیجئے اور دوسرے مصرع کی خصوصیت سے داد دیجئے

جھکتا ہے چرخ دیکھ کے اس احترام کو

کعبہ کے طاق دور سے خم ہیں سلام کو

خط ہے کہ لوحِ قبر پہ گویا کھدا ہے یہ

تسلیم کر، مزارِ امامِ رضاؑ ہے یہ

رضا کی مناسبت سے 'تسلیم' کی لفظ کیسا مزہ دے رہی ہے۔

روضۂ امام رضا کے باغات میں جو پھل لگے ہوئے ہیں ان کی تعریف میں یہ دو بند

ملاحظہ فرمایئے:

نخل بھی و سیب و رطب سب ہیں باردار

بادام پر ہے دیدۂ محبوب کی بہار

کیا تغزل ہے۔ سبحان اللہ۔

دیکھے سے جن کے ہوتی ہے فرحت وہ ہیں انار

نازک ہے ایسا پوست کہ دانے ہیں آشکار

کیا کہنا۔

کیا طرفہ ذائقہ ہے پھلوں میں سما گیا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے مزہ منھ میں آ گیا

مجھ کو تو بند پڑھ کے مزہ منھ میں آ گیا۔ بند اور بیت کی کیا داد دی جا سکتی ہے۔

انگور تر لٹکتے ہیں شاخوں میں متصل
خوشبو سے ان کی عقد ثریا بھی ہے خجل
مائل نہ کس طرح ہو نزاکت پہ ان کی دل
بادِ صبا کے چلنے سے ہوتے ہیں مضمحل
ہیں جھوم کر بلند کبھی، گاہ پست ہیں
انگور خود شرابِ تولا سے مست ہیں

یہ بند خصوصاً چوتھا مصرع اور بیت پڑھیے اور شراب تولا کے نشے سے مست ہو جائیے۔

یہاں سے یہ منظر سامنے آتے ہیں کہ ہارون رشید کا انتقال ہو گیا اور مامون اس کی جگہ تخت سلطنت پر بیٹھا ہے۔ حکومت کے سارے حدود میں خلفشار، انتشار اور شورش برپا ہے جس پر قابو پانا مامون کے بس کی بات نہیں ہے۔ ارکان دولت نے اس کو یہ مشورہ دیا ہے کہ امام رضاؑ کو مدینے سے بلا کر زمام حکومت ان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ وہ فرزند رسولؐ ہیں اور عوام میں ان کا زبردست احترام ہے۔ وہ حسن تدبر اور اپنے اثر سے کام لے کر موجودہ انتشار و بغاوت پر قابو پا لیں گے۔ مامون اس تجویز کو قبول کر کے امام رضاؑ کو مدینے سے بغداد طلب کرتا ہے۔ امامؑ تو اس کا انجام معلوم ہے مگر حکم شاہی کے آگے مجبور ہیں۔ چنانچہ آپ بغداد جانے کی تیاری کرتے ہیں اور مدینے میں قبر رسولؐ اور اپنے اہل حرم سے رخصت ہوتے ہیں، خصوصاً اپنی چہیتی بہن جناب فاطمہؑ سے جو بعد میں معصومۂ قم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس محل پر رخصت کے طویل مگر پر اثر بند مرثیے میں شامل ہیں۔ یہاں سے امامؑ کے سفر بغداد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس موقع پر امامؑ کی سواری کے چند بند ملاحظہ ہوں:-

آخر چلے مزارِ نبیؐ سے بچشمِ نم
آنکھیں ملائک نے بچھائیں قدم قدم
گھوڑے پہ جب سوار ہوئے قبلۂ امم
ساتوں فلک سلام کو خم ہو گئے بہم

کیا عمدہ مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

چھلکا جو نورِ روئے ثریا مآب کا
ذروں کی ضو سے پھر گیا رخ آفتاب کا

بیت کا حسن بھی داد طلب ہے۔

آگے بڑھا جلوس، سواری ہوئی رواں
جادے کی ضو سے چھپ گئی گردوں پہ کہکشاں
دعویٰ کیا زمیں نے کہ اب میں ہوں آسماں
شمس و قمر ہیں چرخ پہ، ایسے قدم کہاں
اس نورِ پا سے آج مجھے اکتساب ہے
ذرہ جو میری خاک کا ہے، آفتاب ہے

کیا کہنا۔ جزاک اللہ۔

یہ پورا بند ملاحظہ کیجیے اور شاعر کی منظر نگاری کی داد دیجیے

ارواحِ انبیاء کی صفیں ہیں اِدھر اُدھر
ہمراہ قدسیوں کے پرے ہیں کشادہ تر
کروبیانِ عرش دِکھاتے ہیں کر و فر

کیا کہنا ہے۔ سبحان اللہ۔

میکائیل و جبرئیل کے ہاتھوں میں ہیں چنور
ہے طرفہ کا شور کبھی، گہہ درود کا

مٹھی میں گل لیے ہوئے تھے زر پئے نثار
غنچے بھی ہنس رہے تھے کہ تھی آمدِ بہار
کحلِ بصر جو بادِ بہاری کا تھا غبار
نرگس کو تھا ورودِ سواری کا انتظار
استادہ ہر نہال تھا تعظیم کے لیے
شاخوں نے سر جھکائے تھے تسلیم کے لیے

پورا بند انتہائی خوب صورت ہے مگر بیت کا تو جواب ہی نہیں۔ شاخوں کے جھکنے کی جو شاعرانہ توجیہ کی گئی ہے وہ بے مثال ہے۔

ان بندوں میں منظر نگاری کا حسن نمایاں ہے اور سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت، بلندیٔ تخئیل اور جدت خیال اپنے عروج پر ہے۔

حضرت امید نے ایک کمال یہ کیا ہے کہ گو اس مرثیہ میں انھوں نے رزمیہ نظم نہیں کیا اس لیے کہ اس کا محل نہیں تھا مگر اس کے باوجود انھوں نے گھوڑے کی تعریف میں متعدد خوب صورت بند لکھے ہیں۔ یہ گھوڑا وہ ہے جس پر سوار ہو کر امام رضا مدینے سے بغداد کا سفر کر رہے ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں:—

یوں تھا سوار فوج میں لختِ دلِ بتولؑ
جاتے تھے جس طرح شبِ معراج میں رسولؐ
شبدیز کو براق کا تھا مرتبہ حصول
یاں اور خوش خراموں کے دعوے ہیں نا قبول
ہوتا تھا خون کبک کا ایک ایک گام پر
پریوں کی جان جاتی تھی طرزِ خرام پر

شل اس فرس کے سامنے ہیں آہوے تتار
اک اک قدم پہ ہوتے ہیں پریوں کے دل نثار

شاہکار ہے۔ سبحان اللہ۔

ہو سرعتِ سمندِ صبادم اگر رقم
ٹھہرے نہ پھر ورق پہ کہیں ادہمِ قلم
بندش کا ذکر کیا ہو کہ نقطے نہیں بہم
کاغذ رہے سفید، ازیں حرف یک قلم
صرصر سے تیز خامۂ سرعت نگار ہو
جس خط میں ہو یہ حال وہ خطِ غبار ہو

شائستگی میں، نرم روی میں ہے لاجواب
تھم کر چلے تو بادِ بہاری کو ہو حجاب
زیرِ قدم ہو سبزۂ خوابیدہ محوِ خواب
لپٹے ہوئے سموں سے ہیں سب ہمرہِ رکاب
سب باغ باغ ہیں، یہ سواری کی چال ہے
ساری نسیم بادِ بہاری کی چال ہے

واہ، کیا خوب صورت بند ہے۔ جزاک اللہ۔

گھوڑے کی تعریف کے بعد حضرت میر نے [illegible] شہزادوں میں [illegible] کا مختلف منزلوں پر قیام [illegible]، قیام کی جگہوں کی تعریف اور خیمہ [illegible] کی شان و شوکت وغیرہ بڑے طمطراق سے نظم کی ہے۔

مثلاً

قدسی طواف کرنے کو گردوں سے آتے تھے
جبریل فرش اپنے پروں کا بچھاتے تھے

یا یہ بند

اس نورِ کبریا کا جہاں پہ ہوا قیام

منزل وہ رشکِ وادیِ ایمن بنی تمام
جس ملک کی زمیں پہ ہوئے آپ کے قیام
وہ فرش مرتبہ میں ہوا عرش احتشام
دی منزلت جو خیمۂ رفعت نشان نے
بوسے زمیں کے جھک کے لیے آسمان نے

کیسا پیارا بند اور کتنی عمدہ بیت ہے۔ [illegible]
یہ بیت بھی دیکھیے:

ہے کون مدعی، یہ شرف کس نے پائے ہیں
چوبوں نے بے مثال کے ڈنکے بجائے ہیں

[illegible]
کس قدر خوب صورت، شاعرانہ اور [illegible] ہے۔

یہاں سے [illegible]
ہوئے حضرت امید شہر طوس میں امام کے [illegible] کہتے ہیں

جب طوس میں ورودِ امام رضاؑ ہوا
ذکرِ نزولِ رحمتِ حق جابجا ہوا
ہر گھر میں اک اساسِ مسرت بپا ہوا
سب شہر انبساط سے عشرت فزا ہوا
فیضِ قدومِ شہ سے نیا طور ہو گیا
آتے ہی شہرِ طوس کا رنگ اور ہو گیا

کیا کہنا ہے۔ کیسا خوب صورت مصرع ہے۔

طوس میں امام کے قیام کے دوران مامون رشید کی طرف سے [illegible]
کی جاتی ہے مگر اس کے دل میں آپ کی طرف سے جو بغض تھا وہ [illegible] تھا۔

آخر ان نے ایک دن امامؑ کو شہید کرنے کی نیت سے انگور میں زہر دے دیا۔ جس سے امامؑ کا حال غیر ہو گیا۔ چونکہ یہ سانحہ عالم مسافرت میں پیش آیا تھا جب امامؑ پردیس میں یکہ و تنہا تھے اور ان کے متعلقین میں سے کوئی بھی ان کے پاس نہ تھا اس لیے اس عالم بے کسی میں گریہ وزاری کون کرتا اور گھر سے نوحہ و ماتم کی صدائیں کیسے بلند ہوتیں۔ حضرت امید نے مصائب کی اس منزل کو بڑے اختصار اور سلیقہ سے سر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف تین بند درج کر رہا ہوں:

جب کر چکے وصیتیں سلطانِ نامدار
فرمایا یہ پسر سے کہ ہے شکرِ کردگار

امام رضاؑ کے قتل سے کچھ پہلے ان کے فرزند ارجمند (امام) محمد تقی علیہ السلام اپنے پدرِ بزرگوار کے پاس علمِ امامت اور الٰہی قوت سے پہنچ گئے تھے تاکہ اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد ان کی نماز اور دفن و کفن کا انتظام کریں۔ واضح رہے کہ امام کی نماز جنازہ امام ہی پڑھ سکتا ہے۔

مرضی ہو جو خدا کی، نہیں اس میں اختیار
آخر میں یہ کہا کہ یہ ہے وقتِ احتضار
حالت ہے مجھ کو یاد شہِ مشرقین کی
روؤ تو یاد کر کے مصیبت حسینؑ کی

یہ کہہ رہے تھے بس کہ ہوا شہؑ کا انتقال
کس کو ہو ان کا رنج اسی کا تو ہے ملال
افسوس، خاندانِ نبوت پہ ہے زوال
ہیں عورتیں کہاں کہ جو کھولیں سروں کے بال
دم بھر کو جو ملا تھا وہ آخر جدا ہوا
تھا لاش پہ پسر کا گریباں کھلا ہوا

دشمن جو تھے، نہ لاش کے تھے وہ قریب بھی
دانتوں میں انگلیاں تھے دبائے طبیب بھی
غسل و کفن انھیں نہ ہوا تھا نصیب بھی
آئے تھے کربلا سے امامؑ غریب بھی

دل پر تھے سارے داغ فلک کے دیے ہوئے
خود تھے رسولؐ چاک گریباں کیے ہوئے

امامؑ کی شہادت اور مصائب نظم کرنے کے بعد حضرت امیدؔ نے جناب معصومہ قم ؑ رحلت اور ان کے مصائب پر مرثیہ کو تمام کیا ہے۔ یہ مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ کے حال میں میرے علم و اطلاع کے مطابق کوئی مرثیہ نہیں لکھا گیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ابتدائی قابل ستائش اور قابل داد ہے اور شاعری کے اعلیٰ معیار کے پیش نظر بے مثال ہے۔ اس مرثیہ میں شاعری کے خصوصیات، فصاحت و بلاغت، زور بیان اور حسن زبان، نزاکت خیال، جدت مضامین، حسن تخیل اور حسب موقع شکوہ الفاظ وغیرہ مندرجۂ بالا اقتباسات سے پوری طرح نمایاں ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف دو مرثیے کہے ہوں اس کا یہ مرثیہ اس قدر اعلیٰ درجہ اور بلند مرتبہ کا ہو جس کو یقینی طور پر اردو کے بہترین مرثیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

## سلام، نوحے، قصیدے اور رباعیات وغیرہ:

یقین ہے کہ حضرت امیدؔ نے ان اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ ان کا یہ کلام دستیاب نہیں ہے۔

## مسالمہ کی ایجاد:

حضرت شمسؔ منظر نے ''لکھنوی شاعری'' میں لکھا ہے کہ مسالمہ کی ایجاد بھی حضرت امیدؔ کا کارنامہ ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی تعداد میں سلام کہے ہوں

گے مگر اب دستیاب نہیں۔

## غزل گوئی:

حضرت امید ایک بڑے اعلیٰ پائے کے غزل گو تھے اور لکھنؤ کے اس وقت کے بڑے اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔

## تلمذ:

غزل گوئی میں وہ نواب عاشور علی خان کے شاگرد تھے جو نواب سعادت علی خان بہادر حاکم اودھ کے پوتے تھے۔ ("افادات"، ص١٩)

## اندازِ غزل گوئی:

غزل گوئی میں ان کا ایک خاص انداز اور ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا۔ ان کے شاگرد خاص جناب مولوی مذن صاحب خورشید نے "افادات" میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"وہ طرزِ عاشقانہ مطلق نہ فرماتے تھے یہاں تک کہ لفظ 'یار' بھی ان کے کلام میں اگر ڈھونڈیے تو معشوق کے معنوں میں نہ ملے گی۔ یا حمد و نعت میں یا مدح ائمہ علیہم السلام میں فرماتے تھے اور جو غزلیں یا اشعار اس سے خالی ہیں ان میں حسرت آمیز اور عبرت خیز مضامین ہیں۔ خلاصہ معشوقانِ مجازی کی مدح میں جو طرزِ مذہب کا ہے وہ بھی کوئی شعر نہ فرماتے تھے۔"

("افادات"، ص١٩)

اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق انھوں نے غزل میں اصلاح کی تحریک بھی شروع کی۔ جناب مولانا محمد باقر صاحب شمس نے "لکھنؤ کی شاعری" میں حضرت امید کے حالات میں لکھا ہے:

"ناسخ کے بعد غزل میں اصلاحی تحریک محمد جعفر صاحب امید نے پیش

ہیں''۔ (ص ۱۹۷)

حضرت امید کی غزل میں اس اصلاحی تحریک کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کی پرورش ایک ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی جس میں ہر طرف علم دین کے چرچے تھے۔ وہ خود ایک عالم دین تھے، اس لیئے غزل میں ایسی باتیں کہنا جو مذہبی نقطۂ نظر سے مستحسن نہ ہوں ان کے دین و شرع میں ڈھلے ہوئے مزاج کے لیئے ناپسندیدہ تھیں۔ دوسرے یہ کہ اس زمانہ کے معمولی درجہ کے غزل گو عموماً اس طرح کے مضامین نظم کرنے اور شرعی نقطۂ نظر کو پس پشت ڈال دینے میں حد سے بڑھ جاتے تھے۔

حضرت امید کی یہ اصلاحی تحریک ان کا ایک کارنامہ ہے، ایسا کارنامہ جس کو حالی جیسے شخص نے اپنے نام سے پیش کرنے میں جھجک تک محسوس نہ کی۔

غزل کے متعلق ان کے خود بتائے ہوئے اصولوں سے اگرچہ محسوس ہوتا ہے کہ غزل میں دلکشی باقی نہیں رہے گی مگر ان کے اشعار ان پابندیوں کے باوجود تغزل سے خالی نہیں اور بہت دلکش اور خوب صورت ہیں۔ حضرت خورشید نے لکھا ہے کہ ہمیشہ مضامین عالی ہی نظم فرماتے تھے اور نازک خیالیوں ہی کی جانب توجہ تھی۔ انھوں نے ''افادات'' میں اور حضرت شمس نے ''لکھنوی شاعری'' میں حضرت امید کے جو اشعار نقل کیئے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ ملاحظہ ہوں۔

ان کا ایک شعر جو بہت مشہور ہے اور لوگ نہیں جانتے کہ یہ کس کا شعر ہے پہلے وہ ملاحظہ کیجیئے

شوق سیرِ عدم کا کم نہیں     وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں

اور اب دوسرے اشعار:

کیا ہے لن ترانی نے قوی دعویٰ بصیرت کا     وہی بینا ہے جو قائل ہوا نفیِ رویت کا
جو آتا ہے تصور وسعتِ دامانِ رحمت کا     نسیمِ لطف پردہ کھول دیتی ہے عدالت کا
بڑھے تھے جو حجابِ قدس و رحمت سے بھی آگے     نہ ان پر بھی کھلا پردہ تری کنہِ حقیقت کا

کچھ رفتگانِ ملکِ عدم کا نشاں ملا ۔۔۔ ذروں میں خاک کے جو کوئی استخواں ملا

پہلے قلم اسی کو کیا باغباں نے ۔۔۔ جس شاخ پر چمن میں ہمیں آشیاں ملا

امن انسان شماتت سے کہاں رکھتے ہیں ۔۔۔ دہر میں آتے ہی نام اہلِ جہاں رکھتے ہیں

پختہ کاروں کے منہ میں نہ رہیں گے محفوظ ۔۔۔ وہ ثمر نخل سے ٹوٹیں گے جو پک جائیں گے

عہدِ پیری میں بھی سرگشتہ ہوس رکھے گی ۔۔۔ سر کو ہوگی حرکت پاؤں جو تھک جائیں گے

بارِ عصیاں سے ہمیں گور میں سختی ہوگی ۔۔۔ جو اٹھیں گے جنازہ کو وہ تھک جائیں گے

روشنی داغِ دل بزمِ [illegible] مضطر میں ہے ۔۔۔ یہ چراغ طور کا جلوہ خدا کے گھر میں ہے

ملتا نہیں پتہ در و دیوار و مسقف کا ۔۔۔ تصویر لامکاں کی ہمارے مکاں میں ہے

با چشم راہ روِ ملکِ عدم رہتے ہیں ۔۔۔ دوشِ احباب پہ چلنے میں قدم رہتے ہیں

[illegible] عمرِ رواں سے نہیں کچھ جا سکتے ساتھ ۔۔۔ اشک اس واسطے رخسار پہ تھم رہتے ہیں

شان بے بخت، رزق جو گردوں نہیں دیتا ۔۔۔ کوئی تجھے تقدیر سے افزوں نہیں دیتا

جھک کے ملنے کو ترقی میں نہ چھوڑ ۔۔۔ دیکھ، اس رفعت پہ گردوں خم رہا

سودا ازل سے عشقِ حقیقی کا سر میں ہے ۔۔۔ جس جا نظر کا کام نہیں وہ نظر میں ہے

امراضِ دنیوی سے نجات اپنی ہے محال ۔۔۔ داخل دوا کی فکر بھی جب دردِ سر میں ہے

رکتا نہیں ہے توسنِ عمرِ رواں کبھی ۔۔۔ گھر میں بھی بیٹھنا مرا داخل سفر میں ہے

نالہ ہے درد، ہو تعریف کے قابل میرا ۔۔۔ ناوکِ آہ میں کھنچ آئے اگر دل میرا

ہر قدم اٹھتی ہے تعظیم کو جب چلتا ہوں ۔۔۔ پاس کرتی ہے یہ گردِ رہِ منزل میرا

جو مقدر کا ہووے دے مجھے بے منتِ غیر ۔۔۔ حصۂ غیر میں حصہ نہ ہو شامل میرا

بیٹھتے اٹھتا مری طرح رواں ہے یہ بھی ۔۔۔ ساتھ دیتا ہے غبارِ رہِ منزل میرا

سانس چلتی نہیں یہ، عمر رواں جاتی ہے ۔۔۔ ہے ہر اک تارِ نفس جادۂ منزل میرا

وہ موحد ہوں کہ شرکت سے تنفر ہے مجھے ۔۔۔ رنگ ہوگا نہ کسی رنگ میں شامل میرا

عیشِ دنیا کے مزے ساتھ جوانی کے گئے ۔۔۔ اب تو امید، نہ وہ میں ہوں نہ وہ دل میرا

بلند دوشِ صبا پر مرا غبار رہا ۔۔۔ ہوا جو خاک بھی تو آسماں وقار رہا

گدا جہاں کے نہ کس طرح شاہ کہلائیں ۔۔۔ نبی کو فقر کی دولت پہ افتخار رہا

ہوا بندھی جو ہماری سیاہ کاری کی — کبھی چراغ نہ روشن سرِ مزار رہا
نظر گئی سوئے صانع ہر ایک صنعت سے — ہزار پردوں میں نور اس کا آشکار رہا

جب آیا سامنے محشر میں نامۂ اعمال
امید تیرے کرم کا امیدوار رہا

چشم نے آنسو کا عقدہ وا کیا — تھا جو اک قطرہ اسے دریا کیا
آنکھ دی تو نے تو نظارہ کیا — تیری آنکھوں سے تجھے دیکھا کیا
اہلِ مسند خاک میں آخر ملے — دولتِ دنیا پہ کیوں تکیہ کیا
خامشی سے بڑھ گئی مشقِ سخن — چپکے رہنے نے مجھے گویا کیا
میرے مہماں کی رسائی دیکھیے — دل میں آ کر غم نے گھر پیدا کیا
اٹھے عصا، میں نہیں اتنے بار کے قابل — عصائے آہ ہے اس جسمِ زار کے قابل
گھٹا دیے مرے دعوے ترے گھٹ گھٹ نے — کمال بھی نہ رہا اعتبار کے قابل
پسِ فنا اثرِ ضعف میرے کام آیا — زمیں رہی نہ لحد کی فشار کے قابل
پسِ فنا دلِ احباب صاف ہیں مجھ سے — میں خاک ہو کے نہیں ہوں غبار کے قابل
ہنر کے ہاتھ سے ہم رزق پا نہیں سکتے — خطِ جبیں سے خط اپنا ملا نہیں سکتے
محال اوج نہ کیونکر ہو خاکساروں کا — زمیں سے نقشِ قدم کو اٹھا نہیں سکتے
یہ نعمتوں کی حلاوت نے بند کر دیے لب — زباں پہ شکر کے کلمے بھی آ نہیں سکتے
روا ہو دل شکنی کیا ہمارے مذہب میں — خدا کے گھر کو مسلمان ڈھا نہیں سکتے
وہ دوست خاک ہماری لحد پہ بیٹھیں گے — جو فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا نہیں سکتے

تمھیں چلو تو چلو دوستوں کے پاس امید
گئے جو ملکِ عدم کو وہ آ نہیں سکتے

فکر زائد کس لیے ہے اے امید — پاؤں پھیلانے کو تربت کم نہیں
سحر کو پھول ہنس دیتے ہیں، شبنم شب کو روتی ہے — چمن کا رنگ بھی تصویر ہے نیرنگ عالم کی
دور سے دیکھنے والے جسے سمجھے تھے غبار — شامیانہ وہ سرِ گورِ غریباں نکلا

مولانا آغا مہدی صاحب مرحوم نے اپنی کتاب تاریخ لکھنؤ میں حضرت امید کا ایک یہ شعر درج کیا ہے:

طالبِ اوج نہ ہو مثلِ فلک او منعم
کہیں تجھ میں بھی نہ بیدادگری آ جائے

حضرت امید کے قتل کے وقت ان کے دو مرثیے اور غزلیات کا ایک دیوان دستیاب تھا۔ مولانا محمد باقر صاحب شمس نے تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے دو مرثیے اور ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ مرثیے عام طور پر لکھنؤ میں ملتے تھے۔ دیوان ان کے بیٹے بندہ کاظم صاحب جانشین کے پاس تھا۔ ان کے بعد مجاور حسین صاحب تشنہ کے ہاتھ لگا۔ وہ اسے چھپا کر رکھتے اور کسی کو دکھانے میں اس کی حفاظت سمجھتے تھے۔ بڑی مشکل سے چند غزلیں حضرت شمس کو ملی تھیں جو مندرجہ بالا کلام میں شامل ہیں۔ اب ان کے انتقال کے بعد اس دیوان کا کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔ ([illegible] ص ۹۶)

حضرت شمس نے مزید لکھا ہے کہ امید صاحب کی [illegible] تھیں [illegible] حضرت معصوم رضا کی [illegible] تک [illegible]

## وفات:

حضرت شمس کے مطابق حضرت امید کا قتل صرف ۳۵ سال کی عمر میں ہوا اور اپنے آبائی امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ نے تاریخ قتل ۲۲ ربیع الآخر ۱۲۹۳ھ لکھی ہے جو عیسوی تقویم کے حساب سے سہ شنبہ ۱۸ مارچ ۱۸۳۶ء ہوتی ہے

دنیا کے شعر و سخن کا یہ آفتاب درخشاں اپنی جلوہ سامانی کے [illegible] عمر کے نصف النہار پر پہنچ کر ایک قبر کے گوشے میں غروب ہو گیا۔ [illegible]

خاک میں کیا (ہستیاں) ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

# حضرت غفرانمآبؒ کا حصولِ علم کا ذوق وشوق

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی "ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

"(حسن رضا خاں وزیر اعظم کے کہنے سے) نواب (آصف الدولہ) نے (حضرت غفرانمآبؒ کو) پانچ ہزار روپیہ دیے اور ہندوستان کا یہ فلسفی علم دین حاصل کرنے کے لیے باب مدینۃ العلم کی طرف روانہ ہوا۔ بمبئی پہنچ کے بادبانی جہاز میں بیٹھے۔ مشہور ہے کہ پندرہ دن کی مسافت طے کی تھی کہ باد مخالف کا طوفان اس زور سے آیا کہ ناخدا بادبان بچا نہ سکا۔ مخالف ہوا بھری اور تیسرے دن ساحل بمبئی پر لا کھڑا کیا۔ مگر دیوانہ ہمت اور جواں مردانہ عزم کف بردہان سمندر کو ٹھکرا کے پھر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ اب کی سمندر مغلوب اور بیڑہ پار تھا"۔ (ص ۵)

آگے لکھتے ہیں کہ (نجف اشرف پہنچ کے حصول علم کا آغاز کیا)۔ اس وقت نجف اشرف کی یہ خصوصیت مشہور تھی "خبز الشعیر، لحم البعیر، زیارت الامیر" یعنی جو کی روٹی، اونٹ کا گوشت اور امیر المومنینؑ کی زیارت۔

اونٹ کا گوشت تو کبھی کبھی ملتا ہوگا۔ نمک اور رطب سے روٹی کھائی جاتی تھی۔

یہ تھا حصول علم کا ذوق وشوق جس نے مولوی دلدار علی صاحب کو برصغیر میں شیعیت کا محسن اعظم اور مجدد ملت اثنا عشریہ کا اعزاز بخشا اور انتقال کے بعد امجد علی شاہ بادشاہ اودھ نے ان کو غفرانمآب کہنا اور لکھنا شروع کیا۔

استاذ الاساتذہ حضرت فقر اجتہادی لکھنوی

(نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ)

۱۸۵۱ تا ۱۹۰۹ء

حضرتِ فاخر اجتہادی لکھنوی

تصویر ساحر لکھنوی کی ملک

کے لیے کوئی ایسی عبارت نہیں لکھتا۔ دوسرے اس سے ان کی مذہبی سوچ اور دینی کردار بھی
کھل کے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی مادحِ ابوعبداللہ الحسینؑ سے صاف ظاہر ہے کہ مداحیٔ محمدؐ
وآلِ محمدؐ ان کی زندگی کے مقاصد میں سے ایک نہایت عمدہ مقصد اور ان کی سیرت کے
پاکیزہ پہلوؤں میں سے ایک نمایاں پہلو تھا جس کا بین ثبوت ان کی مرثیہ گوئی ہے۔ پھر زائرِ
شہنشاہِ کونینؑ کہنا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے مقاماتِ مقدسہ اور عتباتِ عالیات
کی زیارتوں کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ یہ بھی ان کی زندگی کا ایک بہت اہم گوشہ ہے۔ ایسی
باتیں جھوٹ موٹ نہیں لکھی جا سکتیں۔ اس عبارت کے دوسرے القاب وآداب بھی اپنے
اندر صداقت رکھتے ہیں مگر ان کا ذکر ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔

## حضرتِ فاخرؔ کا نام ونسب:

اسم گرامی سید اصغر حسین، تخلص فاخرؔ ابن مولانا سید باقر حسین صاحب اعلی اللہ
مقامہ ابن عمدۃ الدین زین العلما مولانا سید علی حسین صاحب طاب ثراہ ابن سید العلماء
مولانا سید حسین صاحب جنت مکان ابن مولانا سید دلدار علی صاحب غفران مآب علیہ الرحمہ
ورضوان ہے۔ سلسلۂ نسب امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے اور پھر ائمہ معصومین علیہم
الصلوٰۃ والسلام کے واسطوں سے سیدۃ نساء العالمین جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بنت رسول اللہ
تک اور رسولؐ کا شجرہ نسب کسے نہیں پتا ہے۔

خاندانِ اجتہاد کا فرد فرید ہونا خود ایک بڑا شرف اور عزت و اعزاز کا سبب ہے۔

## حضرتِ فاخرؔ کی ولادت:

حضرت فاخرؔ کی تاریخ ولادت کہیں درج نہیں ہے البتہ ان کی لوحِ مزار پر تاریخ
ولادت ووفات دونوں درج تھیں۔ وہ اپنے آبائی امام باڑہ جنت مآب و غفران مآب لکھنؤ
میں دفن ہوئے تھے۔ آج سے کوئی پچیس برس پہلے امام باڑہ کی تعمیر نو کے سلسلے میں
قبروں کے پتھر ہٹا دیے گئے تھے ورنہ ایک جگہ ان کو محفوظ رکھ دیا گیا تھا۔ اب ان میں

ہیں۔ ان سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

## ازدواجی زندگی:

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فاخر صاحب کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ ننھیال اور ددھیال دونوں کا سلسلہ حضرت غفراں مآب سے مل جاتا ہے۔

خاندان اجتہاد کے تعارف میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ خاندان ایسٹ انڈیا کمپنی کا باغی خاندان تھا۔ اس لیے کمپنی کے تسلط کے بعد اس خاندان کے گھروں کو کھود کر وکٹوریہ سٹریٹ نکالی گئی۔ اب اس کا نام لکشمی بائی مارگ ہے۔ ان حالات میں خاندان کا بڑا حصہ ملک بدر ہو کر امام سید الشہداؑ کی کربلا پہنچ گیا، وہیں رہا اور وہیں خاک ہو کر خاک شفا میں مل گیا۔ اس حزب اللہ میں حضرت فاخر کے دادا بھی تھے۔ اس سلسلہ سے آپ بھی اٹھارہ سال عراق میں مقیم رہے۔ یہ وہ عہد تھا جس میں نواب اقبال الدولہ، نواب تاج محل صاحبہ اور بہت سے معززین بہ سلسلہ ہجرت یا بہ رشتۂ زیارت امام سید الشہداؑ سے وابستہ تھے۔ [illegible] (لکھنؤ) سے بڑے ذریعے سے ہوئے تھے اور لکھنؤ کے خصوصیات عراق میں رونما ہو رہی تھیں۔ عربی و فارسی زبانوں کے ہجوم میں عروس اردو بھی لکھنؤ سے جلوہ نما رہی تھی۔ مشاعرے مقدس مقام کے اعتبار سے ممنوع و رسالے ہر جلسہ میں ہوتے تھے۔ حضرت فاخر مرحوم نے اپنے ایک مرثیہ میں کربلائے معلی میں بود و باش اور وہاں کے مناظر نظم فرمائے ہیں مگر افسوس کہ وہ مرثیہ دستیاب نہیں ہے۔

خاندان اجتہاد کی اس وفاداری کے سلسلہ میں خاندان شاہی نے ان کو اپنے میں جذب کرنا چاہا اور نواب تاج محل کی نواسی سے حضرت فاخر کا عقد ہو گیا۔ یہ معظمہ حضرت غفراں مآب کے پوتے مولوی سید کلب حسین صاحب کی نواسی، حضرت ماہر کی بھتیجی اور حضرت فاخر کے سگے چچا مولوی سید جعفر حسین صاحب کی دختر نیک اختر تھیں اور اس طرح وہ فاخر صاحب کی سگی چچا زاد بہن بھی تھیں۔ لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی نے بھی حضرت فاخر کی اس شادی کا ذکر حضرت ماہر کے بارے میں اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اس عقد کے

نتیجہ میں حضرت فاخر کو بیس لاکھ روپیہ نقد اور جواہر و ظروف طلا و نقرہ کا ایک انبار حاصل ہوا (''سحاب'' لکھنؤ مورخہ ۲۲ر فروری ۱۹۵۰ء) یوں اس عقد سے خوش نصیبی نے ان کے قدم چومے اور اس دولت مندی کی وجہ سے وہ نواب کہلائے۔ ان کی اولاد بھی اس لقب سے متصف ہوئی۔

اولاد:

حضرت فاخر کی ان اہلیہ معظمہ سے تین اولادیں ہوئیں۔ ایک صاحب زادے منور آغا مرحوم نے خورد سالی میں انتقال کیا۔ تیسری اولاد کی ولادت میں مولود اور ماں دونوں کا انتقال ہو گیا اور کربلائے معلی میں مقبرہ تاج محل میں مدفون ہوئے۔ صرف ایک صاحب زادے نواب مولوی سید نور حسین صاحب عرف آغا جانی صاحب زندہ رہے۔ انھوں نے تقریباً تین پینتیس سال کی عمر میں ۱۹۱۸ء میں یعنی حضرت فاخر کے انتقال کے نو برس بعد انتقال کیا اور امام باڑہ غفران مآب کے وقف خاص کے دوسرے حصہ میں پختہ مقبرہ میں دفن ہوئے۔

نکاح ثانی سے حضرت فاخر کے دو بیٹے مولوی سید مظہر حسین صاحب عرف چھمن صاحب اور مولوی سید نثار حسین صاحب تھے اور نکاح ثالث سے دو بیٹیاں تھیں۔

نکاح اول سے حضرت فاخر کے فرزند ارجمند نواب مولوی سید نور حسین صاحب کے تین بیٹے زوجہ اولی سے نواب مولوی سید اختر حسین صاحب مصور، راقم الحروف ساحر لکھنوی کے والد گرامی اعلی اللہ مقامہ اور زوجہ ثانی سے نواب سید افسر حسین صاحب ایڈوکیٹ اور نواب سید اظفر حسین صاحب کے علاوہ ایک بیٹی تھیں۔ افسوس کہ اب ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔

حلیہ:

مولانا سید محمد باقر صاحب شمس نے ''پنج آہنگ'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت فاخر صورت شکل، شان و شوکت اور وجاہت میں نوابوں سے بھی آگے تھے''۔ (ص ۱۲۱)

حضرت فاخر کی جو تصویریں میرے پاس ہیں اور شاید میں انھیں اس کتاب میں شامل کرسکوں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مردانہ وجاہت کا ایک جاذبِ نظر مرقع تھے۔ ان کی جوانی کی تصویر جو ان کے قیامِ عراق کے دوران کھینچی گئی ہوگی اس لیئے کہ عربی لباس میں ہے اس سے دبدبہ اور صولت نمایاں ہے۔ دراز قد اور متناسب حد تک بھاری بھرکم جسم، بشرے سے شرافت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری تصویر جو بعد کی عمر کی ہے اس میں نوابی شان سے نہایت قیمتی لباس زیبِ جسم کیئے ہوئے، ہاتھوں میں بیش قیمت نگینوں کی انگوٹھیاں اور مرصع نیام میں جڑاؤ قبضہ کی تلوار جس میں جڑا ہوا ایک ایک نگینہ آج کے حساب سے کئی کئی لاکھ روپیہ مالیت کا۔ پوری تصویر سے رئیسانہ شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے مگر جوانی کے مقابلہ میں دبلا پتلا چھریرا جسم۔

## حضرت فاخر کی سیرت، حسنِ اخلاق اور جود و سخا وغیرہ:

لسان الشعراء مولوی سید [illegible] حسین صاحب ہفت روزہ [illegible] میں لکھتے ہیں

"دولت وہ خراب شے ہے جو ایمان و خصوصیت سے چھپا دیتا ہے اور دولت والے (الا ماشاء اللہ) دیندار نہیں رہتے۔ حضرت فاخر جو خاندانی اعتبار سے مولوی اور حالات کے اعتبار سے دولت مند تھے اس دوراہے پر کبھی راہ نہیں بھولے۔" (ہفت روزہ [illegible] ۲۲ [illegible] ۱۹۵۰ء)

مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے "تاریخ لکھنؤ" میں لکھا ہے

"نواب اصغر حسین صاحب فاخر، ماہر صاحب کے بھتیجے بہت دولت مند، لکھنؤ کے تلامذہ میں تھے......... خاندانی اثر سے تقوے اور پرہیز گاری کا مجسمہ تھے۔ کبھی ان کی زبان سے جھوٹ نہیں سنا گیا۔"
("تاریخ لکھنؤ" ص ۲۶۲)

"حضرت فاخر بہت مذہبی شخص تھے۔ مناہی و منکرات و محرمات شرعی سے ہمیشہ دامن کش رہے۔ حد یہ ہے کہ کنکوے بازی کا شوق تو تھا مگر ایک

اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ (ص ۲۹۰)

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے اپنی کتاب 'پنج آہنگ' میں لکھا ہے:

"وہ (حضرت فاخر اور دیگر روسائے خاندان اجتہاد) نوابی کی شان پیدا کرنے پر تو روپیہ ضرور صرف کرتے تھے لیکن نوابوں کی طرح دوسرے لہو و لعب اور نامشروع باتوں پر ان کی دولت صرف نہیں ہوتی تھی"۔

(پنج آہنگ، ص ۱۲)

حضرت فاخر کی سیرت کے ایک خاص پہلو کے متعلق حضرت شمس کے حوالے سے یہ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سنا گیا۔ اسی صفت کی بنا پر وہ صادق اللہجہ مشہور تھے اور اس کا اعتراف قوم سے آگے بڑھ کر حکومت تک پہنچا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کا مشہور مقدمہ کوتوال گنیش پرشاد صرف آپ کی گواہی پر سزایاب ہوا۔ جج نے آپ کی صداقت پر فیصلہ کا دارومدار رکھا۔

## حضرت فاخر کی عزت و عظمت و احترام
### حکومت اور حکومت کے اہل کاروں کی نظر میں

حضرت فاخر کے زمانہ میں نوابین و روسا و شرفا کا یہ طریقہ تھا ہی نہیں کہ حکومت کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کریں اور اہل کاران حکومت کی نظروں میں اپنا بھرم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ اپنی شرافت، عزت نفس اور خودداری وغیرہ کی بناء پر حکومت کی نظر میں آ جاتے تھے ان کا مقام خود بخود بن جاتا تھا۔

گنیش پرشاد کوتوال کے مقدمہ میں عدالت کے جج کا حضرت فاخر کی گواہی پر اعتبار خود یہ بتاتا ہے کہ حکومت کی نظروں میں ان کی کتنی عزت و عظمت تھی۔ اب ایک واقعہ اور دیکھیے:

بھائی تھے وہ بھی تعلیمی سہولت کے لیے حضرت فاخر ہی کے سایۂ عاطفت میں رہتے تھے اور زبجی سے حیدر گنج قدیم تک روزانہ بغرض تعلیم تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اس ذوق و شوق کا جو صلہ قدرت نے عطا فرمایا وہ ان کو منبروں پر دیکھنے والے بھول نہیں سکتے۔ حضرت شمس مدظلہ العالی نے بھی "شخ آہنگ" میں لکھا ہے کہ خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ کی علمی زندگی انھیں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھی۔ (ص ۱۲۱)

دیگر اہل علم و ادب کے علاوہ خاندان کے بھی بہت سے حضرات کی اس گھر سے خصوصی وابستگی تھی۔ خاندان وغیرہ خاندان کے متعدد حضرات اس خصوصی وابستگی کی بناء پر حضرت فاخر کے ساتھ مستقل طور پر قیام پذیر تھے۔ لسان الشعراء حضرت شاعر نے متعدد ایسے حضرات کے نام بھی لکھے ہیں مگر ان کا یہاں علاوہ ضروری نہیں ہے۔

## سخاوت وسیر چشمی:

حضرت فاخر کو خداوند عالم نے جتنی دولت سے نوازا تھا اتنی ہی سخاوت و سیر چشمی بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرت شاعر اعلی اللہ مقامہ نے لکھا ہے کہ وہ بہت سخی تھے اور خاندان وغیرہ خاندان حضرات کی امداد پوشیدہ کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت فاخر کی سیر چشمی سے متعلق "...باب" میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک مجلس میں حضرت فاخر مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ زمرد کا نگینہ جو انگوٹھے کے ناخن کے برابر تھا (اور آج کل کے حساب سے ہزاروں روپیہ مالیت کا ہوگا) ہاتھ کے جھٹکے سے انگوٹھی سے جدا ہو کر زیر منبر ایک بزرگ کی گود میں جا گرا۔ آپ نے دیکھا اور منھ پھیر لیا۔ فرماتے تھے کہ امام حسین نے دیا ہے تو میں واپس لینے والا کون۔

مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ "تاریخ لکھنؤ" میں لکھتے ہیں

"حضرت فاخر بے شمار خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ مرزا سلیمان قدر کے ہم عصر تھے۔ ان کا مکان ان کی اولوالعزمی اور فیاضی کی یاد دلاتا ہے۔ ان کی داد و دہش اور فیاضیاں زبان زد ہیں۔ مصاحبین کے علاوہ شعراء اور صاحبان

حاجت ان کو ہر وقت گھیرے رہتے تھے"۔

("تاریخ لکھنؤ" ص ۳۱۹ از مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ)

## مشاعرے.

حضرت فاخر خود شاعر تھے اور شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ شریعت کی پابندی کی وجہ سے ان کی تفریحات محدود تھیں اس لیے ان کی تفریح کا بہت بڑا ذریعہ مشاعرے تھے۔ مشاعرے ہماری تہذیب کی اعلیٰ اقدار کا ایسا نمونہ تھے جو اب دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ بے شک مشاعرے آج بھی ہوتے ہیں مگر ان میں اب ہماری تہذیبی قدروں کا بدلا عکس بھی نظر نہیں آتا جو آج سے تیس چالیس سال پہلے اپنے عروج پر تھیں۔ شاعر مصرع پڑھتا تھا اور سارا مشاعرہ مصرع دہراتا تھا۔ درمیان خواندگی میں بولنا یا آنا جانا سخت ممنوع تھا۔ مشاعرہ میں بیٹھ کر حقہ، مشاعرہ ختم ہونے تک پینا وضع داری کے خلاف تھا۔ شاگردی کا لحاظ کئی پشت کیا جاتا تھا۔ حضرت ماہر حضرت اسیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ اسی نسبت سے حضرت ماہر، فاخر، ذاکر حضرت تیر صاحب سے ادب سے پڑھنے کی اجازت لیتے تھے۔ شاگردی کے سلسلے سے خاندان بن جاتا تھا۔ حضرت امجد شاگرد اسیر اور امیر مینائی اور ان کے تمام شاگرد ایک سلسلے کے مانے جاتے تھے عمر کا لحاظ کیا جاتا تھا۔

## میزان اور معیار پارٹی:

لکھنؤ میں نئے اور پرانے شعرا پر مشتمل دو انجمنیں میزان پارٹی اور معیار پارٹی کے نام سے قائم ہوئیں۔ میزان پارٹی میں جلال، ماہر، فاخر، باقر، رشید، عارف، انجم، فصاحت، شہرت، ذاکر، افضل، قمر، نصرت، یکتا اور رضا [illegible] وغیرہ شامل تھے مگر دونوں پارٹیوں میں دونوں طرف کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ میزان پارٹی کا پہلا مشاعرہ حضرت فاخر مرحوم کے مکان واقع پاٹانالہ پر ہوا جس کا ہر شعر [illegible] اور حسن معنی سے لبریز تھا۔

## ایک مشاعرہ کا عجیب واقعہ:

لسان الشعراء مولانا واجد حسین صاحب عرف مولوی لعن صاحب شاعر مرحوم نے
ہفت روزہ سحاب لکھنوی ۸ تا ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں حضرت فاخر کے حالات میں
ایک مشاعرہ کا عجیب واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"انہیں مشاعروں میں سے ایک مشاعرہ نواب ذاکر علی خاں صاحب
مرحوم کے امام باڑہ متصل نوریہ اسٹریٹ میں ہوا جس میں حمام ہے۔ اس
مشاعرہ کو عارضی طور پر بڑے تکلف سے سجایا گیا تھا۔ فرش جھاڑ کنول الٰہ
مردنگ شامل تھے۔ بدقسمتی سے اس مشاعرہ میں دو شاعر (جن کا نام لینا
ترک ادب ہے اور دونوں ہی کا انتقال ہو چکا ہے) پیچھے سے بھی بیٹھے
تھے۔ ایک نے دوسرے پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ ہمارے مشاعرہ میں
غیر طرح کا دستور نہ تھا۔ جب ان بزرگ کی باری آئی جن پر اعتراض ہو چکا
تھا تو انھوں نے اپنے استاد سے فرمایا کہ میں نے طرح میں غزل تو کہی نہیں۔
استاد نے فوراً اجازت دے دی کہ پڑھا غیر طرح کی۔۔۔۔۔۔۔۔ ان معظم
نے اپنا چار ہاتھ لمبا دیوان کھول کر اس خاک زمین میں قافیہ "سیاب و نایاب"
ردیف "ہوئے" کی غزل شروع کر دی۔ جب زیر بحث شعر کی باری آئی تو
فرمانے لگے: اب وہ شعر پڑھتا ہوں جس پر بعض جاہلوں نے اعتراض
کیا ہے۔ ہم میں سے کسی کو معلوم تھا کہ روئے سخن کس طرف ہے۔ سب ان
کا شعر سننے میں مصروف ہوئے۔ یہ مصرع پڑھتے تھے ۔۔۔۔۔۔

تصویر زلف جاناں

ہماری قبر میں مار عذاب ہو کے پھری

اس شعر کے پڑھتے ہی اصل مخاطب جو پیچھے بیٹھے تھے بڑے زور
سے تعریف فرمانے لگے: کیا خوب شعر کہا ہے ۔۔۔۔ ہماری قبر میں مار۔

مشاعرے میں بڑی کامیابی کے ساتھ پڑھی تھی۔ مقطع سے پہلے اس کے آخری شعر میں حضرت عارف نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ دانش صاحب کا بھی یہ کہنا ہے کہ حضرت عارف، حضرت فاخر کے یہاں مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے تھے۔

اشکِ خونیں میں سدا سرخ ہے دامن میرا
تازہ رہتا ہے ہر اک فصل میں گلشن میرا

شیشہ بالفرض بنے گر دلِ روشن میرا
تو کبھی آئینہ دیکھے نہ وہ دشمن میرا

ہو کے بیزار جو وحشت میں چلا وادی سے
شوق سے تھام لیا کانٹوں نے دامن میرا

صرفِ مدحِ اسد اللہ ہوں، کہتا ہے قلم
یہ سبب ہے کہ نیستان ہوا مسکن میرا

چارہ جو بھی یہی آزار رساں بھی ہے یہی
یہی دل دوست ہے میرا، یہی دشمن میرا

قبر پہ اس کی پئے فاتحہ وہ آئیں گے
لحدِ غیر کے نزدیک ہو مدفن میرا

قیس کہتا تھا کہ وحشت سبب عزت ہو
پردۂ محمل لیلیٰ ہو جو دامن میرا

دل میں رہ کر مرے اس بت کو ہوا ہے یہ غرور
آج کل خانۂ اللہ ہے مسکن میرا

چھوٹ کر قید سے پھر اس کو بساؤں صیاد
برق نے چھوڑ دیا ہو جو نشیمن میرا

اک سوا میرے نہ نکلے گا ترا دوست کوئی
اک سوا تیرے نہ ہوگا کوئی دشمن میرا

نام روشن نہ ہوا خلق میں جیتے جی تمھیں
جب تلک خاک میں گھل کر نہ ملا تن میرا

بن کے دیوانہ میں کہہ جاؤں گا حرفِ مطلب
منھ ہی تکتا ہوا رہجائے گا دشمن میرا

درِ محبوب ہو یا راہ گزارِ محبوب
لاش تھم جائے جہاں، ہو وہی مدفن میرا

مجھ کو ایذا سے جو مانوس ذرا پایا ہے
کانٹے ہاتھوں سے نہیں چھوڑتے دامن میرا

فاتحہ آ کے کسی قبر پہ پڑھ دیجیے گا
پوچھیے گا نہ مرے غیر سے مدفن میرا

فاتحہ پڑھنے وہ آتا ہے، یہاں کوئی نہیں
بے کسی تو ہی بتا دے اسے مدفن میرا

کہہ لیے حضرت فاخر کی خوشی سے چھ شعر
شاعری گو کہ حقیقت میں نہیں فن میرا

آتشِ رشک کی تاثیر کہوں کیا عارف
بے جلائے ہوئے جلنے لگا دشمن میرا

کتاب میں ان کے ایک ملازم کا کردار ہے جو انتہائی درجہ کا احمق اور دیہاتی قسم کا آدمی ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کردار زیب داستان کے لیے تخلیق کیا ہے تاکہ قارئین کے لیے تھوڑا دلچسپی کا سامان مہیا کیا جائے مگر آگے چل کر ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک حقیقی کردار ہے جس کے حوالے سے انھوں نے حضرت فاخر کے یہاں کا واقعہ لکھا ہے۔ حضرت مہذب کے مطابق یہ حضرت پہلے نواب غضنفر حسین صاحب مرحوم کے یہاں ملازم تھے۔ ان کی حماقتوں کی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ حضرت مہذب کے دوست کی زبانی ہے:

"نواب غضنفر حسین صاحب مرحوم ایک دن ایک شادی میں شرکت کی غرض سے تشریف لے جانے والے تھے۔ انھوں نے (ملازم) سے پوچھا کہ کپڑے ہیں۔ انھوں نے (ملازم) جواب دیا۔ جی ہیں جو پہنے ہوئے ہیں۔ وہ کپڑے اچھے نہ تھے۔ نواب صاحب مرحوم نے اندر جاکر ایک جوڑا عمدہ صاف دھلا ہوا بھجوایا یعنی نینون کا کرتا، پاجامہ، ٹوپی، تنگی جامدانی کی اچکن۔ انھوں (ملازم) نے نہا دھو کے صاف صاف کپڑے پہنے۔ بعد مغرب جب نواب صاحب فنس پر سوار ہو کے روانہ ہوئے تو یہ سواری کے ساتھ چلے۔ راستہ میں انھیں (ملازم) یہ خیال پیدا ہوا کہ پاجامہ ہے۔ گرد اور مٹی سے خراب ہو جائے گی۔ پاجامہ اتار کے گھٹنوں تک اونچا ہو گیا۔ اسی طرح محمد زئی برات میں پہنچ گئے۔ نواب صاحب مرحوم فنس سے اتر کے محفل میں تشریف لے گئے۔ بڑی شان دار بارات تھی۔ بہت دھوم دھام تھی۔ تمام رؤسا و شاہزادگان مدعو تھے۔"

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ میں نے اس واقعہ کو حضرت فاخر کے یہاں کا واقعہ اس لیے کہا کہ اس زمانے میں لکھنؤ کی دوسری شخصیت ایسی نہ تھی جس کے ملازمت ہوں اور جس کے یہاں کی شادی میں رؤسا اور شاہزادگان مدعو کیے جاتے ہوں۔ مگر اس واقعہ میں چونکہ

## حضرت فاخر کا مجالسِ عزا میں انہماک و اہتمام:

حضرت فاخر شیدائے حسین تھے۔ مجلسیں بڑی شان سے کرتے تھے جن میں حسب
دستور پر تکلف حصہ تقسیم ہوتا تھا۔

۱۲ محرم سے ۲۲ محرم تک پٹے نالے والے محل میں عشرہ مجالس منعقد ہوتے تھے۔
آخری ذاکر جناب مرحوم و مغفور مولوی محسن صاحب ہوتے تھے۔ فصل کی مناسبت سے
شربت کے بہت بڑے پیالے یا چوسے تقسیم ہوتی تھی۔ صفدر خان مرحوم نواب تاج محل
صاحبہ کے ملازم خاص چوسے بناتے تھے۔ یہ چوسے مشہور تھی۔ ایک پیالی کے بعد انسان غذا
سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔ زبدۃ العلما مولانا سید آغا مہدی صاحب "تاریخ لکھنؤ" میں لکھتے
ہیں کہ پبلک اس چوسے کی تعریف میں یہ کہتی تھی کہ چوسے میں اس قدر دودھ اور بالائی گاڑھی
کہ تنکا کھڑا ہو جائے اور شربت اس کثرت سے کہ پٹے نالے کے دھوبی اپنے بیل تک کو
پلائیں۔

ایام عزا کے علاوہ بھی مجلسیں پٹے نالے والے محل میں ہوتی تھیں جن میں حضرت
فاخر اپنا مرثیہ خود پیش کرتے تھے۔ ہفتوں پہلے سے قبل ہند حضرت فاخر پٹے نالے
والے محل سے خرموں کی بڑی بڑی کاغذی ہانڈیاں حصہ میں روانہ فرماتے رہتے تھے۔

اس کے علاوہ ہر پنجشنبہ کو فاخر صاحب کی طرف سے ان کی کوٹھی میں مجلس ہوتی تھیں
جن میں ان کے فرزند ارجمند نواب مولوی سید انور حسین صاحب اور حضرت فاخر کے بھتیجے
صاحبزادے مولوی سید محمد حسین صاحب عرف مولوی لعن صاحب شاعر مرثیے
پڑھتے تھے پھر زور و شور کا ماتم ہوتا تھا۔

عزاداری کی ان مجلسوں کے علاوہ پنج محرم کو حضرت فاخر کی طرف سے [illegible] کی سے
بڑی شان و شوکت سے ایک علم اٹھتا تھا۔ اس علم کی وہاں بھی بڑی اہمیت تھی کہ زندگی سے
امین آباد تک اس علاقے میں کہیں عزاداری نہ تھی۔ حضرت گنج انگریزوں کی چراگاہ تھا۔ اس علم [illegible]

ذی الحجہ سے گھوڑا یوں رام ہو جاتا تھا کہ بچے لجام تھام لیں تو سر جھکائے ساتھ ہوتا تھا۔

جناب مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ مرحوم نے تاریخ لکھنؤ میں اس جلوس کی تاریخ چھ محرم لکھی ہے مگر لسان الشعرا مولانا اولاد حسین عرف موسوی للن صاحب شاعر کا مندرجہ بالا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حضرت فاخر کے یہاں کی مجلس میں خود شریک ہوتے تھے اور مرثیے بھی پڑھتے تھے بلکہ ان کا قیام ہی حضرت فاخر کے ساتھ تھا۔ اس اعتبار سے ان کی اطلاعات زیادہ معتبر کہی جا سکتی ہیں۔

## حضرتِ فاخر کی شاعری:

حضرت فاخر ایک نہایت بلند پایہ شاعر تھے اور اساتذہ لکھنؤ میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ ایسی تفریحات میں حصہ نہیں لیتے تھے جو شرعی محرمات کی زمرہ میں آتی ہوں۔ اس لیے شاعری ان کی ہمہ وقت تفریح کا ذریعہ تھی۔ انھوں نے غزل، سلام، نوحے، رباعیات، قطعات، قصائد اور مرثیے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان اصناف میں انھوں نے ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا جو امتداد زمانہ سے بیشتر تلف ہو گیا۔

## مرثیہ گوئی:

حضرت فاخر کے مذہبی مزاج اور امام حسین سے ان کی عشق کی حد تک عقیدت کی وجہ سے ان کا زورِ سخن مرثیوں میں زیادہ نمایاں ہے۔

وہ لکھنؤ سے باہر بھی مرثیے پیش کرنے تشریف لے جاتے تھے۔ اس طرح ان کی مرثیہ گوئی کی شہرت دور دور تک تھی۔

ان کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ قابل ذکر ہے

ایک مرتبہ حضرت فاخر نے کلکتہ، آگرہ اور دہلی وغیرہ کا تفریحی سفر فرمایا اور اسی سلسلہ میں حیدرآباد دکن بھی تشریف لے گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام فرمایا۔ ضامن عباس صاحب مرحوم جو مدتوں حضرت فاخر کے مصاحب رہے تھے انھوں نے راہ میں آپ کو دیکھ

مولوی سید اصغر حسین صاحب (فاخر)، جناب مہدی حسین صاحب (ماہر) جناب مولوی نذن صاحب (خورشید) اور قبلہ و کعبہ مولوی رضا حسین صاحب، عارف صاحب اور مرزا آغا علی صاحب طوبی اور چھ شاگرد حضرت نفیس کے پاس بیٹھے تھے کہ دولھا صاحب اندر سے باہر تشریف لائے۔ ان کے کان میں دُر پڑا ہوا، صغر سنی میں اس قدر حسین تھے کہ ان کا حسن مشہور تھا۔ آفتاب و مہتاب سا چہرہ دمکتا تھا، گالوں سے خون گویا ٹپکتا ہوا۔ جب تشریف لائے تو ان سب حضرات نے اس مجلس کی مدح کی اور جناب مولوی میر اصغر حسین صاحب تاج محل والے (حضرت فاخر) انھوں نے گلے سے لگایا اور عارف صاحب کی جانب مخاطب ہو کر کہا کہ اب تو یہ دل چاہتا ہے کہ کسی مقام پر ایک گھنٹہ کی نشست ہوا کرے۔ اس میں ہم آپ اور سب صاحب ہوں اور ہمارے دولھا صاحب بھی ہوں۔ شعر خوانی ہوا کرے تاکہ دولھا صاحب کی مشق بڑھے۔ سب نے اتفاق کیا۔ (ص۔۴۳)

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاخر اور میر نفیس و خاندان انیس کے دیگر افراد کے درمیان کس قدر پر خلوص محبت کے رشتے قائم تھے۔ دوسرے یہ کہ حضرت فاخر کی اس تحریک اور تجویز نے دولھا صاحب عروج کو مرثیہ خوانی کی مشق بڑھانے اور اس میں کمال حاصل کرنے کا یہ موقع فراہم کیا جس کے باعث دولھا صاحب کو اس فن میں وہ مقام و مرتبہ حاصل ہوا جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

## تعدادِ مراثی:

حضرت فاخر نے بے شمار مرثیے کہے۔ تعداد کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر اس وقت خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو حضرات میں سے سب سے زیادہ حضرت فاخر کے مرثیے دستیاب ہیں۔ خود میرے پاس ان کے جو مرثیے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

| نمبر شمار | مطلع | تعداد بند | حال |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | گردوں پہ جب ہلال محرم عیاں ہوا | ۱۵۴ | شہادت امام حسینؑ اور روایت جناب شہربانو |

| نمبر | مطلع | بند | موضوع |
|---|---|---|---|
| ۲۔ | آثارِ صبحِ قتل جو رن میں عیاں ہوئے | ۱۳۰ | حضرت ابوالفضل العباسؑ |
| ۳۔ | تاجِ زرِ مہرِ فلک نے جب اتارا سر سے | ۲۰۱ | حضرت حرّ |
| ۴۔ | مطلع ہو فزوں نیرِ تابانِ سحر سے | ۱۵۲ | شہزادہ علی اکبرؑ |
| ۵۔ | صدفِ گوہرِ مضمون ہے طبیعت میری | ۱۳۶ | حضرت ابوالفضل العباسؑ |
| ۶۔ | منزلِ غرب میں جب نیرِ تاباں آیا | ۱۰۰ | حضرت ابوالفضل العباسؑ |
| ۷۔ | براقِ ذہنِ رسا سوئے عرش جاتا ہے | ۱۵۵ | معراج وشہادت امام حسینؑ |
| ۸۔ | یا رب عطا ہو قوتِ جوشِ ولا مجھے | ۸۰ | جنابِ رسولؐ خدا |
| ۹۔ | پھر آج بحرِ طبیعت میں جوش آیا ہے | ۱۳۶ | شہادت امام حسینؑ |
| ۱۰۔ | سمندِ طبعِ رسا عرش کی جانب کو رواں ہو | ۱۰۲ | شہادت فرزندانِ حضرت مسلم و حضرت عونؑ و محمدؑ |
| ۱۱۔ | جب آفتابِ روزِ نہم رو نہاں ہو | ۱۹۰ | حضرت حرّ |
| ۱۲۔ | حجابِ لیل میں پنہاں جب آفتاب ہوا | ۱۵۲ | جنگ لیلۃ الہریر اور شہادت حضرتِ امام حسینؑ |
| ۱۳۔ | خزاں ریاضِ نبیؐ پر بہار میں آئی | ۱۵۲ | حضرت ابوالفضل العباسؑ |
| ۱۴۔ | خورشیدِ آسمانِ فصاحت کلام ہے | ۱۲۵ | شہزادہ علی اکبرؑ |
| | **مطلع ثانی** | | |
| | جب داغِ نوجوانِ شہِ والا اٹھا چکے | ۱۳۸ | حضرت امام حسینؑ |
| | | = ۲۲۶۳ | |
| ۱۵۔ | طورِ سخن مجھے ذکرِ شہدا سے ملا | ۲۴۰ | شہزادہ حضرت قاسمؑ |
| ۱۶۔ | ہے تاجِ حمدِ خدا راسِ افتخارِ سخن | ۱۵۸ | شہزادہ علی اکبرؑ |
| ۱۷۔ | فلک سے بھی ہے سوا اوج میں سحابِ سخن | ۲۱۳ | حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی مشترکہ جنگ فوجِ یزید سے اور حضرت عباسؑ کی شہادت |

حضرت فاخر کا یہ بہت زبردست اور بے مثل مرثیہ ہے۔ اس میں پانچ مطلع ہیں اور ایسے ایسے بند اور بیتیں ہیں جن میں زورِ سخن اپنے عروج پر ہے۔

زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ نے تاریخ لکھنؤ میں حضرت فاخر کے پانچ مرثیوں کے مطلعے لکھے ہیں جو ان کو یاد تھے۔ ان میں سے چار مطلعے تو مندرجہ بالا مرثیوں کے ہیں۔ ایک مطلع ایسے مرثیے کا ہے جو ان میں شامل نہیں ہے وہ حسب ذیل ہے

۱۸۔ جب رن میں قتل بنت علی کے پسر ہوئے — در حال حضرت قاسم

اس کے علاوہ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے ۲۴ اگست ۱۹۷۸ء کو مجھے ایک خط میں ان مرثیوں کے مطلعے لکھے تھے جو ان کے پاس تھے۔ ان میں سے تین مرثیے تو وہی ہیں جو میرے پاس بھی ہیں اور اوپر فہرست میں درج ہیں۔ حسب ذیل دو مرثیے ایسے ہیں جو میرے پاس نہیں ہیں

۱۹۔ اے باغبان طبع ریاض سخن دکھا — در حال حضرت علی اکبر

۲۰۔ یارب بہار میں کوئی گلشن خزاں نہ ہو — در حال حضرت علی اکبر

انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ مکان میں دریائے راوی کا سیلاب آنے کی وجہ سے یہ مرثیے ناقابل مطالعہ ہو گئے ہیں اگر محنت کروں گا تو وہ صاف ہو سکیں گے۔ اس کے جواب میں میں نے ان کو لکھا تھا کہ اگر وہ مرثیے مجھ کو بھیج دیں تو میں ان کو پڑھ کے صاف کرنے کی کوشش کروں گا مگر اس خط کا جواب مجھ کو نہیں ملا اور یہ دونوں مرثیے انھوں نے مجھ کو نہیں بھیجے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا

"آپ کے گھرانے سے میری دلچسپی گوناگوں اسباب کے باعث ہے۔ اس بیچ میں رثائی ادب کی طباعت و اشاعت کے ضمن میں مولوی مہدی حسین ماہر، اصغر حسین فاخر، مرزا صاحب خورشید، بندہ کاظم صاحب جاوید، محمد صادق عرف چھنن صاحب حسین (شیخ محمد صادق علی صاحب) اور حکیم

دوران اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے صاحب زادے سے مل کر اس سلسلہ میں بات کروں مگر بوجوہ ان تک رسائی نہ ہوسکی۔ آخر برادرم سید کلب باقر صاحب کے ذریعہ ان سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ناصری صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد کوئی صاحب مرحوم کا مرثیوں کا سارا ذخیرہ گٹھر باندھ کر لے گئے اور اب متعلقہ الماری بالکل خالی پڑی ہے۔ اسی طرح دوسرے مرثیوں کے ساتھ میرے بزرگوں کے مرثیے بھی کسی صاحب کی نذر ہوگئے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعرا کے مرثیے ناپید نہیں ہیں۔ مختلف لوگوں کے پاس مختلف جگہوں پر مرثیے موجود ہیں مگر ان کا علم نہیں ہے اور علم ہو بھی تو ان تک رسائی بھی بڑی حد تک دشوار ہے اور رسائی ہو بھی تو بعض حالات میں اور دشواریوں کے علاوہ عزت نفس کو مجروح کیے بغیر ان کا حصول ممکن نہیں۔

## تلمذ:

حضرت فاخر مرثیہ گوئی میں اپنے سگے چچا حضرت ماہر کے شاگرد رشید تھے اور ان کے تنہا شاگرد تھے۔ حضرت ماہر نے کسی اور کو اپنا شاگرد نہیں بنایا۔ حضرت فاخر نے بھی ان کی شاگردی کا حق ادا کیا یہاں تک کہ مرثیہ گوئی میں وہی حضرت ماہر کے جانشین قرار پائے۔

## مرثیہ گوئی میں حضرت فاخر کا مقام و مرتبہ:

اس میں شک نہیں کہ مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر رحمہم اللہ نے شاعری اور شہرت و ناموری کی جن بلندیوں پر قدم رکھا وہ کسی اور کو نہیں مل سکا۔ خود ان دونوں عظیم مرثیہ نگاروں کے خاندانوں میں اونس و نفیس جیسے مرثیہ گو بھی وہ مرتبہ حاصل نہ کر سکے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے بعد کوئی اور عظیم مرثیہ گو پیدا نہیں ہوا۔ ہر دور میں بڑے بڑے مرثیہ گو شاعر ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں شہرت و ناموری بھی حاصل کی اور رثائی ادب میں گراں بہا اضافے بھی کیے۔ ایسی ہی ذوات محترمہ میں حضرت فاخر کا نام

نامی اور اسم گرامی بھی شامل ہے۔ چنانچہ آغا صفدر حسین مرحوم نے ''رزم نگاران کربلا'' میں انیس و دبیر کے بعد ادب عالیہ کے نقش کی حیثیت سے حضرت ماجد اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے ساتھ حضرت فاخر کا اسم مبارک بھی درج کیا ہے۔

مرثیہ گوئی میں حضرت فاخر کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ ان کے عہد کے تمام مرثیہ گو شعرا کے مقابلے میں خاندان انیس میں سب سے زیادہ حضرت فاخر کا اعتبار و احترام کیا جاتا تھا اور میر نفیس اعلیٰ اللہ مقامہ ان کی مرثیہ گوئی کے بڑے مداح تھے۔ اس ذیل میں ایک واقعہ گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ جب حضرت فاخر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو بہرام الدولہ بہادر نے ان سے مرثیہ سننے کی فرمائش کی جس پر حضرت فاخر نے پوچھا کہ میری مرثیہ گوئی کی آپ کو کیسے خبر ہوئی تو انھوں نے جواب دیا کہ حضرت نفیس آپ کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی اور اہم بات ہے اس لیے کہ منھ پر تعریف کرنا کچھ اور ہوتا ہے اور پیٹھ پیچھے ہزاروں میل دور کسی کی تعریف کرنا اور اس طرح کہ سننے والے کو کلام سننے کا اشتیاق پیدا ہو جائے، یہ کچھ اور بات ہے۔ اسے خلوص اور قدر دانی کی انتہا کہہ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ لسان الشعرا امداد حسین صاحب شاعر لکھنوی نے ''سحاب'' میں لکھا ہے

> ''اس زمانہ میں لکھنؤ کا بچہ بچہ مرثیہ گو یا مرثیہ خواں تھا مگر خاندان انیس میں حضرت فاخر سے بڑھ کر کسی کا اعتبار نہ تھا۔ خدا مغفرت فرمائے حضرت نفیس فرزند حضرت انیس بھی شریک مجلس ہوتے تھے اور داد سخن دیتے تھے۔ مرثیہ میں رخصت ایک ایسا تنگ و دشوار گزار مرحلہ ہے جہاں مضامین کی پیداوار دشوار تر ہے۔ اس جگہ پر تاثیر اور نیا گوشہ نکالنا ناممکن ہے۔ ایک مرثیہ میں حضرت فاخر نے رخصت عون و محمد میں بیت فرمائی

بڑے دکھ درد اٹھا کے جو تھا پالا ان کو

ماں نے قرآن کے نیچے سے نکالا ان کو

حضرت نفیس مرحوم نے فرمایا کہ یہ گوشہ ہمارے خاندان سے رہ گیا تھا"۔

("سحاب" لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۵۰ء)

یہ واقعات حضرت فاخر کی مرثیہ گوئی کے مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لیئے کافی ہیں۔

## مرثیہ گوئی کا طریقہ:

حضرت فاخر کا قاعدہ تھا کہ نماز صبح کے بعد سے مرثیہ کہنا شروع فرماتے اور نو بجے دن تک اسی میں مصروف رہتے۔ نو بجے کوٹھی کے اگلے حصہ میں تشریف فرما ہو کر حضرت ذاخر و فاطر کو طلب فرماتے اور جتنا کہتے تھے اتنا ان دونوں کو سنا دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ دشمن کی نگاہ سے دیکھو۔ حضرت ذاخر ان سے بڑے بھائی اور عمر میں ان سے کافی چھوٹے تھے۔ حضرت فاطر یعنی ملک الناطقین خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ اس وقت حضرت ذاخر کے مقابلہ میں بھی کم عمر تھے مگر آغاز شاعری ہی سے حضرت فاخر کے شاگرد تھے اور حضرت فاخر ان کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاعر لکھنوی نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے:

"ایک مرتبہ لکھنؤ کے اس وقت کے استاد فن سید عباس حسن صاحب فصاحت مرحوم جو حضرت ذاخر (فاخر) ہی نہیں سارے خاندان کے گھر کے دوستوں میں تھے اس وقت آ نکلے۔ ان کو حضرت فاطر کی کم سنی اور حضرت فاخر کی چشم اعتبار و اعتماد میں مطابقت نظر نہ آئی۔ آپ نے فرمایا، میاں تم کو مدرسے سے مطلب، تم کو شعر سے کیا غرض، شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔ حضرت فاخر و ذاخر نے حضرت فاطر کی حمایت کی اور ان کی خداداد طبیعت کی مدح سرائی فرمائی۔ بات بڑھی اور آخر یہ ٹھہری کہ حضرت فصاحت مرثیہ کا حال اور بحر معین کریں اور اس کے مطابق حضرت فاطر مرثیہ کہیں۔ بحر مضارع اور تاراجی خیام کا حال طے ہوا۔ حضرت فاطر نے دو راتوں میں مرثیہ کہا جس کے صرف دو

مصرعے یاد نہیں۔ دنیا میں آ گئی ہے اور بے پردگی اہلبیت کا وقت قریب ہے۔ یہاں مصرعۂ ثانی یہ ہے

ہٹانا نہ تھا دھواں کہ کہیں سامنا نہ ہو

دوسرا مقام یہ ہے کہ ماں گرمئ رن دیکھ رہی ہے اور مادر حضرت علی اصغر دیکھ رہی ہیں۔

ماں دیکھتی تھی حق پہ بھروسہ کیے ہوئے
لٹتے تھے اپنے ہاتھ کے کُرتے سیے ہوئے"

("سحاب" لکھنؤ مورخہ یکم مارچ ۱۹۵۰ء)

## حضرتِ فاخر کے شاگرد:

حضرت فاخر کے بے تعداد شاگرد تھے جن میں مبتدی شعرا بھی تھے اور پختہ مشق بھی۔ ان کے شاگردوں میں سے کئی حضرات خود استادِ فن قرار پائے۔ اسی لیے حضرت فاخر، استاذ الاساتذہ کہا جاتا تھا۔ شاگردوں کی تعداد کا تعین ممکن نہیں ہے اس لیے کہ کسی تذکرہ میں ان کے شاگردوں کی کوئی فہرست شامل نہیں ہے۔ بس یہ لکھا ہے کہ ان کے سیکڑوں تلامذہ تھے۔ لسان الشعرا حضرت شاعر مرحوم نے چند خاص حضرات کے اسمائے گرامی اپنے مضمون مطبوعہ "سحاب" لکھنؤ میں درج کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

شہزادہ فیروز شاہ صاحب آمر فرزند شہزادہ بیدار بخت صاحب مرحوم، سید محمد رضا صاحب طاہر مرحوم، سید باقر حسین صاحب ناظم مرحوم، حکیم حیدر علی صاحب مرحوم، خلف المتقین خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب فاطر اعلی اللہ مقامہ، والد ماجد حضرت ناخر اعلی اللہ مقامہ وغیرہ۔

والد ماجد حضرت فاخر مرحوم ہی ان کے جانشین ہوئے اور انھیں سے حضرت فاخر کا نام روشن ہوا۔

## اصلاحِ سخن کا انداز:

حضرت شاعر کا فرمانا ہے کہ حضرت فاخر بے مثل اصلاح دیتے تھے۔ باقر حسین صاحب ناصر کے ایک شعر پر ان کی اصلاح یاد ہے:

وہ چپکے کرتے رہے جب تک مرا نامہ
نگاہ غور یاس سے دیکھا کیا کبوتر بھی

نگاہ غور کو آپ نے نگاہ یاس بنا دیا تھا۔ اس اصلاح سے یقیناً شعر بہت بلند ہو گیا۔

وہ مختار نامہ جو حضرت آخر و فاخر نے مل کر سات ہزار اشعار تک فرمایا تھا اور لسان الشعرا مولانا اولاد حسین صاحب عرف للّن صاحب شاعر نے گیارہ ہزار اشعار کا اضافہ فرمایا، اس میں جابجا سرخ روشنائی سے حضرت فاخر کی اصلاح موجود ہے۔

## خصوصیات کلام:

حضرت فاخر کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں بلندی تخیل اور حسن زبان دونوں نظر آتے ہیں۔ تصرف لفظی میں بات پیدا ہوتی ہے مثلاً تاریکی شب عاشور میں ان کا ایک مصرع ہے:

چراغ لے کے بھی ڈھونڈو تو روشنی نہ ملے

پہلوان جو مد مقابل حضرت علی اکبر کا ہے اس کے اسکے اس کے دشمن ہوتے ہیں۔

بیت ہے۔

جلے ہزار، پہ ناری کے دل کی آگ نہ جائے
قدم کو پکڑے تھے موزے کہ رن سے بھاگ نہ جائے

شمشیر کا عکس چار آئینوں میں پڑ رہا ہے۔ تشبیہ موزوں ملاحظہ ہو

چار آئینوں میں جب خون بھری جاتی ہے
ماہیِ سرخ تہِ آب نظر آتی ہے

اس طرح ایک مثال ساقی نامہ سے:

سکہ پڑا ہوا ہے دمِ ذوالفقار کا
دن کٹ گیا، یہ قول ہے نصف النہار کا

## حضرتِ فاخرؔ کے بعض مرثیوں سے کچھ اقتباسات:

اب مختلف اجزائے مرثیہ یا موضوعات کے اعتبار سے میں ان کے مرثیوں سے کچھ اقتباسات اختصار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

**منظر نگاری:** منظر یہ ہے کہ دن ختم ہوا اور رات آ گئی۔ رات کا منظر اور طائروں پر تاریکی کا اثر وغیرہ ملاحظہ کیجیے:

تاج زر پیر فلک نے جب اتارا سر سے
فوج انجم ہوئی برگشتہ شہِ خاور سے
ہوگئی محو شفق بھی فلکِ اخضر سے
چادرِ سرخ ہٹی روئے مہِ انور سے
چاندنی چھٹکی، زمیں نور سے معمور ہوئی
چشم مہتاب و کواکب کی رمد دور ہوئی

حسرت شرق کا مشرق سے وہ زائل ہونا
بہر ضو مہر سے وہ ماہ کا سائل ہونا
تیرگی کا طرف خاک وہ مائل ہونا
ظلمتِ شب سے پرندوں کا وہ قائل ہونا
سرمۂ لیل کو نغموں کا عدو جان گئے
بند آوازیں ہوئیں جب تو اثر مان گئے

رات بھر بند ہر ایک طیر کی آواز رہی
صبح تک حد سے سوا حسرتِ پرواز رہی
اپنے کردار سے بلبل نہ مگر باز رہی

شاہدانِ گل گلزار کی ہمراز رہی
ناز کرنے لگی معشوق پری رو کی طرح
حسنِ گل میں نہاں ہو کے رہی بو کی طرح

اثرِ ظلمت شب کا ہے سوا باغ میں غل
بال بکھرائے ہوئے خود ہے چمن میں سنبل
وہی کھٹکا نہیں گلچیں کا تو بے خوف ہیں گل
مطمئن رات کو دن سے ہے زیادہ بلبل
کردیا ترک اسی دھیان میں مسکن اپنا
دلِ غنچہ کو سمجھتی ہے نشیمن اپنا

اس کے بعد والے بند کی بیت ہے

پنچھیوں کے جلے دل سے شرارے نکلے مہر ڈوبا تو چمکتے ہوئے تارے نکلے

حسنِ تعلیل۔ تاروں کو پرندوں کے جلے دل کے شرارے کہنا کیا خوب صورت شاعرانہ تخیل ہے۔

اگلا بند

جلوہ افگن وہ سرِ شام ہیں تارے کیا کیا
چشمِ مہتاب کے ہوتے ہیں اشارے کیا کیا
طیرِ پرواز میں کرتے ہیں نظارے کیا کیا
لیلیٰ شب نے سیہ بال سنوارے کیا کیا

اور بیت ہے۔

تیرگی شب کی ہے گیسوئے پریشاں کی طرح
دلربا حسن ہے تاروں کا بھی افشاں کی طرح

ان بندوں میں منظر نگاری بھی ہے، تغزل کا حسن بھی اور پرندوں کے عادات و اطوار

کا مشاہدہ بھی۔

اسی مرثیہ کے بند ۹ سے منظر بدلتا ہے اور اب رات گزر کر صبح ہو رہی ہے۔ یہ منظر بھی ملاحظہ ہو:

رخت شب پیر فلک نے جب اُتارا بر سے
سرمۂ لیل گرا چشم مہ و اختر سے
ڈھل کے چادر بھی گری لیلیٔ شب کے سر سے
مہر تاباں نے نقاب الٹی رخ انور سے
فیضِ نورِ سحری سے جو زمیں چاند ہوئی
ذرے ذرے سے ستاروں کی ضیاء ماند ہوئی

کیا خوب صورت بند ہے اور شاعرانہ۔ مدلل و مکمل کا آئینہ دار ہے۔ سبحان اللہ۔

طیر شاخوں پہ تھے مصروف بذکر معبود
ملک و جن و بشر وجد میں پڑھتے تھے درود
ننھے ننھے وہ تجلی کواکب کے نمود
اور تاروں سے تھی ضو نجم سحر کی افزود

بیت ملاحظہ ہو:

اختر صبح فلک پر قمر آرا چمکا
پیر گردوں کے مقدر کا ستارا چمکا

سبحان اللہ۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔ کیا عمدہ منظر نگاری ہے۔

صبح کا نور سوا تھا نہ اندھیرا شب کا
اک دھندلکا سا تہ چرخ نظر آتا تھا
مہر کا کام نہ کچھ ماہ کی حاجت اصلا

تھے مگر وادیٔ ایمن کی طرح ارض و سما

خود بخود ٹھنڈی ہوا اک شمع بھی کافوری تھی

آسماں نور کا تھا اور زمیں نوری تھی

لطف کچھ اور سحر کا ہے میانِ دریا

کوہ و صحرا سے زیادہ ہے یہاں سرد ہوا

سب سے بڑھ کر ہے طلسمی یہ تماشا دیکھا

سبزۂ ضدین ہے دریا میں شفق سے پیدا

یہ بیت بھی ملاحظہ ہو

کانپتے ہیں صفتِ بید شجر پانی میں

آگ بھڑکی ہوئی آتی ہے نظر پانی میں

سبحان اللہ۔ (مطلب: [illegible])

ایک اور مرثیہ سے صبح کا منظر:

آثارِ صبحِ قتل جو رن میں عیاں ہوئے

کوکب تمام پردۂ شب میں نہاں ہوئے

آمادۂ نبرد جنودِ گراں ہوئے

مصروف یاں نماز میں شاہِ جہاں ہوئے

باجوں کا شور ادھر ہوا جنگی سپاہ میں

ڈنکا ہوا اذاں کا ادھر فوجِ شاہ میں

وہ نور اور وہ صبح وہ میدانِ پُرفضا

نالہ وہ طائروں کا وہ بلبل کا چہچہا

شبنم کی برگِ گل پہ چمک تھی وہ باصفا

شاخِ شجر پہ نالۂ بلبل کی وہ صدا
تختے کھلے وہ دشت میں باغِ نعیم کے
بارِ گراں تھے پھول پہ جھونکے نسیم کے

کیا کہنا۔ جزاک اللہ چھٹے مصرع میں نزاکت خیال کی داد نہیں دی جا سکتی۔

اس بند میں منظر نگاری کا حسن ملاحظہ ہو:

ٹھنڈی ہوا میں اڑتے تھے طائر ادھر اُدھر
سبزہ پہ لوٹی جاتی تھی میدان میں نظر
جھونکوں سے بادِ تند کے جنباں تھا ہر شجر
عکسِ شفق سے سرخ تھا صحرا بھی سر بسر
شبنم تھی برگِ گل پہ کہ عالم تھا آب کا
تختہ کھلا تھا صحنِ چمن میں گلاب کا

سبحان اللہ، ما شاء اللہ۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

وہ وقتِ صبح اور وہ طاؤس کی پکار
شبنم کے قطرے تھے کہ گہر ہائے آبدار
رفتارِ کبک ہوش اڑاتی تھی بار بار
وہ بوئے گل کہ جس پہ ہو مشکِ ختن نثار
کوسوں وہ بو سے دشت کا داماں بسا ہوا
گویا گلاب کا تھا قرابہ لنڈھا ہوا
(مطلع "آثارِ صبحِ قتل جو رن میں عیاں ہوئے" در حال حضرت ابوالفضل العباسؑ)

## مرثیہ میں حمد:

مرثیہ کا دامن بہت وسیع ہے۔ سارے اصنافِ سخن اس میں سمٹ کے آگئے ہیں۔ حمد و

نعت و منقبت سے لے کر غزل تک پھر بھی مرثیے کے حدود سے باہر نہیں۔ میں نے اپنے پہلے مرثیہ "مرثیہ، قطب شاہ سے ساحر تک" میں مرثیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اس میں غزل کا حُسن، قصیدے کی دلکشی
مدحت کی آن بان، عقیدت کی چاشنی
حمدِ خدا کا لطف بھی، نعتِ رسولؐ بھی
پھیلاؤ میں ہے نظم، تسلسل میں مثنوی
غم بھی ہے، بزم و رزم بھی ہے، ہمہمہ بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے، زمزمہ بھی ہے

(مرثیہ مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک)

مرثیہ کی اسی صفت سے فائدہ اٹھا کر اکثر مرثیہ نگاروں خصوصاً کلاسیکی مرثیہ نگاروں نے مرثیوں میں حمد و نعت و منقبت بھی نظم کی ہے۔ حضرت فاخرؔ نے بھی بعض مرثیوں میں ان اصناف سخن کو برتا ہے۔ یہاں ایک مرثیہ سے حمد کے چند بند ملاحظہ کیجیے جو مطلع تاباں سے شروع ہوتے ہیں۔ بند میں منظر نگاری کا حُسن ملاحظہ ہو

جلوہ افروز ہوا اخترِ تابانِ سحر
پنجۂ غم سے ہوا چاک گریبانِ سحر
مستعد نغمہ زنی پر ہوئے مرغانِ سحر
بڑھی سائل کے لیے وسعتِ دامانِ سحر
کیا رسا تھیں، گئیں تا عرش صدائیں ان کی
کیوں نہ مقرونِ اجابت ہوں دعائیں ان کی
فیض حق سے کوئی محروم نہیں رہتا ہے
مطلبِ دل کو تضرع سے کوئی کہتا ہے

بختِ بد کی کوئی سختی کا مزہ سہتا ہے
روز و شب ایک طرح بحرِ کرم بہتا ہے
ناخدا کشتیٔ کشکول سے غافل نہ رہا
زرِ حاجت سے تہی دامنِ سائل نہ رہا

کشکول کو کشتی سے تشبیہ دینا اور اس کی نسبت سے منعم کو ناخدا کہنا بڑا نادر خیال اور بالکل نئی بات ہے۔

حمد میں یہ بند اور خصوصاً چھٹا مصرع داد طلب ہے۔

بے طلب منعمِ فیاض سے کیا کیا نہ ملا
قطرہ چاہا جو کبھی، کب اسے دریا نہ ملا
دولتِ دیں نہ ملی یا زرِ دنیا نہ ملا
کب فقیروں کو سلاطین کا رتبا نہ ملا
حکم سے نارِ فروزندہ گلستاں ہو جائے
مہر اس کی ہو تو اک مور سلیماں ہو جائے

فیض ہوتا ہے سدا ابر کا گلزاروں پر
نظرِ لطف و شفا ہوتی ہے بیماروں پر
رحم کیا کیا نہیں کرتا ہے گرفتاروں پر
آنچ آنے نہیں دیتا ہے گنہگاروں پر
دور دم بھر میں کیا خیر کو شر سے کیسا
حُر کو آزاد کیا نارِ سقر سے کیسا

پورا بند خوب ہے مگر چوتھا مصرع اور بیت لاجواب ہے۔

(مرثیہ تاجِ زر پیرِ فلک نے جب اتارا سر سے)

ایک اور مرثیہ سے حمد کے چند بند ملاحظہ ہوں

ہے ذاتِ پاکِ خدائے جہاں وحید و فرید
قریب دیدۂ دل سے ہے، چشم سے ہے بعید
ہر اک جگہ ہے ظہورِ وجودِ ربِ مجید
بیان کیا ہوں صفاتِ خدائے پاکِ عبید

بیت ملاحظہ ہو:

نظارہ قدرتِ حق کا کرے، نظر کیا ہے
ملائکہ بھی ہیں عاجز یہاں، بشر کیا ہے

پورا بند قابلِ داد ہے مگر بیت۔ سبحان اللہ۔

حدوث کون و مکاں ہے بس ایک ہے وہ قدیم
دلیل اس پہ فنا و بقا کی ہے محکم
کہاں ہیں آج زمانے میں حضرت آدمؑ
کہاں ہیں نوحؑ و سلیمانؑ و موسیٰؑ اکرم
پیمبری کا جہاں میں شرف دیا ان کو
خدا نے خلق کیا اور فنا کیا ان کو

بند ملاحظہ ہو

ہے ایک وہ تو ہمیشہ سے اور رہے گا سدا
جہان ایسے بنا کر بگاڑے ہیں صدہا
ہے بے نیاز بھی ذات خدائے ارض و سما
خوشی کسی کی بقا کی اسے نہ رنج فنا
طلسم قدرتِ ربِ علیٰ یہ ادنیٰ ہے
بنا بنا کے مٹانا، یہ کھیل اس کا ہے

کیا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

یہ بند بھی ملاحظہ کیجیے:

ہر ایک شے سے ہے ثابت وجودِ ربِ علا
کہ ایک 'کن' سے زمین و زماں کیئے پیدا
پیمبروں کو ہدایت کے واسطے بھیجا
ہیں سب سے افضل و اکمل جنابِ خیرِ ورا
کبھی حصول یہ قربت بھلا کسی کو ہوئی
سوا حضورؐ کے معراج کس نبی کو ہوئی

(مرثیہ — [illegible] در حال حضرت امام حسینؑ)

## نعت و منقبت

نعت مدح رسول اسلام کا نام ہے اور منقبت آل رسول و اہلبیت طہارت کی مدح کو کہتے ہیں۔ یوں تو آج تک ہزار ہا شعراء نے نعتیں اور منقبتیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر مرثیہ نے بھی ان اصناف سخن کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اپنی آبرو بڑھائی ہے۔ مرثیہ گو شعراء مناسب موقع و محل پر نعت و منقبت کے بند بھی مرثیوں میں شامل کرتے ہیں۔

اس بارے میں ایک بات مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ نعت و منقبت کہنے والے شعراء کرام مشاعروں کے ماحول کے مطابق چلتے ہوئے قافیے تلاش کر کے نظم کرتے ہیں تاکہ کلام مشاعرے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر مرثیہ گو شاعر مرثیہ کے مزاج اور اس کی خاص فضا کو نظر میں رکھ کر نعت و منقبت کہتا ہے۔ یہاں چلتے ہوئے قافیے نظم کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے عام نعت و منقبت اور مرثیہ میں شامل ان اصناف سخن میں خاصہ فرق ہوتا ہے۔

حضرت فاخر نے بھی حسب موقع مرثیوں میں نعت و منقبت کہی ہے۔ ایک مرثیہ سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں

مندرجہ ذیل تین نعتیہ بند ایمان افروز بھی ہیں اور وجد آور بھی۔

جناب ختم رسلؐ ہیں حبیب رب قدیر
لقب خدا کی طرف سے ہوا بشیر و نذیر
جہاں میں ہیں یہ شہنشاہ کبریا کے وزیر
خدا نے خلق نہ ان کا کیا عدیل و نظیر
ضرور خلقت آدم سے بھی یہ اول ہیں
حبیب خاص الٰہی ہیں سب سے اول افضل ہیں

بیت میں کتابت کی غلطی بہت واضح ہے۔ دوسرے مصرع میں اول کی جگہ غالباً افضل ہوگا اور اس محل پر یہی ہونا چاہیے۔

بند ملاحظہ ہو:

یہی ہیں علت غائی آسمان و زمیں
انھیں سے خلق میں رائج ہوئی ہے شرع متیں
انھیں کی شان میں نازل ہوا کلام مبیں
یہی جہاں میں ہیں فرماں روائے کشور دیں
انھیں پہ ختم ہے رتبہ جہاں پناہی کا
انھیں کے سر پہ مزین ہے تاج شاہی کا

کیا اچھی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

جلا چراغ انھیں سے اِلٰہ کے گھر میں
انھیں کے فیض سے تابندگی ہے اختر میں
ضیا عطا شدہ ان کی ہے مہر انور میں
لوائے حمد کے حامل یہی ہیں محشر میں
انھیں سے پار سفینہ ہوا ہے امت کا

انھیں کے سر کے لیئے تاج ہے شفاعت کا

جزاک اللہ۔ (مرثیہ ''براق دہن رسا سوئے عرش جاتا ہے'' در حال حضرت امام حسینؑ)

ایک اور مرثیہ سے نعت کے چند بند مختصر کر کے لکھ رہا ہوں

دعائیہ بند ملاحظہ ہو۔ ایک ایک مصرعٔ دعا کے لیئے باب قبول کھول دینے والا ہے

یارب عطا ہو قوتِ جوشِ ولا مجھے
جو قصدِ بے ریا ہو وہ دے کبریا مجھے
الہام کے کریم ہوں مضموں عطا مجھے
لکھنی ہے بادشاہِ رسلؐ کی ثنا مجھے
ہے مرتبہ جلیل رسولؐ جلیل کا
خامہ بھی دے مجھے تو پرِ جبرئیلؑ کا

سبحان للہ سبحان اللہ۔

اے طبع مدحِ حضرتِ خیرالوریٰ ہو آج
سرتاجِ انبیاءؑ جو ہے اس کی ثنا ہو آج
پاکیزہ ہو زباں تو بیاں باصفا ہو آج
ہاں ذکر معجزاتِ رسولؐ خدا ہو آج
مانندِ شمعِ بزم تجلی فگن ہوں میں
وصفِ نبیؐ کروں تو خدائے سخن ہوں میں

پورا بند پر کیف ہے۔ کیا کہنا ہے۔ سبحان اللہ مگر چھٹے مصرعٔ کا تو جواب ہی نہیں۔

فاخر یہ تو نے عزم کیا ہے بہت بڑا
دشوار مثل حمد ہے توصیفِ مصطفاؐ
عارف نہیں حضورؐ کا کوئی بجز خدا
بعد خدا علیؑ ہی نے پہچانا مرتبا

تو کیا ہے جو بیاں کرے نعتِ رسولؐ کو
ہاں نعتِ پاک زیب ہے زوجِ بتولؑ کو

پھر چند بندوں کے بعد یہ بیت ہے۔ بیت سے پہلے چوتھا مصرع بھی ربط کے لیے ملاحظہ ہو:

فاخر نبیؐ کا وصف کسی سے ہو کیا بیاں
رکھ کوچۂ ثنا میں قدم احتیاط سے
ہاں دیکھ بڑھ نہ جائیو اپنی بساط سے

اس بیت میں حضرت فاخر نے نعت گوئی کی دشواریوں اور نزاکتوں کی طرف بڑی خوبی سے اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح کی تنبیہ فارسی کے مشہور شاعر عرفی نے بھی کی تھی۔

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

بدقسمتی سے زمانہ حال کے بیشتر شعرا نے نعت و منقبت کہنے کو بہت آسان سمجھا ہے اور ہر طرح کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر ایسے ایسے شعر کہتے ہیں جن سے مدح کی مدح کے بجائے اکثر منقصت کے پہلو نکلتے ہیں۔ خیر حضرت فاخر کے دو بند اور ملاحظہ کیجیے جو مندرجہ بالا بیت کے بعد ہیں:

بے حد ہیں گو فضائلِ محبوبِ کبریا
پر ہیں یہ خاص معجزۂ فخرِ انبیاءؑ
جاتے تھے دھوپ میں جو کہیں سرورِ ہداؐ
رہتا تھا فرقِ پاک پہ سایہ سحاب کا
پھرتا تھا یوں وہ ساتھ رسالت مآبؐ کے
جیسے چکور گرد پھرے ماہتاب کے

کیا خوب صورت بیت ہے۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

جاتے تھے جس شجر کی طرف شاہ ذی وقار
اس سے صدا سلام کی آتی تھی بار بار
جس کوچہ سے نکلتے تھے محبوب کردگار
خوشبو سے جسم پاک کی بستی تھی رہگذار

درود پڑھ کر بیت پڑھیئے اور اس کے بعد کا بند بھی۔

بو اس طرح نہ عطر نہ مشک ختن میں تھی
نکہت جو جسم اطہر شاہ زمن میں تھی

سبحان اللہ سبحان اللہ۔

تاریک شب میں جاتے تھے حضرتؐ کبھی اگر
پُر نور ہوتے تھے رخ انور سے بام و در
تھی تیرگی میں روشنی اس درجہ جلوہ گر
خجلت زدہ ہو مہر فلک جس کو دیکھ کر
یوں نور جلوہ گر تھا رسالت مآب کا
چہرہ ہو دیکھ کر جسے فق ماہتاب کا

(مرثیہ "یارب عطا ہو قوت جوشِ دہاں مجھے" در حالِ حضرت رسولؐ خدا)

نعت کے یہ بند روایت کی بناء پر تاریخی حقیقتوں پر بھی مبنی ہیں اور ممدوح سے مداح کی دلی عقیدت و مودت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مدح میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے کہیں نہیں چھوڑا ہے۔

ایک اور مرثیہ سے نعت و منقبت کے چند بند ملاحظہ کیجیے۔

شرف زبان کو نعتِ نبیؐ سے ہوتا ہے
وقار نطق کو مدحِ ولی سے ہوتا ہے
سخن کو اوج ثنائے علیؑ سے ہوتا ہے

بلند نام جہاں میں اسی سے ہوتا ہے
اسی کی فکر سے دنیا و دیں میں راحت ہے
جو بے زوال جہاں میں ہے یہ وہ دولت ہے

بیشک سبحان اللہ۔

زباں کے جرم مٹیں، مدح پنجتن ہو بیاں
ثنائے حضرتِ محبوبِ ذوالمنن ہو بیاں
عطا و بذلِ شہنشاہِ بت شکن ہو بیاں
صفت بتولؑ کی اور مدحتِ حسنؑ ہو بیاں
ثنا و دعائے شہِ مشرقین کی لکھوں
یہ دل میں ہے کہ مصیبت حسینؑ کی لکھوں

بند ملاحظہ ہو

جنابِ ختمِ پیغمبراں، حبیبِ الہٰ
شرف پہ ان کی ہے مہرِ نبوت آپ گواہ
انھیں کے نقشِ قدم سے ملی ہے دین کی راہ
مروج ان سے ہوا لا الٰہ الاّ اللہ
انھیں کی کوشش و کد سے بتائے کفر مٹے
انھیں کے فیضِ نفس سے ہوائے کفر مٹی

کیا عمدہ بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

یہی ہیں سیدِ لولاک و صاحبِ معراج
انھیں کے سر پہ مزین ہے دینِ حق کا تاج
انھیں سے بذل و عطا کے ہیں انس و جن محتاج

انھیں کے در کے ہیں ادنیٰ فقیر شاہ بھی آج
خدا نے دونوں جہاں کی انھیں حکومت دی
پھر ان کے بعد وہی مرتضیٰ کو ثروت دی

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

نبیؐ کے عہد میں شیر خدا مشیر رہے
وہ بعد ان کے ہوئے شاہ جو وزیر رہے
اب ان کے خلق میں محتاج سب امیر رہے
یہ اپنے دوست کے تا حشر دستگیر رہے
انھیں کے ساتھ ریاضِ جناں میں جائیں گے
یہی صراط پہ لغزش سے بھی بچائیں گے

کتابت یوں ہے.... "لغزش میں ہاتھ تھامیں گے" جو شاعری کے اعتبار سے غلط ہے اور کاتب کی غلطی ہے۔ (مرثیہ پھر آج طبیعت کو جوش آیا ہے)

اس کے بعد جناب فاطمہ زہرا اور حضرت امام حسینؑ کی مدحت میں بند ہیں اور آخر میں حضرت امام حسینؑ کے حال میں مصائب ہیں۔ اختصار کے لیے میں نے یہ بند درج نہیں کیے۔

## رخصت:

مرثیہ میں رخصت ایک بہت مشکل مقام ہے اور اس مرحلہ کو حسن وخوبی سے سر کرنا آسان نہیں ہے۔ کسی بیٹے کا اپنی ماں سے، کسی بھائی کا بہنوں سے، شوہر کا بیوی سے، بھانجے بھتیجوں کا پھوپھیوں وغیرہ سے، پھر اجتماعی طور پر سب سے اور خود حضرت امام حسینؑ سے شہادت کی اجازت طلب کرنا اور ہر ایک کو اس بات کا یقین ہونا کہ جانے والا اب زندہ واپس نہیں آئے گا، یہ مواقع بڑے جذباتی، نفسیاتی اور درد انگیز مناظر کی تخلیق کرتے ہیں اور

شاعر کو یہاں صرف قوت تخیل ہی سے کام نہیں لینا پڑتا بلکہ تصور میں بسے ہوئے ان مناظر کو پورے کرب و غم کے ساتھ اپنے اس میں سمونا پڑتا ہے۔ چونکہ ہر مجاہد کو حضرت امام حسینؑ کے علاوہ تمام اہل حرم سے بھی رخصت ہونا ہوتا ہے اس لیے رخصت کا بیان عموماً کافی طویل ہوتا ہے۔ اگر ایک مرثیہ سے بھی رخصت کے سارے بند نقل کیے جائیں تو طول ہو جائے۔

دوسرے اس نازک موقع پر نئے گوشے پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ مگر جیسا کہ گزشتہ اوراق میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت فاخر نے جناب عونؑ و محمدؑ کی رخصت میں ایک ایسی بے مثال بیت کہی کہ مجلس میں موجود حضرت میر نفیس علیہ الرحمہ نے داد دیتے ہوئے کہا کہ یہ گوشہ ہمارے خاندان سے رہ گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر بیت ملاحظہ فرمائیے۔

بڑے دکھ درد اٹھا کے جو تھا پالا ان کو
ماں نے قرآن کے نیچے سے نکالا ان کو

اسی طرح جناب مسلمؑ کے صاحب زادگان کی رخصت میں ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت ملاحظہ ہو۔

کانوں میں دعا پڑھ کے کلیجہ سے لگایا

دو لال چلے رن کو جو مادر سے بچھڑ کے
ماں رہ گئی ہاتھوں سے کلیجہ کو پکڑ کے

(مرثیہ: اے حق رسا عرش کی جانب ہو روانہ... فرزندان حضرت مسلمؑ)

اہل نظر کے لیے اس شرح کی ضرورت نہیں کہ مسافر جب گھر سے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو سفر کی مخصوص دعائیں اس کے کان میں پڑھ کے دم کی جاتی ہیں تاکہ مسافر بحفاظت اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ اسی طرح حضرت فاخر کا یہ مصرع اور بیت بھی رخصت میں بے مثال ہے۔

رزمیہ:

رزمیہ کے بارے میں حضرت ماہر کے حالات میں تفصیل سے اظہار خیال کر چکا ہوں۔ حضرت فاخر کا زور طبع رزمیہ میں خوب خوب کھلتا ہے۔ ان کی تیغ قلم اس میدان میں بڑے ہنر سے اپنے جوہر دکھاتی ہے۔ میں نے اپنے پہلے مرثیہ ''مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک'' میں انھیں کی ایک بیت میں تصرف کر کے انھیں کے بارے میں یہ بیت کہی تھی۔

چلتی تھی ان کی تیغ قلم ہر زمین میں
جبریل فن کے ڈھونڈتی تھی پر زمین میں

رزمیہ کے مختلف اجزا کے بارے میں ان کے مختلف مرثیوں سے کچھ بند پیش کرتا ہوں جن میں زور کلام، لفظوں کا شکوہ اور بندوں اور بیتوں کے تیور دیکھنے کے قابل ہیں

آمد:

شجاعان حسینی میں سے میدان جنگ میں کسی کی آمد سے رزمیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی منظر کشی میں شاعر اپنے جذبات کو اپنے فکر و فن میں سمو کر ایک ولولہ انگیز سماں تخلیق کر دیتا ہے۔ حضرت فاخر کے ایک مرثیہ کے مطلع ثانی سے حضرت ابوالفضل العباس علم دار لشکر حسینؑ کی میدان جنگ میں آمد ملاحظہ کیجیے

آمد ہے رن میں ابنِ شہ ذوالفقار کی
میداں میں دھاک شیر کی ہے کارزار کی
لرزاں ہے روح خوف سے ہر بدشعار کی
جمتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

کیا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

اک شور ہے کہ صف سے بڑھو کارزار کو
آتا ہے شیر نہر پہ، روکو کچھار کو

پورے بند میں زور سخن نمایاں ہے مگر تیسرا اور چوتھا مصرع اور بیت حضرت عباسؑ

[illegible]

کے رعب و دبدبہ کی بہترین عکاس ہے۔

[illegible]

[illegible]

یوں چھیڑ کر عقاب کو آفت کے بن میں آئے

جس طرح سے کہ بادِ بہاری چمن میں آئے

اس رعب و داب سے صفِ ہیجا شکن میں آئے

غل پڑ گیا کہ لو، اسد اللہ رن میں آئے

مثلِ شغال دشت میں ضیغم دبک گئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دیکھا جدھر شکار پہ کی شیر نے نظر

[illegible]

[illegible]

جس پر نظر کی آپ نے، اس نے گریز کی

دکھلائی ابروؤں نے برش تیغ تیز کی

تھے ساتھ دوشِ پاک پہ مشکیزہ و نشاں

وہ تیغِ تیز دم کہ نہ چھوڑے عدو کی جاں

وہ آب الحفیظ، وہ برش کہ الاماں

خجلت سے تھیں اسی کی شرر سنگ میں نہاں

ایسی سپر جو روک لے رستم کے وار کو

برچھا وہ، جو فرس سے اٹھا لے سوار کو

کیا عمدہ بند اور کیسی زبردست بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

سر پر وہ خود جس سے ہو خورشید کو زوال
نور جبیں سے بدر بھی گھٹ کر بنے ہلال
بیت ابروؤں کی حسن کے دیواں میں بے مثال
وہ خال جس پہ مشک کے دانے کا احتمال
دنیا میں ایسی دیکھی نہیں ہے کسی کی آنکھ
غازی کی آنکھ ہے کہ بعینہ علیؑ کی آنکھ

(مرثیہ "آثارِ فتح جو رن میں عیاں ہوئے" در حال حضرت عباسؑ)

ایک اور مرثیہ سے جناب علی اکبر کی میدان کو روانگی کے چند بند ملاحظہ ہوں اس بند میں پہلے تین مصرعے جناب علی اکبر کے جمال کی تصویر ہیں اور آخری تین مصرعے حزن و ملال کی:

میدان کو جاتا تھا ادھر شیرِ نرینہ
تکتے ہوئے افواج کو، تانے ہوئے سینہ
یہ زین پہ بیٹھے تھے کہ خاتم پہ نگینہ
تھے مضطر و بے تاب ادھر شاہِ مدینہ
راحت کسی پہلو تھی نہ زہراؑ کے پسر کو
اک ہاتھ سے دل، ایک سے تھامے تھے جگر کو

یہ بند بھی قابلِ داد ہے:

کس شان سے ہے شیرِ جری رخش پہ اسوار
میدان کو جاتا ہے پھراتا ہوا رہوار
ناظر تھا نگہبان منجم جو ستم گار
کچھ اس کو ملے آمدِ جرار کے آثار
دی اس نے صدا فوج کو، ہشیار جوانو

اک شیر کی آمد ہے، خبردار جوانو

کیسا پُر زور مصرع ہے۔ جزاک اللہ۔

یہ شیرِ غضب ناک ہے رہوار پہ اسوار
دُلدل پہ بصد قہر ہیں یا حیدرِ کرار
اس اسپ کے کاوے سے یہ ہوتا ہے نمودار
گھیرے گا تمھیں غیظ علی اکبرِ جرار
جانوں کی نہیں خیر ذرا اس کی وغا میں
کل فوج گھرے گی غضب و قہرِ خدا میں

(مرثیہ ”مطلع ...“ ... حال حضرت علی اکبر)

اس مسدس کے متعدد بند ہیں مگر میں نے اختصار کے خیال سے سب کو چھوڑ دیا۔

رجز:

مرثیہ میں رجز ایسا جزو ہے جو رجز خواں کے شرفِ خاندانی، شرافتِ نسبی، اپنی فضیلتوں کے بیان اور اظہارِ شجاعت وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں جوش و ولولہ نمایاں ہوتا ہے مگر کبھی کبھی حضرت امام حسینؑ اور ان کے جاں نثاروں کے رجز میں حزن و ملال کی کیفیت بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ حضرت فاخر کے ایک مرثیہ سے امام حسینؑ کے رجز کے صرف دو بند ملاحظہ کیجیے:

ناگاہ پہنچے رن میں شہنشاہِ دو جہاں
بہرِ رجز ہوئے لبِ شبیرؑ دُرفشاں
آگاہ ہو کہ کون ہوں میں اے عدوئے جاں
اپنا حسب نسب تو ہے کونین پر عیاں
ابنِ علیؑ ہوں، سبطِ رسولؐ جہاں ہوں میں
اے جاہلو! سنو کہ امامِ زماں ہوں میں

اس مصرع میں ”امامِ زماں“ کے ساتھ ”جاہلو“ کا لفظ کتنا بلیغ اور پُر لطف ہے۔

ظاہر میں گو کہ آج ہوں مظلوم و بے دیار
لیکن خدا نے مجھ کو دیا ہے سب اختیار
کھینچوں جو بہر جنگ میں حیدرؑ کی ذوالفقار
اک دم میں سب ہلاک ہو یہ فوجِ نابکار
مجھ کو سب اختیار ہے قرب و بعید کا
گر چاہوں یوں سے تخت الٹ دوں یزید کا

پورے بند میں زورِ بیان قابلِ داد ہے۔ کیا کہنا۔

(مرثیہ "گردوں پہ جب ہلالِ محرم عیاں ہوا" درحال حضرت امام حسینؑ)

ایک اور مرثیہ سے امام حسینؑ کے رجز کے تین بند
امام حسینؑ کی فضیلتوں کا بیان انھیں کی زبان قدس سے ملاحظہ ہو

کہا حسینؑ نے شاہنشہِ زماں میں ہوں
شرف میں قبلۂ دیں، کعبۂ جہاں میں ہوں
جہاں کا ذکر ہے کیا، حاکمِ جناں میں ہوں
خدا کا عرش ہوں اور قطبِ آسماں میں ہوں
مقامِ جنگ سے پیغمبرِ امم بھی ہٹے؟
یہ سب ہٹے ہوں تو میداں سے یہ قدم بھی ہٹے

اس بند میں بھی زورِ بیان عروج پر ہے، رجز کے تیور دیکھنے کے قابل ہیں

پرے یہ فوج کے کیا ہیں، یہ ہیں رسالے کیا
جو دیکھے بھالے ہوں وہ کوئی دیکھے بھالے کیا

دیکھے بھالے کی تکرار کیسا لطف دے رہی ہے۔ واہ۔

ہمارے سامنے نیزے یہ کیا ہیں بھالے کیا
کہیں کسی سے بھی رکتے ہیں جانے والے کیا

رکیں نہ فوج سے غصہ میں ہم اگر آئیں
یہ کیا ہے سدِ سکندر کو توڑ کر جائیں
نہیں مقامِ وغا سے دلیر جاتے ہیں
بغیر فتح کے میدان سے کب آتے ہیں
دل و جگر پہ بھی ہنس ہنس کے زخم کھاتے ہیں
خود اپنے خون کے پرنالوں میں نہاتے ہیں
رہِ فرار کا جو لوگ پاس کرتے ہیں
بہادروں پہ وہ اپنا قیاس کرتے ہیں

کیسا عمدہ طرزِ بیان ہے۔

(مرثیہ "[illegible]" [illegible] سوے وطن جاتا ہے [illegible] در حال حضرت امام حسین)

یک مرثیہ سے حضرت علی اکبر کے رجز کے تین بند پیشِ خدمت ہیں۔

نعرہ کیا ضیغم نے ہم آئے ہیں، خبردار
تھوڑے سے ہمارے کوئی ہم سر نہیں پردار
فوجوں کو لئے رن میں بڑھیں فوج کے سردار
آئیں مرے لڑنے کو جوانانِ جگر دار
آتے نہیں میداں میں بہادر جو بڑے ہیں
ہم دیر سے یاں منتظرِ جنگ کھڑے ہیں

اس بند میں رجز کا زور ملاحظہ ہو:

آگاہ ہو ہم بیشۂ حیدرؑ کے اسد ہیں
بازوئے نبیؐ، دستِ الٰہی میرے جد ہیں
کیا اصل ہے ان کی جو پرے بہرِ مدد ہیں
دشمن کے ہزاروں جو چلیں وار تو رد ہیں

دو ایک تو کیا، مل کے جواں پانچ نہ آئے
تیغیں شرر افشاں ہوں مگر آنچ نہ آئے

اس بند کو بالکل سہلِ ممتنع بنا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جرار کبھی ہم سے وغا کر نہیں سکتے
اسوار کبھی ہم سے وغا کر نہیں سکتے
خونخوار کبھی ہم سے وغا کر نہیں سکتے
دو چار کبھی ہم سے وغا کر نہیں سکتے
پیدل سے کبھی گاہ سواروں سے وغا ہو
اس وقت کھلے دل جو ہزاروں سے وغا ہو

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

آتے نہیں کیوں بہر وغا برچھیوں والے
آ کر کوئی میدان میں اک وار تو کھالے
کیوں قلب سپہ میں ہیں کھڑے دل کو سنبھالے
لڑنے کو بڑھیں رن میں رسالوں پہ رسالے
جرأت نہیں بڑھنے کی اگر اہلِ جفا کو
آتے ہیں ہمیں خیر، جوانوں سے وغا کو

(مرثیہ ... مطلع: جب فوج سے تا باب حرم ... در حال حضرت علی اکبر)

مندرجہ بالا دو مرثیوں میں سے پہلے مرثیہ میں حضرت ذوالفقار کی زبان سے بھی رجز نظم کیا ہے۔ اس کے تیور دیکھیے:

کاٹھی سے تیغ کھینچ لی حضرت نے ایک بار
ابرِ سیہ سے آئی نظر برق شعلہ بار
کہنے لگی یہ فوج سے تن کر بصد وقار
پہچانتے ہو، کون ہوں میں اے ستم شعار

اک اک کو دو کروں گی، بڑی آبدار ہوں
میں اور کوئی تیغ نہیں، ذوالفقار ہوں

کیا بیت ہے اور ذوالفقار کی معنویت کو کس طرح واضح کیا ہے۔ جزاک اللہ۔

اس بند میں تلوار کے رجز میں زورِ بیان ملاحظہ ہو:

فقرے ہیں تیز تر کہیں میرے حسام سے
رکھتی ہوں دشمنی میں ہر اک تیرہ فام سے
نکلی ہوں کوندتی ہوئی ابرِ نیام سے
چھوٹے گا زنگ خونِ جوانانِ شام سے
بن کر گروں گی برق میں اہلِ عناد پر
مدت کے بعد آج کھنچی ہوں جہاد پر

یہ بند اور اس کے بعد کے سارے بندوں کے تیور دیکھیے اور شاعر کے زورِ بیان کی داد دیجیے

خارا شگاف و برق دم و شعلہ ور ہوں میں
خنجر سے تیز، تیغ سے بھی تیز تر ہوں میں
زیرِ زمیں کبھی ہوں، کبھی چرخ پر ہوں میں
آئیں عدو کے وار تو شہ کی سپر ہوں میں
تیغیں چلیں ہزار شہِ مشرقین پر
کیا تاب ہے کہ آنچ بھی آئے حسین پر

اوچھا سا میرا وار اگر کوئی پڑ گیا
رودار بھی جو وہ تھا تو چہرہ بگڑ گیا
میں جس جگہ چلی وہ محلہ اجڑ گیا
بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا بچھڑ گیا

ٹکڑے اڑا دیئے ہیں ہر اک بدصفات کے
کاٹے ہیں میں نے سیکڑوں رشتے حیات کے

جس صف پہ میں چلی، ہوئی بے جاں وہ صف کی صف
جل کر وہ خاک ہوگئی کوندی میں جس طرف
جوہر شناس تھے مرے شاہنشہؑ نجف
آیا ہے کم مرے لیئے لاسیف کا شرف
بیرالعلم میں جا کے لڑی قوم جاں سے میں
نازل ہوئی علی کے لیئے آسماں سے میں

قائل ہیں سب جہاں میں مری کاٹ چھانٹ کے
بیری ک ڈوب ڈوب گئے میرے گھاٹ کے
کرتے ہیں وصف روح الامینؑ میری کاٹ کے
خندق کو میں نے بھر دیا لاشوں سے پاٹ کے
دشمن کو میں جفا ہوں، عدو کو میں جور ہوں
دیکھو میں ذوالفقار ہوں یا کوئی اور ہوں

برسوں کے بعد آج کھنچی پھر میں شعلہ ور
خندق کی جنگ آج پھر آجائے گی نظر
ان سب سے معرکہ یہ کہیں ہے زیادہ تر
اک بار اور بس میں کھنچوں گی بکر و فر
رن پر چڑھی ہوں اب شہ کون ومکاں کے ساتھ
نکلوں گی پھر ظہور امام زماںؑ کے ساتھ

یہ سارے بند فصاحت، سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ زور بیان اور شاعری کے
کمال کمال کے آئینہ دار ہیں۔ ہر صاحب ذوق ان کی داد دے گا۔

مے کشی مے کدۂ دہر میں مجھ کو ہے حرام
کچھ غرض مجھ کو نہیں ساغر و مینا ہو کہ جام
مے کش و ساقی و مے خانہ کو یاں کیا ہے قیام
دے وہ بادہ مجھے جس کا رہے نشہ بھی مدام
آنکھیں مشتاق رہیں دیدۂ ساغر کی طرح
جوش زن طبع رہے چشمۂ کوثر کی طرح

یہ بند بہت خوب ہے مگر بیت کی شاعرانہ خوبیوں کی داد نہیں دی جا سکتی۔

حضرت فاخر نے اس بند میں تو اقتران شراب معرفت و مئے مودت کے شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کر دیا ہے اور اس اعتراض کا شافی جواب بھی دے دیا ہے کہ فدائیان محمدؐ و آل محمدؐ اپنی شاعری میں خلاف شریعت شراب و کباب کی گفتگو کرتے ہیں۔ اس نکتہ پر میں حضرت ماہر کے باب میں گفتگو کرتے ہوئے کافی وضاحت کر چکا ہوں۔

اب اگلا بند ملاحظہ کیجیے:

مے کشی کا ہے مزہ جب کہ ہو دلبر کوئی
کوئی مقدادؓ ہو مے خوار اباذرؓ کوئی
دے باصرار چھلکتا ہوا ساغر کوئی
جام پر جام دیئے جائے برابر کوئی
کوئی تصویر بھی آئینہ زانو میں ہو
بزم آراستہ ہو، حور بھی پہلو میں ہو

اس بند کے بعد ملاحظہ ہو:

گئے پھر یں قصر میں کہ باغ جناں میں آئیں
طعمہ کھائیں جنتی اور کبھی میوے کھائیں
بادہ خواری کے لیے گہ سوئے کوثر جائیں

مئے ولائے ولایت مآب لا ساقی
ہوئی ہے دیر زیادہ، شتاب لا ساقی
فلک کے طاق سے اعلیٰ شراب لا ساقی
چھلکتے جام مہ و آفتاب لا ساقی
دوا ضرور ہے دردِ دل و جگر کے لیے
برائے شام ہو اک جام اک سحر کے لیے

یہ بیت لسان الشعرا حضرت شاعر نے "سحاب" میں اس طرح لکھی ہے:

سکون چاہیئے عُشّاق کو عمر بھر کے لیے
ہو ایک شب کے لیے جام اک سحر کے لیے

## تلوار کی تعریف:

تلوار کی تعریف کلاسیکی مرثیہ کا ایک نہایت پرکشش اور ولولہ انگیز جزو ہے۔ شعرا نے مرثیہ میں تغزل کو جگہ دینے کے لیے پہلے تلوار اور گھوڑے کی تعریف ہی کو منتخب کیا تھا۔ انھیں اجزائے ترکیبی نے مرثیہ کو اوجِ ثریا سے ہم کنار کر دیا۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں جدیدیت پرستی کے حد سے بڑھے ہوئے شوق کی قربان گاہ پر مرثیہ کے ان پرشکوہ اور پرعظمت اجزائے ترکیبی کو بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ انتہا یہ ہے کہ آج کے ایک معروف شاعر جدیدیت پرست ادیب اور مرثیہ گو نے کلاسیکی انداز کے ایک مرثیہ پر تبصرہ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا کہ جب سے تلوار سے گھانس کاٹنے کا کام لیا جانے لگا ہے اس وقت سے کوئی سمجھدار شاعر اپنے مرثیوں کو تلوار کے ذکر سے بوجھل کرنا پسند نہیں کرے گا۔ یہ ایک ایسا فقرہ تھا جس نے تلوار کی طرح دل پر وار کیا اور زبان سے بیساختہ لاحول ولا قوۃ نکلا۔ مرثیہ گو شعرا سلف کے ہوں یا آج کے جن کو اللہ نے توفیق دی ہے انھوں نے کسی لوہے کی تلوار کی تعریف نہیں کی۔ وہ فاتح خندق و خیبر شیرِ خدا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی

ذوالفقار کی تعریف کرتے تھے اور کرتے ہیں جو کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے دستِ باطل شکست میں بھی تھی۔ یہ پھر ان شجاعانِ راہِ حق کی راہ اور شہادت کی چاہ میں چلتی ہوئی تلواروں کی تعریف کرتے تھے اور کرتے ہیں جنھوں نے اپنی تلواروں سے ظلم و باطل کے تنومند جسموں سے خون کے دریا بہا دیئے اور جبر و ملوکیت کے سرِ پُرغرور شمشیر زنی کی ہنرمندی سے اتار دیے۔ ایسی تلواروں کے لیئے یہ کہنا کہ ان سے گھانس کاٹنے کا کام لیا جاتا ہے یا بقول دیگرے وہ گھسیاروں کی تلواریں بن گئی ہیں، ان کی توہین کی انتہا ہے۔ خدا معاف کرے اور ایسی فکر سے محفوظ رکھے۔ اس موقع پر مجھے میر کلو عرش کا ایک بڑا برمحل شعر یاد آ گیا جو ان گھانس کاٹنے والے قول کے پس منظر میں زیادہ لطف دے گا

گھسیارا ہمسری کرے دُلدل سوار کی
اس مسخرے کے واسطے کھرپی بھی آئی ہے؟

بہر حال یہ تو ایک ضمنی بات تھی مگر ضروری تھی اس لیئے لکھی گئی۔

تمام کلاسیکی مرثیہ نگاروں کی طرح حضرت فاخر کے مرثیوں میں بھی تلوار کی تعریف میں بڑے عمدہ اور نہایت خوب صورت بند ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند بند ملاحظہ ہوں جو حضرت امام حسینؑ کی تلوار یعنی ذوالفقار کی تعریف میں ہیں

## تلوار کی تعریف:

چمکی کبھی یہ تیغ اِدھر اور اُدھر کبھی
پوشیدہ ہوگئی کبھی ، آئی نظر کبھی
زیرِ زمیں کبھی گئی ، بالائے سر کبھی
خنجر کبھی تھی ، تیغ کبھی تھی ، سپر کبھی
پڑتے تھے وار جو شہِ مرداں مقام پر
سینہ سپر یہ ہوتی تھی شاہِ امام پر

پورا بند قابل تعریف ہے مگر چوتھا مصرع اور بیت خصوصیت سے داد طلب ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک ہی ردیف و قافیہ میں دو مسلسل بند ملاحظہ ہوں

برق حسام شاہ چمکتی تھی بار بار
اوچھے سے وار میں بھی چمکتی تھی بار بار
آنکھوں میں مثل خار کھٹکتی تھی بار بار
پی پی کے خون اور لپکتی تھی بار بار
لاشوں سے ہر نشیب کو وہ پاٹتی اٹھی
کیا خون کا مزہ تھا کہ لب چاٹتی اٹھی

کیا کہنا۔ پورا بند قابل داد ہے مگر بیت تو بے مثل ہے۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

تھمتی تھی بار بار تو چلتی تھی بار بار
گرتی تھی بار بار، سنبھلتی تھی بار بار
چہرے کا اپنے رنگ بدلتی تھی بار بار
ناگن تھی اس کے رخ پہ آتی تھی بار بار
جس پر غضب تھا فوج میں، اس کا یہ حال تھا
نیلے تھے زخم، خون سے سب جسم لال تھا

اور یہ بند:

آئی اگر سپر پہ تو مغفر کو دو کیا
مغفر کو کاٹ کر جو بڑھی، سر کو دو کیا
سر سے بڑھی تو جوشن و بکتر کو دو کیا
بکتر سے بڑھ کے اسپ کے پیکر کو دو کیا
ہر ہاتھ میں وہ جاتی نہ کیونکر زمین میں

روح الامین سے ڈھونڈتی تھی پر زمین میں

کیسی خوب صورت بیت ہے اور یہ شاعرانہ توجیہ ہے۔ سبحان اللہ۔

اٹھی زمیں سے تو قیامت بپا ہوئی
جس کے کہ سر پہ آئی اسے یہ بلا ہوئی
جھک کر ملی گلے سے تو گردن جدا ہوئی
تن کر اٹھی تو شاہ امم پر فدا ہوئی
جانیں نثار کرتی تھی سبط رسولؐ پر
پروانہ ذوالفقار تھی شمع بتولؑ پر

شاعر کو تیسرے اور چوتھے مصرع اور بیت کی داد چاہیے۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔ تلوار نے رجز کے ذیل میں ایک بیت درج کی تھی جو حسب ذیل ہے:

اک اک کو دو کروں گی، بڑی آبدار ہوں
میں اور کوئی تیغ نہیں، ذوالفقار ہوں

یہ بند تلوار کے اسی دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے

شمشیر و گرز و تیر و سناں، نیزہ و تبر
اسوار و اسپ و زین و زرہ، مغفر و سپر
بازو و دست و پنجہ و سینہ، گلو و سر
زانو و پشت و پا و شکم، پہلو و کمر
کاٹا سبھوں کو شاہ نے ایک ایک وار سے
دو دو ہر ایک چیز ہوئی ذوالفقار سے

اس بند میں شاعر نے کتنی چیزوں کو جمع کیا ہے۔ یہ صنعت جمع کی ایک عمدہ مثال ہے۔
تلوار کی تیز رفتاری اور قتل بازی سے میدان جنگ کا یہ حال ہوا، ملاحظہ ہو، دونوں

بندوں میں زورِ بیان اپنے عروج پر ہے۔

مغفر کہیں تھے اور کہیں سر پڑے ہوئے
جوشن کہیں تھے اور کہیں بکتر پڑے ہوئے
کیا کیا تھے نوجوان دلاور پڑے ہوئے
دم توڑتے تھے خاک پہ افسر پڑے ہوئے
پیوندِ خاک فوج کے سردار ہوگئے
کشتوں کے پشتے لاشوں کے انبار ہوگئے

آتش فشاں و برق دم و آبدار ہے
بے باک ہے پری کہ سروں پر سوار ہے
فوجِ یزید میں یہی ہر سو پکار ہے
خیبر میں جو کھنچی تھی وہی ذوالفقار ہے
اضداد سب ہیں جمع، یہ اس میں کمال ہے
بھاگو کہ اس سے جان بچانا محال ہے

دونوں بند میدانِ جنگ کی منظر نگاری اور دشمن کی سراسیمگی اور خوف و دہشت سے ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں جو بڑی خوب صورت ہے۔

تلوار کی تعریف کے ان سارے بندوں میں بندشوں کی چستی، مصرعوں کی روانی، زورِ سخن، حسنِ بیان، شعریت اور تغزل سب کچھ موجود ہے جو سامع و قاری کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(مرثیہ "سروں پہ جب بادلِ محرم بپا ہوا" در حال حضرت امام حسینؑ)

## گھوڑے کی تعریف:

تلوار کی تعریف کی طرح گھوڑے کی تعریف بھی رزمیہ کا ایک مہتم بالشان جزو ہے جس میں مرثیہ گو شعرا نے زورِ کلام اور حسنِ بیان کے ساتھ فکر کی پختگی، تخیل کی بلندی،

مضمون آفرینی اور رنگین مضامین میں تغزل سے بھرپور کام لیا ہے۔ حضرت فاخر کے تقریباً سبھی مرثیوں میں تہور اور گھوڑے کی تعریف میں بند شامل ہیں۔ ایک مرثیہ سے چند بند ملاحظہ ہوں۔ زورِ بیان اور جدتِ خیال داد طلب ہیں۔

بیٹھے سنبھل کے جب شہِ ذی جاہ زین پر
لی باگ بائیں ہاتھ میں شہ نے بکر و فر
شبدیز بے مثال نے دُم کو کیا چنور
دونوں کنوتیوں کو ملایا اٹھا کے سر
کافی نہ تھی وہ سر پہ نشست کا تاج تھا
روکے ہوئے تھے شاہ تو برہم مزاج تھا

لکھتا ہے بادپا کی کمیتِ قلم ثنا
نتھنوں سے اس کے آتی تھی فرفر کی جو صدا
اس سے یہی اشارہ و ایما تھا برملا
پلٹوں گا جب تو یوں کہ رف رف کا مرتبا
صرصر سے تیز تر ہوں، نسیمِ صباح ہوں
میں اور کوئی رخش نہیں، ذوالجناح ہوں

مہمیز کی جو شاہ نے گھوڑا ہوا ہوا
مشہور جب سے خلق میں یہ بادپا ہوا
چرچا سپاہِ شام میں یہ جابجا ہوا
آیا نظر نہ ایک کو، دیکھو یہ کیا ہوا
کیا تیز رو سمند امامِ ہدا کا ہے
سن سے فرس اڑا کہ یہ جھونکا ہوا کا ہے

(مرثیہ "مردوں پہ جب بلا کا محرم عیاں ہوا" از جناب حضرت ... حسین)

ایک اور مرثیہ سے کچھ بند گھوڑے کی تعریف میں درج ذیل ہیں۔ ایک ایک بند، ایک ایک بیت اور ایک ایک مصرع "دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کے مصداق ہے۔

کوندی جو برق تیغ تو بجلی بنا سمند
خود آگ تھا عقاب تو سیماب جوڑ بند
آہو زمیں پہ تھا تو ہوا پر تھا وہ پرند
اسوار کو چھپالے جو، ایسا تھا سر بلند
کبک دری بھی وجد میں تھی اس کی چال پر
ہر نعل فوق رکھتا تھا اس کا ہلال پر

ضیغم کہیں تھا، برق کہیں تھا، پری کہیں
عنقا کہیں، ہما کہیں، کبک دری کہیں
صرصر نے بھی نہ دوڑ میں کی ہمسری کہیں
رفتار تیز و تند کہیں، سرسری کہیں
یوں پاؤں فرشِ خاک پہ رکھتا تھا ناز سے
آواز بھی نہ دوڑ میں آتی تھی ساز سے

تیزی کو اس فرس کی قلم کیا بھلا لکھے
سرور ہوا ہے، لوگ کہیں گر ہوا لکھے
مضمون پست یہ ہے جو بالِ ہما لکھے
خود آپ نارسا ہے جو ذہنِ رسا لکھے
دوڑے ہزار ذہن وہ پائے گا چال کیا
جو آپ بے نظیر ہو، اس کی مثال کیا

وہ سر وہ سینہ اور کفل وہ بھرے بھرے
وہ بھی خجل تھے فوج میں گھوڑے جو تھے ہرے

سبزے کو روندے یوں کہ ہوں دل دیکھ کر ہرے
دب جائے ٹور تاپ زمیں پر وہ گر دھرے
گویا [illegible] سے بادِ صبا تھی بندھی ہوئی
اس کی رواتوں کی ہوا تھی بندھی ہوئی

رفتارِ تیز میں وہ تگ و دو ، وہ آؤ جاؤ
غمزے نئے تھے ، ناز نیا تھا ، نیا بناؤ
طے کرتا تھا وہ راہ میں اس طرح کے چڑھاؤ
جیسے بہاؤ پر کوئی زوروں میں جائے ناؤ
شیرِ خدا کا شیر تھا رن پر تلا ہوا
تھا بادباں علم کا پھریرا کھلا ہوا

ایک اور مرثیہ سے صرف دو بند ملاحظہ ہوں

ہاں توسنِ خامہ صفتِ رخش بیاں ہو
سائے کی طرح گاہ نہاں گاہ عیاں ہو
پوشیدہ ہو نظر سے تو صرصر کا گماں ہو
ظاہر ہو تو پھر ابر کے مانند رواں ہو
چمکے جو فرس ، برق بھی سو جاں سے فدا ہو
کاوے میں رواں دورِ زمانہ سے سوا ہو

بند ملاحظہ کیجیے ۔ ردیف و قوافی کا آہنگ زور [illegible] اور بڑھا دیتے [illegible] بند کے
تیور بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔

ہے شوخیوں میں مردمِ دیدہ سے زیادہ
سرکش ہے یہ ابروئے کشیدہ سے زیادہ
گردن میں ہے خم تیغِ خمیدہ سے زیادہ

ہے جست میں آہوئے رمیدہ سے زیادہ
برہم کسی معشوق کے گیسو سے سوا ہے

اور تیز روی کی یہ تشبیہ ملاحظہ ہو۔ جو بالکل نئی ہے۔

رفتار میں چلتے ہوئے جادو سے سوا ہے
(مرثیہ مطلع: ہو فزوں نیر تابانِ سحر سے، در حال حضرت علی اکبر)

## مصائب:

مصائب مرثیہ کا جزو لاینفک ہیں اس لیئے کہ مرثیہ رثا، سے مشتق ہے جس کے معنی میت کے صفت بیان کر کے اس پر گریہ کرنا ہے۔ اس وجہ سے بیان شہادت اور بیان مصائب پر ہر مرثیہ گو نے بہت زور دیا ہے۔ شہادت کے علاوہ رخصت میں بھی گریہ و ماتم کے بند نظم کیئے جاتے ہیں جو ان قیامت خیز لمحات کی تصویر کشی کرتے ہیں جب کوئی مجاہد شہادت کے لیئے میدان جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اہل حرم کے خیموں میں ہر مجاہد کا کوئی باپ، چچا، ماموں یا بھائی اور خواتین محترم میں ماں، پھوپھی، بہنیں اور بیٹیاں وغیرہ ہوتی ہیں جن کو یہ یقین ہوتا ہے کہ میدان کی اجازت مانگنے والا یہ گھر بھر کا پیارا اور سب کا دلارا مجاہد اب میدان سے زندہ پلٹ کے نہیں آئے گا۔ اس کے بجائے اس کی لاش آئے گی۔ اس یقین کے ساتھ میدان کی اجازت دیتے وقت کیا قیامت دلوں پر گزرتی ہے۔ مرثیہ گو کسی ایسی صورت حال کا تصور کر کے اس کی تصویر کشی کرتا اور بین رقم کرتا ہے جو ہرگز غیر فطری نہیں ہوتے مگر کبھی کبھی ایسا کرنے میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اس لیئے کہ مرثیہ گو ان دائمی جدائی کے منظر اور گوش تصور سے سنے جانے والے بین و بکا سے جذباتی طور پر خود مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے۔ خود میری مرثیہ نگاری کی زندگی میں ایسے کئی مواقع آئے ہیں جب کوئی بند یا بیت کہتے ہوئے مجھ پر شدت سے رقت طاری ہوئی ہے۔ جو مرثیہ گو اس تجربے سے نہیں گزرتے اور ان درد انگیز جذبات کو

اپنے دل پر محسوس نہیں کرتے، گستاخی معاف، ان کی مرثیہ گوئی ایک میکانکی عمل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ بہرحال یہ دو مواقع، ایک رخصت اور دوسرے شہادت بیان مصائب کے لیے خاص ہیں اور ہر مرثیہ گو نے ان مقامات پر مصائب نظم کیے ہیں۔ حضرت فاخر بھی ان میں شامل ہیں۔ ان کے ایک مرثیہ سے مصائب کے چند بند درج کیے جاتے ہیں۔

محل مصائب یہ ہے کہ امام حسینؑ میدان میں شہید ہو چکے ہیں اور فوج یزید اپنی اس ظاہری فتح کی خوشی کا باجے بجا کر اعلان کر رہی ہے۔ یہاں سے ملاحظہ ہو:

باجے بجے جو فتح کے میدان میں ادھر
ناموسِ مصطفیٰؐ کو ہوئی اس کی تب خبر
خیمہ سے نکلی پیٹتی زینبؑ برہنہ سر
ناگاہ قتل گاہ میں پہنچی وہ نوحہ گر
دل غم سے خون ہوگیا زہراؑ کی جائی کا
دیکھا بہن نے نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا

چلائی سر کو پیٹ کے ہے ہے یہ کیا ہوا
زہراؑ کا لعل فدیۂ راہِ خدا ہوا
دو دن کا پیاسا امتِ جد پر فدا ہوا
سید کا تن سے فرق مبارک جدا ہوا
کیا جلد سر جدا ہوا حق کے فدائی کا
دیدار بھی میں دیکھنے پائی نہ بھائی کا

پانی نہ تا بہ ذبح ملا وا مصیبتا
خنجر سے کاٹا خشک گلا، وا مصیبتا
تنہا جہاں سے کوچ کیا، وا مصیبتا

خواہر کو کیوں نہ ساتھ لیا ، وا مصیبتا
ہونے کو قید زینبؑ مغموم رہ گئی
دیدار آخری سے بھی محروم رہ گئی

ناگاہ آئی حلق بریدہ سے یہ صدا
بس صبر اے بہن کرو ، میں تم پہ ہوں فدا
خیمہ میں جاؤ ، حفظِ خدا میں تمہیں دیا
ہوویں گے قید اب حرم پاکِ مصطفیٰ
رنج و غم والم سے ہمیں کب فراغ ہے
مر کر بھی تم بہنوں کی اسیری کا داغ ہے

پیٹیں یہ سن کے خیمہ کو زینبؑ بصد فغاں
روتی تھیں در پہ سر سے یوں ساری بیبیاں
رو رو کے پیٹ پیٹ کے ان سے کیا بیاں
لو بیبیو ، شہید ہوئے شاہِ انس و جاں
نیزے پہ سر علم ہے شہِ تشنہ کام کا
ماتم کرو حسینؑ علیہ السلام کا

(مرثیہ "...... جب ہلالِ محرم عیاں ہوا" در حالِ حضرت امام حسینؑ)

اسی مرثیہ سے جناب علی اکبرؑ کی شہادت کے مصائب میں چند بند ملاحظہ ہوں
جناب علی اکبر میدان جنگ میں گھوڑے سے گر چکے ہیں اور امام حسینؑ کو سلام آخر
کرنے کے لئے صدا بلند کی ہے جسے سن کر امام نے بے تاب ہو کر مقتل میں جناب علی اکبر کے
پاس پہنچ کر انھیں مخاطب کیا ہے۔

جس دم سنی صدائے شہنشاہ بحر و بر
بیٹے نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخ پدر

ناگاہ پہنچے خیمہ کے در پہ شہِ زمن
بانہیں گلے میں ڈال کے رونے لگی بہن
بھائی سے کی یہ عرض بصد صدمہ و محن
فرمایئے کہاں ہے مرا شیرِ صف شکن
غربت میں آس میرے بڑھاپے کی توڑ کے
تنہا حضور آئے ہیں لاکھوں میں چھوڑ کے

شہ نے کہا میں کیا کہوں اے زینبِ حزیں
تم سن سکو گی حالِ علی اکبرِ حسیں
آتا پدر کے ساتھ وہ کس طرح مہ جبیں
آرام کر رہا ہے تمھارا وہ نازنیں
غفلت بڑی ہے خواب کی اس نورِ عین کو
چھوڑا ہے دشمنوں میں اکیلا حسینؑ کو

کیا پوچھتی ہو مجھ سے کہ اکبرؑ کدھر گئے
سینہ پہ برچھی کھا کے جہاں سے گزر گئے
بیکس پدر کے گھر سے وہ دادی کے گھر گئے
پیری میں اے بہن ہمیں برباد کر گئے
غربت میں آ کے لٹ گئی دولت حسینؑ کی
مقتل میں وہ پڑی ہے بضاعت حسینؑ کی

(مرثیہ "۔۔۔ پہ جب ہلالِ محرم عیاں ہوا" در حالِ حضرت علی اکبر و امام حسینؑ)

تبصرہ:

حضرت فاخر نے مرثیہ گوئی میں اپنے عم معظم اور استادِ محترم حضرت ماہر کی شاگردی اور جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے اپنے مرثیوں اور غزلوں میں بعض جگہوں پر حضرت ماہر

اور ان کے فیوض سخن کا ذکر کیا بھی ہے۔ چنانچہ ایک مرثیہ کے مقطع کے بند کی بیت ملاحظہ ہو

یہ فیض طبع کا ہے یا یہ فیض ماہر ہے
پر اب معین سخن ہے نہ کوئی ناصر ہے

(مرثیہ پھر آج بحر طبیعت کو جوش آیا ہے)

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مرثیہ انھوں نے حضرت ماہر کے انتقال کے بعد ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان کہا تھا۔

اسی طرح ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں

ملا عروج یہ فاخر کو شعر گوئی میں
جناب ماہر عالی وقار کے باعث

امام حسینؑ سے ان کی زبردست عقیدت اور اس عقیدت کی سرشاری نے اس صنف سخن یعنی مرثیہ میں ان کے کلام میں بڑا زور پیدا کر دیا تھا اور ان کی فکر کو بلندی، تخیل کو قوت، زبان کو فصاحت و بلاغت اور نظم کو سلاست اور روانی عطا کر دی تھی۔ روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات سے حسن کلام کو بڑھا دینا، صنائع و بدائع کا کثرت اور معتدل استعمال، محاکات و مکالمات، نفسیات و منظر نگاری میں تغزل کی ہلکی سی آمیزش، ان سب خوبیوں نے زبان و بیان کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ رزمیہ میں ان کا زور کلام اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور مصائب کے بیان میں بڑی حد تک حفظ مراتب کے ساتھ دل کو تڑپا دینے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔

ایک مرثیہ نگار کے کلام میں یہ خوبیاں اس کو رفیع و اعلیٰ منزل پر فائز کر دیتی ہیں۔ ایسے ہی اسباب کی بنا پر خاندان اجتہاد میں حضرت فاخر کا اعتبار قائم ہو گیا تھا اور میر نفیس اعلیٰ اللہ مقامہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

ان حقائق کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اپنے عہد میں حضرت فاخر کا مرتبہ بحیثیت مرثیہ نگار بہت بلند تھا۔

## رباعی:

رباعی فارسی کے آدم الشعرا رودکی کی ایجاد ہے جس کو ایران کے مشہور شاعر خیام نے شہرت و مقبولیت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ مگر برصغیر میں ابتداءً رباعی کا سراغ نہیں ملتا یا بہت کم ملتا ہے غالباً اس لئے کہ اپنی نہایت مشکل بحروں کی وجہ سے عام شعراء کے لیئے اس میدان میں کامیابی کے ساتھ قدم رکھنا تقریباً ناممکن تھا اور اب بھی ہے۔ اس کے لیئے طویل مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو کہ رباعی اردو میں مقبول نہ ہوسکی۔ مگر مرثیہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو شعراء نے رباعی کو بھی ترقی دی۔ چنانچہ اس کی ایک روایت بنا دی گئی کہ مرثیہ گو مرثیہ پیش کرنے سے پہلے دو چار رباعیاں ضرور پیش کرتا تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی مرثیہ گو کوئی رباعی نہ پیش کرسکا تو اس سے نہایت شائستہ، مہذب اور مؤدبانہ لہجے میں کوئی شخص کھڑے ہوکر درخواست کرتا تھا کہ اگر آپ اس مرتبہ کی وجہ سے رباعی نہیں کہہ سکے تو اب کہہ لیجئے۔ شاعر کے لیئے یہ بڑا نازک وقت اور اس کی صلاحیتوں کا بڑا سخت امتحان ہوتا تھا۔

میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ کی طرح رباعی کو بھی اوج و عروج عطا کر دیا۔ مرزا دبیر ایک مجلس میں "یہ مال فقیر آیا ہے" اور "دبیر آیا ہے" کی زمین میں نئی رباعی ضرور پیش کرتے تھے۔ یہ رباعیاں بہت دلچسپ ہیں اور اس صنف سخن کے لیئے سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ رباعیاں بھی بہت دلچسپ ہیں جو میر انیس اور مرزا دبیر ایک دوسرے کے جواب میں اسی زمین میں کہتے تھے جس میں نئی نئی رباعی کا جواب دینا ہوتا تھا۔

مرثیہ گو شعراء نے رباعی کو کسی ایک مضمون کا پابند نہیں رکھا۔ اخلاقیات سے تعلّی تک اور الٰہیات سے امور دنیوی تک سب کچھ رباعی کے مختصر سے چار مصرعوں میں سمیٹ لیا مگر پیری کا موضوع زیادہ مقبول ہوا۔

ہر مرثیہ گو کی طرح حضرت فاخر نے بھی رباعیات کہیں جن میں سے تقریباً پچاس رباعیاں دستیاب ہوسکی ہیں ان میں سے بعض رباعیوں کے اوراق بالکل خستہ اور کرم خوردہ …

ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان میں سے جو رباعیات پڑھی جا سکیں انھیں یہاں ضرور درج کردوں تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ حضرت فاخر نے ہر موضوع پر رباعیاں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ اگر ان کی ساری رباعیاں دستیاب ہوتیں تو ایک بڑا ذخیرہ ہوتا۔ بہر حال جو دستیاب ہیں وہ ملاحظہ ہوں۔ معذرت خواہ ہوں کہ ان رباعیوں کو عنوانات کے تحت یک جگہ جمع نہیں کیا

پیری

اس دکھ میں ملا مجھ کو نہ آرام کبھی ... آئے گی کسی کے بھی نہ یہ کام کبھی
پیری میں کہاں خواب جوانی کی بہار ... اس صبح کی ہوتی ہی نہیں شام کبھی

بلبل کی طرح نہ خوش بیانی آئی ... اک عمرِ دو روزہ کی کہانی آئی
کیا یہ بھی گیا وقت کوئی ہے فاخر ... پھر جا کے دوبارہ نہ جوانی آئی

مدح حضرت علیؑ:

بازوے نبیؐ ہے شہ ذیجاہ کا ہاتھ ... ہے پنجۂ ضیغم اسد اللہ کا ہاتھ
معراج میں باقی نہ رہا کوئی حجاب ... باہر ہوا پردہ سے ید اللہ کا ہاتھ

دنیا سے کوئی دم میں رواں ہوتا ہوں ... راہی طرف باغ جناں ہوتا ہوں
جاتے ہیں علیؑ لے کے مجھے جنت میں ... پیری میں نئے سر سے جواں ہوتا ہوں

ملک الموت:

ظلم و ستم و جور کیے جاتا ہے ... (قزاق) قضاق اجل داغ دیے جاتا ہے
فریاد ہے اے خالق جانِ عالم ... یہ تیری امانت کو لیے جاتا ہے

قناعت:

کچھ خواہشِ اقلیم نہیں راج نہیں — حرصِ علم و طبل نہیں ، تاج نہیں
دل فقر میں قانع کا غنی رہتا ہے — درویش ترا کسی کا محتاج نہیں

مدحِ حضرت علیؑ:

کہتا ہے جہاں فاتحِ خیبر کس کو — خالق نے کیا ساقیِ کوثر کس کو
یہ مرتبہ کعبہ میں کسے ہاتھ آیا — معراج ہوئی دوشِ نبیؐ پر کس کو

مرثیہ:

ذکرِ شہِ ذی جاہ سے وابستہ ہے — پھولوں سے گلستاں کی طرح بستہ ہے
ہر بند میں گلہائے مضامیں ہیں بہت — یہ مرثیہ فردوس کا گلدستہ ہے

اشکِ عزا:

اشکوں کی روانی کو نہ پائے دریا — یہ شور یہ دھارا تو دکھائے دریا
دل جوششِ رقت سے بھر آیا فاخر — دشوار ہے کوزہ میں سمائے دریا

مجلسِ عزا:

ذکرِ شہِ والا کی جو باری آئی — فردوس سے زہراؑ کی سواری آئی
مجلس میں سیاہوں کے چلے ہیں جھونکے — گلزار میں یا بادِ بہاری آئی

مجلسِ عزا:

کچھ فکر نہیں ، شاد یہاں ہر دل ہے — کونین کی اس وقت خوشی حاصل ہے
ہوں پاک گناہوں سے نہ کیوں اہلِ عزا — مجلس نہیں فردوس کی یہ محفل ہے

شکایتِ زمانہ:

مرنے پہ زمانہ ہوا دشمن کیسا — احباب ہیں خوش ، نالہ و شیون کیسا
گریاں تھی فقط شمع لحد پر فاخر — ہنستا ہے چراغِ سرِ مدفن کیسا

پیری.

کیا کیا نہ ضعیفی نے ستایا مجھ کو پیری کا مگر دھیان نہ آیا مجھ کو
بے وقت جوانی میں ہوئے بال سفید آئینہ تحیر نے دکھایا مجھ کو

سب عمر گناہوں میں بسر ہوتی ہے کچھ بھی نہ جوانی کی خبر ہوتی ہے
اب آمدِ پیری میں یہ غفلت کیسی اٹھ خواب سے غافل کہ سحر ہوتی ہے

جس کی تھی ہوس وہ زندگانی گزری دو دن کی بھی اب راحت فانی گزری
ہشیار کہ پیری میں اجل اب ہے ضرور طفلی گزری تری جوانی گزری

مدح حضرت علیؑ

افلاک سے بھی اوج میں بالا ہیں علیؑ جو بحرِ امامت ہے وہ دریا ہیں علیؑ
مولود سے آبرو بڑھی مولد کی کعبہ ہے صدف، گوہرِ یکتا ہیں علیؑ

ہو یاد غم سبط پیمبرؐ جس میں لازم ہے رہے دہشتِ محشر دل میں
بے کار ہے یہ خمس و نماز و روزہ ذرہ نہیں گر الفتِ حیدرؑ دل میں

اوصاف عیاں ہیں فاتح خیبر کے ہیں مالک و مختار خدا کے گھر کے
کعبہ میں ہوا اوج دوبالا ان کا تھے دوشِ محمدؐ پہ قدم حیدرؑ کے

بدگو:

کہنے دو برا کہتے ہیں جو، اچھا ہے ہم دیں نہ جواب، اس میں برائی کیا ہے۔
خاموش ہی رہتے ہیں بدی بھی سن کر الکن کی طرح منھ میں زباں گویا ہے

دستگیری:

جلدی رہِ وحشت سے نکالو مجھ کو — آفت سے صراط کی بچالو مجھ کو
اے دستِ الٰہ دستگیری ہے ضرور — گرتا ہوں جہنم میں، سنبھالو مجھ کو

سفرِ عدم:

اٹھتے ہی جہاں سے کوئی دم میں پہنچے — حیرت ہے کہ کب باغِ ارم میں پہنچے
کیا حال کھلے دارِ بقا کا فاخر — بند آنکھیں کیے ملکِ عدم میں پہنچے

مدحِ علیؑ:

دولت کا نہ طالب ہوں نہ زر کا ہوں میں — خواہاں تری رحمت کی نظر کا ہوں میں
شاہوں پہ نہ کیوں فخر و مباہات کروں — درویش درِ علم کے در کا ہوں میں

مجلسِ عزا:

ممکن نہیں انساں سے ثنائے شبیرؑ — لے جائے گی جنت میں ولائے شبیرؑ
شرکت ہوئی مجلس میں، گنہ دور ہوئے — کیا خوب ہے یہ بزمِ عزائے شبیرؑ

پیری:

طفلی میں تمنائے بقا ہوتی ہے — امید جوانی کی سوا ہوتی ہے
پیری میں نہ کیوں روح ہو فاخر تحلیل — ہر شمع دمِ صبح فنا ہوتی ہے

پیری میں مری سیف زبانی نہ رہی — پہلی سی طبیعت میں روانی نہ رہی
تن سے نظر و تاب و تواں نے یہ کہا — ہم بھی نہ رہیں گے جو جوانی نہ رہی

جوانی:

بے فکر جہاں میں زندگانی نہ رہی — گھر عیش کا یہ سرائے فانی نہ رہی
غفلت سے سرِ شام تو سونا کیسا — جھپکی نہ پلک بھی کہ جوانی نہ رہی

پیری.

کس دن نہ خیال غم احباب آیا    گرداب بلا میں دل بے تاب آیا
راحت کی جوانی میں، قضا پیری میں    بیدار رہے شب کو، سحر خواب آیا

جوانی:

یک رنگ نہ ابنائے زماں میں پایا    کب موسم گل فصل خزاں میں پایا
کی تابہ لحد قد خمیدہ نے تلاش    گم گشتہ جوانی کو جناں میں پایا

پیری:

ہے موت ضرور ہر فانی کے لیئے    بیکار ہے رنج زندگانی کے لیئے
بے وجہ نہیں شیب میں سر ہلتا ہے    پیری متاسف ہے جوانی کے لیئے

عزائیہ رباعی:

صدمے جو بہت اہل جفا دیتے ہیں    دل قبر میں حیدر کا دکھا دیتے ہیں
گرمی سے جو آتا ہے پسینہ شہ کو    آ آ کے پر تیر ہوا دیتے ہیں

سلام ونوحہ:

رثائی ادب میں سلام غزل کا نعم البدل ہے۔ اس کی ہیئت بھی غزل ہی کی ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعے اور ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ ابتدائی اشعار میں عموماً اخلاقی مضامین اور محمدؐ وآل محمدؐ کی مدح وغیرہ ہوتی ہے۔ تعلّی بھی ہوتی ہے اور آخر کے چند اشعار کربلا سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس صنف سخن کی ترقی بھی مرثیہ کی بدولت ہوئی۔ مرثیہ گو کے منبر پر جانے سے پہلے ایک دو حضرات پیش خوانی کے طور پر منبر سے سلام پیش کرتے تھے۔ اس سے سامعین منبر کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، مجلس کا ماحول بن جاتا تھا، اور مرثیہ خواں کے لیئے فضا ہموار ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد خاندانِ اجتہاد نے مسالمہ ایجاد کیا جو

مشاعرے کے طرز پر تحت طرح میں غزلوں کے بجائے سلام پیش کیے جاتے تھے۔ ایام عزا میں چونکہ مشاعرے منعقد نہیں کیے جاتے تھے اس لیے ان کی جگہ مسالموں نے لے لی۔ خاندانِ اجتہاد کے جو افراد انگریزوں کے خوف سے پناہ سید الشہدا میں چلے گئے تھے اور کربلائے معلی میں مقیم ہوگئے تھے انھوں نے وہاں مسالمے منعقد کرنا شروع کیے کیونکہ اس مقدس سرزمین پر مشاعرے اور غزل خوانی اس کی عظمت و تقدس کے خلاف تھی۔

یہ صنفِ سخن یعنی سلام اور اس کے حوالے سے مسالمے بہت مقبول ہوئے۔ آج بھی شعرا با توفیق مذہب و ملت سلام گوئی میں مصروف ہیں اور طرحی و غیر طرحی مسالموں کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے۔

[illegible] و دبیر اور ان کے بعد کے زمانے کے مرثیہ گو شعرا نے کثرت سے سلام کہے۔ بیشتر شعرا کے سلاموں کے دیوان بھی شائع ہوئے۔ حضرت فاخر کا بھی ایک ضخیم دیوان شائع [illegible] لکھنؤ میں میرے [illegible] تھی لیکن میرے لکھنؤ چھوڑ دینے کے بعد بیشتر [illegible] میں میرے [illegible] (۲۲) نواب سید محمد [illegible] صاحب باقر [illegible] کتب خانے کی [illegible] بھی شامل تھیں۔ مگر خوش قسمتی سے حضرت فاخر کے سلاموں کے دیوان کا ایک نسخہ لکھنؤ میں محترم جناب سید محمد رشید صاحب قبلہ کے پاس محفوظ ہے جس کے متعلق انھوں نے خود مجھے بتایا تھا۔ میرے پاس چند سلام کسی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں جن میں سے بعض کے اوراق خستہ و کرم خوردہ ہیں اور بعض نمی کی وجہ سے خراب ہوگئے ہیں۔ میں نمونہ کلام کے طور پر انھیں میں سے چند سلاموں کے کچھ اشعار پیش کر رہا ہوں۔ ان اشعار کے مطالعے سے قارئین کرام کو محسوس ہوگا کہ زبان و بیان کے حسن کے ساتھ خیال کی بلندی اور مضمون آفرینی ان کے سلاموں میں بھی بھرپور طور پر موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

سلام نمبر ۱:

[illegible] تھی — [illegible] حسین [illegible] تھی

عقی جو قتل ہوئے غل ہوا یہ مسجد میں — خموش خانۂ حق کا چراغ ہوتا ہے

ہو داغ دل سے نہ کیونکر فروغ داغ جگر — کہ اک چراغ سے روشن چراغ ہوتا ہے

شہید کرتے ہیں تیروں سے شہ کو اہل دمشق — ہوائے شام سے گل اب چراغ ہوتا ہے

خیال ظلمت مرقد ہو کیا مجھے فاخرؔ
مثال بدر غم شہ کا داغ ہوتا ہے

میں نے اختصار کے خیال سے صرف پانچ سلاموں سے اقتباسات دیئے ہیں جبکہ میرے پاس کوئی بیس پچیس یا کچھ زائد سلام ہوں گے۔ نمونۂ کلام کے لیے اتنا ہی کافی ہے اور مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام اس کے مطالعہ سے حضرت فاخرؔ کے استادانہ کلام، بلندی تخیل، ورزبان و بیان کے حسن کے علاوہ مضمون آفرینی، جدت خیال اور زور سخن کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں نے اشعار کے انتخاب میں کوئی خاص معیار پیش نظر نہیں رکھا۔ ان اشعار کو تو چھوڑنا ہی تھا جو کاغذ کی خستگی، کرم خوردگی یا پانی کے اثر سے قابل مطالعہ نہیں رہ گئے ہیں۔ باقی اشعار میں سے سرسری مطالعہ سے کچھ شعر لے کر یہاں نقل کر دیے۔ میری صحت تفصیلی مطالعہ اور انتخاب کی اجازت نہیں دیتی۔

## نوحہ گوئی:

اردو میں قطب شاہی خاندان کے دور حکومت میں عزائیہ ادب کے آغاز ہی سے نوحہ گوئی رائج ہوگئی تھی۔ نوحہ سلام سے اس حد تک مختلف ہے کہ نوحہ میں اول سے آخر تک بیانیہ اور عزائیہ اشعار ہوتے ہیں۔ دوسرے مضامین کو اس میں جگہ نہیں دی جاتی۔ دوسرے یہ کہ گو عموماً نوحہ ابیات کی صورت میں کہا جاتا ہے جس میں سلام کی طرح مطلع کے دونوں مصرعے اور ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے مگر نوحہ اس ہیئت تک محدود نہیں ہے۔ وہ مثلث، مخمس اور مسدس میں بھی کہا جاتا ہے۔ مستزاد کی صنعت بھی اس میں استعمال ہوتی ہے اور کسی خاص واقعہ کے بیان میں ایک مسلسل نظم کی صورت میں بھی ہوتا ہے جسے روایت کہتے ہیں۔ ایک زمانہ میں نوحہ گوئی کا رواج بہت تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ اس کی جگہ سلام رائج

ہو گئے اور ماتمی انجمنوں نے نوحوں سے زیادہ سلام پڑھنا شروع کر دیئے۔ مگر حال میں پھر نوحہ خوانی کا ذوق بڑھتا جا رہا ہے اور سامعین خصوصیت کے ساتھ عاشورا اور چہلم کے دن ماتمی انجمنوں سے نوحے سننا چاہتے ہیں۔

حضرت فاخر کی بھی نوحہ گوئی کی طرف خاص توجہ تھی اور اس صنف سخن پر بھی ان کو بڑی دسترس حاصل تھی۔

ڈاکٹر سکندر آغا مرزا اوج پر اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں

"مرزا اوج کے عہد میں فن نوحہ گوئی اور نوحہ خوانی اپنے عروج پر تھا۔ ان کے ہم عصر نواب سید محمد حسین عرف ننھن صاحب تمنا (برادر حضرت جاوید) سید فرزند حسین وزیر، نواب سید اسد حسین فاخر، نواب قمر الدین حیدر بہادر عرف نواب دولہا صاحب نفیس (خلف جناب نواب سراج الدولہ بہادر، مصنف تاج الملک) جس طرح دوسری اصناف پر قدرت رکھتے تھے اسی طرح نوحہ تصنیف کرنے پر بھی ان حضرات کو کمال حاصل تھا۔"

(مرزا محمد جعفر اوج۔ حیات اور ادبی کارنامے۔ ص ۲۰۹)

اس بیان میں ڈاکٹر سکندر آغا سے ایک غلطی یہ ہو گئی ہے کہ حضرت تمنا کے نام کے ساتھ نواب لکھا ہے۔ جناب محمد حسین صاحب تمنا خاندان اجتہاد کے فرد فرید تھے مگر خاندان کی اس شاخ سے تعلق نہیں رکھتے تھے جس کے افراد دولت دنیا کی فراوانی کے سبب اہل دولت میں شمار کیے جاتے تھے اور نواب کہلاتے تھے۔

بعض شعراء کرام نعت و منقبت کی طرح نوحہ گوئی کو بھی بہت آسان سمجھتے ہیں۔ آج کل تو بعض حضرات بیٹھے بیٹھے دو چار نوحے تصنیف کر دیتے ہیں۔ چونکہ اب بیشتر ان کا درجہ دنیا ہی میں وصول کر لیا جاتا ہے اس لیے قلم میں تیزی آ گئی ہے۔ لیکن اگر ان نوحوں کے شعری معیار اور معنویت پر نظر کی جائے تو ایسی صورت حال سامنے آتی ہے کہ خدا محفوظ رکھے۔

جناب محمود حسین صاحب تمنا لکھنوی معروف شعرا بلکہ اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ دولھا صاحب عروج نے حضرت تمنا کی نوحہ گوئی پر تبصرہ جو ان کے نوحوں کے ایک مجموعہ "جوش ماتم" کے حصہ اول کی ابتدا میں شامل ہے۔ اس سے نوحہ گوئی کے متعلق حضرت عروج کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو

"لوگ خیال فرماتے ہیں کہ نوحہ تصنیف کرنا بہت آسان ہے۔ میرے نزدیک یہ مشکل ہے۔ کیونکہ عورتوں کی زبان میں جذبات شاعری اور حسن بندش کا خیال رکھنا اور محاورات کا محل پر صرف کرنا اور واقعات کربلا کو شستہ کرنا، مضمون اور الفاظ کے حوالے کر دینا جن لفظوں کی روشنی میں مطلب اور بھی واضح طور سے نظر آنے لگے کوئی سہل بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں حضرت تمنا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے نوحوں کا ہر شعر بجائے خود معرکہ کا ایک نمونہ ہے اور ماتم شہدائے کربلا کا زبان حال سے اظہار کرتا ہے"۔ (جوش ماتم)

ڈاکٹر صفدر آہ نے مجموعی طور پر جن باکمال نوحہ گو حضرات کا ذکر کیا ہے ان میں حضرت فاخر کا نام نامی اور گرامی بھی شامل ہے۔ اس کے بعد انفرادی طور پر ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس عہد کا ایک اور درخشندہ و تابندہ ستارہ نواب سید اصغر حسین فاخر ہیں جنہوں نے نوحوں میں واقعات کربلا کچھ اس انداز اور لب و لہجہ میں لکھے ہیں کہ جب اور جس وقت پڑھے جاتے ہیں سامعین کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان کا ایک نوحہ جو نو اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں انہوں نے جناب سکینہ کی زبانی ان مظالم کو بیان کیا ہے جو بعد شہادت امام حسین ان پر کیے گئے۔ ملاحظہ ہو:

# قصیدہ:

قصیدہ ایک نہایت پرشکوہ اور شاہانہ ٹھاٹ کی صنف سخن ہے۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بڑے شان دار قصیدے کہے گئے ہیں۔ عربی میں شعرا زیادہ تر اپنے محبوب کی تعریف میں قصیدے کہتے تھے اور انعام و اکرام کے لیئے امراؤ سلاطین کی مدح میں بھی قصیدے کہتے تھے۔ فارسی میں زیادہ تر قصیدے امراؤ سلاطین کی مدح میں کہے گئے۔ معدودے چند قصیدے بزرگان دین کی شان میں بھی ہیں۔ اردو میں دونوں طرح کے قصیدے بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں سودا جیسا عظیم قصیدہ گو اپنے نعتیہ اور منقبتی قصیدوں کی بدولت عظیم قرار پایا۔ بعد کے دور میں خصوصیت کے ساتھ لکھنو میں عزیز، منیر، صفی، بہشتی اور دیگر شعرا نے عموماً صرف نعتیہ اور منقبتی قصیدے ہی لکھے اور ایسے ہی قصیدوں کی وجہ سے آج بھی قصیدہ گوئی کا فن زندہ و باقی ہے۔

یہی سبب ہے کہ لکھنو تک استاد ذوق کے علاوہ سارے قصیدہ گو شعرا نے نعتیہ اور منقبتی قصیدے ہی کہے۔ لیکن مرثیہ گو شعرا نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ میر انیس اور مرزا دبیر اور ان کے بعد کے بیشتر مرثیہ گو شعرا نے قصیدے نہیں کہے۔ لیکن مولانا مرتضیٰ حسین صاحب فاضل لکھنوی نے مرزا دبیر کے حالات میں ان کی قصیدہ گوئی کا بھی ذکر کیا ہے۔ (جواہر دبیر ص ۴۴)

حضرت فاخر نے چند قصیدے لکھے جو ان کے غزلوں کے دیوان اول میں موجود ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ قصیدے مشبب نہیں ہیں، مقتضب ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کو غزل کے نام سے دیوان میں شامل کیا گیا ہے۔ غالباً اس وقت یہی رواج تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ قصیدے ہی کہے جائیں گے، غزل نہیں۔

حضرت فاخر کے دیوان اول کے ابتدائی بارہ صفحات نہیں ہیں مگر صفحہ نمبر ۷ اور ۸ جو جلد سے لگ ہوئے ہیں۔ صفحہ نمبر ۷ پر امام زمانہ کی مدح میں ایک قصیدہ کے آخری تین شعر درج ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصیدہ صفحہ نمبر ۵ یا ۶ سے شروع ہوا ہوگا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صفحہ نمبر ۱ سے صفحہ نمبر ۵ تک بھی قصیدے ہی ہوں گے۔ صفحہ نمبر ۸ سے

جواز بھی مہیا کر دیا ہے۔ مثلاً

استقامت دین حق کی اب جہاں میں ہوگئی
قائم آل عبا صاحب زماں پیدا ہو

اس شعر میں قائم آل عبا سے دین حق کی استقامت ایک قوی دلیل ہے۔ یعنی چونکہ وہ پیدا ہوا ہے جو قیامت تک قائم رہے گا اس لیے اب دین حق کو استقامت حاصل ہوگئی اور وہ بھی قیامت تک باقی رہے گا۔

انبیاؑ و اوصیاؑ اک دن کریں گے اقتدا
پیشوا و مقتدائے دو جہاں پیدا ہوا

اس شعر میں مہدی کو پیشوا و مقتدائے دو جہاں اس لیے کہا کہ روایات، احادیث اور عقیدہ کے مطابق امام مہدی آخر الزماں کے ظہور کے بعد حضرت عیسیٰ اور بعض دیگر انبیاء و اوصیاء آپ کی اقتدا میں نماز ادا کریں گے۔ یہ حقیقت اس کا جواز ہے کہ آپ کو پیشوا و مقتدائے دو جہاں کہا جائے۔

تضمین بر غزل حضرت مظفر علی اسیر

حضرت فائق نے اور اساتذہ کی طرح بعض اساتذہ شعراء کے کلام پر تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ حضرت ماہر نے استاد جناب مظفر علی اسیر کی ایک غزل پر ایک تضمین بصورت مخمس کہی ہے جو دیوان میں شامل ہے جو درج ذیل ہے

تضمین غزل میں رنگ تخیل میں بھرتے ہیں
ہم پلہ یہ ثمن میں ذر بے بہا کے ہیں
یاقوت کے نگیں میں کرشمے خدا کے ہیں
ناخن جو لال لال ترے دست و پا کے ہیں
ٹکڑے حریر شعلۂ رنگ حنا کے ہیں
[illegible]

شہرے جہان میں تیرے جود و سخا کے ہیں
امیدوار کیا ہمیں لطف و عطا کے ہیں
زردار بھی گدا تری دولت سرا کے ہیں
جتنے ہیں پھول باغ میں کاسے گدا کے ہیں

حیلے حوالے اوروں سے جاکر بتایئے
بے کار وہم کا نہ غم و غصہ کھایئے
وسواس اپنے دل میں نہ کچھ اور لایئے
جمعہ اگر نہیں تو وہ شنبہ کو آیئے
شنبہ عبث ہے آپ کو، سب دن خدا کے ہیں

تھا باوفا تو سوگ لیا اس نے میرے بعد
کھانا جو آیا بانٹ دیا اس نے میرے بعد
دن رات آبِ اشک پیا اس نے میرے بعد
آب و طعام ترک کیا اس نے میرے بعد
جیتے ہیں خیر ہے کہ یہ روزے قضا کے ہیں

دنیا میں کام قیصر و خاقاں سے کچھ نہیں
مطلب ہمیں تکلف و ساماں سے کچھ نہیں
خواہش پلاؤ نان . . . . سے کچھ نہیں
لذت زبان کو نعمتِ الواں سے کچھ نہیں
بھوکے جہاں میں ہم تک آشنا کے ہیں

لطف و عطا و فیض میں ذرہ کمی نہیں
اوصاف اور، اور بہت ہیں یہی نہیں
بیٹا جو ہے جلی ہے یہ اس پر خفی نہیں

ہر چیز ہے خدا میں فقط عاجزی نہیں
سو نام ایک کم اسی باعث خدا کے ہیں

بوسے جو دیجیے تو دعائیں بھی لیجیے
غیظ و غضب نہ کیجیے ، غصے کو پیجیے
بیمار یہ ہیں شربت دیدار دیجیے
روشن جمالِ یار سے آنکھوں کو کیجیے
مشتاق دیر سے یہ نگینے جلا کے ہیں

ساماں ترا یہ دیکھ کے کیوں ہوں نہ شاد شاد
فرہاد و قیس کی مجھے آتی ہے شان یاد
چلتی ہیں دشت میں جو ہوائیں یہ بامراد
اٹھتے نہیں ہیں وادیِ وحشت میں گردباد
پردے یہ اے جنوں تری دولت سرا کے ہیں

شاہوں سے کم یہ کب ترے وحشی کا ہے جلوس
مجنوں کا پہلے اب ترے وحشی کا ہے جلوس
بارش میں کیا غضب ترے وحشی کا ہے جلوس
برسات میں عجب ترے وحشی کا ہے جلوس
بجتی ہیں بادلوں سے تو جھوڑے ہوئے ہیں

سودائیوں کو کوہ و بیاباں میں دیکھیے
رنگِ بہارِ صحنِ گلستاں میں دیکھیے
شیروں کو جا کے گنجِ شہیداں میں دیکھیے
دنیا کا حال گورِ غریباں میں دیکھیے
کشتے یہ سب غریب اسی بیسوا کے ہیں

دنیا میں عیش و راحت و آرام ہے کہاں

بے فکر رنج و چین سے کوئی نہیں یہاں
آرام گاہ ملک عدم پر ہے بے گماں
تکلیف کا طریق فنا میں نہیں نشاں
پیدل بھی شہسوار سمند قضا کے ہیں

سب سے جدا ہے آپ کے سودائیوں کا ڈھنگ
جسم برہنہ کا نہیں کچھ ان کو عار و ننگ
ہے رخت زیست ان کے بدن پر کمال تنگ
کیا خوش نما ہے جامۂ عریاں سے ان کا رنگ
تن پر نہیں ہیں داغ یہ بوٹے قبا کے ہیں

ہو نہیں گے شاد شاد وہ رخصت بھی گور سے
ظاہر رہے گی ان کی بشاشت بھی گور سے
خوش طبع نکلیں گے دم رجعت بھی گور سے
ہنستے اٹھیں گے روز قیامت بھی گور سے
کشتے ترے جو خندۂ دندان نما کے ہیں

اوصاف زلف یار کروں کیا بھلا رقم
خوشبو میں مشک و عنبر سارا ہے ان سے کم
کاندھے کے پاس دو ہیں یہ افعی زہر دم
کہتے ہیں جس کو بر بھی و پیچ و تاب و خم
یہ چار رکن مصرع زلف دوتا کے ہیں

بڑھ جائے کیوں نہ اور جلا اس کی نور سے
دونی ہے آب و تاب و ضیاء اس کی نور سے
خلقت ہوئی ہے سب سے جدا اس کی نور سے

ہے۔ ان کے مطبوعہ دیوانوں میں دیوانِ اول، دیوانِ دوم، دیوانِ سوم اور دیوانِ پنجم میرے پاس ہیں۔ دیوانِ اول و دوم و سوم حیرت انگیز طور پر میرے ہاتھ آئے۔ یہ تینوں دیوان جو ایک ہی جلد میں ہیں حضرت نسیم امروہوی اعلی اللہ مقامہ کوٹ ڈی جی، خیر پور میرس، سندھ سے مجھے جو انھوں نے مجھ کو عنایت فرمائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کوٹ ڈی جی سے مجھ کو ایک خط بھی لکھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کا متن درج ذیل ہے۔

"نسیم امروہوی، ادارۂ ترجمۃ القرآن، کوٹ ڈی جی، ضلع خیر پور میرس
(سندھ)

۲۶ مارچ ۱۹۸۱ء

عزیزم ساحر صاحب

'اس کوردہ میں جہاں اردو پڑھنے اور بولنے کا تصور بھی مشکل ہے' ایک ضرورت مند دیہاتی نہ جانے کہاں سے دیوانِ فاخر لے آیا جس میں تینوں دیوان ہیں مگر اول و ثالث قدرے ناقص ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر لے لینا مناسب سمجھا کہ شاید آپ کے پاس یہ مجموعہ نہ ہو۔ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد تحریر کریں کہ میں نے ٹھیک خریدا یا ایک بے کار کام کریں۔ خدا کرے مفید مطلب ہو۔

والدعا

(دستخط) نسیم امروہوی"

حضرت نسیم امروہوی کی یہ عطا میرے لیئے ایک گراں قدر تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ ان کو اس کا اجر عطا کرے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ حضرت فاخر کے یہ دیوان کوٹ ڈی جی جیسے سندھ کے علاقہ میں کس طرح پہنچے۔ ان کے حالات میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ وہ کبھی مرثیہ پیش کرنے یا کسی اور ادبی تقریب میں شرکت کے لیئے سندھ کے علاقہ میں آئے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ جس طرح لکھنؤ سے باہر سے حضرات لکھنؤ سے مختلف شعراء کا کلام لے

جاتے تھے اسی طرح سندھ کے کسی باذوق نے یہ دیوان حاصل کر لیے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ تالپور حکمران کے اسلاف میں سے کسی کے پاس یہ مجموعہ پہنچا ہو۔ ایک قوی امکان یہ ہے کہ حضرت فاخر کے بھانجے شاگرد اور شاعری میں ان کے جانشین دعبل ہند حضرت ذاکر جو مرثیے پیش کرنے کے لیے کئی سال تک خیر پور میرس (سندھ) جاتے رہے، یہ مجموعہ انھیں کی وساطت سے وہاں پہنچا ہو۔

اس مجموعے کے پہلے دیوان کے ابتدائی بارہ صفحے اور سرورق نہیں ہے۔ اس لیے نہ تو دیوان کا نام معلوم ہو سکتا ہے نہ سن اشاعت۔ اس میں ۲۰۹ غزلیں اور ۲۰۴ صفحات ہیں۔

دیوان دوم کا تاریخی نام گلشن منظوم ہے جس سے تاریخ ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتی ہے جو سرورق پر ہی درج ہے۔ صفحہ نمبر ۴۴ پر یہ عبارت درج ہے

"الحمد للہ کہ دیوان جناب مستطاب معلی القاب نواب سید اصغر حسین صاحب دام اقبالہ بتاریخ بست و ششم ماہ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ بقلم فضل علی عفی عنہ باتمام رسید۔ فقط"۔

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان کی تکمیل و اشاعت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی جبکہ اس کا آغاز ۱۳۰۰ھ میں ہوا تھا۔

دیوان فاخر جلد سوم کا نام تاریخی بھی گلشن منظوم ہے جس سے ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دراصل دیوان دوم و سوم ایک ہی دیوان کے دو حصے ہیں۔ ان کو جلد دوم اور جلد سوم میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

اس جلد سوم یا دیوان سوم میں حضرت فاخر نے ایک بالکل نئی صنعت سے کام لیا ہے۔ قوافی کا حرف آخر یعنی روی تو حسب قاعدہ حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ہے۔ اس کے بعد ردیف "ہو کہ نہو" ہے۔ یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس جلد کی ساری غزلوں کی ردیف "ہو کہ نہو" ہے۔ جیسے حق ہو کہ نہو۔ شاق ہو کہ نہو، فلک ہو کہ نہ ہو اور "ملک ہو کہ نہو" وغیرہ۔ یہ ایک منفرد بات ہے جو شاید اور کسی شاعر کے دیوان

میں نہ ملے۔

حضرت فاخر کا پانچواں دیوان جو کافی ضخیم ہے ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں بڑی تقطیع کے ۵۰۸ صفحات ہیں، صفحہ نمبر ۴۹۲ تک غزلیں ہیں۔ غزلوں کی تعداد ۴۰۴ ہے۔ ابتدا کے ۲۲ صفحات نہیں ہیں مگر آخر کے صفحات مکمل ہیں۔ صفحہ نمبر ۴۹۲ سے وہ عبارت شروع ہوتی ہے جس سے میں نے اس مضمون کا آغاز کیا۔ آخری صفحہ پر تصویر عالم پریس کی بعض کتابوں کا اشتہار ہے۔ اسی پریس سے یہ دیوان اور حضرت فاخر کے دوسرے دواوین بھی اس کے مالک داروغہ سید محمد عرف چھدن صاحب نے شائع کیے۔ صفحہ نمبر ۴۹۳ سے اس دیوان کی اشاعت کے سلسلہ میں قطعات تاریخ درج ہیں جو اس وقت کے تمام اساتذہ لکھنؤ کے کہے ہوئے ہیں۔ ہر قطعہ تاریخ میں سے اختصار کے پیش نظر یہاں صرف ایک ایک دو دو شعر درج کیے جا رہے ہیں اس لیئے کہ تقریباً سبھی قطعات متعدد اشعار پر مشتمل ہیں اور خاصے طویل ہیں۔

پہلے خود حضرت فاخر کے کہے ہوئے دو قطعات ہیں۔ وہ ملاحظہ ہوں:

ہے مدح سخن اپنی زباں سے مہمل ہو طبع کی تعریف کہ اس کا ہے محل
فاخر کہی تاریخ مسیحی سن میں "ہاں خوب چھپا پانچواں دیوان غزل"
۱۸۹۶ء

فکر تاریخ کی احباب نے میرے اکثر قصد فاخر نہ تھا، کہنے سے ہوا ان کے مگر
کی رقم میں نے بہت جد سن ہجری میں "آج دیواں کی ہے تعریف قلم کے لب پر"
۱۳۱۴ھ

قطعہ تاریخ از حضرت ذاکر (فرزند حسین صاحب) خواہر زادۂ حضرت فاخر

بہر سال طبع و توصیف سخن ذاکر نوشت "گوہر تاج تیمن زیب دیہیم کلام"
۱۳۱۴ھ

مطلع:

شعر دیواں کے لاجواب ہیں سب      جو فلک میں نہیں وہ اختر ہیں

آخری شعر

اپنی تعریف کے نہیں محتاج      "آپ رگ ہائے دل کو نشتر ہیں"

۱۳۱۴ھ

سعید مولوی سید ابوالقاسم صاحب عرف سید ابن صاحب تلمیذ جناب سید محمد اصطفیٰ صاحب خورشید لکھنوی۔ ۳۸ اشعار کی نہایت عمدہ نظم میں سے صرف مقطع جس میں مادہ تاریخ بھی ہے:

دی ندا ہاتف نے، کہہ دے اے سعید      "عشق کا دفتر چھپا ہے پانچواں"

۱۳۱۴ھ

شہرت سید باقر حسن صاحب عرف اچھے صاحب شاگرد و برادر زادۂ حضرت فصاحت:

"بے مثل ایک نظم جو ہے وادو دہ میں"      "فخر کا اب نیا ہے یہ دیوان یادگار"

۱۹۵۳ سنت      ۱۳۰۳ (فصلی)

شہرت فدا یہ بلبل دل اس سخن پہ ہے      "آفاق میں یہ ایک گلستاں ہے پُر بہار"

۱۸۹۶ء      ۱۳۱۳ھ

فصاحت جناب سید عباس حسن

ہوا یہ پانچواں طبع دیوان فاخر      جنھیں ذوق شعر و سخن ہو وہ دیکھیں

فصاحت جو ہے فکر تاریخ ہجری      لکھو "اب یہ ہے مستند شاعروں میں"

۱۳۱۴ھ

کاشف نواب سید علی خاں عرف ممن صاحب شاگرد جناب یوسف

یک کا لازمہ ہے اس میں تخرجہ      "بلبل باغ سخن کا زمزمہ"

۱۸۹۶ء

محشرؔ جناب کاظم حسین صاحب شاگرد جناب بندہ کاظم صاحب جاوید:

پئے تاریخ طبعش گفت محشرؔ "کلام شاعر بے مثل و نایاب"

۱۳۱۴ھ

نادرؔ جناب سید حیدر علی شاگرد و نائب داروغۂ سرکار جناب فاخرؔ:

طبع کی تاریخ نادرؔ نے کہی "واقعی یہ معدنِ مضموں ہوا"

۱۳۱۴ھ

نصرتؔ: جناب یعقوب علی خان:

کہی تاریخ ہاتف نے فلک سے "یہ اوج فاخر رنگیں بیاں"

۱۳۱۴ھ

وصلؔ منشی سید عاشق حسین صاحب تلمیذ جناب شادؔ لکھنوی معروف بہ پیر و میر۔

کیا تردد ہے تجھے لکھ یہی مصرع اے وصلؔ "فاخرِ سحر بیاں کا ہے یہ جادو گویا"

۱۳۱۴ھ

لکھ دے اے وصلؔ بدیہی مصرع "فاخرِ سحر بیاں کا دیواں"

(۱۳۰۴ فصلی)

(دیوان فاخرؔ۔ ج پنجم)

حضرت فاخرؔ کے چاروں دیوان یعنی اول، دوم، سوم اور پنجم جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں ان کا کاغذ اس قدر خستہ اور بوسیدہ ہو چکا ہے کہ ہاتھ میں اٹھاؤ تو ان میں سے بھوسہ جھڑنے لگتا ہے۔ غزلوں کے انتخاب کے لیئے اوراق کو ضائع کیئے بغیر الٹنا پلٹنا ممکن نہیں۔ اس لیئے جو بھی اشعار سامنے آ گئے وہ یہاں درج کروں گا۔ ان میں انتخاب کو کوئی دخل نہیں۔ حضرت فاخرؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی دیوان جو میرے پاس ہے میں نے اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیئے بٹر پیپر کے لفافوں میں رکھ کر جلد بندی کروائی تھی۔ اس لیئے وہ کسی حد تک محفوظ ہے۔

اس قلمی دیوان کی ابتدا میں حضرت فاخر کے ہاتھ کی تحریر حسب ذیل ہے:

"بتاریخ دوازدہم ماہ جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ شب جمعہ در دیوان ہذا غزلیات نو تصنیف آغاز تحریر شد در مقام کوٹھی کریمن صاحب واقع حضرت گنج من محلات شہر لکھنو متصل سکندر باغ، بخط خادم احقر الثقلین اصغر حسین عفی عنہ"

(قلمی دیوان)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دیوان کی تدوین کا آغاز بارہ جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ میں ہوا۔

## حضرت فاخر کی غزل گوئی کا انداز:

حضرت فاخر چونکہ خالصتاً مذہبی مزاج رکھتے تھے اس لیے ان کی غزلوں میں عشقیہ شاعری کی رنگینی بہت کم ہے۔ زیادہ تر اشعار مضمون آفرینی، اخلاقیات، عبرت انگیزی اور معرفت وغیرہ سے آئینہ دار ہیں۔ بیشتر غزلوں کے مقطعوں میں اور بعض غزلوں کے اشعار میں بھی نعت و منقبت کے مضامین شامل ہیں۔ زبان کا حسن اور بیان کی لطافت، مصرعوں کی رواں دواں بندشیں، فصاحت و سلاست اور عشقیہ مضامین میں بھی خیالات کی پاکیزگی ان کی غزلوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ستم و جور و جفا کا میں گلا کیا کرتا / اتنی سی بات پہ اس بت کو خفا کیا کرتا

کچھ آج کل سے میں نہیں مجنون و بادہ خوار / روزِ ازل سے مست و گریباں دریدہ ہوں

کب جھریاں پڑی ہیں یہ سر سے قدم تلک / پیری میں مثلِ کاغذ مسطر کشیدہ ہوں

کہتا ہے دامِ گیسوئے جاناں سے دل مرا / پھنسنے کا میں نہیں کہ غزالِ رمیدہ ہوں

نکلوں دو دستوں سے جہاں میں کماں کی طرح / فاخر عدو کے حق میں میں تیغ کشیدہ ہوں

جو آیا شام کو وہ صبح کو روانہ ہوا / سرائے دہر میں رہنا مسافرانہ ہوا

جو یاد آگئی یارانِ رفتگاں کی مجھے / مثالِ گردِ پسِ کارواں روانہ ہوا

مثالِ گل مجھے کانٹوں سے بھی محبت ہے / چنے جو خار چمن سے تو آشیانہ ہوا

وہ چھپ کے راتوں کا آنا تو یاد ہوگا تمھیں یہ کل کی بات ہے، تھوڑا ابھی زمانہ ہوا
نہ پوچھو حال مرا میں غبارِ صحرا ہوں اڑا کی خاک مری، قافلہ روانہ ہوا
رکھا نہ خرمنِ مضموں کو خوشہ چینوں نے کیا جو جمع تو خالی مرا خزانہ ہوا
بھلا رقیبوں سے تکرار آنے دیتے ہم تمھیں تو پاس ہمارا کبھی ذرا نہ ہوا
چڑھا کے سر پہ رقیبوں کو زک اٹھائی نا لو دیکھو کہتے تھے جو ہم، وہی ہوا نہ ہوا
کرو نہ شور ابھی خفتگانِ کنجِ مزار نہ کچی نیند میں مجھ کو جگاؤ، سونے دو
بجھ دیتا چراغِ قیس و فرہاد مرا نام و نشاں ایسا تو ہوتا
ہمیں بھی عاشقِ شیدا سمجھتے کبھی تم کو گماں ایسا تو ہوتا
مریں گے یاد شاعر تجھ کو فاخر غزل کا قدرداں ایسا تو ہوتا
خوب گھر گھر کے ابر گو برسا پر کہاں میرے دیدۂ تر سے
شکل دکھلا دے از برائے خدا اب تو ترسا نہ اے بت ترسا
ان کی باتوں میں جو کچھ درد کے پہلو نکلے دل بھر آیا مری آنکھوں سے آنسو نکلے
آہیں کھینچی ہیں، فغاں ہونے کو ہے آندھی آئی ہے، اذاں ہونے کو ہے
مجھ سے اک بت سے جو رستے میں ہوئی کچھ تکرار شیخ کعبہ سے تو بت خانہ سے ہندو نکلے
زلفِ جاناں پہ نہیں ذرۂ افشاں، دیکھو یہ چمکتے شبِ تاریک میں جگنو نکلے
کب سمجھتا ہے یہ سمجھانے کو دل تڑپتا ہے وہاں جانے کو
دامِ گیسو سے جدا دل نہ کرو کیوں رہا کرتے ہو دیوانے کو
فقیر گو ہیں پہ رہتا ہے دل غنی اپنا جہاں میں ہم کبھی حرص و ہوا نہیں کرتے
بیکسوں کا نہیں ہر روز ستانا بہتر دیکھو اچھا نہیں کرتے ہو، برا کرتے ہو
آتشِ ہجر لگاتے ہو ہمارے دل میں خانۂ حق کو جلاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو
منزلِ مہر ہوا اب یہ مکاں اے عیسیٰ آج وہ غیرتِ خورشید مرے گھر آیا
دام میں پھنس گیا یوں جا کے کسی ظالم کے پھر مرے پاس نہ پھر کر دلِ شیدا آیا

جانے دو جو ہوا سو ہوا اس کا ذکر کیا اچھا مری خطا ہی سہی، اب خفا نہ ہو
پیری میں زندگی کی ہو امید کس طرح فاخرؔ چراغِ صبح کا کیا اعتبار ہو
ایک پہلو میں رہے دل مرا بسمل کی طرح ایک پہلو میں رہیں آپ مرے دل کی طرح
کھاتا ہوں جب میں ترکِ ملاقات پر قسم فرماتے ہیں وہ ہنس کے، ترا اعتبار کیا
تھام لیتے ہیں وہ ہاتھوں سے کلیجہ اپنا ہم اگر تذکرۂ دردِ جگر کرتے ہیں
اس کی رحمت سے جو بخشش ہوئی ہم رندوں کی واعظوں کو ہوئی محشر میں ندامت کیسی
سینہ پہ آپ ہاتھ جو رکھ دیں تو ہو سکوں بس ہے یہی علاجِ دلِ بے قرار کا
آتا ہے گیسوؤں کا جو اس کے مجھے خیال رہتا ہوں مثلِ زلف پریشاں تمام رات
سمجھوں اسے بساطِ سلیماں سے بھی سوا دنیا میں آبرو سے اگر بوریا ملے
ہے جلوہ فگن گھر میں جو وہ رشکِ قمر آج اک چاندنی چھٹکی ہوئی آتی ہے نظر آج
کہتے ہیں وہ سن سن کے دلِ زار کی آواز آتی ہے یہ شاید مرے بیمار کی آواز

غزلوں کے شعر آپ نے ملاحظہ کیے۔ ان میں انتخاب کا دخل بہت کم ہے۔ پھر بھی ان میں حضرت فاخرؔ کی غزل کی وہ خصوصیات بہر حال نظر آتی ہیں جن کا ذکر میں نے اشعار کی ابتدا میں کیا تھا۔ ان کے پانچ مطبوعہ اور ایک قلمی دیوان سے ایسے سیکڑوں نہیں ہزاروں اشعار منتخب کیے جا سکتے ہیں جو ان کی غزل گوئی کا حسن اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

## وفات:

حضرت فاخرؔ کو اپنی زوجہ اولیٰ کی وفات کا بہت شدید صدمہ تھا جو ان کی سگی چچا زاد بہن بھی تھیں۔ اسی صدمہ سے وہ سل کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور آخری سانس تک اس سے شفا نہ ہوئی۔ اس کی وجہ سے غذا بہت کم ہو گئی تھی۔ پانی پینے کے اوقات بھی مقرر تھے۔ آخر کار اسی بیماری میں ماہ مئی ۱۹۰۹ء کو جو ربیع الثانی یا جمادی الاول ۱۳۲۷ھ کے مطابق ہے۔ حضرت فاخرؔ نے اپنے محل واقع پاٹا نالہ، لکھنؤ میں انتقال فرمایا اور اپنے خاندانی امام

# حضرت غفرانمآبؒ کی اولاد امجاد کے فیوض و برکات

حضرت غفرانمآبؒ اور ان کی اولاد کے فیوض و برکات برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں رہے اور کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف تک کے مومنین ان سے فیضیاب ہوئے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت غفرانمآبؒ نے جب دیکھا کہ اہل کربلا و نجف کو پانی کی سخت تکلیف ہے تو انھوں نے آصف الدولہ کو آمادہ کیا کہ کربلائے معلّٰی سے نجف اشرف تک ایک نہر کھدوائی جائے۔ آصف الدولہ نے اس کام کے لیئے اسی (۸۰) ہزار اشرفیاں دیں اور مجوزہ نہر بنا دی گئی جسے نہرِ آصفی کہا جاتا تھا۔

(۲) غفرانمآب کے سب سے چھوٹے فرزند کے زمانہ میں نہر آصفی جگہ جگہ سے پٹ گئی جس سے پانی کا مسئلہ پھر پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت سید العلماءؒ نے اس وقت کے بادشاہ محمد علی شاہ سے کہہ کے ڈیڑھ لاکھ روپیہ آقای سید ابراہیم، صاحب ضوابط الاصول کو بھجوائے جو اس وقت عراق کے سب سے بڑے عالم تھے اور انھیں کو نہر کی صفائی کے کام کی ذمہ داری دے دی۔

(۳) تیس ہزار روپیہ حضرت ابوالفضل العباسؑ کے روضہ کے نقرئی دروازوں کی تجدید اور ایوان طلائی تعمیر کے لیئے بھیجے۔

(۴) سامرہ میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے روضہ کی چہار دیواری بنوائی اور گنبد پر سونا چڑھوادیا۔

(۵) وہیں ایک مسافر خانہ فردوس کے نام سے بنوایا۔ (۶) حضرت حرؑ کی قبر پر ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔ (۷) نجف اشرف میں نہر حسینی نکلوائی۔ (۸) حضرت مسلم و ہانی کی قبر مطہر پر کوئی عمارت نہیں تھی، اس کے لیئے روپیہ بھجوایا۔ (۹) مسجد کوفہ خستہ ہوئی تھی اور کوئی مینارہ نہ تھا، اس کا انتظام کروایا۔

ان سب کاموں کے لیئے شیخ محمد حسین نجفی، صاحب جواہر الکلام کو رقوم بھجوائی گئیں۔

یہ چند خدمات ان کے فیوض و برکات کی بہترین مثالیں ہیں۔

خاتم المجتہدین حضرت جواد سید اجتہادی لکھنوی
(مولوی سید محمد کاظم عرف ننھے کاظم صاحب علی اللہ مقامہ)
۱۸۶۳ء تا ۱۹۲۱ء

عمل: جناب دلاور مرزا

حضرت جاوید اجتہادی لکھنوی

بشکریہ محترم جناب سید محمد تقی صاحب قبلہ خداداد
خلف رشید قدوۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ طاب ثراہ

مطابق ہے۔ (لکھنؤ کی شاعری۔ ص ۲۲۰)

## تعلیم و تربیت:

جاوید صاحب کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی جب ان کے پدر بزرگوار حضرت امید نے انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے ماموں نواب مولوی سید مہدی حسین صاحب ماہر نے ان کی پرورش کی ذمہ داری خود لے لی۔

ابتدائی تعلیم حسب قاعدہ گھر ہی میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم بھی اپنے بزرگوں سے حاصل کی جو جید علماء، فقہاء اور مجتہدین تھے۔

## علمی استعداد:

یہ تو حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی علمی استعداد کیا تھی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک علمی گھرانے کی فرد ہونے کی حیثیت سے یقیناً اعلیٰ علمی مدارج پر فائز ہوں گے۔ حضرت ماہر کے زیر تربیت ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت خورشید جیسے عالم فاضل کی شاگردی بھی نصیب تھی۔ یہ سب حقائق ان کی علمی استعداد کو شک و شبہ سے بالاتر ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس پر ان کے کلام کی گواہی مستزاد ہے۔

## ذریعۂ معاش:

لکھنؤ کے رئیس اعظم نواب مہدی حسین صاحب ماہر کی زیر کفالت ہونے اور پھر "مرزا العلماء مولوی سید ابو الحسن صاحب عرف بچھن صاحب قبلہ" کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیے جانے سے ان کی ابتدائی زندگی خوش حالی میں بسر ہوئی۔" (لکھنؤ کی شاعری ۲۲۰) حضرت ماہر کے انتقال کے بعد وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ بقول حضرت شمس منظر انھیں پریشانیوں کے سبب سے انھوں نے مرثیہ گوئی شروع کی جو ان کی زندگی کا [illegible] ذریعۂ حصول معاش ہو گیا تھا۔ (لکھنؤ کی شاعری۔ ص ۲۲۱) چونکہ [illegible] ان کا باقاعدہ [illegible] "لکھنؤ کی شاعری" میں حضرت شمس کا بیان

دلچسپی سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہو:

"(حضرت جاوید) مرثیے پڑھنے کے لیے دور دور بلائے جاتے تھے..... اور ہر جگہ سے معقول رقم ملتی تھی۔ جب واپس آتے تھے تو خوش حال ہو جاتے تھے۔ مرغ، تیتر، بٹیر دونوں وقت پکتے۔ ڈیوڑھی پردوں سے بھری رہتی تھی۔ کھانے میں اکثر شاگرد بھی شریک رہتے تھے۔ جب پیسہ ختم ہو جاتا تو وہی عسرت کا عالم ہو جاتا لیکن غیور اتنے تھے کہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے نہ کسی شاگرد سے کبھی طالب ہوئے۔ کبھی کوئی چیز گروی رکھ دی یا بیچ ڈالی۔ اسی سلسلہ میں اپنا آبائی مکان جو سرائے معالی خاں میں تھا بیچ ڈالا اور تھوڑی دور میں کرائے کے مکان میں اٹھ آئے جہاں مرتے دم تک رہے"۔ (ص ۲۲۲)

## ازدواجی زندگی اور اولاد:

حضرت جاوید کی شادی جناب پیارے صاحب حسین کی بہن سے ہوئی۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جب بیوی کا انتقال ہو گیا تو دوسری شادی نہیں کی۔ (لکھنؤ کی شاعری۔ ص ۲۲۰)

## حلیہ:

حضرت مہذب لکھنوی نے "مراثی" میں حضرت جاوید کی تصویر شائع کی ہے جو ان کی پرکشش شخصیت اور وجاہت کی آئینہ دار ہے۔ حضرت شمس نے ان کا حلیہ یوں بیان کیا ہے۔ "کتابی چہرہ، میانہ قد، گدیلا جسم، وجاہت اور شان چہرے سے نمایاں تھی۔ داڑھی کھچڑی تھی۔ جب سے بال سفید ہونے لگے تھے خضاب پابندی سے لگاتے تھے۔" (لکھنؤ کی شاعری۔ ص ۲۲۰) ان کی تصویر اس کتاب میں بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی۔

## لباس:

پنج گوشیہ ٹوپی، انگرکھا اس پر تکونا رومال، مشروع (مشروع) یک پچھ لٹھے کا جیب مار اور ڈوری کا

پمپ پہنتے تھے۔ ایک ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی۔

## اخلاق و عادات:

وہ نہایت خلیق، متواضع، منکسر مزاج اور صاف دل انسان تھے۔ سیکڑوں لطیفے یاد تھے۔ جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ کبوتر پالنے کا شوق تھا۔ خصوصاً شیرازی کبوتروں کا۔ ان کے یہاں نہایت عمدہ قسم کے رنگ برنگی کبوتر پلے تھے۔ جب ان کی ڈھبلیاں کھلتی تھیں تو ایک چلتا پھرتا بلکہ ہوا پر اڑتا ہوا باغ نظر آتا تھا۔ دنگل کے بہت شوقین تھے۔ پان کثرت سے کھاتے تھے۔ (لکھنؤ کی شاعری ص ۲۲۰)

## مزاجی کیفیت:

ان کا مزاج احتیاطی تھا۔ ہیضہ سے بہت ڈرتے تھے۔ میرا (راقم الحروف) کا ذاتی خیال ہے کہ حضرت خورشید سے جو ان کے باپ بھی تھے اور استاد بھی، چند جان کر ہیضہ میں مبتلا ہونے اور اسی بیماری میں انتقال کرنے کے واقعہ نے ان کو نفسیاتی طور پر بہت زیادہ متاثر کیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ ہیضہ سے ڈرنے لگے ہوں گے۔ چنانچہ اس مرض سے محفوظ رہنے کے خیال سے گرمیوں میں اور خاص طور پر فصل کی خرابی کے زمانہ میں احتیاطاً روزہ دیکھ کے کھانا کھاتے تھے۔ اکثر فاقہ کرتے تھے۔ سفر سے بھی بہت گھبراتے تھے حالانکہ مرثیے پیش کرنے کے لیئے دور دراز شہروں میں جانا ہوتا تھا۔ جب کہیں جانے لگتے تو کوئی شاگرد قرآن کے نیچے سے نکالتا اور وہ دعا میں پڑھتے دونوں بازوؤں پر دم کرتے گھر سے نکلتے تھے۔ (لکھنؤ کی شاعری۔ ص ۲۲۰۔۲۱)

## شاعری:

شاعری حضرت جاوید کی نمایاں ترین خصوصیت تھی اور اس میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ کسی حال میں فکر سخن سے غافل نہیں رہتے تھے اور مشق سخن جاری رہتی تھی۔ پیتل کا جالی دار قلمدان سامنے رہتا تھا جس میں قلم دوات اور جس کا چاقو، الائچیاں اور عطر کی شیشی رکھی

ہوتی تھی۔ حضرت مہذب لکھنوی نے "اسرارِ سخن" میں لکھا ہے کہ "اس میں کلام نہیں کہ حضرت جاوید نہایت پرگو اور زود گو شاعر تھے۔ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی"۔ (ص ۵۶)
شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ بڑے برجستہ شعر کہتے تھے۔ حضرت شمس کا بیان ہے کہ شعر کہنے میں انھیں فکر کی ضرورت نہ تھی۔ غزلوں کی غزلیں اس طرح کہہ ڈالتے تھے جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ انھوں نے اپنی بعض غزلوں کے مقطع میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ صفدر مرزا پوری ان کے شاگردوں میں تھے۔ انھوں نے ایک کتاب "بزمِ خیال" لکھی جس میں ان شعرا کا ذکر ہے جن کو انھوں نے دیکھا تھا۔ جاوید صاحب کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے کمالِ فن، سادگیِ طرز اور برجستہ گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب میں لکھنؤ میں آیا یہاں کے اکثر شعرا کاملین فن سے ملتا رہا۔ جس وقت میں نے دولھا صاحب جاوید سے ملا تو جس قدر میں نے شہرت سنی تھی اس کا دوگنا ظرف پایا۔ اتفاق سے ایک دن بزم سلام ہو رہی تھی کہ ایک صاحب سیاہ کپڑے پہنے ہوئے نمودار ہوئے۔ آپ نے کہا، صبح سے شام تک اصلاحیں دے کر یہاں آیا تھا۔ یہ بھی مرے ماتم میں سیاہ پوش ہیں۔ انھوں نے قریب پہنچ کر فرشی سلام کیا اور شعر اصلاح کے لیے سنایا۔ جاوید صاحب سنتے جاتے تھے اور اصلاح دیتے جاتے تھے۔ اتنے میں ایک دوسرے صاحب نازل ہوئے۔ انھوں نے ایک شعر اور ایک مطلع اصلاح کے لیے پیش کیا۔ مطلع تو مجھے یاد نہیں رہا۔ شعر یہ تھا

نہیں ہے اب کوئی جو ان کو دیکھے
حسیں اب کیا کریں سرمہ لگا کے

حضرت جاوید نے یوں اصلاح دی:

دمِ زینت خیال آتا ہے کس کا

حسین رو دیتے ہیں سرمہ لگا کے"
(بزم خیال)

صفدر مرزا پوری صاحب ایک واقعہ اور بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ایک دن جاوید صاحب میرے گھر سے جا رہے تھے۔ پانی برس کے نکل گیا تھا۔ راستہ میں کیچڑ بہت تھی۔ پاؤں کیچڑ میں پڑا اور چھینٹیں اڑیں۔ مولانا عشقی اور عزیزی طرب ساتھ تھے۔ آپ نے برجستہ کہا

جو چھینٹ پاؤں سے اڑتی ہے سر پہ آتی ہے
فلک کی طرح زمیں بھی ہمیں ستاتی ہے"
(بزم خیال)

## تلمذ:

شاعری میں وہ اپنے عم محترم اور استاد فن مولوی محمد مصطفیٰ عرف بدن صاحب خورشید کے شاگرد رشید تھے۔ انھوں نے اس عالم فاضل صاحب فن شاعر بے مثل غزل گو اور اعلیٰ پایہ کے مرثیہ نگار سے فیض حاصل کیا جس نے ان کی شعر و سخن کی فطری صلاحیتوں کو ایسی جلا دی کہ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے غزل گو اور نہایت اہم مرثیہ نگار کے طور پر ملک گیر شہرت کے مالک ہوئے۔

## تلامذہ:

حضرت مہذب لکھنوی نے اپنی کتاب "بازار سخن" میں ان کے تلامذہ کی ایک مختصر فہرست دی ہے اور "اسرار سخن" میں لکھا ہے کہ "شاگردوں کی مکمل فہرست کا بار مختصر صفحات اٹھانے کو تیار نہیں"۔ اس بیان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ کثیر التلامذہ تھے اور ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بقول حضرت مہذب بس اسی قدر کافی ہے کہ آپ مسلم الثبوت استاد تھے۔ آپ کے بعد بعض شاگرد بھی صاحب فن و صاحب تلامذہ گزرے ہیں۔ مثلاً جناب سید مجاور حسین صاحب تمنا مرحوم اور لڈن صاحب بہار مرحوم وغیرہم مگر مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے "انتخاب دیوان جاوید" میں ان کے کوئی پونے دو سو

شاگردوں کی فہرست دی ہے جو ان کے دیوان سے اقتباس ہے۔ ان میں سے تقریباً چالیس شاگردوں کو انھوں نے اپنے چچا زاد بھائی اور استاد زادہ جناب بنے صاحب اختر کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ ان کے کلام پر اصلاح دیا کریں۔ (ص ۲) ان کے شاگردوں میں ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں کے شعرا کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اس کے علاوہ بعض بہت معروف اور اہم شعرا بھی شامل تھے۔ مثلاً جناب کاظم حسین محشر جو قصیدہ گوئی میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور لکھنؤ کے بڑے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ اسی طرح نبیرۂ میر انیس علیہ الرحمۃ سید علی نواب صاحب قدیم، لڈن صاحب بہار، وجاہت حسین صاحب ناظم، نواب سرفراز علی خان صاحب شاکر، رئیس جانسٹھ جنھوں نے حضرت جاوید کے بہت سے مرثیے صاف کروائے اور جلد بندھوا کے محفوظ کیے تھے اور ان میں سے ایک جلد حضرت مہذب لکھنوی کو عنایت کی تھی۔ نیز جناب پھنگا صاحب حسین وغیرہ۔ ان سب نے شاعری میں بڑی شہرت حاصل کی اور پیشتر استادی کے درجہ پر فائز ہوئے۔

## مرثیہ گوئی:

مرثیہ گوئی حضرت جاوید کی امتیازی خصوصیت تھی۔ وہ اپنے وقت کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے بقول حضرت شمس مدظلہ غالباً اپنی مالی پریشانیوں کی وجہ سے مرثیہ گوئی اختیار کی تاکہ باعزت طریقہ سے معاش حاصل کر سکیں اور پھر مرثیہ گوئی میں اتنا بلند مرتبہ حاصل کیا کہ اس وقت کے مرثیہ گوئی کے شاہان سخن اور پنجتن پاک ایمان سخن میں ان کا شمار کیا گیا۔ چنانچہ حضرت انجم لکھنوی نے اس وقت کے اکابر مرثیہ گویوں کا ذکر اس رباعی میں کیا۔

اس عہد کے بس ہیں پانچ شاہان سخن
حقا کہ انھیں کے دم سے ہے شان سخن
جاوید و عروج و عارف و اوج و رشید
یہ پنجتن پاک ہیں ایمان سخن

حضرت شمس نے "تاریخ لکھنؤ" میں لکھا ہے کہ بندہ کاظم صاحب جاوید، علی محمد صاحب عارف، خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج مرزا محمد جعفر صاحب اوج اور پیارے صاحب رشید کا شمار صف اول کے اساتذہ میں تھا۔ یہ لوگ مرثیہ اس پایہ کا کہتے تھے کہ علامہ شبلی ایک دفعہ اوج و عروج کی مجلسوں میں شریک ہوئے تو کہا کہ لکھنؤ میں ابھی انیس و دبیر زندہ ہیں۔ (ص ۲۰۷) غزل گوئی کی طرح حضرت جاوید مرثیہ گوئی میں بھی ملک گیر شہرت رکھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کے لیے دور دور بلائے جاتے تھے۔ دو مرتبہ نواب رکن الملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ اصغرآباد، چندراول، جانسٹھ ضلع مظفر نگر، پٹنہ اور دیگر مقامات میں بھی آپ تشریف لے جاتے تھے اور کامیاب مجلسیں پڑھ کر واپس آتے تھے جن کا سکہ ابھی تک دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔

حضرت مہذب نے ان کے مرثیوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے

"آپ کے مراثی میں تغزل کا کافی ذخیرہ ہے۔ زبان بہت نرم، محاورات بکثرت اور روزمرہ کے دریا بہائے ہیں۔ تخیل کی نزاکت آپ کا حصہ تھی۔ جدید مضامین کی پیداوار آپ کا فطری جوہر تھا"۔ (ا۔ر۔ن۔ ص ۵۶)

خواندگی کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ نہایت سادہ تھی مگر پُر کیف تھی۔

## تعداد مراثی:

حضرت مہذب لکھنوی نے "اسرار محن" میں لکھا ہے کہ

"آپ کے بکثرت مراثی موجود ہیں جو مصنف مرحوم کی خوش نصیبی سے عالی جناب سید سرفراز علی خان صاحب تعلقہ دار رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر تک پہنچے اور خوب صاحب موصوف نے اپنی ادب دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت سلیقے سے مرثیے صاف کرا کے دو جلدوں میں تقسیم فرمائے ہیں جن میں سے ایک جلد حضرت مہذب کو مرحمت فرمائی"۔

(ص ۵۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جاوید کے متعدد مراثی حضرت مہذب کے ورثہ سے

مرثیہ نمبر ۳ میں ناقدریِ زمانہ کا ذکر ہے۔

مرثیہ نمبر ۴ میں صبح ہونے کا منظر اور بے پناہ تغزل ہے۔

آیئے اولاً پہلے مرثیہ کے چہرے کے کچھ بند ملاحظہ فرمایئے۔ مجھے اس مرثیہ کے اقتباسات نہیں دینا ہیں اس لیئے کہ کم یاب ہونے کے باوجود یہ مطبوعہ ہے۔ صرف چہرے کے چند بند مرثیہ کی اٹھان دیکھنے کے لیئے ملاحظہ ہوں۔ مطلع ہے۔

کون دنیا میں نہیں آج ثنا خواں میرا
بس کے جو دل میں رہے وہ نہیں ارماں میرا
دہر کی تیز ہوا سے نہیں نقصاں میرا
منہ چھپا لے گا چراغِ تہہِ داماں میرا
سوزِ غم بھی سببِ کارِ نمایاں ہو جائے
یوں نفس ہو تہہ و بالا کہ چراغاں ہو جائے

بند ملاحظہ ہو

میں وہ ہوں جس کو نہ اچھے نہ برے کی پروا
کون سی جا پہ نہیں نظم کا میری چرچا
میرے سائے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں ہوں یکتا
بارہا مہرِ جہانتاب نے کی کسبِ ضیا

کس قدر بلیغ اور خوبصورت بات کہی ہے۔ واہ۔ تعلّی میں یہ مضمون بالکل نیا ہے۔

سبحان اللہ۔

بارور پھر نہ ہو کس طرح یہ گلشن میرا
سو شعاعوں کے ہیں ہاتھ ایک ہے دامن میرا
سچ ہے قسمت پہ جو بنتی ہے بگڑ جاتی ہے خو
گردشِ چشم ہوئی اور نکل آئے آنسو

دل تڑپنے کے بتا دیتا ہے سو سو پہلو
اب یہ رونا ہے کہ ضائع کیا کیوں دل کا لہو

تیسرے اور چوتھے مصرع میں تغزل قابل داد ہے۔

نئے صدموں نے جہاں سے مجھے کھو رکھا ہے
انھیں اشکوں کے تو دریا نے ڈبو رکھا ہے

حسرتیں لے کے ابھی آئیں گے آنے والے
نقش باطل مجھے سمجھے ہیں مٹانے والے
دوست رکھتے ہیں مجھے میرے گھرانے والے
آفتاب اب مجھے کہتے ہیں زمانے والے

بیت ملاحظہ ہو۔

چاندنی چار ہی دن کی صفتِ بدر ہوئی
جب زوال آ گیا مجھ پر تو مری قدر ہوئی

کیا عمدہ بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

اب تو آنکھوں کی طرح سے چلے اشک کی جو ب
دل لہو ہوتا ہے جب سے نظر آتے ہیں وہ خواب
کوئی دے دیتا ہے فردوسی و طوسی کا خطاب
کوئی مردوں میں ملاتا ہے، یہ مٹی ہے خراب

نقش کی پاؤں سے جب دشت میں زنجیر ملی
میں یہ سمجھا کہ مرے خواب کی تعبیر ملی

مندرجہ ذیل بند کا دوسرا مصرع ملاحظہ ہو۔ حسن تعلیل کی کتنی خوبصورت مثال اور مضمون آفرینی اور جدت خیال کا کیسا کمال ہے۔

میرے راتوں کے تڑپنے کو نہ پوچھیں احباب

غیظ سے جس پہ جبیں ہو گیا تھا بستر خواب

اور بیت کے دوسرے مصرعے میں تغزل

کسی بلبل کو خبر تھی نہ کسی بلبل کی
بجلی آنے سے رگیں ٹوٹ گئی تھیں دل کی

تین بندوں کے بعد کا بند:

کوئی دم بھی نہیں صدموں سے مجھے اب تو فراغ
اب نہ پہلے سے خیالات نہ پہلا سا دماغ
مدتوں سے جو خزاں دیدہ ہے یہ ہے وہی باغ
ان ہی قبروں پہ جلا کرتے ہیں داغوں کے چراغ
آہیں بھرنے کی حقیقت نہ بتائیں ان سے
دور ہیں ان سے نفس کی بھی ہوائیں ان سے

اختصار کے ساتھ یہ بند اور مصرعے اس صورت حال کی تصویر دکھانے کے لیے کافی ہیں جس سے اس وقت وہ دوچار تھے۔

ایک دوسرے مرثیہ سے ناقدری زمانہ کی شکایت میں چھ بند۔ مطلع اور دوسرے بند میں حسن تغزل کے ساتھ انھوں نے اپنا ذکر کیا ہے پھر ناقدریٔ زمانہ کا۔ ملاحظہ ہو

مطلع

ہاں زباں پھر سے گہر ریز دہن ہو میرا
آج پھر طرۂ دستار سخن ہو میرا
بوئے گل ہوں، کسی گلشن میں وطن ہو میرا
اڑ سکے رنگ نہ جس کا وہ چمن ہو میرا
یکی دوری کی ہوا کو بھی نہ تاب آئے گی
سانس لینے میں بھی خوشبوئے گلاب آئے گی

لائقِ سیرِ احباء ہے یہ گلشن میرا
رنگ اڑانے لگا آخر گلِ سوسن میرا
گرد ہیں پھول تو ہے بیچ میں مسکن میرا
کھلتی کلیوں سے بسا جاتا ہے دامن میرا
ایسی خوشبو کا جو باطن میں اثر ہو جائے
وہی عارض کا پسینہ گلِ تر ہو جائے

کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

ن۔خدوں میں بہار [illegible] کیف ہے۔ اور اب ناقدری زمانہ

اس زمانہ میں نہیں مرثیہ گوئی کا مزا
جب توجہ نہیں لوگوں کو تو اچھا ہے برا
دل سے سنتا ہوں اسے بھی جو نیا ہے چرچا
تفرقہ یہ ہے کہ ہیں قلب کے ٹکڑے بھی جدا
سیکھ کے مجھ سے یہ فن صاحب ایجاد بنے
چار دن جن کو بتایا وہی استاد بنے

اک تو آفات سے اب ہوش نہیں میرے بجا
دوسرے لے گئی احباب کو چن چن کے قضا
تیسرے یہ کہ جو اچھے ہیں وہ کہتے ہیں برا
چوتھے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت ہیں خفا
مرثیہ ست ہے، یہ سن لیا چرچا میں نے
اپنی تقدیر کا لکھا ہے جو لکھا میں نے

جو کہ منصف ہیں کہیں گے یہ ہے عذر بے جا
سارے احباب کی توضیح نہیں ہے زیبا

ڈھونڈنے سے بھی نیا کوئی نہ مضمون ملا
یا یہ ہے ذہن کی یا میرے مقدر کی خطا
جودت طبع کو اب مجھ سے جدا بھی تو کہے
خیر، اچھا کہا جس نے وہ برا بھی تو کہے

کیا برجستہ اور رواں مصرع ہے۔

آبلے سینہ میں ہیں چند نہاں چند عیاں
نہیں معلوم کہ اب آتے ہیں وہ لوگ کہاں
ایسے ہم عصر ہوئے خاک کے پردے میں نہاں
ڈھونڈنے کو جنھیں آنسو ہوئے آنکھوں سے رواں
مضطرب ہوتا تھا دل جب کبھی کم ملتے تھے
دفن وہ ہوتے تھے اور خاک میں ہم ملتے تھے

مندرجہ بالا بند کا چوتھا مصرع نازک خیالی کا ایک حسین مرقع ہے اور حسن تعلیل میں بالکل نئی بات ہے۔ اسی طرح چھٹے مصرع میں زبان کا حسن قابل داد ہے۔ اگلا بند ہے

اس کا کیا ذکر ہے دنیا کا یہی ہے معمول
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے یہ عالم کا اصول
آرزوؤں کا چمن لٹنے سے ہے طبع ملول
جب فشار ان پہ ہوا قبر پہ مرجھائے پھول
ہم بھی ویرانوں میں لے کر دل ناشاد آئے
چادر قبر کو دیکھا تو وہ گل یاد آئے

اس کے بعد کا ایک بند نمبر ۸ چھوڑ کر دوسرے بند کی ہیئت میں گریز کی طرف اشارہ ہے اور بند نمبر ۱۱ سے مرثیہ کربلا کی طرف مڑ جاتا ہے۔

آ گیا یاں یہ مجھے اور ہی بے کس کا خیال
(مرثیہ در حال [illegible])

کیا ابھی صبح کا تارہ ہے حبابِ لبِ جو
نشترِ غم دلِ ہر جن و ملک میں ڈوبا
نہر میں یہ تو وہ دریائے فلک میں ڈوبا

صبح کا نور بڑھا جب تو ضیا بھی آئی
آئینہ جاگنے والوں کو دکھا بھی آئی
ہر گلِ تر میں نزاکت بھی ادا بھی آئی
بے بلائے ہوئے گلشن میں ہوا بھی آئی
اور بھڑکانے پر اس نے تو کمر باندھی ہے
آتشِ گل کو تو کم کم بھی ہوا آندھی ہے

ہے بڑی بات کہ معشوق نہیں برسرِ جور
جو کہ عشاق میں بینا ہیں وہی کرتے ہیں غور
یوں تو ظاہر میں ہر ایک پھول کا ہے ایک ہی طور
بو یہ کہتی ہے کہ یہ اور ہے وہ پھول ہے اور

کیا کہنا۔

اور نظارۂ گل کر لیں کوئی دم آنکھیں
پھر کہیں چھپیں کہاں ہجر میں پُرنم آنکھیں

کیا تغزل ہے۔ سبحان اللہ۔

واہ آغاز میں بھی ہو گیا انجام کہیں
روئے گل دیکھتے ہیں عاشق بدنام کہیں
کھولے ہے سنبلِ تر زلفِ سیہ فام کہیں
ایک گلشن میں کہیں صبح ہے اور شام کہیں
جن کے زخمی ہیں جگر، پاس نہیں آتے ہیں

اور مصرع ہے:

چاند خود چاندنی کے پھول بنے جاتے ہیں

واہ وا۔ سبحان اللہ۔

گیارہ بندوں پر مشتمل اس منظر نگاری کے بعد بارھویں بند میں [illegible]

بس زباں بس کہ دیا فکر میں بیکار ہے طول
رخ سے ظاہر ہے کہ احباب کی خاطر ہے ملول
جلد اب بہرِ حصولِ شرفِ باغِ رسولؐ
[illegible]
رنج کا نام نہ باقی رہے، راحت ہو جائے
ذکر سے جن کے یہ مجلس ابھی جنت ہو جائے

سبحان اللہ۔

[illegible]
شہزادوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[illegible]

اے تیغِ شعلہ بارِ زباں اب رواں ہو پھر
جو حدِ التہاب ہے سب پر عیاں ہو پھر
حدت کا فصلِ گرم کی کم کم بیاں ہو پھر
باہر دہن سے جل کے قلم کی زباں ہو پھر
خود حرف حدِ سوزِ الم میں بتا گئے
کانٹے زباں کے صفحۂ کاغذ پہ آ گئے

ذی روح جو ہے اس کو ہے گرمی سے انتشار
گویا ہوا کا رہتا ہے پھیلا ہوا غبار

جلتی زمیں پہ پاؤں کا رکھنا ہے ناگوار
ذروں سے دب کے آگ نکلتی ہے بار بار

ان کے تصوروں سے بھی دل باغ باغ ہیں
روشن جو دن کو رہتے ہیں یہ وہ چراغ ہیں

ظاہر ہوا ہے سب پہ سبب انتشار کا
دل پر ہجومِ غم سے تعب ہے فشار کا
سامان دن کو ہو گیا شب ہائے تار کا
منھ پر لیا زمین نے دامن غبار کا

کیا کہنا۔ کیا جدت خیال ہے۔

ذروں کی ضو سے اور کلیجے کباب ہیں
گردوں پہ اک زمیں پہ ہزار آفتاب ہیں

جلتے ہیں لوگ (گرمی) میں اس کا ہے دل پہ غم
خود آفتاب شرم سے گردن کیئے ہے خم
کانٹے زبانِ خشک کے دکھلائیں کس کو ہم
بوندیں نہیں پسینے کی چنگاریوں سے کم

اللہ اکبر گرمی کے بیان میں یہ مبالغہ قابل داد ہے۔

..... ہوائے گرم ہوئی کیوں گلہ ہے یہ
پانی بھی آگ بن گیا ہے، انتہا ہے یہ

سبحان اللہ۔

پہلے اور پانچویں مصرع کے پہلے دو لفظ پڑھنے میں نہیں آتے۔

گرمی کے ذکر میں بارہ بندوں کے بعد پھر آمد بہار ہے جو آٹھ بندوں میں مذکور ہے۔ اس کے بعد گریز ہے۔

رخ وہیں سے کیا میدان کا جراروں نے

یہ بند ملاحظہ ہو۔ موقع کی مناسبت سے مصرعوں میں کیسا زور ہے۔ دوسرا، چوتھا اور چھٹا مصرع خاص طور سے قابل داد ہے۔

دیکھ کر فوج مخالف کے ہوئے دل تھوڑے
ہاتھ خود نصرت و اقبال نے بڑھ کر جوڑے
ہاتھ میں تیغوں کی طرح سنبھالے کوڑے
یا علی کہہ کے دلیروں نے اڑائے گھوڑے
تھا یہ ایما کہ یونہی فتح و ظفر ساتھ آئے
یوں اڑے وہ کہ نہ سائے کو قدم ہاتھ آئے

(مرثیہ جلوہ گر جو رخ تاباں سحر ہوتا ہے)

اسی طرح جناب علی اکبرؑ کی میدان میں آمد ملاحظہ ہو۔ جناب علی اکبرؑ میدان کو جانے لگے تو پہلے جناب عباسؑ کے کٹے ہوئے ہاتھوں سے اپنی تلوار کو مس کیا۔ یہ دیکھ کر۔

فوج میں غل ہوا، ظاہر ہوا اس کا مطلب
دم میں بے دست نظر آئیں گے اس فوج میں سب
غم کے پہلو میں نظر آتے ہیں آثار غضب
اس کا پوتا ہے یہ صفدر جو ہے قتال عرب
جنگ کو دور سے سب شیر غریں دیکھتے ہیں
پر سمیٹے ہوئے جبریل امیں دیکھتے ہیں

بند ملاحظہ ہو

شان کہتی ہے کہ لڑنے میں نہیں ہے کوئی دیر
ایک مدت سے طبیعت ہوئی ہے جینے سے سیر
کھنچ کے اب داخل قسمت ہوا ہے راہ کا پھیر

آمد کے یہ بند آپ نے ملاحظہ کیئے جن میں زورِ سخن عروج پر ہے۔ لہجہ میں دبدبہ ہے۔ گھن گرج ہے اور نازک خیالی و مضمون آفرینی ہے۔ یہ ساری صفات حضرت جاوید کے خصوصیات میں سے ہیں۔

**تلوار کی تعریف**۔ اسی ذیل میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف کے کچھ بند بھی ملاحظہ فرمایئے ایک بند کے چار مصرعے اور پھر اس کے بعد کے چند بند:

ہے وہی زیب کمر دیکھی ہے جس کی رفتار
بچپنے میں جو لگائی تھی علیؑ نے تلوار

جس سے ہے برق بھی بیتاب وہ بدل ہے یہی
ذوالفقار شہ مرداں سے بھی اول ہے یہی

اگلے بند کی بیت:

اس کے جوہر، ہیں نگاہوں میں کھٹکنے والے
یہ وہ تارے ہیں جو دن کو ہیں چمکنے والے

اگلا بند

مبتلا عشق میں سب کا دلِ سودائی ہے
اور میداں کی ہوا کھانے سے اترائی ہے
میان میں پاؤں نہ رکھنے کی جو شیدائی ہے

اور مصرع ہے:

اس نے اکبرؑ کی جوانی کی قسم کھائی ہے

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

صاف و شفاف بہت سینۂ بے کینہ تھا
یہ بھی حسن علی اکبرؑ کو اک آئینہ تھا

جزاک اللہ۔ کیا تخیل ہے۔

بند مسدس ہو۔ قوافی کا آہنگ اور تیور دیکھنے کے قابل ہیں

اسی تلوار کی ہر ایک سپاہی کو ہے قدر
پہنی جوہر کی قبا یوں کہ حسین ہو گیا صدر
جس جگہ کھنچ گئی یہ تیغ بپا ہو گیا غدر
کہکشاں تیغ ہلال ہے تو قبضہ بھی ہے بدر
شوق کہتا ہے کہ منزل رہِ دشوار کی ہے
دل میں قبضہ کے جگہ ایسی ہی تلوار کی ہے

قبضۂ شمشیر

اِس کا ہر دل کو بھروسہ ہے، سہارا اُس کا
جان دیتا ہے ملت اس کا، اشارا اُس کا
اِس کا عاشق ہے ہلال اور ستارا اُس کا
تیغ دریا ہے تو قبضہ ہے کنارا اُس کا
جب بیاضِ حسن چمن عرش بھی ہے طوبیٰ بھی ہے
گل بہت خوب ہے یہ شاخ بھی ہے پھول بھی ہے

تیغ نے ہر جسدِ بانیِ شر کو کاٹا
کبھی سینہ میں در آئی تو جگر کو کاٹا
کاٹ کر دل کو جھکی جب تو کمر کو کاٹا
کر کے گھر آنکھ میں پتلی کی سپر کو کاٹا

سبحان اللہ۔ کیا اچھا مصرع ہے۔ یہ جدتِ خیال ہے۔

اک تلاطم سا بپا کفر کی راہوں میں ہوا
اور اندھیر زمانے کی نگاہوں میں ہوا

یہ بند بھی دادطلب ہے:

آگ جنگل میں لگاتی ہے، شرر بار ایسی
جھک کے ملتی ہے کلیجوں سے، ملنسار ایسی
آنکھ جوہر کی لڑے جس سے، طرحدار ایسی
ہاتھ میں ان کے رہے جو وہ، ہو تلوار ایسی
ہوگئی ذہن نشیں اس کی ہر اک خوبی بھی
اپنے ہی آپ میں ابھری بھی ہے اور ڈوبی بھی

ایک بند کا تیسرا اور چوتھا مصرع:

اور جوہر کی ذرا زلف بکھر جانے دو
اس ادا پر کوئی مر جائے تو مر جانے دو

واہ، کیا تغزل ہے۔

گھوڑے کی تعریف: اسی مرثیے سے گھوڑے کی تعریف کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

باگ لیتے ہی رواں رخشِ سبک خیز ہوا
رن میں وہ اپنے پسینہ سے عرق ریز ہوا
اپنے جامے سے بھی باہر دمِ مہمیز ہوا
رہ گیا گر کے جو سایہ تو فرس تیز ہوا
حد کی محجوب ہوئی راہ سے بھی پھرنے لگی
رخش کے پاؤں پہ تیورا کے ہوا گرنے لگی

مندرجہ ذیل بند کا چوتھا مصرع داد طلب ہے:

رخش ایسا تھا سبک رو کہ نظیر اس کا نہ تھا
جب کوئی نقش قدم پھیل گیا، پھول کھلا
دے دیا سم نے کبھی خون تو عقدہ یہ کھلا
بند تھے پائے حنائی میں لہو کے دریا

کیا کہنا۔ بالکل نئی بات ہے۔

عشق کرنے کو گیا، عشق کا دم بھر نہ سکیں
مچھلیاں اپنے گلے کاٹ کے بھی مر نہ سکیں

اس بند کی بیت ملاحظہ ہو:

برق بیتاب ہو، گر ہو اسے گھوڑے سے فراق
جان سے بڑھ کے سمجھتے ہیں اسے اہلِ عراق
اس گھوڑے کی جدائی ہوئی حوروں کو بھی شاق
کہیں تعریف سے بڑھ کر ہے یہی رشکِ براق
منزلوں کو نہ کبھی ذہنِ رسا تک پہنچا
لے کے ہمشکلِ پیمبرؐ کو خدا تک پہنچا

کیا بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

رخش بجلی ہے تڑپ جانے میں، چلنے میں ہے تیر
ذکر گھوڑے کا ہے کیا شوخ ہے میری تحریر
اس کے کاوے ہی کی گردش میں ہے سب کی تقدیر
مضطرب ہو گئی گر برق نے کھینچی تصویر
دل عاشق کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے
حکمِ فرزندِ پیمبرؐ پہ فرس چلتا ہے

اس بند میں تغزل کا حسن ملاحظہ کیجیے

حسن صدقے ہے وہ اعلیٰ ہے فرس کا انداز
کھلتی کلیوں کی ہنسی کا نہیں بھایا کبھی ناز
چل کے کہتی ہے ہوا، تھم کہیں او تفرقہ ساز
غنچۂ گل کی چٹک ہے کہ قدم کی آواز

کیا خوبصورت تخیل ہے۔ سبحان اللہ۔

اپنی رفتار مجازی کا طریقہ بھولے
تر پسینہ سے ہوا ہو جو قدم کو چھولے

کیا کہنا۔

راہ میں ہے یہ نفس کی بھی ہوا سے آگے
اڑتا جاتا ہے قدم کی بھی صدا سے آگے
منزلوں ہے یہ فرس وہمِ رسا سے آگے
تیز ہی جاتا ہے یہ پیکِ صبا سے آگے
آگ جنگل میں لگی جاتی ہے گرمانے سے
اور دم بڑھتا ہے جنگل کی ہوا کھانے سے

کیا بیت ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا کہنا۔

صف روبہ پہ فرس اور بھی کچھ تن کے چلا
مطمئن بیچ میں اس قلعۂ آہن کے چلا
کون ایسا تھا کہ جو پاس سے توسن کے چلا
آگیا تھا جو پسینہ تو ہوا بن کے چلا
قید ہو کر نہ رہا حسرت و ارماں کی طرح

اور مصرع ہے کہ

آنکھ میں آکے اڑا خواب پریشاں کی طرح

## جنگ:

جناب علی اکبر کی جنگ کے دو یا تین بند ملاحظہ ہوں

اس بند کی بیت خصوصاً چھٹا مصرع زبان کے حسن، محاورے کی دلکشی اور نظم کی برجستگی کی اچھی مثال ہے۔ جناب علی کبھی فوج یزید پر حملے کر رہے ہیں اور فوج کا یہ عالم ہے کہ

ان کا منھ یاس سے سب بانی شر دیکھتے تھے
گاہ رہ رو کے سوئے تیغ دوسر دیکھتے تھے
اپنا دل دیکھتے تھے، اُس کا جگر دیکھتے تھے
موت آتی تھی نظر ان کو جدھر دیکھتے تھے

کہا قسمت نے، بجا آج یہ بے حالی ہے
جاؤ سیدھے، ابھی دوزخ میں جگہ خالی ہے

کیا سب [illegible]تگی ہے۔ سبحان اللہ۔

اب تلوار سے خطاب ملاحظہ ہو:

اب تو ان تیز نگاہوں کا اثر رہنے دے
چند ٹوٹے ہوئے دل، چند جگر رہنے دے
حالت خوف میں کچھ نوحہ گر رہنے دے

اور مصرع ہے:

جتنے باقی ہیں وہ جبریل کے پر رہنے دے

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کیا مصرع ہے۔

زخم سب سینہ و دل کے نہیں بھرنے والے
کس کو ڈھونڈے گی رہیں گے جو نہ مرنے والے

بیت کے تغزل کی داد نہیں دی جا سکتی۔

ہر جگہ پر تھے سر و پا و جبیں کے ٹکڑے
انگلیوں سے کہیں پر تھے کہیں کے ٹکڑے
سب یہ تھے قلب بن سعد لعیں کے ٹکڑے
کردیے تیغ نے مقتل کی زمیں کے ٹکڑے

بات ہی اور ہے گر کہیئے کہ کیا خاک اٹھی

گرد بھی اٹھی تو دامن کو کیئے چاک اٹھی

سبحان اللہ۔ پورا بند قابل داد ہے۔

اور پھر یہ بیت

ہے ہمیشہ سے وہی فضل خدا ساتھ ان کے
وہ تو لڑتے تھے ملک چومتے تھے ہاتھ ان کے

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

اور اب جناب عونؑ و محمدؑ کی جنگ کے حوالہ سے تین بند۔ جناب عباسؑ جنگ میں دونوں بھانجوں کا دل بڑھا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو پورے بند کے تیور قابل تعریف ہیں

اے مرے لعل میرے دل کے بڑھانے والے
کیوں نہ غالب رہیں حیدرؑ کے گھرانے والے
سامنے پھر کے شقی اب نہیں آنے والے
بھاگنے کے لیئے یہ، تم ہو بھگانے والے
صف سے اکبرؑ نہ بڑھے اور نہ ابھی ہم نکلے
اس لڑائی میں تمھیں سب سے مقدم نکلے

لشکرِ شر کو یونہی زیر و زبر رہنے دو
آستینوں کو بس اب خون میں تر رہنے دو
ہاتھوں میں نیچے، شانوں پہ سپر رہنے دو
جتنے باقی ہیں وہ جبریلؑ کے پر رہنے دو
سب یہ غالب جو رہے، جنگ میں ہیں ساتھ وہی
تم وہی، شان وہی، تیغ وہی، ہاتھ وہی

سبحان اللہ، سبحان اللہ بیت کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اس بند کا چوتھا مصرع جناب علی اکبرؑ کے مرثیے کے مصرعے سے ٹکرا گیا ہے۔ یہ تو نہیں

[illegible]

[illegible]

کرلیا ہو۔ اس کے بعد کا بند

رایت فوج کو لے آئے جو خیمہ کے قریں
مسکرانے لگے کچھ سوچ کے خود سرورِ دیں
کہا عباسؑ نے اکبرؑ سے کہ اے ماہ جبیں
ان کا عالم میں نظیر آج نہیں مثل نہیں

اور بیت ملاحظہ ہو

آج اس طرح لگائے کئی تلوار کے ہاتھ
آگئے یاد مجھے حیدرِ کرار کے ہاتھ

کیا کہنا، کیا عمدہ بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

## ساقی نامہ:

اور اب ساقی ناموں سے کچھ بند اختصار کے ساتھ:

ساقیا دیر ہوئی اب مرے اعضاء ہیں نڈھال
[illegible] حال
ہاتھ بے کار یونہی گردنِ مینا میں نہ ڈال
خیر اچھی کہ بری جو ہو وہ شیشہ سے نکال

[illegible] بھی باقی [illegible] ہوش میں ہے
میری ہر رگ کو جو توڑے وہ لہو جوش میں ہے

[illegible]

ہو نہ جائے سبب اشک فشانی شیشہ
کہ کے دیتا ہے مرے دل پہ گرانی شیشہ

دیکھ لے خود کہ صفائی میں ہے پانی شیشہ
خیر دیتا ہے تو دے دے مجھے دھانی شیشہ
تا بہ لب کھنچ کے ذرا پھر دل زار آنے دے

اور مصرع ہے:

چمنِ آرزوئے دل میں بہار آنے دے

کیا کہنا۔

اب ایک دوسرے مرثیہ سے چند بند

ساقیا دے دے شراب آج مری باری ہے
فیض ہر سمت ترا بحر صفت جاری ہے
ہجر میں نشہ کا کیا ذکر، (لفظ پڑھنے میں نہیں آتے)
ے ہے شیشہ میں کہ دل میں کوئی چنگاری ہے
نہیں آیا کوئی آوارہ وطن یوں لٹ کے
بن گیا داغ کلیجہ کا دھواں گھٹ گھٹ کے

شوق کہتا ہے کہ پھر جام سفالی دے دے
دیکھ کر اب مرے چہرے کی بحالی دے دے
گر دلائے تری وہ ہمتِ عالی، دے دے
جام لبریز کوئی اور کوئی خالی دے دے
اک طلسم اور دکھادوں ابھی میخانے میں

اور مصرع ملاحظہ ہو:

قوت جذب سے کھنچ آئے گی پیمانے میں

سبحان اللہ۔

آخر میں مصرعِ ب

ننگے سر حضرت زینب نکل آئی ہیں ادھر
کہتی ہیں کون سی بدلی میں چھپا ہے وہ قمر
یہیں مر جاؤں گی میں پیٹ کے اب سینہ و سر
میرے اٹھارہ برس والے کی ہے لاش کدھر
شاہ کچھ زیر لب آہستہ دعا پڑھتے ہیں
کانپتے ہاتھ سناں کھینچنے کو بڑھتے ہیں

اللہ اکبر۔ یہ منظر چشم تصور سے دیکھیے۔

روتے تھے [illegible] غربت میں پدر
پیاسے دنیا سے سدھارے سوئے جنت اکبر
اب زباں روک لے جاوید یہی ہے بہتر
کر دعا حق سے کہ مجبور ہے ہر طرح بشر
کیا کوئی اور ہے جو اس کے سوا رحم کرے
بخش [illegible] کے تصدق میں خدا رحم کرے آمین

تغزل:

حضرت جاوید کے مرثیوں میں تغزل کا عنصر نمایاں ہے جیسے کہ حضرت مہذب نے لکھا ہے کہ ان کے مرثیوں میں تغزل کا کافی ذخیرہ ہے۔ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی صاحب نے بھی ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ تغزل کس کے مرثیوں میں زیادہ ہے یہ جاوید صاحب کے مرثیوں میں۔ خاندان اجتہاد کے مرثیہ گویوں کے مرثیوں میں تغزل پر ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم کے اعتراض کا جواب میں حضرت ناظر کے تذکرہ میں دے چکا ہوں۔ ان کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"محمد کاظم جاوید بھی خاندان اجتہاد کے مشہور مرثیہ گو ہوئے ہیں۔ ان کے

فطری جوہر تھی"۔ (اسرار محن، ص ۵۶)

میں سمجھتا ہوں کہ ان خصوصیات میں شاید ہی کوئی مرثیہ گو حضرت جاوید کا مد مقابل ہو۔ بیشک مولوی سید مہدی حسین صاحب ماہر اعلی اللہ مقامہ کا کلام بھی ان صفات کا حامل ہے مگر حضرت جاوید کے یہاں یہ خوبیاں زیادہ کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان سے شاعری کا حسن، بلندی فکر، قوت تخیل اور جدت مضامین وغیرہ کا بڑا دلکش ظہار ہوتا ہے۔ میں ان کے مرثیوں سے چند مثالیں پیش کر رہا ہوں جو صاحبان ذوق کے لیے ایک خوب صورت ہدیہ ہوں گی اور ان کے دل کے سرور اور بصیرت کے نور میں انشاء اللہ اضافہ کا باعث بھی ہوں گی۔

ملاحظہ ہو

میرے راتوں کے تڑپنے کو نہ پوچھیں احباب — غیظ سے چیں بجبیں ہو گیا تھا بستر خواب

دوسرا مصرع حسن تعلیل اور تخییل کی نزاکت و جدت کا ایک حسین مرقع ہے۔ بستر کی شکنوں کو چیں بجبیں ہونے سے تعبیر کرنا بالکل نیا اور اچھوتا خیال ہے۔

تیغ بردوش پڑا دشت میں اجل کی ادا سے — کانپتے ہاتھوں کے گہوارے میں نیند آئی اسے

امام حسین کے ہاتھوں پہ جناب علی اصغر کی شہادت کے بیان میں دوسرا مصرع تخییل کی بلندی، شاعری جدت فکر اور قدرت کلام کی بین مثال ہے۔ کانپتے ہاتھوں کا گہوارہ اپنے اندر مصائب کی ایک دنیا بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ کانپتے ہاتھوں کو گہوارہ سے تشبیہ دینے میں گہوارہ کی جنبشوں کا تاثر ملتا ہے۔

رک گئی چال کہ ہوا تیز نفس آ پہنچا — ہلیں مژہ کو ہوئی جنبش کہ فرس آ پہنچا

گھوڑے کی سرعت رفتار کے بارے میں مرثیہ گو شعراء نے بڑی عمدہ عمدہ تمثیلیں، تشبیہیں اور استعارات استعمال کیے ہیں مگر مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع میں مژہ کی جنبش سے فرس کا حاضر ہو جانا بہت عمدہ بات ہے۔

[illegible] — حسن کی شان میں دو دو تیغیں چومیں کے بار

ایسے ہم عصر ہوئے خاک کے پردے میں نہاں     ڈھونڈنے کو جنھیں آنسو ہوئے آنکھوں سے رواں

جزاک اللہ جزاک اللہ۔ دوسرے مصرع کی تخئیل بالکل نئی اور ندرت خیال کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ کیا کہنا۔

آنکھوں سے آنسو رواں ہونے کی یہ تعبیر کہ گزر جانے والوں کو ڈھونڈنے کے لیے رواں ہوئے ہیں، کیا خوب صورت شاعرانہ خیال ہے۔

جن سے منہ موڑتے ہیں لشکر کے سیہ دھاڑیں ہیں     ان کے ہاتھوں کی لکیریں نہیں، تلواریں ہیں

جناب علی اکبر کے ہاتھوں کی لکیروں کو تلواریں کہنا بالکل اچھوتی اور بے مثال تشبیہ ہے۔

جناب علی اکبر کے ریور کے سم خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس کی تمثیل ملاحظہ ہو

دے دیا سم نے کبھی خون تو عقدہ یہ کھلا     بند تھے پاے حنائی میں لہو کے دریا

دوسرے مصرع میں کس قدر نئی بات ہے جس میں تغزل کے ساتھ تخئیل کا حسن قابل داد ہے۔

جناب عباسؑ کے صاحب زادوں کے حوالے سے دو مصرع ملاحظہ ہوں

مرتے مرتے بھی گیا ماں کا نہ داب و آداب     جن کے بچپن کو کہیں دور پہ روتا ہے شباب

بچپن کے زمانے سے عہد شباب کے فصل کے پیش نظر یہ کہنا کہ جن کے بچپن کو کہیں دور پہ روتا ہے شباب، ندرت بیان بھی اور مصائب کا بے پناہ تاثر بھی۔

جناب علی اکبر کے حسن و جمال کے شہرے تھے۔ آپ ہو بہو رسولؐ خدا کی جوانی کی تصویر تھے۔ شوق زیارت رسولؐ میں جناب علی اکبر کی زیارت کی تمنا صرف گھر والوں ہی کو نہیں رہتی تھی بلکہ سبھی مشتاق تھے۔ اس سلسلے میں دو مصرعے ملاحظہ کیجیے اور نزاکت خیال کی داد دیجیے:

میان سے تیغ اسی شوق میں نکلی باہر     کہ پڑے میری بھی حسن علی اکبر پہ نظر

سبحان اللہ۔ میان سے تیغ نکلنے کی بے شمار تشبیہیں اور استعارے مرثیوں میں ملیں گے مگر

کی خوشبو سے ادب کو معطر کرتی رہے گی اور جس کی روشنی سے جہاتِ مرثیہ نگاری ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی فکر نہ کسی سے مستعار ہے نہ کسی سے متاثر۔ سب کچھ خود ان کے ذوق و ذہن کی پیداوار ہے۔ ان کے ہمعصروں میں مرثیہ نگاری کے حوالہ سے حضرت اوج، جناب پیارے صاحب رشید، جناب دولھا صاحب عروج اور حضرت عارف ان کے ہم پلہ تھے مگر کوئی ان پر فوقیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ملک گیر شہرت کے مالک تھے اور ہندوستان میں دور دور مرثیے پیش کرنے جاتے تھے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان کی مرثیہ گوئی ان کے ممدوحین کی عطا، ان کے خلوص کی دین اور ان کے جذبہ مودت و عقیدت کا ثمرہ تھی۔

## خواندگی:

حضرت مہذب نے لکھا ہے کہ ان کی خواندگی نہایت سادہ تھی مگر اس میں ایک کیف تھا۔ (اسرار الحسن ص ۵۶)

## عزائیہ ادب کے دوسرے اصناف:

عزائیہ ادب کے دوسرے اصناف میں سلام، نوحہ، رباعی اور قطعات شامل ہیں۔ جو مرثیہ گو رباعی اور سلام ضرور کہتا تھا۔ حضرت جاوید نے بھی متعدد سلام اور رباعیات کہیں مگر بقول حضرت مہذب لکھنوی ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ اور اس کے بڑھتی روش کی بے اعتنائی اور لاپرواہیوں کی وجہ سے سلف کا سارا شعری سرمایہ ضائع ہو رہا جس کا جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضرت جاوید تو لاولد ہی تھے۔ ان کا سرمایہ کون سنبھال کے کون رکھتا۔ حضرت شمس نے لکھا ہے کہ چالیس سے زیادہ مرثیے اور سو سے قریب سلام اور بیس پچیس رباعیاں اور بہت سے قطعات تاریخ بھی انھوں نے کہے تھے۔ اب کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔ (انتخاب دیوان جاوید، حرف آغاز) خوش قسمتی سے حضرت جاوید کا ایک سلام دستیاب ہو گیا۔ ایک مرثیہ جو صرف ۲۱ بند کا ہے ورثہ داروں سے ملا ہے۔ بیاضوں سے دستیاب حضرت جاوید کا ایک سلام بھی ہے۔ یہ مرثیہ ۱۹۳۱ء سے

اس کے علاوہ ان کا ایک سلام جناب سید علی رضوی نے اپنی کتاب "حسینؑ پر سلام" کے صفحہ ۱۴۱ پر دیا ہے جو حسب ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| زینبؑ کے پسر پیاس سے گھبرائے ہوئے ہیں | دو پھول دمِ صبح سے مرجھائے ہوئے ہیں |
| دھڑکن دلِ اصغرؑ میں ہے کیا بعد فنا (قضا) بھی | اب تک شہِ دیں لاش کو لپٹائے ہوئے ہیں |
| حضرت کا یہ نقشہ ہے کہ غش آتے ہیں پیہم | اکبرؑ جو کلیجہ پہ سناں کھائے ہوئے ہیں |
| دنیا کی کسی شے سے شہیدوں کو نہیں کام | سب گرد بیاباں کے کفن پائے ہوئے ہیں |
| حر ساتھ رفیقوں کے ہوا شہ کا قدمبوس | یہ چاروں حضوری کا شرف پائے ہوئے ہیں |
| قائم پہ سعد سے کہتے تھے دمِ جنگ | اب ان کو بلا جو ترے بلوائے ہوئے ہیں |
| آپس میں یہ کہتے تھے رفیقانِ شہِ دیں | یاں دیر سے حوروں کے پیام آئے ہوئے ہیں |

جاوید یہی وقت ہے دل کھول کے پڑھ لے
احباب جو ہیں خاص وہ سب آئے ہوئے ہیں

ان دو سلاموں سے آپ کو ان کی سلام گوئی کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

یوں تو جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں حضرت جاوید کی رباعیات دستیاب نہیں ہیں مگر ایک رباعی جناب مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے "تاریخ لکھنو، ج ۲ ص ۱۲۰ پر اس واقعہ کے حوالے سے لکھی ہے کہ ایک مجلس میں جناب جاوید پڑھنے گئے۔ بانی اس کے بخیل تھے۔ کسی دوست کے ایماء سے اسی وقت یہ رباعی موزوں کر کے پڑھی

دنیا کے تعب سب پہ گزر جاتے ہیں    دل صدقے جو نازک ہیں تو ڈر جاتے ہیں
آخر میں بخیلوں کا یہ ہوتا ہے مآل    مہماں جو اجل آتی ہے مر جاتے ہیں

## غزل گوئی:

حضرت جاوید نے غزل گوئی سے شہرت پائی اور اپنے زمانہ میں سب سے بڑے

غزلوں کو تلف کیے گئے۔ بقول حضرت شمس ان کا مزاج عاشقانہ تھا اور غزل سے فطری مناسبت تھی۔ اوائل عمر ہی سے انھوں نے شہرت حاصل کر لی تھی۔ (معنوی شاعری، ص ۲۲۱) وہ صاحب دواوین شاعر تھے۔ حضرت مہذب نے لکھا ہے کہ آپ کا مکمل دیوان نامعلوم کہاں ہے اور کس شاعر کو شعر گوئی کی زحمت سے محفوظ کیے ہوئے ہے۔ (مہر محشر ص ۵۶) مہذب صاحب کو ان کی جو غزلیں دستیاب ہوئیں ان میں سے کچھ انھوں نے "بزم سخن" میں شائع کیں۔ مرحوم نا محمد باقر صاحب قبلہ شمس مدظلہ نے "انتخاب دیوان جاوید" کے نام سے ان کا تلخیص شدہ دیوان شائع کیا ہے جس میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے:

"جاوید صاحب کی غزلوں کے دو دیوان تھے۔ دونوں دیوان ان کی زندگی ہی میں چوری ہو گئے۔ پہلے دیوان کا تو پتہ ہی نہ چلا۔ دوسرا مجھے ملا یہ جو آپ کے سامنے ہے۔ کچھ غزلیں ان کے انتقال کے بعد پرچوں اور سگریٹ کی ڈبیوں پر ملیں۔" (انتخاب دیوان جاوید، تمہید)

حضرت جاوید نے اپنے ایک قطعے میں بھی اپنے دونوں دیوان چوری ہو جانے سے متعلق لکھا ہے:

دوستوں کو ترے تجھ سے بھی زیادہ جاوید جستجو ہے ترے کھوئے ہوئے دیوانوں کی

جناب نیاز فتح پوری نے ان کے کچھ اشعار اپنے تبصرہ کے ساتھ "نگار" میں شائع کیے پھر انھیں اپنی کتاب "انتقادیات" حصہ دوم میں شائع کیا جو ص ۴۲ سے ۵۲ تک درج ہیں۔

## حضرت جاوید کا مرتبہ بحیثیت غزل گو ان کے معاصرین اور احباب کی نظر میں

حضرت جاوید کے معاصرین و احباب میں اس وقت کی بڑی بڑی شخصیتیں شامل تھیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ یہ حضرات شاعری کے مصرعے بھیج کر ان سے غزلیں منگواتے تھے۔ جاوید صاحب نے ہمیں

جاوید کس ادا سے وہ کہتے ہیں بار بار — ہم بھی سنیں گے شعر، ہمیں بھی سنائیے
جب جاوید جو اصلاح لیا کرتے تھے — چار دن میں وہی لوگ آپ سے بہتر نکلے
کون تیرا نظیر ہے جاوید — تجھ کو خالق نے بے مثال کیا
...پہ جاوید کی خوبی کے پڑے ہیں سکے — جتنے دراصل ہیں استاد وہ سب مان گئے

## نمونہ کلام:

اب حضرت جاوید کی غزلوں سے چند اشعار نمونہ کلام کے طور پر پیش خدمت ہیں

یہ کہہ کے مجرموں میں مجھے دی گئی سزا — تیرا کوئی گناہ نہیں، یہ گناہ ہے
جانگنی میں نگہ یاس دکھا دو ان کو — یوں بھی برہم ہو مزاج ان کا تو برہم ہو جائے
میں وقت واپسیں تمہیں دیکھوں کہ جان دوں — تھوڑا سا وقت، کام بہت، کیا کرے کوئی
دو حسینوں پر نظر اک وقت میں اچھی نہیں — دیکھ کر چاند، آئینہ میں منہ نہ دیکھا کیجئے
آج ان کے سامنے اس سوچ میں لب بند ہیں — بات کچھ پہلے پہل کیجئے مگر کیا کیجئے
کلیم دید کی حسرت بڑھا دی لکنت نے — مزے کی بات نہ کیوں لب پہ بار بار آئے
ہنس دیتے ہیں منہ پھیر کے وہ میرے سرہانے — جب لوگ یہ کہتے ہیں خدا اس کو شفا دے
جو دیکھتا ہوں کبھی آئینہ میں فرقت میں — تو خود بھی کہتا ہوں یہ آپ کو ہوا کیا ہے
تم پاس جو آئے کھو گئے ہم — جب تم نہ ملے تو جستجو کی
چن کے افشاں شب کو وہ کچھ اور پیارے ہوگئے — جتنے ذرے تھے مری آنکھوں کے تارے ہوگئے
چٹکتی کلیوں کا بھی شور ہوتا ہے گلشن میں — یہ کون اس درد سے اے باغباں فریاد کرتا ہے
ہجر کی شب جان کر آنکھیں کیے لیتا ہوں بند — چاہتا ہوں نیند آجائے کسی تدبیر سے
کہہ رہا ہے رعب حسن دوست سونے دو ابھی — شوق کہتا ہے جگاؤ بھی کسی تدبیر سے
وہ آئینہ دیکھیں، وہ زلفیں بنائیں — انھیں کیا جیئے یا کہ مر جائے کوئی
ایسا بھی زمانہ میں تعلق نہیں دیکھا — جس سمت کو تم جاؤ ادھر سب کی نظر جائے

غیر نے مطلب نکالا شوخیِ تقریر سے ہم یونہی خاموش بیٹھے رہ گئے تصویر سے

موت آ جائے تو سمجھوں کہ ملی مجھ کو حیات دل پریشان ہوا روز کی بیماری سے

اس کو دنیا کے مزے سب مل گئے جس سے کچھ دن کی محبت آپ نے

بچپن تھا آپ کا ہر دل عزیز دیکھنے آئی جوانی آپ کی

ہو گیا اس کا کلیجہ بھی فگار جس قلم سے مری تصویر بنی

جاوید اور وہ ہیں جو پی لیتے ہیں شراب ہم تو نگاہِ مست سے بے ہوش ہو گئے

ملے گا کیا غریبوں کو ستا کے چلو جانے دو، بندے ہیں خدا کے

بتائیں کس سے کہیں ہجر کی ایذاؤں کو اب اگر موت نہ آئے گی تو مر جائیں گے

کوئی جاوید نہ پھر نام وفا کا لے گا تم سے دو چار جو دنیا سے گزر جائیں گے

چلو یہ کام ہے اس داستاں سے تمہیں اٹھنے لگے سارے جہاں سے

نہ دل میں سوزشِ غم ہو نہ کوئی داغ جلے سحر کو جائیے، آ جائیے چراغ جلے

یہ کس کو آئینہ میں آپ دیکھے جاتے ہیں جہاں میں آپ سے بھی کوئی خوبرو سا ہے

مجھے بھی امتحاں اپنا ہے منظور جہاں تک ہو سکے تم سے، ستاؤ

شبِ تاریک ہجر آتی ہے جاوید چراغوں کو سویرے سے جلاؤ

رہ گیا آئینہ خود محوِ تماشہ بن کے یوں کوئی محوِ تماشائے رخِ یار نہ ہو

دل گیا ہر پاس سے تو کیا گیا لوگ کہتے ہیں چلو صدقہ گیا

اس قدر چپ چاپ نہ دیکھی تھی کبھی دیکھ کے تصویر کو پیار آ گیا

ہماری عمر سے کچھ روز گھٹتے جاتے ہیں قسم حضور نہ کھایا کریں جوانی کی

اب کے بوسہ پہ آئی بحث زبردستیاں ہے نگاہیں نیچی کر لو، خیر، اچھا، لے لیا ہوگا

نہیں یہ تفرقہ انداز فلک دیکھ نہ لے نہ اس طریق سے بانہیں گلے میں ڈال کے چل

اک ادا سی اسے محفل میں آ کر رہ گئی میں یہ سمجھا اک کلی تھی مسکرا کر رہ گئی

رات کو دریا میں موجیں کس طرح بے چین ہیں اک کنارے چاند ہے اور اک کنارے آپ ہیں

شعرِ شریف تھے۔ غفراں مآب کے امام باڑہ (لکھنؤ) میں دفن ہوئے (انتخاب دیوان جاوید ص و)۔ بقول حضرت ثاقب لکھنوی

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اور بقول حضرت مہذب لکھنوی:

خلق سے اٹھ کر وفا کا نام زندہ کر گئے
زندۂ جاوید ہیں جو راہِ حق میں مر گئے

لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی نے تاریخ وفات مندرجۂ ذیل مصرعے سے نکالی

یافت آں سید مقام حیات جاوید
(۱۳۴۰ھ)

دعبلِ ہند حضرت ذاکر اجتہادی لکھنوی
١٢٨٨ھ تا ١٣٥٣ھ
(مولوی سید فرزند حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ)

اس شکل و شمائل کا زمانہ میں کوئی تھا
اتنا تو بتا دیتی ہے تصویر ہماری (ذاکر)

بشکریہ محترم جناب سید ظہیر عباس صاحب مد
سفیر ا تقا محترم جی شاہ حضرت فضل نقوی اعلی اللہ مقامہ

نعتیہ رباعی:

احمدؐ کو جو اللہ نے شاہی دے دی
ہر چیز انھیں تامہ و ماہی دے دی
شک لائے جو اعجاز نبیؐ میں کافر
مہتاب نے دو ہو کے گواہی دے دی

(ذاخر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دعبلِ ہند حضرت ذاکر اعلی اللہ مقامہ

## نام و نسب:

اسم گرامی سید فرزند حسین، عرفیت اچھن صاحب، تخلص ذاکر، لقب نوحہ گوئی میں اپنے مدارات کی وجہ سے دعبل ہند کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور آج بھی اس لقب کا اطلاق صرف انھیں کے اسم گرامی پر ہوتا ہے۔ یہ لقب ان کو اس وقت کے معروف عالم دین و مجتہد حضرت قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ نے عنایت فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کا لقب "انیس نوحہ" بھی تھا

آپ کے والد مرحوم مولوی سید وارث حسین صاحب نقوی سادات سے تھے اور خاندان اجتہاد سے نسبی قرابت رکھتے تھے یعنی ان کی شادی نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ کی ہمشیرۂ معظمہ اور عماد العلماء کی سگی بھانجی سے ہوئی تھی جن کے بطن مبارک سے حضرت ذاکر پیدا ہوئے تھے۔

خاندان اجتہاد کے بانی مولانا سید دلدار علی صاحب غفراں مآب علیہ الرحمہ کے وطن مالوف نصیر آباد، یوپی میں سادات کے تین محلے ہیں جن میں سے ہر ایک میں ایک ایک امام بارگاہ اور ایک ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ ہر محلّہ کا ایک میر محلّہ ہوتا ہے جس کو رئیس کہتے ہیں۔ میر وارث حسین صاحب محلّہ روضہ کے رئیس تھے اور ان کے بعد حضرت ذاکر اس ریاست کے رئیس ہوئے۔ (بغداد "نواب لکھنو")

## ولادت:

ذاکر صاحب کی ولادت لکھنؤ میں ۱۲۸۸ھ میں ہوئی جس کی تصدیق ان کے تاریخی نام ''نظیر حسین'' سے ہوتی ہے جس کے اعداد حسب جمل سے ۱۲۸۸ ہیں۔ ہفت وار ''سحاب لکھنو'' میں ان کا تاریخی نام کتابت کی غلطی کی وجہ سے نظر حسین چھپا ہے مگر چونکہ ساتھ میں تاریخ ولادت بھی دی ہوئی ہے اس لیئے صحیح نام نظیر حسین ہی ثابت ہوتا ہے۔

## تعلیم و تربیت:

حضرت ذاکر نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ کی ہمشیرہ کے بیٹے تھے جن کا انتقال اس وقت ہوگیا جب ذاکر صاحب کی عمر ابھی صرف ڈیڑھ سال تھی۔ حضرت فاخر نے اپنی ہمشیرہ کے انتقال کے بعد ذاکر صاحب کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خود لے لی اور بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت فاخر کا قیام عراق میں تھا۔ چنانچہ فرزند حسین صاحب (ذاکر) بھی اپنے ماموں نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب (فاخر) کے ہمراہ اٹھارہ سال کی عمر تک عراق میں رہے اور روضۂ کاظمینؑ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔

## علمی استعداد:

جس نے اٹھارہ سال کی عمر تک کاظمین علیہم السلام میں تعلیم حاصل کی ہو اس کی علمی استعداد کا کیا پوچھنا۔ دوسرے یہ کہ کہیں سے اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ عراق سے واپسی کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہو۔ اس کے علاوہ حضرت فاخر نے جناب ذاکر کے ساتھ ساتھ اور بھی متعدد طلاب کی تعلیم کا انتظام اپنی زیر نگرانی اور اپنے پیسہ سے کیا ہوا تھا جن میں ذاکر صاحب کے مختلف الطبع بھائی ملک الناطقین خطیب اعظم جناب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کی شخصیت نمایاں تھی۔ انھوں نے منبر سے

## ازدواجی زندگی:

عراق سے واپسی کے بعد جبکہ ذاخر صاحب کی عمر کوئی اٹھارہ سال تھی، حضرت فاخر نے ان کا عقد اس وقت کے مشہور و معروف عالم دین فقیہ اہلِ بیت عماد العلماً مولانا سید مصطفیٰ عرف میر آغا صاحب قبلہ مجتہد اعظم کی دختر نیک اختر سے کردیا۔ ایسے پاکیزہ ماحول میں ان کی ازدواجی زندگی بھی بہت پاکیزہ اور خوشگوار گزری۔ ان معظمہ کے بطن مبارک سے حضرت ذاخر کی مندرجہ ذیل اولاد نرینہ پیدا ہوئی

(۱) مولوی سید محمد صاحب گرامی اعلی اللہ مقامہ

(۲) لسان الشعراً سید الواعظین مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للّن صاحب شاعر اعلی اللہ مقامہ جن کا تفصیلی ذکر ان سے متعلق مضمون میں آئے گا۔

(۳) حسینی شاعر سید ظفر عباس صاحب فضل نقوی اعلی اللہ مقامہ جو سلام اور نوحہ گوئی میں اپنے والد گرامی حضرت ذاخر کے وارث و جانشین اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہوئے۔

## مزاج و اخلاق و عادات:

حضرت ذاخر اخلاق میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ مذہب کے حد سے زیادہ پابند تھے۔ ہندو مسلم سنی شیعہ چشم محبت میں ایک تھے مگر مذہبیت میں دراندازی یک لمحہ کے لیئے گوارا نہ فرماتے تھے۔ اختلاف عقائد کی صورت میں دوستی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ملاحظہ ہے۔ عقد جناب قاسمؑ کے سلسلہ میں خود ہمارے شیعہ کے درمیان زبردست اختلافات تھے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کی تکفیر میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ شعراً بھی علماً کے گروہوں میں بٹ گئے۔ کاظم حسین صاحب مرحوم نے اس سلسلہ میں تاریخ کہی:

داستانِ عقدِ قاسمؑ جھوٹ ہے

۱۳۳۰ھ

حضرت ذاخر نے تاریخ کہہ کے کاظم حسین صاحب کا جواب دیا

عقدِ قاسم جھوٹ کہہ کر چارہ گر جھوٹے ہوئے

۱۹۰۸ء

۲۹ ذی الحجہ سے ۹ ربیع الاول تک غزل گوئی کی اجازت نہیں دیتے تھے اور غزل کے ایک مصرع پر بھی اصلاح دینا انھیں گوارا نہ تھا۔

حضرت ذاخر کی مذہبی فکر کے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ ملتا ہے ملاحظہ ہو

ان کے سب سے پہلے شاگرد جناب شاکر تھے جو مرثیہ گو شاعر بھی تھے۔ وہ مرحوم انگریزی کھانے پکانے میں ماہر تھے۔ بڑے بڑے انگریزوں کے یہاں ملازمت کی۔ گورنر کی پارٹیوں کا کھانا ان کے بغیر بے نمک ہوتا تھا۔ ایک دفعہ جناب شاکر نے حضرت ذاخر سے گزارش کی اور اصرار کرتے ہوئے کہا کہ استاد آپ لفٹنٹ گورنر لاٹوش کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ دیجیے۔ میں پیش کروں گا اور وہاں سے کافی فائدہ ہو جائے گا۔ حضرت ذاخر ان کے اصرار سے راضی ہوئے اور تیس بتیس شعر کہہ دیے۔ دوسرے روز شام کو مرحوم سننے آئے تو خوشی خوشی ان کو سنائے۔ اتفاق سے ان اشعار میں ایک شعر ایسا بھی تھا جس میں حضرت عیسیٰ کا ذکر بطور تشبیہ آگیا تھا۔ بس یہاں تک پہنچتے ہی ذاخر صاحب نے قصیدہ پھاڑ ڈالا اور فرمایا صاحب میں نہیں کہہ سکتا۔ ایک انگریز کو آج عیسیٰ وقت کہوں گا تو کل کسی مسلمان کو خاتم النبیین کہہ ڈالوں گا۔ روپیہ کے لیے ایمان جائے گا۔ شاکر مرحوم منہ دیکھ کر رہ گئے۔ ("سحاب" لکھنؤ)

ان کے اخلاق کی بلندی کا پتہ اس واقعہ سے بھی چلتا ہے کہ بنے صاحب مژدہ مرحوم ایک نوجوان خوش گو شاعر تھے جنھوں نے عین شباب میں انتقال کیا۔ حضرت ذاخر مدتوں ان کو روتے رہے۔ ان کی وفات سے متاثر ہو کر ایک نوحہ کہا۔ مقطع میں ایصال ثواب کے خیال سے مژدہ ہی کا تخلص رکھا اگرچہ بعد کو پڑھنے والوں نے مژدہ مرحوم کا تخلص نکال کر خود ذاخر صاحب کے تخلص کو جگہ دے دی۔ اس نوحہ کا مطلع

اور مقطع ملاحظہ ہو

مرنا جواں پسر کا بہت ناگوار ہے
اکبرؑ کا دم نکلتا ہے، ہاں بے قرار ہے
تنہائی مزار کا احباب غم نہ کھائیں
مژدہ کے ساتھ رحمت پروردگار ہے

حضرت دعبل ہند کے اخلاق کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ شاعروں میں کوئی کیسا ہی پڑھے، آپ ضرور تعریف کرتے تھے۔ بعض شاگردوں کو آپ کا یہ انداز پسند نہیں تھا۔ انھوں نے شکایت کی تو فرمایا کہ بھئی زبان کی خدمت تو کرتا ہے۔ حوصلہ افزائی سے ہمت اور بڑھے گی۔ آج نہیں تو کل اچھا کہنے لگے گا۔

ان کے حسن اخلاق کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ لکھنؤ کے باہر وقف حسین آباد مونگیر اور خیر پور سندھ میں برسوں مرثیے پیش کرنے جاتے رہے اور جب تک اس زمانے کے سامعین زندہ رہے ان کے حسن اخلاق کے مداح اور گرویدہ رہے۔

## شاعری:

حضرت ذاخرؔ چونکہ استاذ الاساتذہ حضرت فاخرؔ کے ساتھ ہی ان کے بیٹے کی طرح رہتے تھے جہاں حضرت فاخرؔ کے سیکڑوں تلامذہ کے علاوہ ان کے احباب میں بڑے بڑے شعرا اور شیدائیان شعر و ادب کا مجمع رہتا تھا اس لیئے ایسے شعر و ادب کے ماحول نے حضرت ذاخرؔ کو بھی شاعری پر مائل کیا اور اپنے کلام پر اصلاح کے لیئے اپنے ماموں حضرت فاخرؔ کا انتخاب فرمایا۔

حضرت فاخرؔ کے بے شمار شاگرد تھے جن میں ایک بہت نمایاں نام ملک الناطقین خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ کا ہے۔ آپ کا تخلص فاطرؔ تھا۔ ان کے علاوہ سید محمد ذکی صاحب عاطرؔ، حکیم سید باقر حسین صاحب ناصرؔ وغیرہ بھی نمایاں تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کمالات شاعری کی وجہ سے حضرت ذاخرؔ ہی شاعری میں

حضرت فاخر کے جانشین قرار دیئے اور مرثیہ گوئی کے علاوہ غزل گوئی اور نوحہ گوئی میں بھی بڑی شہرت حاصل کی۔

## مختار نامۂ منظوم کی تصنیف:

قبل ہندسیّتی حضرت ذاکر کے والدِ گرامی قدر میر وارث حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ ایک خاص رنگِ مذہب کے حامل تھے۔ حضرت ذاکر کی غزل گوئی کو شہر میں سب پسند کرتے تھے اور حقیقتاً وہ ایک بے مثل غزل گو تھے مگر آپ کے والد مرحوم اس سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ ایک روز سختی سے فرمایا کہ انسان کو ایسا کام کرنا چاہیے جو خیرِ آخرت کا باعث ہو۔ غزل گوئی سے سوائے دنیا کی واہ واہ کے کچھ حاصل نہیں۔ اگر شعر ہی کہنا ہے تو مدحِ ائمہ اظہار کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مختار نامہ اردو میں نظم کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں یعنی حضرت ذاکر اور مولانا سید سبط حسن صاحب فاطر نے مشترکہ طور پر کہنا شروع کیا۔ سات ہزار اشعار تک یہ مختار نامہ پہنچا تھا کہ حضرت فاخر اعلی اللہ مقامہ نے زنگی کی سکونت ترک کردی اور اپنے مکان واقع پاٹا نالہ لکھنؤ میں منتقل ہوگئے۔ شیرازۂ اجتماع متفرق ہوگیا اور مختار نامہ سات ہزار اشعار تک ہی رہ گیا۔
۱۳۳۶ھ میں شریعت کدۂ حضرت قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ پر حاضر رہنے والے کچھ احباب نے مختار نامہ جتنا منظوم ہو چکا تھا سننے کی فرمائش کی۔ حضرت ذاکر نے اول سے آخر تک یہ نظم سنائی تو دوستوں نے بے حد پسند کی اور اصرار کیا کہ نظم کو مکمل کیا جائے مگر انھوں نے ضعفِ پیری سے معذوری ظاہر کی اور یہ تجویز پیش کردی کہ ان کے فرزند لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب قبلہ یہ نظم مکمل کریں۔ حضرت قدوۃ العلماء اعلی اللہ مقامہ نے بھی یہی حکم دیا اور انھوں نے تعمیلِ ارشاد میں ڈیڑھ سال میں اس نظم میں گیارہ ہزار اشعار کا اضافہ فرمایا۔

("سحاب" لکھنؤ، جون ۱۹۵۰ء)

## شاگرد:

حضرت ذاخر بھی حضرت فاخر کی طرح کثیر التلامذہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو ڈھائی سو شاگرد تو صرف لکھنؤ میں تھے۔ اور بیرون جات میں بھی چودھری الطاف حسین جویا، اکبر ملیح آبادی اور چودھری امجد حسین صاحب آرزو وغیرہ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

لکھنؤ میں ان کے فرزند ارجمند مولوی سید محمد صاحب گرامی سید الواعظین لسان الشعراً مولانا سید اولاد حسین عرف مولوی للن صاحب شاعر اور حسینی شاعر سید ظفر عباس صاحب فضل مدیر ''نظارہ'' لکھنؤ کے علاوہ مولوی سید محمد رضی صاحب شگفتہ، ابوالمعارف راز اجتہادی، مولوی سید اختر حسن صاحب ہدف اجتہادی، مولوی سید حسن صاحب تاثیر منشی فاضل، بہزاد ذاخری جنھوں نے ترک وطن کے بعد کراچی آ کر خود کو بہزاد لکھنوی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ منشی پیارے لعل صاحب صولت، مدن موہن صاحب فہیم، سوہن لعل صاحب بیدار، شیام سندر لعل صاحب قیصر، سید محمد تقی عرف میرن صاحب نامی، راز یزدانی رامپوری، سید محمد ولایت حسین عرف چھبن صاحب گہر، بنے صاحب سحر، ڈرامہ آرٹسٹ شمس لکھنوی، ارتضیٰ خاں صاحب ارتضیٰ، خلیل احمد صاحب خلیل، فرید الدین صاحب فرید، اسد لکھنوی اور سید مصطفیٰ حسین صاحب صہبا نے شہرتیں حاصل کیں۔

## حضرت ذاخر کے احباب:

ان کے خاص اور بے تکلف دوستوں میں مرزا کاظم حسین محشر، علامہ آرزو، منے آغا صاحب ہوش، اچھے صاحب شہرت، سید محمد عسکری صاحب بسمل، سید امیر حسین صاحب فروغ، حکیم مرزا احمد صاحب دانش، حکیم منے آغا صاحب آفتاب اور عبدالحلیم صاحب شرر نمایاں تھے۔

## وقتی مشاعرے:

حضرت فاخر نے جب زینبی کی سکونت ترک کی تو حضرت ذاخر بھی جوہری محلہ میں

منتقل ہو گئے جہاں آپ کے دروازے پر ہر وقت شاگردوں کا مجمع رہتا تھا اور آپ دو دو بجے رات تک اصلاح دینے میں مشغول رہتے تھے۔ رات کو وقتی مشاعرے ہوتے۔ حضرت ذاکرؔ خود طرح نکالتے اور آپ کے تلامذہ گلی میں ٹہل ٹہل کر شعر کہتے۔ اچھے شعر پر حضرت ذاکرؔ بے اختیار تعریف کرتے۔ یہ شاگردوں کو مشقِ سخن کرانے کا ایک بہت عمدہ طریقہ تھا۔ ان کے فرزند ارجمند حسینی شاعر حضرت فضل نقوی نے بھی اپنے شاگردوں کو مشقِ سخن کرانے کے لیئے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ میں بھی ان وقتی مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہا۔

## مرثیہ گوئی:

حضرت ذاکرؔ نے گو کہ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر مرثیہ کی طرف خاص توجہ تھی۔ یہ آپ کی مذہبی فکر کا منطقی نتیجہ تھا۔ انھوں نے کم و بیش پچاس مرثیے کہے بلکہ پچاس سے بھی کچھ زائد۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لسان الشعرا حضرت شاعرؔ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت ذاکرؔ کی مرثیہ گوئی کے ذیل میں جدید و قدیم مرثیہ کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس کو یہاں درج کر دیا جائے اس لیئے کہ یہ ایک ایسے طرزِ قدیم کے مرثیہ گو کے خیالات ہیں جس نے آج سے کوئی پچاس سال پہلے "اسلام اور مزدور" کے جدید ترین موضوع پر ایسا مرثیہ کہا جو بے مثال ہے۔ حضرت شاعرؔ کے یہ خیالات ہفت وار اخبار "سحاب" لکھنؤ کی ۸ تا ۱۵ جون ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں حضرت ذاکرؔ کے متعلق مضمون میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدید و قدیم کی بحث اور کلاسیکی مرثیہ کے خلاف شور و ہنگامہ اتنا نہیں تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ ملاحظہ کیجیئے

> "اگر ہم انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مرثیہ کو سوداؔ اور میرؔ کے مرثیوں اور موجودہ قومی نظموں کے بیچ میں رکھ کر دیکھیں تو ہم کو وہ خصوصیات معلوم ہو سکتی ہیں جو صرف مرثیہ کے لیئے ہیں۔ اور جو مرثیہ کے قیود یا دستور العمل

ہیں۔ اگر قومی نظم کے آخر میں چند بند حالِ شہداء کے اضافہ کر دیئے جائیں تو یہ نظم مرثیہ نہ ہوگی۔ اور اگر مرثیہ سے حالِ شہادت جدا کر لیا جائے تو یہ موجودہ مرثیہ نظم نہ ہوگا۔

خاندانِ انیسؔ، رشیدؔ کے عہد تک منبر پر بالاعلان کہا کرتا تھا کہ یہ ہمارے گھر کی زبان ہے۔ کیا یہ زبان اردو نہ تھی۔ کیا لکھنؤ میں اردو کی چند قسمیں تھیں؟ ایسا نہ تھا بلکہ مرثیہ کے لیئے مناسب الفاظ جو اساتذہ کے مذاقِ سلیم نے منتخب کر لیئے تھے ان کا ترک یا غیر منتخب الفاظ کا استعمال اصلی فرق تھا۔

شعر کے لیئے متداولہ بحور میں کہنے کی آزادی ہے۔ اس طرح مرثیہ بھی ہر بحر میں کہا جا سکتا ہے مگر اساتذہ نے جو چار بحریں مضارع، ہزج، رمل اور مجتث معین کر دی ہیں ان کے علاوہ کسی پانچویں بحر میں مرثیہ مرثیہ نہیں رہتا۔ ایک استاد نے بحرِ متقارب میں مرثیہ کہا۔ (　　) نے سن کر فرمایا کہ یہ مرثیہ تو نہیں دھوبی کا کھنڈ ہے۔

آخرالذکر دو بحروں میں انیسؔ و دبیرؔ کے بعد میر نفیسؔ صاحب اور دیگر اساتذہ نے (بھی) مرثیے کہے۔

اسی طرح آج کا مرثیہ جس کو ہم ترقی یافتہ کہنے میں جرأت سے کام لیتے ہیں، سب کچھ کہا جا سکتا ہے، مرثیہ ہی نہیں کہا جا سکتا۔ جس قومی نظم کا اختتام امام حسینؑ کے حال پر (کیا جائے) وہ مرثیہ نہیں ہے۔

یہ بالکل دوسری بحث ہے کہ موجودہ مرثیہ کتنا مفید (ہے) اور کتنا وسیع میدان رکھتا ہے۔

قدیم اساس کا مرثیہ اب بھی بہت گنجائش رکھتا ہے اگر اس کے چہرے کو بہار کا تختہ مشق نہ بنا دیا جائے"۔ (ہفتہ وار "سحاب"، مورخہ ۸، ۱۵ جون ۱۹۵۰ء)

## حضرت ذاخر کے مرثیوں کی خصوصیات:

اس کے بعد حضرت شاعرِ اہلبیت جناب ذاخر کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے مرثیوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اساسِ مرثیہ سے باہر نہیں ہوتے اور پامال مقامات میں جدت انگیزی ان کا وطیرہ ہے۔ جب بلندیِ تخیل سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی افتادِ طبیعت ہی مضامین آفرین تھی۔ اور زبان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری زندگی کی کاوش یہی تھی۔

حضرت شاعر نے کلام ذاخر کے نمونے کے طور پر ان کا ایک مرثیہ یا مرثیے کے بعض مقامات درج کیے ہیں۔ ترتیب تصنیف کے اعتبار سے یہ حضرت ذاخر کا تیسرا مرثیہ ہے جو ۱۳۱۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کوئی پچاس مرثیے اور فرمائے۔ یہ مرثیہ حضرت حرؑ کے حال کا ہے۔ حضرت حرؑ کے حال میں اساتذہ نے مرثیوں میں جو قوتِ نظم اور زورِ سخن دکھایا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مرثیہ کا مطلع ہے

جب نگاہوں سے چھپا نیرِ تابانِ فلک
لیلئِ مصیبت ہوئی مہمانِ فلک
منتشر ہوگئے سب گوہرِ دامانِ فلک
زاہدِ شب سے بڑھی رونقِ ایوانِ فلک

دم بدم حق کے فریضہ کو ادا کرنے لگا
دانۂ انجم پہ تسبیحِ خدا کرنے لگا

تیسرے مصرع میں زاہدِ شب کہہ کے چاند کا استعارہ کیا ہے جس کی ندرت اور حسن قابلِ داد ہے۔ جب تک یہ بات واضح نہ ہو، بیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

افسوس کہ اس بیت کے بعد "سحاب" کے بقیہ متعلقہ اوراق دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے مزید بند درج کرنا ممکن نہیں۔ مگر میرے پاس حضرت ذاخر کے جو مرثیے ہیں ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

ا۔ ایک مرثیہ کا مطلع ہے:

بھائی سے چھٹے شہؑ جو غریب الوطنی میں

مگر اس کے متعدد اوراق خستہ وشکستہ ہیں۔ کچھ اوراق دستیاب نہیں ہیں۔ صرف درمیان کے اوراق سلامت ہیں۔

۲۔ دوسرے مرثیہ میں کم از کم ایک سو ایک بند ہیں مگر دو تین خستہ وشکستہ اوراق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جس کی وجہ سے مرثیہ کے متعلق ضروری تفصیلات معلوم نہیں ہو سکتیں۔

ان کے علاوہ کچھ مرثیے مکمل ہیں جو ان کے پوتے جناب شمس الحسن تاج (شمسی بھائی) مرحوم کے نقل کیئے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ ۷ اکتوبر ، ۱۹۹۸ء کو لکھنؤ میں میری موجودگی کے دوران اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ایسے شخص تھے جن سے کم از کم حضرت ذاخؔر اور خود شمسی بھائی کے والد گرامی سن الشعراً مولانا سید اولاد حسین عرف مولوی للّن صاحب شاعؔر کے علاوہ خاندان کے اور بھی صاحبانِ کمال کے متعلق بہت سی معلومات فراہم ہو سکتی تھیں۔ ان کو اپنے جد دعبل ہند حضرت ذاخؔر اور اپنے والد بزرگوار حضرت شاعؔر کے بیشتر مرثیے زبانی یاد تھے اور ان حضرات کے ایسے مرثیوں کو جو خراب ہوجانے یا کاغذ کے شکستہ ہو جانے کی وجہ سے کہیں کہیں پڑھنے میں نہیں آتے ، وہ اپنی یاد داشت کے سہارے درست کروا سکتے تھے۔

حضرت ذاخؔر کے جو مرثیے بہتر حالت میں میرے پاس ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

| مطلع | تعداد | درحال |
|---|---|---|
| ا۔ جب آسماں پہ رات کے گیسو بکھر گئے | ۱۱۶ | سید الشہدا امام حسینؑ |
| ۲۔ پھر ابتدائے شام سے آئی بلائے ہجر | ۱۳۵ | شہزادہ علی اکبر تصنیف ۱۳۲۱ھ |
| ۳۔ جواب پائے نہ جس کا وہ گفتگو نہ کرے | ۱۲۸ | شہزادہ قاسم |

| | | |
|---|---|---|
| ۳۔ خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو (حصہ دوم) | ۳۴۳ | ماہر لکھنوی |
| ۴۔ جب ابتدائے شام مصیبت گزر گئی | ۱۰۳ | حضرت ابوالفضل العباس |
| | | تصنیف ۱۳۴۸ھ |

تیسرے مرثیہ کا مطلع غلط لکھا ہے۔ صحیح یوں ہے

جواب جس کا نہ پائے وہ گفتگو نہ کرے

## حضرت ذاخر کا مرثیہ گوئی میں مرتبہ اور اس کی خصوصیات۔

کتاب کی ابتدا میں ''اسرار محن'' سے حضرت مہذب لکھنوی کا یہ قول نقل کیا جاچکا ہے:

''سرزمین لکھنؤ میں شعر و سخن سے متعلق کسی خاندان، کسی قبیلہ کی خصوصیت نہیں۔ یہ مانا کہ چند خاندان ذمہ دارِ فن کی حیثیت سے ایک خاص منزل تک پہنچے لیکن دوسرے خاندان کے افراد نے بھی خداداد قوت کا مظاہرہ کیا۔ خصوصاً خاندان اجتہاد کی بعض فردوں نے اپنا لوہا منوا دیا۔ جہاں قابل ذکر حضرت جاوید، فاخر، ذاخر، حسین اور خورشید وغیرہ تم رحمہم اللہ ہیں۔''

حضرت مہذب کے اس قول سے حضرت ذاخر کی مرثیہ گوئی کی عظمت و اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت ذاخر کی مرثیہ گوئی کی خصوصیات مندرجہ بالا سطور میں ہفتہ وار اخبار ''انقلاب'' لکھنؤ سے اقتباس کرکے درج کی جاچکی ہیں۔ مختصراً زبان و بیان اور مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ ان کا مرثیہ اساسِ مرثیہ سے باہر نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ ان کے مراثی مرثیوں کے لیے معین کردہ اجزائے ترکیبی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے مکمل مرثیے ہوتے ہیں۔

اپنی مرثیہ گوئی سے متعلق انھوں نے خود جو کہا ہے اس کو تعلّی کہا بھی جائے تو مرثیہ نگار کی تعلّی بے جواز ہے۔ حسن اخلاق اور تہذیبی قدروں کی مظہر ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں

ہاں اے قلم راکبِ شبدیزِ معانی
وعدہ جو کیا تھا وہ دکھا سحر بیانی

راکب شبدیز معانی کی ترکیب کتنی خوبصورت اور نئی ہے۔ سبحان اللہ۔

ہر بات نئی ہو نہ ہو کوئی (بھی) پرانی
مشہور ہو ہر سمت مری زمزمہ خوانی
شاباش کہیں لوگ فسانہ مرا سن کر
بلبل کو تحیر ہو ترانہ مرا سن کر

پورے بند کا ایک ایک مصرع قابل داد ہے۔

یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

(دعویٰ) نہیں اس کا کہ ہوں میں شاعر کامل
یہ بھی نہیں غرہ ہے کہ ہوں عالم و فاضل
پر نظم کی قوت مجھے بے شبہ ہے حاصل
ہے سہل مرے سامنے مشکل سے بھی مشکل
قوت یہ خدا داد ہے پائی ہے جو ہم نے
مشکل کے جو عقدے ہیں وہ کھولے ہیں قلم نے

اعجاز بیانی ہے مری طبع کی ہمدم
گرتی ہے دمِ نظم سیہی کی جو شبنم

آہاہا۔ کیا خوبصورت بات کہی ہے۔ سبحان اللہ۔

رخ حرفوں کے دھو دھو کے صدا دیتی ہے پیہم
یہ پھول بھی خوشبو میں کسی گل سے نہیں کم
ہر دم تر و تازہ ہے وہ گلشن ہے یہ گلشن
ہر طائرِ مضموں کا نشیمن ہے یہ گلشن

یہ بند ان کی انکسار پسند طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ ہو

کچھ مرثیہ گویوں میں حقیقت نہیں میری
اوروں کی طرح خلق میں شہرت نہیں میری
وہ جاہ و جلال اور وہ عزت نہیں میری
خود اپنی ثناء کرنے کی عادت نہیں میری
بیٹھے ہیں جو سخن فہم، کبھی چپ نہ رہیں گے
گر لائق تعریف ہوں، تعریف کریں گے

ذی علم بھی ہیں، اہلِ فن بھی ہیں یہاں پر
اور واقفِ اسرارِ سخن بھی ہیں یہاں پر
خوش فکر رئیسانِ دکن بھی ہیں یہاں پر
میری طرح آوارہ وطن بھی ہیں یہاں پر
بستہ جو کلی دل کی ہے وہ آج کھلے گی
تحسین سے مجلس میں مجھے داد ملے گی

کس قدر رواں اور برجستہ مصرع ہے۔

اس بند کے تیسرے اور چوتھے مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ حیدرآباد دکن میں پڑھا گیا جہاں سامعین میں باہر کے لوگ بھی موجود تھے۔

یہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ کیا خوبصورت بند ہے:

ہم اور گلِ تر باغ میں یکجا رہے برسوں
خوش رنگ مضامین کے جویا رہے برسوں
ہر ناظمِ خوش فکر کے شیدا رہے برسوں
شاگردِ دبیرِ سخن آرا رہے برسوں
گھر میں تو کبھی دشت نوردی میں کٹی ہے

عمر اپنی اسی بادیہ گردی میں کٹی ہے
سلجھی ہوئی گیسو کی طرح ہے میری تقریر
اور پاؤں میں بندش کے صفائی کی ہے زنجیر
یوں حال جناب علیؑ اکبرؑ کا ہو تحریر
ہر صفحۂ کاغذ پہ کھنچے جنگ کی تصویر
کٹ جائے گی گو نظم کی منزل یہ کڑی ہے
خوب آج طبیعت بھی لڑائی میں لڑی ہے

سبحان اللہ۔

یہ بند ایک ایسے مرثیے کے ہیں جس کا صرف ایک ورق میرے پاس ہے اور وہ بھی خستہ وشکستہ ہے۔ اس پر مندرجہ بندوں کے نشان ۵۶ سے ۶۰ اور ۶۱ سے ۶۵ تک ہیں۔ ایک بند اضافی ہے۔ مندرجہ بالا آخری بند سے یہ معلوم ہوا کہ مرثیہ جناب علیؑ اکبر کے حال میں ہے۔

میں نے جو یہ سب بند نقل کرنے سے پہلے لکھا تھا کہ حضرت ذاخر کی تعلّی بھی سر بہ انکسار ہے وہ ان کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا۔

ایک وضاحت بہت ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آخری بند سے پہلے والے بند کے چوتھے مصرع میں لفظ دبیر مرزا صاحب اعلی مقامہ کے تخلص کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ حضرت ذاخر کبھی بھی مرزا دبیر کے شاگرد نہیں رہے، یہ بات بالکل واضح ہے۔ اس مصرعے میں لفظ دبیر انھوں نے اصلی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس طرح تیسرے مصرعے میں ناظم خوش فکر کہا ہے اسی طرح چوتھے مصرعے میں دبیر سخن آراء اسی کی مناسبت سے کہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس لفظ سے کسی مغالطہ میں نہیں پڑیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ذاخر کو مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ سے استفادہ کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اس لیے کہ حضرت ذاخر کی ولادت ۱۲۹۰ھ میں ہوئی اور جب وہ صرف

دو برس کے تھے تو ۱۲۹۲ھ میں مرزا صاحب اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔

ایک اور مرثیہ سے تعلّی کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ اس مرثیہ کا سیاق و سباق معلوم نہیں ہے۔ مطلع اور مقطع کا کچھ پتہ نہیں ہے مگر درمیان کے کوئی ۱۱۴ بند مسلسل وار موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے۔ مرثیہ امام حسین علیہ السلام کے حال کا ہے۔ تعلّی کے بند حسب ذیل ہیں:

اب اہل نظر بزم میں ہو جائیں خبردار
گو سننے کے قابل نہیں پر سن لیں یہ گفتار
ہر اک سے برا میں ہوں نہ حجت ہے نہ تکرار
کچھ دن تو مگر یاد رہے آج کی پیکار

بیت ملاحظہ ہو

مضموں کی گھٹا جھوم کے کہسار سے آئے
آواز ثنا کی در و دیوار سے آئے

یا [illegible]

سب جانتے ہیں مجھ میں نہیں کچھ (ہمہ دانی)
پر شکر ابھی تک ہے طبیعت میں روانی
معلوم ہے ان کو مرے رتبہ کی گرانی
جو کر چکے ہیں سیر کتب ہائے معانی
بیکار کا جو شور ہو وہ شور نہیں ہے
ہے جس کو حسد اس پہ مرا زور نہیں ہے

کیسا رواں مصرع ہے۔ نظم کو نثر بنا دیا ہے۔

بے جا نہیں گر اپنے ہی رتبہ پہ کروں ناز

مداح ہوں حضرتؑ کا اسی سے ہوں سرفراز
کیوں سب سے الگ ہو نہ مری نظم کا انداز
کہتا ہوں چہک کر کہ میں ہوں بلبلِ شیراز
اپنوں کے یہ قابل ہے، نہیں غیر کے قابل
یہ باغ ہر اک رنگ سے ہے سیر کے قابل

تعلّی کے یہ سارے بند فکر و فن کے لحاظ سے بلند بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ جن مصرعوں سے شاعر کے انکسار اور عاجزی کا اظہار ہوتا ہے وہ ان کی اعلیٰ انسانی قدروں اور تہذیبی رویوں کے آئینہ دار ہیں۔

## منظر نگاری:

حضرت ذاکر کے جو مراثی میرے پاس ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے منظر نگاری کے لیے بہاریہ مضامین وغیرہ کا انتخاب نہیں کیا۔ ان کی منظر نگاری بیشتر شب عاشور کے حالات سے عبارت ہے جس میں "واقعہ" کے مواقع بہت کم آتے ہیں۔ عموماً حزن و یاس کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ حضرت حر کے حال میں ان کا مرثیہ جو تسلسل تصنیف کے اعتبار سے ان کا تیسرا مرثیہ تھا اور افسوس ہے کہ میرے پاس نہیں ہے، اس کا مطلع منظر نگاری میں ان کی صلاحیت کا غماز ہے۔ حضرت حر کے حال کے پیش نظر شب عاشور کے اس منظر میں شاعری اور فکر و فن کی ندرت قابل داد ہے۔ یہ مطلع میں اسی مضمون میں پہلے درج کر چکا ہوں مگر اب منظر نگاری کے حوالے سے یہاں دوبارہ درج کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہوں

جب نگاہوں سے چھپا نیّرِ تابانِ فلک
لیلیٰ لیلِ مصیبت ہوئی مہمانِ فلک
منتشر ہو گئے سب گوہر دامانِ فلک
زاہد شب سے بڑھی رونق ایوانِ فلک

دم بدم حق کے فریضے کو ادا کرنے لگا
دانہ نجم پہ تسبیح خدا کرنے لگا

[illegible]

ملاحظہ کیجیے

جب انتہائے شام مصیبت گزر گئی
بے تابیوں کی ملک عدم تک خبر گئی
ٹھنڈی ہوا سے یوں تپ فرقت اتر گئی
جو دل کی آگ تھی وہ چراغوں کے سر گئی

[illegible]

حدت جگر کی نعل سر تاج ہو گئی
شعلے کو کوہ طور پہ معراج ہو گئی

کیسی وہ آگ تھی جو جلا کی تمام رات
کس دل کو جستجو تھی دوا کی تمام رات
درد جگر سے کس نے قضا (بکا) کی تمام رات
آتی رہیں صدائیں دعا کی تمام رات

اس مصرع میں قضا کا لفظ سہو کتابت ہے۔

نالے دہن کے بے اثر و پر اثر رہے
سامان زندگی و قضا رات بھر رہے

قرب شفتگی ہے گل مہر آسماں
اکھڑے ہوئے نفس کا اثر ہے کہاں کہاں
ہوا رہا ہے شمع کے بالائے سر دھواں
جلتے ہوئے جگر نے کیا اور بدگماں

کیا چیز تھی جو شمع کی لو سے سلگ گئی
گھبرا کے دیکھتا ہوں، کہاں آگ لگ گئی

کیا برجستہ مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

اس آخری بند کا پہلا مصرع طلوع آفتاب کے بیان میں بالکل نیا اور بے مثال ہے۔

(مرثیہ ''جب انتہائے شام مصیبت نزدیک'' در حال حضرت عباسؑ)

منظر نگاری کا ایک یہ انداز ہے جس میں ہلکا سا جذبات نگاری کا پرتو بھی ہے۔ دوسرا انداز مندرجہ ذیل بندوں میں دیکھئے۔ یہ میدان جنگ کا منظر ہے۔ حضرت ذاکر نے ایک خاص انداز فکر سے میدان جنگ کی منظر نگاری کو اپنا موضوع بنایا ہے جو عموماً ان کے سب مرثیوں میں ملتی ہے۔

امام حسینؑ دشمن سے مخاطب ہیں۔ اس بند کی آخری بیت اور پھر منظر نگاری ملاحظہ ہو

جو ہو نہ سکے ہاتھ سے وہ کام نہ لینا
اب آج سے لڑنے کا کبھی نام نہ لینا

اب دشمن کا حال:

ایسی بھی مصیبت نہ فلک ایک پہ ڈالے
خود کانپتے ہیں دل کی طرح برچھیوں والے

کیا کہنا۔

بیکار ہوں گر ہاتھ تو دل کون سنبھالے
جو تیر تھے سینوں میں وہ مشکل سے نکالے

منہ خاک کے پردے میں چھپا بیٹھے یہ ذرے
بے گھر ہوئے، اب ہیں نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

سبحان اللہ۔

کس طرح نہ ہو غدر جو یہ فوج کو دابیں

رسوا و پریشاں ہیں جو ٹوٹی ہیں رکابیں
ڈھل ڈھل کے کمر سے بھی گری جاتی ہیں ڈھالیں
پاؤں میں الجھ جاتی ہیں خیموں کی طنابیں

کیا منظر نگاری ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

شمشیر الگ ہو گئی ہے ذلتیں دے کے
ڈرتے ہیں جو نامرد تو سائے کو بھی لے کے

کیا خوبصورت تخیل ہے۔ بالکل نئی بات ہے۔

واقف ہے ہر اک ان کی بزرگی و شرف سے
ڈرتا ہے ہر اک ابنِ شہنشاہِ نجف سے
اب حملے سے مقصد ہے نہ چھوٹا ہے نہ صف سے
تیر بھی اب چھوٹتے ہیں اُن کی طرف سے

دشمن کی بدحواسی کی کیا سچی تصویر ہے۔

پانی ہوئے جاتے ہیں دل آہوں کے اثر سے
آواز کا دم بند ہوا جاتا ہے ڈر سے

کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

چکر میں ہر اک گرزِ گراں بار کا سر ہے
تلوار جو آری ہے تو غربال سپر ہے
انجام کی اب ان کو نہ باجوں کی خبر ہے
ٹوٹی ہوئی پہلے سے کمانوں کی کمر ہے

کیا خوبصورت مصرع ہے۔ کمانوں کے جھکاؤ کو ٹوٹی ہوئی کمر سے استعارہ کرنا فکر کا کمال ہے۔

جو نیک سے لڑتا ہے وہ بد ہے کہ نہیں ہے

جھکنا مرا دعوی پہ سند ہے کہ نہیں ہے

اور اسی کیفیت میں حسن تعلیل کا لطف اک بیت میں دیکھیے

مضطر ہیں اگر اہلِ جہاں اب تو بجا ہے
ہر سمت خبر دینے کو خوں دوڑ رہا ہے

سبحان اللہ کیا عمدہ تخیل ہے۔

مندرجہ بالا ساری مثالوں میں آپ فکر کی بلندی تخیل کی رسائی، زبان و بیان کا حسن اور بہترین شاعرانہ خوبیوں کو ملاحظہ فرماسکتے ہیں جو شاعر کے فکر و فن کی ندرت، نزاکت خیال اور قدرت نظم کا بیّن ثبوت ہیں۔

## تغزل:

یہ کہنا تو غلط ہے کہ مرثیوں میں تغزل کا عنصر عشق و تعشق نے شامل کیا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں بھی تغزل ملتا ہے جس کا بہت واضح ثبوت ان کے رزمیوں میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف کے بند ہیں لیکن عشقؔ و تعشقؔ اور پھر پیارے صاحب رشیدؔ نے اس پر بہت زیادہ توجہ دی اور دوسرے اجزائے مرثیہ مثلِ منظر نگاری وغیرہ میں بھی تغزل کا بھرپور استعمال کیا جس سے لوگوں کو اعتراض کا موقع ملا۔ اس لیئے کہ بات اعتدال کی حد سے گزر گئی تھی۔ چنانچہ نواب سردار صاحب سردارؔ لکھنوی نے جو کہ میاں کاملؔ کے شاگرد تھے میر نفیسؔ کے ایک مرثیہ کے جواب میں مرثیہ لکھا جس میں جناب سیدۃ النساء فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شادی کا جشن آسماں پر حوروں کو مناتے ہوئے دکھایا گیا۔ اس سلسلے کے چودہ بند ہیں جن میں سے آٹھ بند مرزا جعفر حسین صاحب نے اپنی کتاب "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" میں نقل کیے ہیں۔ آٹھویں بند کی بیت بے مثال ہے۔

نہ شادیاں کبھی ایسی ہوئیں نہ بیاہ ہوئے
خدا نے عقد پڑھا انبیاءؑ گواہ ہوئے

کی بیت سے ملا دو ان سے دو مصرعے تقریب کی وضاحت کے لیے کہے گئے ہیں جس کے لیے عرش معلیٰ سے یہ صدا آتی ہے:

ولیمہ آج ہے جنت میں اس کی شادی کا

کیونکہ

پڑھا ہے فاطمہؓ کے ساتھ ہم نے عقد اس کا

میں اس جگہ وہ سارے بند نقل کر کے طول نہیں دینا چاہتا۔ صرف دو تین بند درج ذیل ہیں جس سے آپ کو غزل میں حد سے تجاوز کا اندازہ ہوگا۔ پہلے بند کے پہلے دو مصرعے

صدا یہ سن کے ہے سکانِ خلد کا دل شاد
چہار سمت ہے ہنگامۂ مبارک باد

دوسرا بند

وہ حوریں اور وہ ان کے قدوں کی رعنائی
وہ سادے سادے لباس اور وہ ان کی زیبائی
وہ مل کے ابروؤں کی دلبری دل آرائی
کسی حسین نے گویا کہ لی ہے انگڑائی
وہ حسن طوق کا زینت وہ گوشواروں کی
وہ ماہ نو کی ضیاء وہ چمک ستاروں کی

نکل کے قصر سے طوبیٰ کے سایہ میں آنا
وہ سینہ تان کے چلنا وہ ان کا اٹھلانا
وہ ہاتھ ڈالے گلوں میں ادھر اُدھر جانا
وہ دیکھ دیکھ کے آئینہ اور اترانا
ادھر کو حوروں کا مجمع اُدھر کو غلماں کا
سماں ہے گلشن فردوس میں پرستاں کا

کرشمے آنکھوں کے سفاک، چتونیں قتال
وہ گدری چوٹیاں ان کی وہ لمبے لمبے بال
وہ حسن سیب ذقن کا وہ گورے گورے گال
لبھے فرشتوں کے دل، اس بلا کی پیاری چال

وہ نخرے حشر بپا جن سے پارساؤں میں
لگاوٹوں کی نظر بانکپن اداؤں میں

(قدیم لکھنؤ کی آخری بہار چہارم، ص ۲۹۴)

باوجودیکہ تغزل اس زمانہ میں مرثیہ کا ایک مقبول عام جزو تھا اور اکثر سامعین تعشق اور رشید کی مجلسوں میں صرف تغزل اور بہاریہ کے لئے سننے جاتے تھے اور شاعری مضمون آفرینوں اور نازک خیالیوں کی داد دیتے تھے مگر جب مندرجہ بالا بندوں کی طرح اعتدال کی حد سے گزرتے تو اعتراض بھی ہونے لگے۔ چنانچہ مرزا جعفر حسین ان بندوں کو درج کر کے لکھتے ہیں کہ:

"ایک مولوی کو تو یقیناً یہ حق حاصل تھا کہ وہ جنتوں میں اپنی ریش پکڑ پکڑ کے حوروں کی یاد میں تڑپ اٹھے اور اپنی رال ٹپکا ٹپکا کے ان کے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش کی خیالی تصویر پیش کرے۔ ہم کو اس تعیش دماغی سے کوئی سروکار نہیں"۔

پھر کہتے ہیں کہ:

"مرثیے میں یہ تذکرے اگر شامل نہ ہوتے تو بہر حال بہتر تھا"۔

(ص۔ ۲۹۵)

اب آپ مرثیہ نگاران خاندان اجتہاد کے مرثیوں کا مطالعہ کیجیے جن میں یقیناً جا بجا تغزل کے عمدہ نمونے ملتے ہیں مگر ایسا تغزل نہیں جیسا ان بندوں میں ہے۔ وہ اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے موقع و محل اور ماحول اور مرثیے کی عمومی فضا کو مد نظر رکھتے

نسب میں ہونے کے باوجود مرثیوں کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ ان کا دیوان "خزینۂ خیال" ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا۔ مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلیٰ اللہ مقامہ حضرت مہر کے سگے بھتیجے، شاگرد اور جانشین تھے۔ انھوں نے جہاں بے شمار مرثیے کہے وہیں غزلوں میں ان کے پانچ دیوان شائع ہوئے۔ نادر شام غریباں عمدۃ العلما مولانا سید کلب حسین صاحب عرف مولوی ببن صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ بڑے مقدس اور مقبول عام متقی تھے۔ وہ باقاعدہ شاعر نہیں تھے مگر جب جی چاہتا تھا غزل بھی کہہ لیتے تھے۔ مجھ کو ان کی ایک غزل کا ایک شعر بے حد پسند ہے:

اڑتے پھرتے ہیں چمن میں مرے اکھڑے ہوئے پر
ڈھونڈتی پھرتی ہے یوں قوت پرواز مجھے

اعلم العلما مولانا سبط حسین صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ علوم دین کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز تھے۔ مجتہد اعظم اور فقیہ تھے، ساتھ ہی بہت خوش فکر شاعر بھی تھے وہ بہترین غزل گو تھے ان کے علاوہ خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ جن کی خطابت کی آج تک دھوم ہے وہ بھی نہایت اعلیٰ پائے کے شاعر اور غزل گو تھے۔ ماضی قریب میں علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ مرحوم مجتہد اعظم پاکستان علوم دین کی طرح شاعری میں بھی بلند درجے پر فائز تھے۔ ان کی غزلوں کا دیوان "نقوش بے خودی" کے نام سے ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ آج کے بعض منبر نشین علما حضرات کی غزلیں اکثر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا غزل گوئی کو خاندان اجتہاد کی شرافت کے خلاف قرار دینا ناجائز ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ غزل مرثیہ میں ہو، قصیدہ میں یا غزل میں اس میں کوئی رکیک، مبتذل یا نامناسب لفظیں تو نہیں آتی ہیں یا مضمون میں کوئی ابتذال یا مذموم بات تو نہیں ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعرا کا یہ ذکر دوسرے مرثیہ گویوں کے مرثیے بھی مستثنیات کے علاوہ اس عیب سے انشاء اللہ خالی

نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین صاحب نے اسی ذیل میں یہ فرمایا ہے کہ ''ذاکر مرحوم کے مرثیوں کو دیکھیے تو ہر ہر قدم پر رنگ تغزل کھلا ہوا نظر آتا ہے''۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب نے درست کہی لیکن یہ نہیں بتایا کہ تغزل کا انداز کیا ہے۔ میں ان کے ایک مرثیہ سے چند بند چہرے کے اور چند بند گھوڑے اور تلوار کی تعریف کے درج کر رہا ہوں۔ ان میں تغزل کا اندازہ کیجیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ یہ رنگ تغزل کہاں تک مذموم اور کہاں تک مستحسن ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جب آسماں پہ رات کے گیسو بکھر گئے

یہ پہلا ہی مصرع تغزل کا خوبصورت نمونہ ہے۔

دارِ جہاں سے دن کے مسافر گزر گئے
پُرنور ذرے گوشۂ عالم کو کر گئے
نزدیک شام زخم چراغوں کے بھر گئے
زلفیں دھوئیں کی ظلم ہوا سے بکھر گئیں
ناسورِ دل میں بتیاں شعلوں کی پڑ گئیں

چوتھا مصرع اور بیت بھی تغزل کی عمدہ مثال ہے۔

ایک اور بند ملاحظہ ہو خاص طور سے دوسرا مصرع

تھیں شب کی مہربانیاں بھی، دن کا جور بھی
حلقوں میں گیسوؤں کے درازی بھی دور بھی
اندازِ نور میں تھا اندھیرے کا طور بھی
زینت شفق نے دے دی سیاہی کو اور بھی
شہرے جہاں میں ہو گئے اتنی سی بات کے
شعلے بھڑک کے رہ گئے دامن میں رات کے

تھا جو جمالِ روز وہ عالم سے کھو گیا
جلدی نصیب خاک کے ذروں کا سو گیا
دریا دھوئیں کا پھیل کے ضو کو ڈبو گیا
جس میں شریک آگ تھی وہ آگ ہو گیا
انگشتِ شعلہ اولِ شب برمحل اٹھی
اتنا دھواں بڑھا کہ ہر ایک شمع جل اٹھی

بیت کے پہلے مصرع میں تخیل کی ندرت قابلِ داد ہے۔
اور اب اختصار کے پیشِ نظر دو تین مصرعے اور بیتیں

تارے نکل کے کہنے لگے رات ہو گئی

پڑی شفق تو شام کے گیسو میں بل پڑے
کشتو، یہ خون، قلب کے چھالے ابل پڑے

ایک بند کے آخری چار مصرعے:

تاثیرِ سوزِ صاحبِ آزار بڑھ گئی
شب کی حرارت سے نبض کی رفتار بڑھ گئی
ہٹ جس میں تھی اسی سے وہ بات آ گئی
اے صاحبانِ دردِ جگر، رات آ گئی

چاروں مصرعوں میں تغزل کے حسن کے علاوہ چھٹا مصرع کس قدر رواں اور حسین ہے۔
اب گھوڑے کی تعریف میں کچھ بند:

زیں پر ادھر سوار ہوئے شاہِ مشرقین
طاعت ہوئی سمند کو اس سمت فرضِ عین
زیں پر چڑھا جو لختِ دلِ فاتحِ حنین
کمی فرس نے پاؤں میں دنیا کی زیب و زین

پوتھے مصرعے کے بعد بیت دیکھئے اور کمال شاعری کی داد دیجیے۔

سم میں صدائیں بند تھیں فریاد کی طرح
جو چپ تھی وہ عالم ایجاد کی طرح

جو منتخب تھا اہل نظر میں وہ بےنظیر
ابرو میں یوں نگہ تھی کماں میں ہو جیسے تیر
گیتی نورد ، صاعقہ دم ، آسماں سریر
چالاک و شوخ و تجربہ کار و فلک مصیر

رفتار میں نہ(۹) نقش تھے نہ زمیں پامال تھی
چوکڑی کے نشاں تھے نہ جولانی کی چاپ تھی

پانچویں مصرعے سے غزل کا حسن سمٹ کے چھٹے مصرعے میں آ گیا ہے۔ در غزل میں بے مثال اس بند کو بھی ملاحظہ کیجیے۔

میداں کسی حسیں کا جلوخانہ ہوگیا
دل پھنس کے دامِ زلف میں دیوانہ ہوگیا
جھونکا ہوا کا شمع پہ پروانہ ہوگیا
مشہور حُسنِ دوست کا افسانہ ہوگیا

ذرے چراغ بن گئے نعلوں کے نور سے
لے لیں بلائیں طور کی بجلی نے دور سے

اس بند کا تغزل بھی قابلِ داد ہے۔

بیمارِ غم کو نرغے سے آ کے قضا بچائے
کام اب دوا نہ دے گی ، کسی کی دعا بچائے
شعلہ بڑھا ہے حسن کا ، دامن ہوا بچائے
بجلی تڑپ رہی ہے نظر کی ، خدا بچائے

واہ، کیا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

ہر قلب کو امید ہے لطفِ عمیم کی
پھر بڑھ نہ جائے طور پہ خواہش کلیم کی

اور ذیل کے دونوں بند تغزل میں خاصہ کی چیز ہیں۔

رخنے پڑے ہیں حسن سے دیوارِ مصر میں
بے چینیاں ہیں قلبِ خریدارِ مصر میں
پھر ہوش ڈھونڈے جاتے ہیں بیمارِ مصر میں
یوسف دوبارہ آئے ہیں بازارِ مصر میں
دنیائے عشق میں اثرِ انقلاب لے
جو پیر ہو گیا ہو وہ آکے شباب لے

دل ہم نہ دیں گے تیز روی پر، قسم نہ کھاؤ
برقِ جمالِ رخ تمھیں دکھلا دیں، آؤ آؤ
طوفانِ بحرِ حسن میں ڈوبے گی دل کی ناؤ
جس پر جواں فدا ہیں وہ پیری کا ہے بناؤ
آخر جہاد ہے دل و جانِ بتول کا
لایا ہے پھر شباب کو گھوڑا رسول کا

اور اب دو تین بند تلوار کے:

اے تیغ تیرے عشق کا سودا ہے آج تک
تو ہر دل و جگر کی تمنا ہے آج تک
تیرا دیارِ حسن میں شہرہ ہے آج تک
اٹھتے ہوئے شباب پہ قبضہ ہے آج تک
برقِ جمال و شعلہ فشانی گئی نہیں

ساتھ ہو اور موضوع اور اس کی فضا کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

## معرفت و پند و نصائح:

اب اس کے ساتھ حضرت ذاخر کے ایک مرثیہ سے چند بند معرفت اور پند و نصائح سے متعلق ملاحظہ ہوں۔ یہ بند چہرے کے ہیں اور مطلع سے شروع ہو رہے ہیں

جواب پائے نہ جس کا وہ گفتگو نہ کرے
بغیر صاف کیئے زخم کے رفو نہ کرے
جسے نہ ڈھونڈ سکے، اس کی جستجو نہ کرے
جو حق سے بھی نہ ہو پوری وہ آرزو نہ کرے
سوال حد سے جو گزرے، بھلا نہیں ہوتا
کبھی زمانہ میں بندہ خدا نہیں ہوتا

کیا کہنا۔ پورا بند قابل داد ہے۔

لباسِ کفر میں زہاد کے نہ سیکھ اصول
وہ مادّہ ہی نہیں نور کو کرے جو قبول
سیاہ دل عملِ نیک سیکھتے ہیں فضول
ہوئے بھی ہیں کہیں کفار کبریا کے رسول
ملا ہے کب یدِ بیضا سے نور چھالوں کا
طریق اور ہے معراج پانے والوں کا

کھلے فریب کے رستے چلا یہ کون سی چال
قدم سے چھوٹتے جاتے ہیں جادہ ہائے محال
کبھی تو قلب کی قوت سے لغزشوں کو سنبھال
فلک پہ جا سکے جس سے ارے وہ راہ نکال
ترا خیال تری حد سے بڑھ نہیں سکتا

شعاعِ مہر کے زینوں سے چڑھ نہیں سکتا

کیا عمدہ بیت ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

یہ پورا بند قابلِ داد ہے ملاحظہ ہو۔

جہاں میں کشتیٔ دل بحرِ حرص میں نہ ڈبو
نکال تہہ سے وہ موتی جو تیرے کام کا ہو
ضرور ڈوبیں گے وہ تن سبک ہوئے نہیں جو
ارے نہ چادرِ آبِ رواں کو اوڑھ کے سو

وہ قطرے ہاتھ سے دامن جو تجھ سے چھوٹ نہ جائیں
نقوشِ آب ہوائے نفس سے ٹوٹ نہ جائیں

کیا کہنا ہے۔ جزاک اللہ۔

نہیں ہے تجھ تک آبِ زمیں کی طغیانی
بڑھی نہ دستِ مژہ ڈوبنے سے حیرانی
جو کام جس کا ہے کرتا ہے وہ بہ آسانی

اور مصرع ہے کہ

کنویں کا کھینچ نہ تارِ نگاہ سے پانی

یہ تخیل ہے سبحان اللہ۔ بالکل نئی بات کہی ہے۔

قوی پہ زور ضعیفوں کا چل نہیں سکتا
جگر کی آگ سے چشمہ ابل نہیں سکتا

اور بند ملاحظہ ہو:

وہ کیا سنے گا فلک نے کیا ہو جس کو ملول
یونہی رہیں گے ارادے جو کر رہا ہے فضول

یہ مصرع ہے کہ

نہ ہوگا نیچا ترے قد سے سروِ باغ کا طول

سبحان اللہ۔ جہاں پہ ہاتھ نہ جائیں وہاں کے چھوڑ دے پھول

کجی راہ پہ طرزِ عمل نہیں ملتا

کبھی کھنچی ہوئی شاخوں سے پھل نہیں ملتا

کیا کہنا ہے۔ سبحان اللہ

جنھیں بھرا ہے مئے کبر سے وہ پی نہ ایاغ

جلا چراغ سمجھ کر کسی کے دل کے نہ داغ

ہے آسماں پہ تری طرح شعلے کا بھی دماغ

جو شئے ہوا میں بھری ہو عبث ہے اس کا سراغ

نہ نکلے گی جو ہوس وہ پسند کرتا ہے

اور مصرع ہے کہ

دھوئیں کو ہاتھ کی مٹھی میں بند کرتا ہے

کیا کہنا۔ جزاک اللہ

بگڑ کے بخت سے تحصیلِ زر میں دین نہ کھو

ذرا سے پانی میں موتی سی آبرو نہ ڈبو

کرے وہ خدمت کافر، خدا کا عبد جو ہو!

مثل یہ یاد زمانہ میں کیا نہیں تجھ کو

کوئی تصور دولت نہ فائدہ دے گا

خدا نہ دے تو سلیماں کسی کو کیا دے گا

کیا کہنا ہے، کیا کہنا۔ جزاک اللہ۔

ان بندوں میں معرفتِ حق کی جھلک بھی ہے اور پند و نصیحت بھی جن کے شاعرانہ انداز نے قارئین و سامعین کے لیئے پند و نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر بنا دیا ہے۔ ایسے

مضامین صرف مرثیہ ہی میں لائے جا سکتے ہیں۔ کسی دوسری صنف سخن کے دامن میں اتنی گنجائش ہی نہیں۔ ایسے ہی مضامین نے مرثیہ کے وقار و عظمت کو بھی بلند کیا ہے اور مرثیہ کو اتنی وسعت دے دی ہے جس کی کوئی نظیر ہی نہیں ہے۔

## شبِ فرقت:

شاعر نے اپنے ہی جذبات و احساسات کو پیش نظر رکھ کر شب عاشور کا تصوراتی نقشہ کھینچا ہے۔ چند بند ملاحظہ کیجیے اور ان میں بھی تغزل کا حسن دیکھیے

سونگھا کیا جلے ہوئے قلب و جگر کی بو
آنسو کسی جگہ نظر آئے کہیں لہو
چھٹنے نہ پائی شام سے دیوانگی کی خو
راحت کو ڈھونڈتا رہا بستر پہ چار سو

بیت ملاحظہ ہو

کرتا تھا گردشیں فلکِ پیر کی طرح
تکیہ پھرا کیا مری تقدیر کی طرح

دہ، نیند نہ آنے کی بے چینی کا کتنا خوب صورت اظہار ہے۔

گردش دکھا رہا تھا زمانہ کا انقلاب
رخسار صبحِ غم سے سرکتی نہ تھی نقاب
پنہاں رہا ہو ایسے دلوں کا نہ پیچ و تاب
پچھلے سے اور بڑھ گیا شمعوں کا اضطراب

نور اپنی حد سے بڑھ جو نہ سکتا تھا داغ کا
کانپ اٹھتا تھا زمیں پہ اندھیرا چراغ کا

اور اسی بند سے گریز کا حسن ملاحظہ کیجیے:

آرام خوب تھا، تعب آیا تو یہ کھلا

رحمت وسیع تھی ، غضب آیا تو یہ کھلا
ہم مضطرب تھے ، وقت شب آیا تو یہ کھلا
دم دل سے کھنچ کے تا بہ لب آیا تو یہ کھلا
عالم میں اک غریب کے مقتل کی رات ہے
ظلمت پکارتی ہے کہ جنگل کی رات ہے

(مرثیہ جب انتہائے شام مصیبت گزر گئی، در حال حضرت عباسؑ)

ان بندوں میں بھی تغزل ہے جو شاعر کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے مگر وہ کہاں تک خلاف شریعت اور ''عیب'' ہے۔ یہ تو صاحبان نظر ہی بتا سکتے ہیں۔

## رخصت:

رخصت مرثیہ کا بہت اہم اور بہت مشکل مقام ہوتا ہے۔ عموماً اس میں شعراً بہت طویل بند کہتے ہیں مگر کبھی کبھی کوئی ایک بیت ایسی نکل آتی ہے جو اس موضوع کا نچوڑ ہوتی ہے۔ حضرت ذاخرؔ کے ایک مرثیہ میں جناب قاسمؑ کی رخصت کے سلسلہ میں ایک بیت ایسی ہی ہے مگر سیاق وسباق کو مد نظر رکھنے کے لیئے میں پورا بند نقل کر رہا ہوں بلکہ سابق بند کی بیت بھی درج کر رہا ہوں۔ جناب قاسمؑ اذن جہاد کو خیمے میں آئے ہیں۔

حرم میں سید مسموم کا پسر آیا
نظر جو ماں پہ پڑی ، منہ تلک جگر آیا

ماں کی حالت یہ ہے:

رواں ہیں آنکھوں سے آنسو، کھلے ہیں دوش پہ بال
سہارا در کا یہ کہتا ہے دل ہے غم سے نڈھال
جو بے کہے ہوئے معلوم ہو وہ غیر ہے حال
ادھر لگی ہوئی آنکھیں ہیں جس طرف ہے خیال
تڑپ رہی ہے غم ہجر کی ستائی ہوئی

اور چھٹا مصرع ملاحظہ ہو کہ:

بلائیں لے رہی ہے آنکھ ڈبڈبائی ہوئی

کس قیامت کا مصرع ہے۔ اللہ اکبر۔

(مرثیہ جواب پائے نہ جس کا وہ گفتگو کرے۔ در حال حضرت قاسمؑ)

اس طرح جناب علی اکبر کا وقت رخصت اپنی والدۂ گرامی سے امام زین العابدینؑ کے لیے وصیتیں کرنا۔ اس موقع پر دو بندوں سے اقتباس

ہشیار غش سے حضرت سجادؑ ہوں اگر<br>
کہیے گا، کہہ گیا ہے یہ شبیرؑ کا پسر<br>
تنہائیِ لحد ہے گراں قلبِ زار پر<br>
پڑھیے گا آپ بیٹھ کے قرآں مزار پر

اور دوسرا بند

بھائی سفر عدم کا ہے اور ہے یہ دل حزیں<br>
جنگل میں ہوگی اور یہ قبر کی زمیں<br>
ممکن ڈراونے بن میں نہ ہوگی اماں کہیں<br>
بابا سے چھوٹ کر میں اکیلا رہا نہیں

اور بیت ملاحظہ کیجیے کیسی حسرت بھری تمنا ہے

تکلیف دے نہ شام دلِ بے قرار کو<br>
دن سے جلائیے گا چراغ مزار کو

(مرثیہ بجھا ابتدائے شام سے کس کا ... در حال حضرت علی اکبرؑ)

اسی طرح وقت رخصت حضرت عباسؑ سے ان کی زوجہ کی گفتگو میں یہ بند ملاحظہ ہوں۔ سابق بند کی بیت ہے:

تسکینِ دل کوئی نہ کوئی دیتے جائیے

بچوں کو ساتھ بہرِ وغا لیتے جائیے

ظاہر ہوں تربیت سے جواں مردیوں کے رنگ
سکھلاتا جائے بازوئے سرورؔ وغا کا ڈھنگ
بڑھتی ہی جائے چھوٹی سی تلوار کی امنگ
روکیں خدنگ ننھے سے سینوں پہ وقتِ جنگ
اپنا لہو گرائیں پسینے پہ آپ کے
بچے سعید وہ ہیں جو کام آئیں باپ کے

کیا کہنا۔

لے لیجیے کسی نہ کسی امتحان کو
دیجے بڑے کو تاکہ یہ کھینچے کمان کو
بٹھلا کے زینِ اسپ پہ ننھی سی جان کو
کچھ دور دیکھیے تو سواری کی شان کو

واہ وا۔ اور بیت ہے:

فکرِ شکار غیظ بھری چتونوں کو ہے
چھوٹا ابھی سے الٹے ہوئے دامنوں کو ہے

کس تیور کی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

رخصت کے بند خصوصاً بیتیں پر اثر بھی ہیں اور ان میں تخئیل اچھوتی بھی۔ ہے اور نئی بھی۔ اوپر کی ساری بیتیں نئے مضمون کی تلاش میں شاعر کی قوت فکر کی آئنہ دار ہیں اور اس کے ساتھ ہی جذبات نگاری کی بھی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

## رجز:

مرثیہ کے رزمیہ حصہ میں اکثر رجز نظم کی جاتی ہے گوکہ لازم نہیں ہے۔ رجز خواں اس میں اپنی نسبی شرافت اپنے بزرگوں کی صفات اور ان کی اور اپنی شجاعت اور حرب و

ضرب میں مہارت کو جوش و ولولے کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس بیان سے اپنے مدِ مقابل کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حضرت ذاکر نے بھی بعض مرثیوں میں رجز نظم کی ہے۔ چند مثالیں درج ہیں۔
جناب قاسم میدان جنگ میں آتے ہیں۔ لحہ بھر کو میدان جنگ میں لشکر دشمن کا حال دیکھ کر رجز پڑھنا شروع کرتے ہیں:

رہا ادھر تو یہ کچھ دیر حالِ لشکرِ شر
پکارا تھم کے ادھر شیرِ بیشۂ حیدرؓ
حسب نسب کو مرے سن لیں دشت میں خودسر
وہی ہے کام کی تلوار جس میں ہوں جوہر

اور بیت ملاحظہ کیجیے:

قدم نہ جس کا ہٹے وہ دلیر ہیں ہم بھی
خدا کے شیر تھے دادا تو شیر ہیں ہم بھی

بیت کے تیور اور اس کا زور دیکھنے کے قابل ہے۔ واہ۔
یہ بند بھی ملاحظہ کیجیے۔

مئے دلیری و جرأت سے پُر ہے جام مرا
اجل سے تیغ کہا کرتی ہے پیام مرا
رہا ہے ملکِ شجاعت میں اہتمام مرا
جہاں میں قاسمؑ گلگوں قبا ہے نام مرا
گلے کٹاتے ہیں جو ہم سے تن کے ملتے ہیں
ہماری تیغ سے زخموں کے پھول کھلتے ہیں

مری وغا سے بچیں گے نہ رن میں عربدہ جو
وہ تیغ ہے جو پیے گی ہر ایک تن کا لہو

جو بچپنے میں تھے دادا کے، ہیں وہی بازو
مرے پسینہ میں ہے فاطمہؑ کے دودھ کی بو
اگر ملا نہیں رتبہ مجھے امامت کا
شریک خوں میں مرے زور ہے نبوت کا

رجز کے اس بند کا ایک ایک مصرع بے مثل اور وجد آور ہے اور اب ذیل کا بند بھی ملاحظہ ہو۔

یہ دل کو رہتا ہے ارمان تیغ صاعقہ بار
مجھے پسند نہیں ہے کسی کی بھی گفتار
میں بیٹھتا ہوں تو بستر پہ رہتی ہے تلوار
فسانہ کہہ کے سلاتی ہے رات کو جھنکار

سبحان اللہ۔

جہاں میں لخت دل ضیغم الٰہی ہوں
پلا جو گود میں تیغوں کی وہ سپاہی ہوں

کیا کہنا، کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

اس سلسلہ میں مرثیہ میں متعدد بند ہیں۔ دو بند حضرت قاسمؑ کی زبان سے حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں بھی ہیں جو رجز کا حصہ ہیں مگر میں نے اختصار کے پیش نظر اتنے ہی پر اکتفا کی۔ (مرثیہ بہ "جواب جس کا نہ پائے، وہ گفتگو ندرے"۔)

میدان جنگ میں دشمن کے سامنے فخر و مباہات کے ساتھ گفتگو کرنے میں متانت کے ساتھ لہجہ میں جو زور اور لفظوں میں جو شکوہ ہونا چاہیئے اور دشمن کو للکارنے میں شیر کا پتہ پانی کر دینے والا جو دبدبہ اور ہیبت ہونا چاہیے وہ سب مندرجہ بالا بندوں میں نمایاں ہے۔ اس طرح یہ ایک کامیاب رجز ہے اور شاعر کی رجز نگاری میں مہارت کا بین ثبوت بھی ہے۔

## ساقی نامہ:

جب سے حضرت تعشق اور پیارے صاحب رشید نے مرثیوں میں تغزل کی طرح بہار اور ساقی ناموں پر زور دیا اس وقت سے گویا ساقی نامہ کہنا ہر مرثیہ گو کے لیئے ضروری ہوگیا اس لیئے کہ سامعین اس زمانہ کے اس نئے ذوق سخن کی تسکین کے لیئے ہر مرثیہ میں ساقی نامہ بھی سننا چاہتے تھے۔ حالانکہ بعض حلقوں میں تغزل اور بہار کی طرح ساقی نامہ بھی مورد اعتراضات ہوا۔ بات وہی تھی، اعتدال سے بڑھ جانے والی اور اس کی وجہ بھی وہی تھی یعنی مرثیوں میں زیادہ سے زیادہ تغزل پیدا کرنا جس کے لیئے بہار اور ساقی نامہ دونوں اپنے دامن میں بہت زیادہ گنجائش رکھتے تھے۔

حضرت ذاکر نے بھی مرثیوں میں ساقی نامے کہے ہیں اور بعض جگہوں پر کئی کئی بند کہے ہیں۔ میرے پاس ان کے جو چار مرثیے ہیں ان چاروں میں ساقی نامے موجود ہیں اور اکثر آٹھ آٹھ دس دس بند پر مشتمل ہیں مگر کسی ساقی نامہ میں تغزل کا وہ انداز نہیں ہے جس پر رفت کی جاسکے۔ افسوس کہ میں اختصار کے پیش نظر سارے بند درج نہیں کرسکتا پھر بھی جو چند درج کروں گا اس سے بھی صاحب نظر اور غیر جانبدار قارئین خود ہی اندازہ لگالیں گے۔ ملاحظہ ہوں:

پھر نونہال دیں کو ملا ہے شباب نو
ہے یہ زمین جلوہ گہہ آفتاب نو
خرمہ کے نخل ہیں سبب انقلاب نو
ہے وادی غدیر سے رسم شراب نو
میکش ہوائے گرم سے مخمور ہو گئے
جتنے رطب ہیں دانۂ انگور ہو گئے

واہ کیا بند۔

ایک بند کی بیت ہے:

سنتے ہیں لے کے آئے ہیں مے سلسبیل کی
اڑتی ہوئی خبر ہے پرِ جبریلؑ کی

کیا اچھی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت:

اللہ رے بزم ساقیِ کوثرؑ کا بندوبست
خیرہ کیا چمک کے نگاہوں کو نور نے
پونچھے ہیں جام دامنِ پوشاکِ حور نے

کیا کہنا۔

ایک اور بند ملاحظہ ہو:

بتلا رہا ہے قلقلِ مینا سروشِ مے
سنتا رہا ہے ایک زمانہ خروشِ مے
لی ہے جگہ دماغ میں، اللہ رے ہوشِ مے
سینہ پہ سینہ آئی ہے تاثیرِ جوشِ مے
دل حسنِ رخ پہ کھوئے ہوئے مے پرست ہیں
نسلیں ولائے ساقیِ کوثرؑ سے مست ہیں

(مرثیہ جب انتہائے شامِ مصیبت گزر گئی۔ در حال حضرت عباسؑ)

کیا ایمان افروز مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

ایک دوسرے مرثیہ سے کچھ بند یا بیتیں۔ ایک بند کے آخری چار مصرعے۔ موقع غدیرِ خم کا منظرِ جانشینی

کب مصطفیٰ کے ہاتھ پہ زوجِ بتولؑ ہے
یہ روزِ جانشینیٔ آلِ رسولؐ ہے
وہ خود سمجھ لیں رمز جو عالی دماغ ہیں

دامن میں ایک نور کے گیارہ چراغ ہیں

یوم غدیر سے متعلق حضرت ذاخر نے یہ بالکل نئی بات کہی ہے کہ آج کے دن صرف ولایت علیؑ ابن ابیطالبؑ کا اعلان نہیں کیا گیا بلکہ ان کی نسل میں اور جو گیارہ ائمہ ہیں ان کی ولایت کا اعلان بھی ولایت علیؑ کے اعلان میں پوشیدہ ہے۔

ایک اور بند ملاحظہ ہو اس میں تغزل کا مزہ بھی ہے

بے کار کی ہوس ہے کہ جو مدعا نہ دے
تجھ سے وہ مئے نہ پائے گا جس کو خدا نہ دے
مخفی جگر میں آگ ہے، ساقی ہوا نہ دے
سینہ میں دل شراب کا شعلہ جلا نہ دے

بیت ملاحظہ ہو:

لوں گا وہ جام وارث خوانِ خلیلؑ سے
جو سرد ہو ہوائے پرِ جبرئیلؑ سے

کیا عمدہ بیت ہے۔ یہ تخئیل بھی بالکل نئی ہے۔ ساقی نامہ میں کسی نے پہلے یہ بات نہیں کہی۔

ایک اور بند کی بیت:

بھرتا نہیں ہے مئے سے جو کاسہ فقیر کا
منہ دیکھتے ہیں جام جنابِ امیرؑ کا

ایک اور بیت ملاحظہ ہو:

لے جاؤں گا نبیؐ کے نواسے کے واسطے
دے جام تین روز کے پیاسے کے واسطے

(مرثیہ جب آسماں پہ رات کے گیسو بکھر گئے در حال سید الشہدا امام حسینؑ)

ایک اور مرثیہ سے اختصار کے ساتھ کچھ مثالیں۔ اس میں پورا ساقی نامہ یوم غدیر

کے بیان سے مزین ہے۔ چنانچہ دوسرے ہی بند کی بیت ہے:

دن کی ہوئی ہے دھوپ نہاں اژدحام میں
نصف النہار دیکھنا ہے خطِ جام میں

دوسرے بند کی بیت چوتھے مصرع کے ساتھ:

ساقی بتا دے فرق عراق و حجاز کا
دوری ہے کتنی وادیِ خم غدیر سے
ایک جام مانگتا ہے جنابِ امیرؑ سے

کیا عمدہ بیت ہے۔ واہ وا۔

اک اور بیت:

پیری کو بھی شراب کے نشہ سے کام ہے
وہ رعشہ دار ہاتھ پہ بوذرؓ کے جام ہے

بالکل نیا خیال ہے۔ سبحان اللہ۔

اور اب ایک بند:

ناکارہ ہو کے رہ گئی تاثیر ساقیا
نو عمر کر نے پائے نہ تدبیر ساقیا
ہم سب پہ لے گئے سبقت پیر ساقیا
یہ اپنا اپنا بخت یہ تقدیر ساقیا
تھا جن کا مردہ دل وہ زمانے میں جی گئے
نوجے اس شراب کے سلمان پی گئے

(مرثیہ پھر ابتدائے شام سے آئی بلائی ہجر، در حال شبیہ اودھ پی ایجا)

اور اب چوتھے مرثیہ سے ایک آدھ بند یا بیت:

ساقی نامہ کے پہلے بند کی بیت ملاحظہ ہو۔ اس ساقی نامہ کا تعلق شبیہ وہ قاسم اور ازرق

شامی کی جنگ سے ہے۔ بیت ہے:

چھپا نہ رخ سوئے غازی وہ تیرہ فام چلے
اٹھے سپر کی گھٹا جھوم کر تو جام چلے

سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا عمدہ مصرع ہے۔

دوسرے بند کے آخری چار مصرعے:

سمجھ سکے نہ ذرا بھی کوئی دمِ پیکار
یہ [illegible] ہے کہ رن میں ہے خوں بھری تلوار
جہاں کا رنگ لیئے جامِ آفتاب چلے
لہو سے ملتی ہوئی بزم میں شراب چلے

ایک بند ہے

سکونِ قلب رہے انقلاب میں ساقی
حسام ادھر سے چلے گی جواب میں ساقی
ہے عکسِ تیغ کا جامِ شراب میں ساقی
ہلال دیکھتا ہوں آفتاب میں ساقی
نہیں وہ لطف ابھی رحم میں جو، جور میں ہے
خدا کی شان شب و روز ایک دور میں ہے

اب ایک اور بند کے آخری چار مصرعے:

وہ جام دے جو مجھے اوجِ لامکانی دے
کبود چشم سے لڑتا ہے، زعفرانی دے
اتار عالمِ شمشیر سے جنوں ساقی
اور مصرع ہے کہ ہنسی ہنسی میں بہا دے کسی کا خوں ساقی

(مرثیہ جواب [illegible])

میں نے حضرت ذاخر کے چاروں دستیاب مرثیوں سے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے جو بند اور بیتیں درج کی ہیں ان سے بہت واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ساقی نامہ جیسے موضوع پر جس میں تغزل کی بے انتہا گنجائش ہوتی ہے، تغزل کو محض برائے نام جگہ دی ہے اور تغزل کو کم سے کم برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ان کی مذہبی فکر اور ذہنی پاکیزگی اور تقدیس کا ثبوت ہے۔

### تلوار اور گھوڑے کی تعریف:

میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں کچھ بند تغزل کے عنوان کے تحت نقل کر چکا ہوں اس لیئے اب زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک دو بند اور چند بیتیں اور بس۔

**تلوار کی تعریف:** اس بند میں گھوڑے اور تلوار دونوں کی تعریف ہے۔

کاٹھی سے باہر آ گئی جب تیغ برق دم
غازی نے رخ کیا طرف لشکرِ ستم
باجے بجے، سپاہ بڑھی، کھل گئے علم
بڑھ کر پروں سے مل گیا اسپ سبک قدم
جس سر پہ تیغ آ گئی وہ منھ کے بھل چلا
دو چار لاشیں روند کے گھوڑا نکل چلا

کس تیور کی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت:

عباسؑ کی ہے تیغ کسی اور کی نہیں
لاکھوں کا خوں بہائیں گے میداں میں گھیر کے
جوہر نہیں ہیں تیغ پہ، ناخن ہیں شیر کے

ایک اور بند تلوار کا رجز:

دعویٰ جسے نبرد کا ہو وہ ہنر دکھائے
مرحب کی طرح کوئی مرے سامنے تو آئے
سوئے سقر جو جائے تو بے دو ہوئے نہ جائے
میری ادائے جنگ پہ دھوکا نہ کوئی کھائے
جھک کر اگر گروں، دلِ گیتی کے پار ہوں
دوبار اگر چمک کے اٹھوں، ذوالفقار ہوں

کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔
(مرثیہ جب انتہائے شامِ مصیبت گزر گئی، در حال جنابِ عباسؑ)

یہ دوسرے مرثیہ سے ایک بند کا پہلا مصرع اور بیت

اے تیغِ زباں پھر سے دکھا سیفِ زبانی

کیا خوب عمل غرب سے تا شرق کیا ہے
اک موج نے سب کشتیوں کو غرق کیا ہے

واہ　　(مرثیہ جس کے سیاق و سباق کا علم نہیں)

ایک اور مرثیہ سے ایک بند ملاحظہ ہو، پورا بند آپ سے داد طلب ہے

برش سے کرتی ہے جو نیں ستمگروں کی تلف
اٹھی تو دھو دیا آئینۂ قمر کا کلف
جھکی تو نور سے تارے بنے زمیں کے خذف
جری کی تیغ تھی اک سمت، عکس ایک طرف
نئی طرح سے بلندی پہ داغ جلتا تھا
زمیں پہ لو تھی فلک پر چراغ جلتا تھا

کیا عمدہ تمثیل ہے، سبحان اللہ

اسی مرثیہ سے تلوار کی تعریف میں ایک اور بیت ملاحظہ ہو

دو قتل ہوگئے تو سپہ زیر ہوگئی

اب تو حسامِ صاعقہ دم شیر ہوگئی

کیا کہنا ہے۔ سبحان اللہ۔

گھوڑے کی تعریف: ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت، یہ گھوڑا / رہوار

اڑنے میں جو آندھی تو پہنچنے میں خبر ہے

ہے چال قیامت کی سبک خیز یہی ہے
کہتی ہے ہوا مجھ سے سوا تیز یہی ہے

(مرثیہ کے مطلع کا علم نہیں، سیاق و سباق کے اوراق دستیاب نہیں ہیں)

ایک مرثیہ سے ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت

زیں پر ہوئے سوار بڑھا اسپ شوخ و شنگ

جنبش تھی کلک کاتبِ تقدیر کی طرح
سائے میں رنگ آگیا تصویر کی طرح

کیا خوبصورت بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

ایک بیت ملاحظہ کیجیے:

ہیں اختیار میں جو قدم باد پا کے ہیں
ہاتھیں نہیں ہیں ہاتھ میں دامن ہوا کے ہیں

کیا عمدہ تشبیہ ہے۔ جزاک اللہ۔

(مرثیہ جب انتہائے شام مصیبت نزدیک تھی، در حال حضرت عباسؑ)

جناب علی اکبر کے گھوڑے کی تعریف میں ایک بند

گانٹھی ادھر لجام، بڑھا اس طرف قدم
ڈھونڈا ہوائے دشت کو زلفوں نے ہوئے خم
رن کا غبار اڑا طرف وادیٔ ستم
ذروں سے خاک، خاک سے ذرے ہوئے بہم

اک "ہاں" جہاں کے رنگ کو مہمیز ہو گئی
باگوں کی جنبشوں سے ہوا تیز ہو گئی

کیا کہنا۔ کیسا نادر اور اچھوتا خیال ہے۔

(مرثیہ [illegible])

**متفرق ابیات:** اب میں مرثیوں سے صرف چند ایسی متفرق بیتیں درج کرنا چاہتا ہوں کہ جو شاعر کے حسن اور ندرت فکر کی آئینہ دار ہیں۔ ملاحظہ ہوں

**حسن تعلیل:** ہوا کی جنبش سے چراغ کی لو تھرتھراتی ہے تو چراغ کا سایہ بھی تھرتھراتا ہے۔ اس سے یہ شاعرانہ بیان کی وہ حسن تعلیل کی ایک عمدہ مثال اور تخیل کی بلندی کی دلیل ہے:

نور اپنی حد سے بڑھ جو نہ سکتا تھا داغ کا
کانپ اٹھتا تھا زمیں پہ اندھیرا چراغ کا

**شبِ عاشور:**

ایسی غضب کی رات عبادت میں کٹ گئی
لو شمع کی تھی عہد کی تجدید کے لیے
انگلی اٹھی تھی کلمۂ توحید کے لیے

شمع کی لو کو اٹھی ہوئی انگلی سے تشبیہ دینا کمال شاعری ہے۔

**پیاس میں بچوں کی نفسیاتی کیفیت**

وا چشمِ شوق ایک کی ہے ذکرِ جام سے
کھولے ہوئے ہے منہ کوئی پانی کے نام سے

**موجِ دریا:**

یہ حملہ پانی کی موجوں کا مستقل رو تلواروں سے کیا ہے

کھودی ہیں مچھلیوں نے امیدیں حیات کی
تلواریں ڈالے دیتی ہیں موجیں فرات کی

کیا عمدہ تخیل ہے۔ سبحان اللہ۔

## گرمی کی شدت:

بدلا ہوا تپش سے ہے صحرا کا روپ بھی
بے دم پڑی ہوئی ہے ترائی میں دھوپ بھی

اس شاعرانہ توجیہ کی کیا تعریف کی جاسکتی ہے۔ سبحان اللہ۔

## لطفِ زبان:

گردش میں شکل گرد تھی فوج ذلیل تک
چونٹیں چُگ رہی تھیں پر جبریل تک

کیا عمدہ زبان ہے۔ واہ وا۔

## جنگ:

پیدل کو بھی اماں نہیں اسوار کی طرح
ہستی ہوئی ہے نقطۂ پر کار کی طرح

## جمال حضرت علیؑ اکبر:

دل حسن پر کھنچے ہوئے ہیں مشرقین کے
اک گل مہک رہا ہے چمن میں حسینؑ کے

یا رب یہ کس نہال شجاعت کا پھول ہے
سایہ اگر نہ ہو تو خدا کا رسولؐ ہے

## تلوار کی زبان سے شہزادہ علیؑ اکبر کی تعریف:

لڑنے وہ آئے رن میں جو خواہانِ گور ہے

ان بازوؤں میں چار اماموںؑ کا زور ہے

کیا اچھی بات کہی ہے۔ جزاک اللہ۔

جناب علیؑ اکبر: چوتھا مصرع۔

گھوڑے کو چھیڑ کر ادھر آئے ادھر گئے

تھی ہو بہو جو شکل شہِ قلعہ گیر کی
تصویر پھر رہی تھی جناب امیرؑ کی

امام حسینؑ کے رجز سے ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت

چاہوں اگر تو ہل جہاں ہوں ابھی تمام

بن جائے انس و جان و ملائک کی جان پر
ہو آسماں زمیں پہ زمیں آسمان پر

کیا کہنا ہے۔

جناب قاسمؑ سے جنگ میں ازرق کی حالت اور نفسیاتی کیفیت

یہ انتہا ہے کہ تقدیر سے بگڑتا ہے
بھڑک کے آگ کا شعلہ ہوا سے لڑتا ہے

تخئیل اور زورِ بیان کی کیا داد دی جائے۔ سبحان اللہ۔

جناب عباسؑ ازرق سے جنگ میں جناب قاسمؑ کا دل بڑھا رہے ہیں، پورا بند ملاحظہ کے قابل ہے۔ چوتھا مصرع بہت ہی قابلِ داد ہے۔

دمِ تبرد کوئی دم تو چلنے دو تلوار
ابھی یہ لاف زنی بھول جائے گا مکار
ہو ہوشیار مرے شیر ہے قریب شکار
اگر وغا میں ستمگر کا ہو قوی کوئی وار
رکے گا ڈھال سے وہ بھی نہ غم کرو بیٹا

سپر پہ نادِ علی پڑھ کے دم کرو بیٹا

سبحان اللہ، کیا ایمان افروز مصرع ہے۔

**گرمی:** بند کا چھٹا مصرع:

وہ حبس تھا کہ پسینہ نکل نہ سکتا تھا

**صبر،** جوہرِ انسانیت، امام حسینؑ کا کمال صبر وضبط اور راضی برضا رہنا۔

جنابِ زینبؑ سے خطاب:

تم کو تو سمجھتا ہوں میں زہراؑ کے برابر\
پھر یہ ہے تو دکھلا دو مجھے صبر کے جوہر\
گو خاک پہ فرزند کی بھی لاش ہے خواہر\
یہ سب ہے، پہ چہرہ مرا بشاش ہے خواہر

کلاسیکی مرثیہ پر جو الزام ہے کہ اس میں امام حسینؑ کو ایک مظلوم مفتوح کے طور پر دکھایا گیا ہے، یہ بند خصوصاً چوتھا مصرع اور بیت اس کی بہتر تردید کرتی ہے۔

**مصائب۔** بیانِ مصائب مرثیہ کا لازمی جزو ہے۔ سلف کے سارے مرثیہ نگاروں نے اس پر خاصہ زورِ بیان صرف کیا ہے اس لیے کہ مرثیہ اور مجلس غمِ حسینؑ کے حوالے سے وہ بیانِ مصائب کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے اور لوگوں کے دلوں میں کربلا کو اتارنے اور غیر مذہب کے افراد کے دلوں میں مظلومیتِ حسینؑ کا درد اور غمِ حسینؑ کی روشنی پیدا کرنے کے لیے اسے سب سے زیادہ موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔

حضرت ذاکر کے مرثیوں میں بھی مصائب بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ مرثیہ کا یہ حصہ چونکہ اکثر خاصہ طویل ہوتا تھا اس لیے ہر مرثیہ سے اس کی مثالیں پیش کرنا ایک طول عمل ہوگا۔ میں اختصار کے ساتھ چند بند اور چند بیتیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مصائب صرف بیانِ شہادت پر منحصر نہیں ہیں۔ رخصت کے وقت بھی بیان

مصائب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایسے مواقع آتے ہیں جن میں مصائب کا پہلو ہوتا ہے۔ رخصت میں بیان مصائب کے سلسلہ میں چند مثالیں پیش کر چکا ہوں۔ اب شہادت وغیرہ کے مواقع سے بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

امام حسینؑ جناب زینبؑ سے گفتگو فرما رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ خاص طور سے بیت دیکھیے کہ بیان مصائب میں کس قیامت کی بیت ہے

پہلو میں نہیں کوئی بھی، دل کون سنبھالے
افسوس مجھے چھوڑ گئے قافلے والے
بچے ہیں ستم گار لیے ہاتھوں میں بھالے
فرزند نے اٹھتے پہ سنے آپ کے نالے
ہاں آنکھ سے ہنگامۂ محشر نہیں دیکھا
سب دیکھا، پہ زینبؑ نے تمہیں مرتے نہیں دیکھا

یہ ایک مصرع ہی پورا مرثیہ ہے۔

امام حسینؑ لاش جناب قاسمؑ پر آئے ہیں۔ جناب عباسؑ و علی اکبرؑ ساتھ ہیں۔ بند کے چار مصرعے:

سرہانے بیٹھے ہوئے تھے امام نیک اساس
یہ کہہ اٹھے حرکت دل کی دیکھ کر عباسؑ
ہمارے آنے سے پہلے گزر گئے قاسمؑ
تڑپ کے دشت مصیبت میں مر گئے قاسمؑ

تین مصرعے:

کہا حسینؑ نے یہ کیا سنائی حالت زار
الم سے دست تاسف نہ یوں ملو بھائی
مکاں میں میت قاسمؑ کو لے چلو بھائی

ایک بند کے دو مصرعے اور بیت:

حرم کی ڈیوڑھی تک آئے جو شاہِ کون و مکاں
امامؑ نے یہ کیا رو کے بیبیوں سے بیاں
وہ قلب کہہ نہیں سکتا جو غم اٹھایا ہے
شہید راہِ خدا سب سے ملنے آیا ہے

پھر ایک بند

گئے مکان سے باہر امام دیں تو ادھر
ہٹائی ماں نے ادھر منہ سے خوں بھری چادر
تڑپ کے دی یہ صدا اے قرار قلب و جگر
تمھارے بیاہ پہ واری لگی یہ کس کی نظر
پتہ نہ دے گئے ماں کو جہاں گئے بیٹا
دلہن کو چھوڑ کے، رن میں کہاں گئے بیٹا

ایک اور بند کے دو مصرعے اور بیت:

نہیں تڑپتے ہوئے دل پہ اب کوئی قابو
کیئے ہیں حشر دلھن کے کھلے ہوئے گیسو
ذرا سا فرق نہیں دل کے جوش میں کوئی
نثار ماں ہو، نہیں اپنے ہوش میں کوئی

ایک اور بند:

ہے مبتلائے الم بنتِ شاہِ نیک اساس
اٹھو اٹھو کہ ہے دل پر ہجومِ حسرت و یاس
نہ دیکھی جائے گا ماں سے کبھی دلھن کا ہراس
بٹھانے آئی ہیں کچھ بیبیاں سفید لباس

وہ لے کے پیرہن آئی ہے آرزو بیٹا
بسی ہوئی ہے رنڈاپے کی جس میں بو بیٹا

اور آخر میں:

جنھیں ہے صبر کی عادت ہیں وہ بھی دل بے تاب
کہاں ہیں تیر الم کے نکالنے والے
تڑپ رہے ہیں کلیجہ سنبھالنے والے

کس قیامت کا مصرع ہے۔

اور اب بہت اختصار کے ساتھ جناب علی اکبر کے مصائب جناب علی اکبر شہید ہو گئے، اس محل پر بیت ہے۔

واں نورِ عین قبر کی منزل کا ہو گیا
یاں امتحاں تڑپتے ہوئے دل کا ہو گیا

امام حسینؑ نے اپنی تمام قوت جمع کر کے جوان بیٹے کی لاش اٹھائی۔

کام آیا اتنا زور شہِ مشرقین کا
ڈیوڑھی تک آ کے بیٹھ گیا دل حسینؑ کا

کس غضب کا مصرع ہے۔

ایک بند کے دو مصرعے اور بیت۔ چھٹا مصرع کس قدر رقت خیز ہے۔

یہ کہہ رہی تھیں بانوئے شاہنشۂ امم
جو لاش کے قریب ہیں ہٹ جائیں وہ حرم
باقی گلِ فراق ہیں کھلنے کے واسطے
آتا ہے بھائی بھائی سے ملنے کے واسطے

دو بند اور:

جناب سید سجاد بھائی کی لاش پر آئے اور لاش پر گریہ کرتے ہوئے فرمایا

جاں اپنی ہم تمھاری سعادت پہ کھوئیں گے
زندہ اگر رہے تو جوانی پہ روئیں گے
سورے لحد پہ تا حدِ امکاں پڑھیں گے ہم
جزرے نہ ہوں گے یاد تو قرآں پڑھیں گے ہم

مصائب میں کتنی اثر انگیز بیت ہے۔

یہ کہہ چکے جو بھائی سے بیمارِ کربلا
منھ رکھ کے منھ پہ آپ نے کی اس قدر بکا
بڑھ جانے نے بخار کے بے ہوش کر دیا
یہ دیکھ کر حرم میں قیامت ہوئی بپا
کہرام ہو گیا جسدِ پاش پاش پر
اٹھ کر نثار ماں ہوئی بیٹے کی لاش پر

مصائب کی اس سے زیادہ مثالیں درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر مرثیہ میں کسی نہ کسی کی شہادت اور اس پر اعزا و اقربا کا فطری ردِ عمل بین مصائب کی صورت میں بھرپور طریقے سے موجود ہے۔

تبصرہ: حضرت ذاخر کے مرثیوں میں سے مندرجہ بالا سارے اقتباسات سے یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت بلند پایہ مرثیہ گو تھے۔ ان کی فکر و نظر عمیق، فن نہایت پختہ اور زبان و بیان پر ان کو مکمل قدرت حاصل تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے نقادانِ فن اور محققینِ رثائی ادب کا جنھوں نے شروع ہی سے انیس و دبیر کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد دوسرے سارے مرثیہ نگاروں کو نظر انداز کیا۔ صرف انھیں کی نسل کے چند اور مرثیہ گویوں کو نمایاں کیا باقی سب کی طرف سے اعراض فرمایا۔ خصوصاً خاندانِ اجتہاد کے مرثیہ گویوں کو جو اس فن میں کسی سے کمتر درجہ نہیں رکھتے تھے، ان کو تو اس طرح نظر انداز کیا گویا وہ اس دنیا میں تھے ہی نہیں۔ یہ نہ ہوتا تو حضرت ذاخر و فاخر و

دوسرے سولہ ہزار کی تعداد بھی غلط ہے۔ میں اسی مضمون میں یہ لکھ چکا ہوں کہ حضرت ذاخر اور ملک الناطقین خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب فاطر اعلی اللہ مقامہ نے جو حضرت ذاخر کے مختلف ابطن بھائی تھے، آپس میں مل کر مختار نامہ نظم کرنا شروع کیا تھا اور جب اس میں سات ہزار شعر ہو گئے تو بعض حالات کی بناء پر یہ کام یہیں پر رک گیا۔ بعد میں حضرت ذاخر کے کہنے پر ۱۹۵۰ء تک لسان الشعراٗ حضرت شاعر لکھنوی نے اس میں گیارہ ہزار اشعار کا اضافہ کیا۔ اس طرح اس وقت تک اس میں کل اٹھارہ ہزار اشعار ہوئے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں ہے کہ ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد حضرت شاعر اعلی اللہ مقامہ نے اس میں کچھ اور اضافہ کیا یا نہیں۔ ان کے بیٹے حضرت مہدی نظمی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے مختار نامہ کو چالیس ہزار اشعار تک پہنچا دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہنامہ کی طرح اس میں بھی ساٹھ ہزار اشعار ہوں مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ یہ بیان بھی بادی النظر میں صحیح نہیں ہے اور مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔

۳۔ ہلال نقوی صاحب نے ایک جگہ اس مختار نامہ منظوم کو "مسدس" لکھا ہے۔ یہ صریحی اور حیرت ناک غلطی ہے۔ اس لیئے کہ بقول خود ان کے انھوں نے یہ مختار نامہ حضرت فضل نقوی کے پاس خود دیکھا۔ اس کے باوجود اسے مسدس کہنا حیرت انگیز نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ مختار نامہ ایک مثنوی ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے کوئی اسے مسدس نہیں کہہ سکتا۔ چونکہ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں فردوسی کے شاہنامہ کے انداز پر لکھی جا رہی تھی اس لیئے شاعر نے تعلی کے ساتھ شعر کہا

دکھا دوں　ہند کی مٹی کی تاثیر
مرا نسخہ　ہو　فردوسی　کو　اکسیر

ان حقائق کے پیش نظر مختار نامہ کو حضرت ذاخر کا طویل ترین مسدس کہنا صحیح نہیں ہے۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ذاخر کا کوئی مرثیہ ۲۱۰ بندوں سے کم نہیں ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ میں نے جن چار مرثیوں کا ذکر اس مضمون میں

کیا ہے اور جو میرے پاس ہیں ان میں سے سب مرثیے دو سو بند سے بھی کم ہیں۔ ان میں سے ایک ۱۱۶، ایک ۱۳۵، ایک ۱۲۱، اور ایک ۱۷۳ بندوں پر مشتمل ہے۔ یقیناً انھوں نے ۲۱۰ یا اس سے زیادہ بندوں کے طویل مرثیے بھی کہے ہوں گے مگر یہ غلط ہے کہ ۲۱۰ بند سے کم کوئی مرثیہ نہیں ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور غلطیاں خاندان اجتہاد کے بعض دوسرے شعرا کے حوالے سے بھی ہیں جن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر آیا ہے یا آئے گا۔

ڈاکٹر ہلال نقوی اس سلسلہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ذاکر کے بیٹے اور ان کے پوتے کے بیان اور تحریر کے حوالے سے یہ اطلاعات درج کیں اس یقین کے ساتھ کہ یہ صحیح ہوں گی۔ لیکن اول تو حوالوں کے متعلق معلوم نہیں کہ یہ کہاں تک درست ہیں یا کہاں تک ان کو صحیح طور پر پڑھا یا سمجھا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختار نامہ منظوم تو خود ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ پھر اس کے متعلق غلطیوں کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ تیسرے وہی بات جو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ محقق کا کام یہ نہیں ہے کہ بس دوسروں کے قول نقل کر دے اور ان کو تجزیہ اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کی ضرورت کو نظر انداز کر دے۔

اس تبصرہ کا بہر حال یہ مقصد نہیں ہے کہ ڈاکٹر ہلال نقوی کے اتنے اہم مقالہ کو نظر کمتر سے دیکھ رہا ہوں یا اس کو غلطیوں کا پلندہ ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک شخص واحد کا اتنا بڑا کام داد کے قابل ہے۔ اس کے بعض مندرجات سے مجھ کو اور بعض دوسرے لوگوں کو بھی اختلاف یا ان پر اعتراض ہو سکتا ہے اور ان کی نشاندہی رثائی ادب سے تعلق رکھنے والوں کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ حقائق کی درستی ویسے بھی ضروری ہے تاکہ غلطیاں ہمیشہ کے لیے باقی نہ رہ جائیں۔ اس سے کسی کی تحقیر یا تخفیف منظور نہیں ہوتی۔

## دعبلِ ہند کی نوحہ گوئی:

دعبل ہند حضرت ذاکر کی دوسری بڑی وجہ شہرت ان کی نوحہ گوئی ہے۔ انھوں نے

اپنی جدت طرازِ طبیعت اور قوت فکر و فن سے کام لے کر اس صنف سخن کو نیا رنگ و آہنگ دیا جس سے ان کو ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر سید سکندر آغا اپنے تحقیقی مقالہ "مرزا محمد جعفر اوج۔ حیات اور ادبی کارنامے" میں حضرت ذاکر کی نوحہ گوئی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"مرزا اوج کے عہد میں فن نوحہ گوئی اور نوحہ خوانی اپنے عروج پر تھا۔ ان کے ہم عصر نواب سید سجاد حسین عرف مجن صاحب تمنا (برادر حضرت جاوید) سید فرزند حسین ذاکر، نواب سید اصغر حسین فاخر، نواب قمر الدین حیدر بہادر عرف نواب سردار صاحب مجنون (خلف نواب سراج الدولہ بہادر جنگ تخلص بہ مجنون ابن جناب نواب محتشم الدولہ بہادر مدبر الملک فتح جنگ) جس طرح دوسرے اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے اسی طرح نوحہ تصنیف کرنے پر بھی ان حضرات کو کمال حاصل تھا حالانکہ نوحہ تصنیف کرنا بہ نسبت دوسرے اصناف سخن کے مشکل ہے جیسا کہ سید خورشید حسن عروج عرف دولہا صاحب، تمنا کے نوحوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں"۔ (ص ١٠٩)

اس سے آگے ڈاکٹر صاحب موصوف مزید رقم طراز ہیں کہ

"اس عہد کی دوسری جلیل القدر ہستی و بلبل ہند حضرت ذاکر کی تھی جن کے بارے میں ان کے ایک شاگرد جناب راز اجتہادی فرماتے ہیں

شاعری سے تھی جدا معجز بیانی آپ کی
بن گئی شمع ہدایت نوحہ خوانی آپ کی"

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ:

"مدح اہلبیت علیہم السلام میں موصوف (حضرت ذاکر) نے اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ جس کو دیکھ کر انسان کو تعجب ہوتا ہے۔ مجھے اس مجموعے

لیئے حضرت ذاکر مرحوم کا دوسرا لقب 'انیس نوحہ' ہے"۔ (تاریخ العزاء")

## خصوصیات اور مقبولیت:

حضرت ذاکر کے نوحوں کے خصوصیات اور مقبولیت کے بارے میں حسینی شاعر حضرت فضل نقوی تحریر فرماتے ہیں:

دعبل ہند ذاکر کے کہے ہوئے نوحے دنیا کے ہر ملک میں مقبول ہیں۔ گریہ خیزی ان کے نوحوں کا جوہر ہے۔ ان نوحوں کے اشعار دلوں کو متاثر کیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قلبی تاثر پیدا کرنے کے لیئے انھوں نے اشعار میں تغزل شامل کیا ہے۔ جیسے:

کانٹے کہاں ، رسولؐ خدا کا چمن کہاں

یا ابہام میں بیان واقعہ مصائب کی روشنی میں

کیوں وقت عصر نہر کے پانی کو جوش ہے
کہتا ہے اپنی پیاس کا کیا ماجرا کوئی

ان کے نوحوں میں کتنی ہی خصوصیات اور بھی نظر آتے ہیں جن پر تبصرے کے لیئے سیکڑوں صفحات چاہئیں۔ یہی وجہ تھی کہ ذاکر کے نوحوں کو جتنی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے لیئے ممکن نہ ہوسکی۔ نوحوں کو انھوں نے اتنا بلند کیا کہ ہر شاعر ان کا اتباع کرنے پر مجبور ہو گیا"۔　　　(تاریخ العزاء")

ڈاکٹر سکندر آغا نے حضرت اوج پر اپنے محولہ بالا مقالہ میں تحریر فرمایا ہے

"ان (حضرت ذاکر) کے نوحوں میں بڑا سوز و گداز ہے اور ان کی معجز بیانی سے تاثیر کلام میں اضافہ ہوجاتا ہے"۔ (ص ۲۱۲)

دعبل ہند کے پوتے اور حسینی شاعر حضرت فضل نقوی کے فرزند ارجمند جناب سید ظہیر عباس نقوی موجودہ مدیر ہفتہ وار "نظارہ" لکھنؤ حضرت ذاکر کے نوحوں کے ایک

اور مجموعہ "کائنات ذاخر" مطبوعہ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں

"دعبل ہند حضرت ذاخر غفر اللہ کو یوں تو اصناف سخن میں غزل، قصیدہ، تاریخ، مرثیہ، رباعی وغیرہ ہر صنف پر استادانہ عبور حاصل تھا (اور) ہندوستان بھر میں ان کے سیکڑوں شاگرد تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ نوحوں میں زبان، ندرت اور زور طبع سے انھوں نے وہ تاثیر اور درد دیا ہے کہ آج ہندوستان و پاکستان کا کوئی شہر اور دیہات ایسا نہیں ہے جہاں دعبل ہند کے نوحوں کو مقبولیت اور افضلیت نہ ہو۔ ایران و عراق کے مقامات مقدسہ میں بھی دعبل ہند کے نوحے برابر پڑھے جاتے ہیں"۔

(کائنات ذاخر)

دعبل ہند کے بھتیجے صاحب ادب اور شاعری میں ان کے جانشین لسان الشعراء سید الواعظین مولانا سید ابن حسین صاحب عرف مولوی میاں صاحب قبلہ شاعر اعلی اللہ مقامہ "مورخ ہندی" کے فرضی نام سے ہفتہ وار "...ب" لکھنؤ میں "آنکھوں سے کیا یا دیکھی" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون تحریر فرماتے تھے۔ وہ حضرت ذاخر کے بارے میں مضامین کی ایک قسط میں ان کی نوحہ گوئی سے متعلق لکھتے ہیں

"حقیقت تو یہ ہے کہ نوحہ گوئی کے سلسلہ میں آپ نے اس صنف کو شعرا کے لئے طبع آزمائی کے قابل بنا دیا۔ ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ کی نوحہ گوئی موزوں طبع عورتوں پر منحصر تھی۔ بہت کم شعرا ادھر متوجہ تھے۔ مستزاد میں نوحے محدود ہو گئے تھے اور اس میں بھی ردیف و قافیہ کا لحاظ تک نہ تھا۔ (ماشاءاللہ) آپ نے نوحہ کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ کے ابتدائی کلام میں اس عہد و ماحول کی جھلک ہے۔ استاد ...ن خان مرحوم آپ کے نوحے چانچی پر پڑھتے تھے۔ ہم کو آج سے پچاس پچپن برس پہلے کے ایک نوحہ کا مطلع یاد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوحے میں اس وقت صرف تین

ہی پسند کیئے جاتے تھے:

شہ کہتے تھے ، برباد ہوا گھر مرے آگے
مارا گیا زینبؑ ، علی اکبرؑ مرے آگے

لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ نے بین میں محدود رہتے ہوئے ترقی شروع کی:

شہ کہتے تھے جو جاؤ تو یہ رسم نبھاتے جاؤ
اکبرؑ غریب باپ کا لاشہ اٹھاتے جاؤ
دولھا سے بولی ماں کہ تمہیں کیا خوشی سے کام
مرنے اگر چلے ہو تو سہرا بڑھاتے جاؤ

اس کے بعد تری پر ترقی ہوتی گئی:

قریب عصر جفا فوج کی تمام ہوئی
چراغ بجھ گیا زہراؑ کا جب تو شام ہوئی

اب وہ رنگتیں پسند فرمائی جانے لگیں جو غزل سے بہت مخصوص تھیں جن طرحوں میں مشہور شعراء کی غزلیں تھیں جیسے امیر مینائی کی مشہور غزل کے ہم طرح۔ شعر فرمایا ہے:

پسِ حسینؑ یہ کہتا تھا جوش دریا کا
تمام خلق پہ پانی حرام ہو جائے

اس نوحہ گوئی کے صلہ میں پروردگار عالم نے آپ کو آپ کے خلوص کی جزا بھی دی۔ آنحضرتؐ کی یہ حدیث مشہور ہے کہ آپ نے امیر المومنینؑ سے دم فتح خیبر فرمایا تھا کہ اے علیؑ ایک شخص کا مسلمان ہونا تمہارے لیئے ستر سرخ چشم اونٹوں سے بہتر ہے۔ آپ (حضرت ناصر) نے تقریباً ایک سو زن و مرد کو خلعتِ ایمان پہنایا اور ان کی انجمنیں قائم

ماں کا نالہ لاش تک آتا ہے، اکبرؑ، گھر میں آؤ
ہجر کوئی یوں بھی اٹھواتا ہے اکبرؑ، گھر میں آؤ

اس مطلع ہی سے ان کا رنگِ سخن اور نوحہ گوئی کا بدلا ہوا مزاج ظاہر ہے۔ اس کے کچھ اور شعر سنیئے

ماں کے ہوتے دوسرا تیمارداری کیوں کرے
دردِ دل کروٹ بدلواتا ہے، اکبرؑ، گھر میں آؤ

تخیّل کی ندرت اور تغزّل کا حسن دیکھیے اور یہ دیکھیے کہ ان عناصر سے بیانِ مصائب میں درد و اثر کتنا بڑھا دیا ہے۔ ایک شعر اور

صدقہ جاؤں، کی وفا عہدِ جوانی نے نہ کچھ
کوئی اتنا جلد مر جاتا ہے اکبرؑ، گھر میں آؤ

تم تپاں مقتل میں ہو اور ماں ڈیوڑھی پر تپاں
میری جاں، فرقت میں غش آتا ہے اکبرؑ، گھر میں آؤ

چند شعر اور ملاحظہ کیجیے، مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے

در پہ خیمہ کے ہے اک عرصے سے لیلیٰ منتظر
یوں کوئی ماں سے بگڑ جاتا ہے اکبرؑ گھر میں آؤ

زخم میرے پالنے کا دے رہے ہیں یہ صلہ
دودھ خوں ہو کر بہا جاتا ہے اکبرؑ گھر میں آؤ

تم سے ملنا یہ مری جاں، میری قسمت میں نہیں
دم مرا کاہے کو گھبراتا ہے اکبرؑ، گھر میں آؤ

اب میں "کائنات ذاکرؔ" کے نوحوں میں سے چند شعر اور درج کر رہا ہوں تاکہ نمونۂ کلام اور واضح ہو کر سامنے آسکے۔ ملاحظہ ہوں

چلے حسینؑ مدینہ میں خاک اڑنے لگی
عقب میں شہؑ کے غبارِ وطن روانہ ہوا

دیکھا رخِ عباسؑ تو یاد آگیا دریا
بھائی کے تصور سے بڑھا درد جگر میں

نزع کے ہنگام یہ کہتا تھا اکبرؑ کا شباب
امتحاں کا وقت ہے، اے دل، تڑپنا چھوڑ دے

جنت میں اس قدر شبِ عاشور جوش تھا
پیاسوں کا منتظر رہا کوثر تمام رات

تا صبح شوقِ ذبح سے مضطر رہے حسینؑ
پھرتا رہا نگاہ میں خنجر تمام رات

ماں شمع اک جلائے ہوئے دیکھتی رہی
غافل رہے شباب میں اکبرؑ تمام رات

شبیرؑ، نہ بھولے گی کسی عہد میں دنیا
ہر ملک میں ہر قوم تمہیں یاد کرے گی

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی مشہور رباعی کے اس مصرع کو دیکھیے کہ "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ" اور حضرت ذاکرؔ کے مندرجہ بالا آخری شعر کو ملاحظہ کیجیے جو اس

رباعی سے برسوں پہلے کہا گیا تھا۔

خاک آنے نہ دی رن میں شہیدوں کے تنوں پر
لاشوں کو چھپائے ہوئے دامن تھا ہوا کا

رن میں علیؑ اصغر کی لحد دھوپ میں پاکر
ماں بادلوں کا سایہ کیے تربت پہ کھڑی ہے

اک شمع لیے کہتی ہے یہ ماں شب عاشور
اکبرؑ ابھی آرام کرو رات بڑی ہے

چھوٹے گی جو ہمشیر سے ماں جائے کی تربت
ہاتھوں کی رسن پاؤں کی زنجیر بنے گی

لیلیٰ کو ہے اکبرؑ کی جوانی کا تصور
بالائے لحد چاند سی تصویر بنے گی

تبصرہ۔ ان اشعار میں تخیل حق بلندی پر ہے۔ مضمون آفرینی کا کمال قابل دید ہے۔ تغزل بھرپور طریقہ سے اپنی پرچھائیں ڈال رہا ہے اور ان سب نے مل جل کے اشعار کی اثر آفرینی، درد انگیزی اور رقت خیزی کو کس قدر بڑھا دیا ہے۔ اس کو وہ صاحبان فکر و نظر ہی سمجھ سکتے ہیں جن کے دل احساس درد سے خالی نہ ہوں، جن کی آنکھیں پتھرائی ہوئی نہ ہوں اور جن کی فکر امام حسینؑ، ان کے رفقا، اور اہل حرم کو ہر قسم کے جذبات سے عاری اور احساس درد و غم سے بے نیاز ایسے مشینی روبوٹ نہ سمجھتی ہو جن کو پروگرام کیا گیا ہو کہ امام پر کہ مرنے کی اجازت لیں، رخصت ہوں، میدان جنگ میں لڑتے ہوئے ختم ہو جائیں اور سارے متعلقین پتھرائی آنکھوں سے دیکھتے

رہیں۔ شدت غم سے نہ تو ان کے دلوں میں درد کی تڑپ پیدا ہو، نہ تقاضائے فطرت سے آنسو نکلیں، نہ تقاضائے محبت سے لب پر آہ و فغاں آئے کہ ہمارے بیشتر جدید ناقدین کے نزدیک صبر کا یہی معیار ہونا چاہیئے۔ مسلمان کیا، غیر قوموں کے حساس اور دردمند افراد بھی ایسے بیان مصائب سے اپنے دلوں میں جو تڑپ محسوس کرتے ہیں وہ انسان دوستی اور مظلومیت سے ہمدردی کے جذبات کو ابھارتی ہے۔

یقیناً دعبل ہند حضرت ذاکر اس طرز نوحہ گوئی کے موجد تھے اور ان کو اس میں جو کمال حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔

## رباعیات:

جس طرح دوسری اصناف سخن میں حضرت ذاکر کا کلام ضائع ہو چکا ہے اور اب بطور نمونہ چند مرثیوں اور چند اشعار کے سوا کچھ دستیاب نہیں ہے، وہاں نوحے کسی قدر موجود ہیں۔ ان کی رباعیات بھی بہت کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ چند رباعیات جو زبان زدِ خاص و عام ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱)

ہو ضعف تو جینے کی دعا دیتے ہیں
آئے جو پسینہ تو ہوا دیتے ہیں
پیری میں ضیاء آنکھ کی یہ کہہ کے چلی
ہنگامِ سحر شمع بجھا دیتے ہیں

(۲)

ہم بارِ روئے شہ کی جو ثنا کہہ دیں گے
زینت دہِ بزمِ شہداء کہہ دیں گے
عباسؑ کو ہم صورتِ حیدرؑ نہ کہو
سن لیں گے نصیری تو خدا کہہ دیں گے

(۳) نعتیہ رباعی:

احمدؐ کو جو اللہ نے شاہی دے دی
ہر چیز انھیں تا مہ و ماہی دے دی
شک لائے جو اعجازِ نبیؐ میں کافر
مہتاب نے دو ہو کے گواہی دے دی

(۴)

یارب، مرے مرنے کو فسانہ کر دے
سمتِ شہِ مظلوم روانہ کر دے
حسرت ہے کہ ہوں دفن تہِ خاکِ شفا
مٹی مری تسبیح کا دانہ کر دے

(۵) دعائیہ:

برسات کی اشکوں میں روانی دے دے
ساقی، مجھے رنگین جوانی دے دے
بن جائے گا مے، تیری نگاہوں کی قسم
ساغر پہ نظر ڈال کے پانی دے دے

(۶) تولاّ:

ساقیِ شرابِ حوضِ کوثر حیدرؑ
حامی حیدرؑ، شفیعِ محشر حیدرؑ
پوچھے جو کوئی، کون ہے آقا تیرا
میں قبر سے چلاؤں کہ حیدرؑ حیدرؑ

(۷) عزتِ نفس

یارب، مجھے ممنونِ سخی تک نہ کر

برباد غریبوں کی مگر لاج نہ کر
پتھر سے پلا صورتِ موسیٰ پانی
روزی کا تنگ ظرف کی محتاج نہ کر

تبصرہ: حضرت ذاخر کی بس اتنی ہی رباعیات دستیاب ہیں گو کہ یقیناً انھوں نے بے شمار رباعیاں کہی ہوں گی۔ ان رباعیوں سے ایک طرف ان کی مذہبی اور اخلاقی فکر کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف ان کے کمال شاعری اور جمال سخن کا جلوہ دل دادگان شعروادب کے لیئے عروسِ نظم کے شوق دید کی پذیرائی کرتا ہے۔ کاش شاعری کے ایسے عظیم نمونوں کا یہ ذخیرہ تلف اور ضائع نہ ہوا ہوتا تو اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ دوسرے کلام میں مختار نامہ موجود ہے جس کا ذکر آچکا ہے مگر بادی النظر میں اٹھارہ ہزار اشعار کی اس طویل مثنوی کی اشاعت ممکن نہیں ہے ورنہ کم از کم ایک بڑا کارنامہ بھی منظر عام پر آجاتا۔ ان کے دستیاب مرثیوں کی اشاعت بھی ان کا نام رثائی ادب میں زندہ و تابندہ رکھنے کے لیئے کافی ہوتی۔ اے کاش!

## حضرت ذاخر کی غزل گوئی:

حضرت ذاخر غزل گوئی میں ایک خاص رجحان طبع رکھتے تھے اور وہ ان کی شاعرانہ فطرت کا خاص جوہر تھی جس کا اثر ان کے مرثیوں اور نوحوں میں بھی بھرپور طریقہ سے ظاہر ہوا۔ لسان الشعراء حضرت شاعر لکھنوی ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ کے ایک شمارہ میں ان کی غزل گوئی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

> "مولوی سید وارث حسین صاحب مرحوم (حضرت ذاخر کے پدر بزرگوار) خاص روح مذہب کے حامل تھے۔ حضرت ذخبل جند کی غزل کو شہر میں سب پسند کرتے تھے مگر آپ کے والد مرحوم خوش نہ تھے"۔

(ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، ۸ اپریل تا ۷ جون ۱۹۵۰)

اسی مضمون کی دوسری قسط میں تحریر فرماتے ہیں

"حضرت ذاکر مرحوم پر مذہبیت غالب رہی۔ انھوں نے آغاز تو غزل گوئی سے کیا اور آخر وقت تک اس فن کو جاری رکھا مگر اب غزل گوئی دوستوں کے اصرار یا شاگردوں کے مجبور کرنے پر منحصر تھی"۔

(ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، ۸ اپریل تا ۷ جون ۱۹۵۰)

مزید تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت ذاکر کی غزل گوئی بادل ناخواستہ تھی۔ اگرچہ آپ نے ہزاروں غزلیں فرمائیں مگر آپ کی مذہبی دلچسپی نے ان کو جمع نہ کیا اور جو کچھ شاگردوں نے لکھنا کرلیا تھا وہ بھی آپ کی حیات ہی میں تلف ہوگیا۔ صرف جو شعر یاد ہیں پیش کیے جارہے ہیں"

جلوہ آنکھوں میں نہ پایا اس دل شیدائی میں
تم کو کس کس نے نہ ڈھونڈا شب تنہائی میں

شمعِ روشن نہ بجھاتا کبھی شامِ وعدہ
اتنی ہی عقل جو ہوتی ترے سودائی میں

اب کہاں باقی وہ زمانہ جس کو کہتا تھا شباب
یاد ہے جب کہ آتی تھی اک انگڑائی مجھے

طور کے جلووں کا حدِ قبر سے آغاز تھا
دو قدم آگے اگر بڑھتا حریمِ ناز تھا

یہ بہت مشہور شعر ہے کہ:

اس شکل و شمائل کا زمانہ میں کوئی تھا
اتنا تو بتا دیتی ہے تصویر ہماری

گرے بجلی اس آہِ آتشیں پر
پسینہ آگیا ان کی جبیں پر

کوئی بے چین فرشِ نرم پر ہے
کوئی سوتا ہے راحت سے زمیں پر

---

مری پتلی کو کب گردش ہے اشکوں کی روانی میں
خدا کی شان پڑتا ہے بھنور اک بوند پانی میں

تبصرہ: حضرت ذاخر کے رنگِ غزل کو سمجھنے کے لیئے یہ چند شعر بھی کافی ہیں۔ مروجہ زمینوں میں جدت مضامین، بلندیٔ خیال، رواں بندشیں، تغزل کی فراوانی، مصرعوں کی چستی اور سلاست و فصاحت سبھی کچھ چشمِ شوق کو دعوت فکر و نظر دیتی ہے اور دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کاش ان کی غزلیں تلف نہ ہوئی ہوتیں تو یہ ذخیرہ اردو غزل میں ایک شاندار اضافہ ہوتا۔

## وفات:

حضرت ذاخر نے ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۳۵۳ھ مطابق ۳۵-۱۹۳۴ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور جنت الفردوس میں خدمت سید الشہداء میں حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○

انتقال لکھنؤ میں ہوا اور اپنے خاندانی امام باڑہ حسینیۂ غفرآں مآب میں مدفون ہوئے۔ ان کی مندرجہ بالا تاریخ وفات ہفتہ وار اخبار "سحاب" کی اپریل / مئی ۱۳۵۰ھ کی ایک اشاعت میں حضرت ذاخر کے متعلق ایک مضمون میں درج ہے جو ان کے فرزند رجمند لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی لسن صاحب شاعر لکھنوی اعلی اللہ مقامہ کا تحریر کردہ ہے۔

تمیذی بند حضرت خورشید اجتہادی لکھنوی

۱۲۴۲ھ تا ۱۳۱۹ھ

( ... صاحب ... صاحب اعلی اللہ مقامہ )

... طالب حسین عرف ... آغا صاحب ...
خلف جناب آغا محمد حسین صاحب ... اللہ ...
...

رباعی:

کب حال دل اپنا کہنے والے ہم ہیں
غم شمع کی طرح سہنے والے ہم ہیں
روشن ہے سبھوں پہ صبر اپنا خورشید
جل جل کے خموش رہنے والے ہم ہیں
(خورشید)

## ولادت:

حضرت خورشید طاب ثراہ کی تاریخ ولادت کہیں نہیں لکھی ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں تحقیق اور جستجو سے بہت سے عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے ان کی معرکہ آرا کتاب ''افادات'' سے اس کی تکمیل کی تاریخ معلوم ہوئی جس کی عبارت کتاب کے آخر میں یوں ہے۔ ''تمام شد بہ شب نہم جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ''۔ اسی کتاب میں انھوں نے اپنی شاعری کے آغاز کی مدت معین کرتے ہوئے لکھا کہ ''اب سن میرا تینتیس برس کا ہے۔'' اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۷۴ھ میں یا اس کے آس پاس ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ یقینی طور پر یہی تاریخ محقق ہے۔

## تعلیم و تربیت:

حضرت خورشید کے سلسلہ نسب میں لکھ چکا ہوں کہ وہ حضرت غفران مآب کے پر پوتے، حضرت سلطان العلماء کے پوتے اور حضرت خلاصۃ العلماء کے فرزند تھے جن کی روحانیت اور تقدس کے بارے میں ایک واقعہ بھی درج کر چکا ہوں۔ روحانیت اور تقدس کے ایسے ماحول اور علم و ادب کی ایسی عظیم الشان اجتہادی فضا میں جناب لڈن صاحب خورشید کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہی تعلیم و تربیت کا کیا کہنا۔ انھوں نے علوم دینی کی تکمیل کی اور عالم و فاضل شخصیتوں میں ان کا شمار ہوا۔

## علمی استعداد:

ان کی علمی استعداد گفتگو سے بالاتر ہے۔ حضرت مہذب لکھنوی نے ''ذکار محسن'' میں لکھا ہے کہ:

> ''خورشید مرحوم کی درسی استعداد اور فنی تحقیقات نہایت مسلم اور مستند مانی جاتی تھیں۔ ان کے زمانہ میں نواب بنے صاحب مشتاق مرحوم، قاری یعقوب علی خان صاحب (نصرت)، میر مشتق مرحوم اور وہ خود بیچ راستہ دیا

"افادات" کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

عروض میں حضرت خورشید زبردست مہارت کے مالک تھے اور اپنے زمانے کے سارے مستند اساتذہ کے مقابلے میں اس فن میں ان کا پایہ مرزا اوج سے بلند نہ سہی مگر ان کے برابر ضرور تھا جو "افادات" کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور طرح اس کی صداقت ثابت ہوتی ہے اور وہ یوں ہے کہ مرزا محمد جعفر اوج اعلی اللہ مقامہ فرزند حضرت دبیر اعلی اللہ مقامہ کو ان کی زندگی میں برصغیر میں عروض کا سب سے بڑا ماہر تسلیم کیا گیا تھا۔ اس فن پر بلکہ فن شعر گوئی کے مختلف پہلوؤں پر ان کی کتاب "مقیاس الاشعار" اس بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سکندر آغا نے حضرت اوج پر اپنے مقالے میں میر فضل حسین ثابت کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جو ان کی عروض دانی پر غالباً سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہوا یوں کہ:

"۱۳۲۲ھ سے پہلے کا ذکر ہے کہ مرزا اوج نے اقبال الدولہ مرحوم کے یہاں ایک مجلس پڑھی تھی جس میں ایک رباعی کا مصرع آخر یہ تھا 'اقبال الدولہ بہادر آباد رہیں'۔ اس میں ایک سبب تقطیع سے بڑھ گیا تھا۔ یعنی تقطیع میں صرف یہی آتا ہے۔ 'بال الدولہ بہادر آباد رہیں' بعض حاضرین مجلس اس پر معترض ہوئے۔ کوئی کہتا تھا یہ زیادتی جائز ہے، کوئی ناجائز بتاتا تھا۔ ایک صاحب نے جناب داغ مرحوم سے (وہ شریک مجلس نہ تھے) بغیر مصنف کا نام بتاتے ہوئے پوچھا 'یہ مصرع درست ہے یا نادرست' 'اقبال الدولہ بہادر آباد رہیں'۔ پوچھا "کہو، مصنف اس کا کون ہے"۔ وہ صاحب بولے 'مرزا اوج لکھنوی'۔ فرمایا 'سبحان اللہ آپ مرزا اوج کے مصرع کی نسبت مجھ سے پوچھنے آئے ہیں۔ بھئی یہ تو سمجھو کہ آج علم عروض کا ماہر مرزا اوج سے بڑھ کر ہندوستان میں نہیں ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی کریں گے۔ ان کی کتاب علم عروض میں مقیاس نام ان کی عروض دانی میں اکمل ہونے کی

دلیل ہے''۔ (''مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی۔ حیات اور ادبی کارنامے''، ص ۹۴۔۹۵)

یہ اقتباس معراج الکلام کے دیباچے کے ص ۱۴ سے لیا گیا ہے۔

حضرت داغ دہلوی جیسے استاد کا یہ اعتراف حضرت اوج کی عروض دانی کو بہترین خراج تحسین ہے۔ اب حضرت خورشید کا واقعہ ملاحظہ ہو جو انھوں نے افادات میں لکھا ہے:

''نواب احمد حسن خان صاحب عروج مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے تھے .... میں نے احمد حسن خان صاحب سے پوچھا کہ یہ غزل جناب شیخ کی کس بحر میں ہے جس کا ایک مصرع مجھے یاد ہے۔ 'نیام تیغ قضا ہے مرا تب ہے قاتل کی تیغیں کا'۔ انھوں نے کہا متقارب میں ہے۔ میں نے کہا، کیوں اسے رجز نہیں ٹھہراتے۔ انھوں نے وہی جواب دیا جو اکثر عروضیوں نے لکھا ہے کہ جب ایک مصرع چند وزنوں میں ہو تو جس وزن سے پڑھنے میں سہولت ہوئی اسی سے پڑھیں گے۔ چنانچہ متقارب ہی سے اسے لیا ہے۔ میں نے کہا، وہ لیکن مگر دیکھ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کیا سبب ہے اسے متقارب ہی سے لیا کیونکہ دو وزن صحیح کس سے ہیں۔ ایک فعول فعلن کی تکرار دوسرے مفاعلتن کی تکرار۔ پہلا متقارب دوسرا رجز۔ پہلے میں دو زحاف ثلم اور ثرم۔ دوسرے میں بھی دو زحاف خبن اور ترفیل۔ پھر کیا فرق ہوا اور کیا سہولت ہوئی۔ اسے سن کر وہ چپ ہو رہے....''۔ (افادات، ص ۴۲)

یہ بحث بہت تکنیکی مگر بہت دلچسپ ہے۔ اس کو یہاں دہرانا مقصود نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے بہت سے اساتذہ اور عروضیوں کے سامنے یہ سوال رکھا مگر کسی سے تشفی بخش جواب نہ ملا۔ خود بھی بہت غور کیا مگر تشفی نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں حضرت اوج کے رسالہ مقیاس الاشعار سے بھی رجوع کیا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ بھی قابل قبول نہ ہوا۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ وہ شبہ اس سے نہ نکلا اور یہ ہوتی ہے کہ یہ تسمیت عرب

میں ہے۔ فارسی والوں نے خاص اسے نہیں رکھا بلکہ زحافات عام سے ہے۔
جیسا کہ مقیاس میں جناب اوجؔ قبلہ نے لکھ دیا ہے تو یہ قول قابل اعتنا نہیں ہے
کیونکہ جناب اوجؔ قبلہ نے جو لکھا ہے کہ یہ زحاف خاص صدر و ابتداء سے
فارسی میں نہیں رہا ہے تو اس کی دلیل اس بحر کو گردانا ہے اور جب یہ بحر ہی
مجہول عنہ ہے تو پھر اسے کون قبول کر سکتا ہے"۔ (افادات، ص ۴۳)

حضرت اوجؔ کے نقطۂ نظر کو اتنی مضبوط دلیل سے مسترد کر دینا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت خورشید اپنے وقت کے سب سے بڑے ماہر عروض تھے۔

بہر حال اس مسئلہ پر انھوں نے اپنا جو نظریہ قائم کیا تھا اس کے بارے میں تلاش بسیار کے بعد ان کو شیخ محقق طوسی کی معیار الاشعار سے تائید حاصل ہوئی اور انھوں نے یہ تحریر فرمایا

"جب کل کتاب معیار میں نے دیکھی تو ایک دن دیکھتے دیکھتے اس
مقام پر نظر پڑی کہ محقق رحمۃ اللہ لکھتے ہیں.......... (فارسی عبارت میں
نے حذف کی۔ ساحر)۔ یہ دیکھ کر مجھے وہ شبہ جو رامپور میں میں نے بعض
شعرا کو ملاتے ہوئے پیش کیا تھا یاد آیا اور کمال مسرور ہوا کہ الحمد للہ میرا ذہن
کہاں پہنچا۔ کجا میں اور کجا محقق علیہ الرحمۃ"۔ (افادات، ص ۴۶)

اس ساری گفتگو سے عروض و قافیہ وغیرہ میں حضرت خورشید کی اپنے ہم عصر ماہرین عروض پر برتری ثابت ہوتی ہے۔

## ذریعۂ معاش:

جس کے پدر بزرگوار کی فیضوں کے قصے ان کی رحلت کے ایک عرصہ بعد تک لوگوں کی زبان زد ہوں اس کے گھر میں معاش یقیناً کوئی حل طلب مسئلہ نہ تھا مگر چونکہ تذکروں میں اس بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اس لیے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

## ازدواجی زندگی:

نواب مولوی مہدی حسین صاحب ماہر کی ایک صاحبزادی حضرت خورشید سے

منسوب تھیں دوسری جناب چھنگا صاحب حسین سے۔ حضرت ماہر، حضرت خورشید اور حضرت حسین کو ان سبھی رشتوں نے یکجا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں حضرت خورشید اور حضرت حسین مرثیہ گوئی کی طرف اور متوجہ ہوگئے ہوں گے۔ اس لیئے کہ حضرت ماہر جیسے عظیم مرثیہ گو کے فیض صحبت نے ان کے اپنے اپنے فطری ذوق مرثیہ گوئی کو یقیناً اور مہمیز کیا ہوگا۔ اس جملہ کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم ذوق وہم مذاق افراد کبھی رشتوں میں منسلک ہو جاتے ہیں تو یقیناً آپس کے تعلقات بہت خوشگوار ہوتے ہیں اور ان کا اثر ازدواجی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت خورشید کی ازدواجی زندگی بھی بہت خوشگوار تھی اور زندگی کی آخری سانسوں تک خوشگوار رہی۔

## اولاد:

حضرت خورشید کے تین بیٹے تھے۔ مولوی سید محمد عابد عرف چھٹن صاحب، [illegible] صاحب قمر اور وقار آغا صاحب عرف بنے صاحب [illegible]۔ یہ تینوں حضرت خورشید کی زندگی ہی میں اپنے اپنے عہد جوانی میں [illegible]۔

## حلیہ:

لڈن صاحب خورشید نہایت حسین و جمیل اور مردانہ وجاہت کا بہترین مرقع تھے۔ حضرت مہذب لکھنوی نے لکھا ہے کہ خاندان اجتہاد میں تین شخص ایسے حسین و وجیہہ گزرے کہ ان کا جواب خاندان کے علاوہ بھی اس زمانہ میں مشکل سے ملتا تھا۔ ایک شمس العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب مجتہد، دوسرے ڈپٹی آغا صاحب مرحوم اور تیسرے خود لڈن صاحب خورشید مرحوم۔ (اذکار محسن، ص ٦٢)

## اخلاق:

ایک عالم فاضل شخص خصوصاً مذہبی علوم میں اعلیٰ درجہ پر فائز انسان کے اخلاق و عادات خود ہی خلق حسنہ میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات خصوصاً سیرت معصومین

کے تذکرے جس طرح انسانی اخلاق و کردار کو نکھار دیتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ تذکروں میں چونکہ اس بارے میں کچھ نہیں ملتا اس لیئے شواہد کے ساتھ کوئی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ بہر حال خاندان کی علمی ادبی اور تہذیبی فضا بھی حضرت خورشید کے بلند اخلاق و کردار کی تائید مزید کے لیئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریر سے جس انکسار اور ادب و آداب کا اظہار ہوتا ہے وہ خود بھی ان کی کسر نفسی اور اعلیٰ تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا آئینہ دار ہے۔

## شاعری:

لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "یہ بزرگ (لڈن صاحب خورشید) لکھنؤ کے مشاہیر شعرا میں تھے اور مسلم الثبوت استاد تھے"۔

(مضامین عزیز۔ ص ۵۷ ذیلی نگارش)

حضرت مہذب لکھنوی کا قول گزشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے۔ شاعری حضرت خورشید کی ایک امتیازی خصوصیت تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے آغاز اور پھر مختلف ادوار کے متعلق "افادات" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے اقتباسات اس موضوع پر مفصل اور بھرپور روشنی ڈالنے کا بہترین ذریعہ ہیں جو میں اختصار کے ساتھ حسب ضرورت کے مطابق یہاں درج کروں گا۔ چنانچہ "حالات مصنف بطور تذکرہ" کے عنوان کے تحت وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "مخفی نہ رہے کہ یہ فن شریف وہ فن ہے کہ اکثر انسان ذوق فطری و خلقی اس کا رکھتے ہیں۔ چنانچہ کمترین بھی عالم طفلی سے یہ ذوق رکھتا ہے اور موزوں طبع بھی ہے۔ جو زمانہ کھیل کا تھا۔ اکثر کھیل بھی آپس میں ایسے ہی نکالے جاتے تھے۔ چنانچہ بیت بازی بار بار ہوا کرتی تھی۔ سیکڑوں شعر فارسی اور اردو بیت بازی کے لیئے یاد کیئے۔ جب کبھی شعر پڑھتے وقت بھولے اپنے دل سے کچھ ملا کے موزوں پڑھ دیا۔ رفتہ رفتہ شوق پیدا ہوا"۔ (افادات ص ۱۔۱۲)

جناب خورشید کے جد بزرگوار حضرت سلطان العلماء طاب ثراہ اور ان کے یعنی حضرت خورشید کے بڑے بھائی کا ادب واحترام ان کے کہیں آنے جانے بلکہ گھر سے نکلنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔ شاعری کا ذکر بھی منافی ادب تھا چنانچہ مزید لکھتے ہیں

"یہ تو کیا مجال تھی کہ غزل کا نام بھی زبان سے نکالتے۔ ہاں کچھ شعر نوحے کے نظم کیئے۔ جب چار پانچ نوحے جمع ہو گئے بڑے بھائی صاحب سے پوچھا کہ ان پر کس سے اصلاح لیں۔ انھوں نے فرمایا کہ غیر سے اصلاح لینی خوب نہیں۔ اپنے حقیقی چچا زاد بھائی سید محمد جعفر صاحب سے جن کا تخلص امید ہے اصلاح مناسب ہے"۔ (افادات۔ ص ۱۲)

## تلمذ:

چنانچہ انھوں نے حضرت امید سے تلمذ اختیار کیا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ وہ باپ کے شاگرد تھے اور بیٹے کے استاد تھے۔ یعنی جناب سید محمد جعفر صاحب امید کے شاگرد ہوئے اور ان کے فرزند ارجمند اور اپنے بھتیجے مولوی بندہ کاظم صاحب جاوید کے استاد ہوئے۔ ان کے دوسرے شاگردوں کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

وہ حضرت امید کے اصلاح دینے کے طریقے سے بہت مداح تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے اس طریقہ کی بدولت ان کے شاگرد دس برس میں شاعری کے رموز و اسرار سمجھ کر استادی کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ حضرت امید سے سات سال تک ان کو توسل رہا۔ دفعتاً ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

حضرت امید نواب سعادت علی خاں وزیر ہند اور حاکم اودھ کے پوتے نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ حضرت خورشید نے ان کے انتقال کے بعد نواب عاشور علی خاں کے بھائی نواب آغا جو صاحب کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا جن کا تخلص ہندی تھا۔ حضرت امید کے بعد انھیں کسی کو اپنا کلام دکھانے کی ضرورت نہ تھی مگر پورے اطمینان کے لیے انھوں نے یہ سلسلہ بھی اختیار کیا گو کہ خود آغا جو صاحب یہ فرماتے تھے کہ تم کو اصلاح کی کوئی

ضرورت نہیں بلکہ تم خود اب اپنے شاگرد بناؤ اور ان کے کلام پر اصلاح دیا کرو۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے بھی انتقال کیا اور بقول حضرت خورشید صحبت ان کی بھی بہت کم نصیب ہوئی''۔

## غزل گوئی کی ابتداء:

حضرت امید بڑی مرنجاں مرنج اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے مضمون میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے حضرت خورشید کو غزل کہنے کا مشورہ دیا اور فرمایا۔

''بہت سے اقسام شعر ہیں الا سب پر قدرت غزلوں ہی کے کہنے سے ہو جاتی ہے''۔ (افادات، ص ۱۳)

خورشید صاحب کہتے ہیں:

''میں چونکہ اس زمانہ تک گھر میں سے کو یہ نکلا تھا۔ ایسا اجنبی تھا کہ میں نے کہا غزلیں کیوں کر کہتے ہیں اور غزلوں میں کیا بیان ہوتا ہے۔ ان (امید صاحب) کے مزاج کو تو میں بیان ہی کر چکا ہوں کہ عجیب طرح کا تھا۔ بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔ مجھ سے فرمایا، اجی تم نے بھی اتا چھو چھو سے محبت بھی کی ہے۔ بس غزل میں جسے آدمی چاہتا ہے اسی کی تعریف اور اسی سے گویا باتیں کی جاتی ہیں۔ وہی تم بھی نظم کر لاؤ''۔ (افادات، ص ۱۳)

غرض اس طرح ان کی غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اس کو زمانہ انیس برس کے قریب گزرا ہوگا۔ یہ بات تینتیس برس کے سن میں لکھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت امید سے شاگردی اور غزل گوئی کا آغاز تقریباً چودہ برس کی عمر سے ہوا۔ نوحے وغیرہ اس سے پہلے نظم کرتے رہے تھے۔

## مرثیہ گوئی:

حضرت خورشید اپنے وقت کے نامور اور نہایت بلند پایہ مرثیہ گو تھے۔ ان کی استادانہ

دیکھنے تک کو تو چاہتا نہیں۔ مرثیہ کہنا کیسا؟ مگر اپنی جگہ پر خیال آیا کہ لاؤ نظم تو کرو۔ دیکھو کہا جاتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک مرثیہ بحر رمل مثمن مخبون محذوف میں شروع کیا۔ چار پانچ روز میں رخصت بھی کہی۔ بعد اس کے کچھ ایسے افکار وتر ددات لاحق ہوئے کہ مطلق ترک ہو گیا۔ پھر کبھی خیال اس کے پورا کرنے کا بھی نہ آیا۔ جب بار دیگر زیارت کے لیئے میں گیا اور حضرت ماہر قبلہ سے ملاقات ہوئی جہاں اور ذکر آئے یہ بھی ذکر آیا کہ یہاں تمھارے جانے کے بعد سب کو شوق مرثیوں کا ہوا اور کیا کیا خوب مرثیے کہے گئے تم کو بھی تو میر ضامن عباس صاحب نے لکھا تھا۔ معلوم نہیں تم نے کچھ کہا یا نہیں۔ میں نے عرض کی کہ ایک مرثیہ شروع تو کیا تھا بلکہ رخصت تمام و کمال کہہ چکا تھا مگر پھر کچھ ایسا اور باتوں میں الجھنا ہوا کہ پھر تمام کرنے کی نوبت نہ آئی۔ انھوں نے اور اوروں نے اصرار کیا کہ سنایئے میں نے پہلے عذر کیا، پھر وہ ٹکڑا رخصت بھر پڑھ کر سنایا۔ چونکہ سب صاحب محبت کرتے تھے بہت پسند کیا اور اصرار کیا کہ اسے پورا کرو۔ میں نے جب چارہ کوئی نہ دیکھا مجبوراً اسے پورا کیا۔ جب ختم ہوا ایک مجلس بھائی صاحب قبلہ نے معین کی اور وہ مرثیہ میں نے سرِ منبر پڑھا۔ بعد پڑھنے کے کچھ ایسی مسرت حاصل ہوئی کہ مجھے خیال آیا اس سے بہتر کوئی بات ہی نہیں۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ بس اس دن سے غزل گوئی ترک اور مرثیہ گوئی اختیار کی"۔　　(ص ۳۳-۳۴)

پھر تحریر فرماتے ہیں:

"جب بعدِ زیارت لکھنؤ آیا۔ یہاں بھی بہت سی مجلسیں پڑھیں۔ پہلے پہل تو بڑا تعجب لوگوں کو ہوا۔ کسی نے کہا کہ یہ مرثیہ ان کا نہیں، میر نفیس صاحب نے کہہ دیا ہے۔ کسی نے کہا نہیں کہہ تو نہیں دیا، بنا دیا ہے۔ جب خود جناب میر نفیس سے پوچھا اور معلوم کیا کہ ان کا بنایا ہوا نہیں ہے تو پھر کچھ دنوں

یہ مشہور رہا کہ انھوں نے اپنے بھائی یعنی حضرت ماہر سے کہلوالیا ہوگا یا بنوالیا ہوگا۔ جب وہ خود ایک آدھ مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھے تو یہ شبہہ بھی لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا کیونکہ میرے ان کے مرثیوں میں فرق کلی دیکھا۔ رنگ ہی جدا تھا۔ اب کیونکر وہ خیال کرتے۔ خدا خدا کر کے اب جا کے لوگوں کے سب شبہے مٹ گئے"۔ (ص ۴۴)

حضرت خورشید کے مندرجہ بالا بیان سے ان کی مرثیہ گوئی کے ضروری پہلو روشن ہو گئے۔ اس سلسلہ میں اختصار کے سبب سے میں نے بہت سی باتیں ترک کر دیں۔ جو بہت ضروری تھیں وہی درج کیں۔

## مرثیوں کی تعداد:

حضرت مہذب نے تحریر فرمایا ہے کہ

"جناب خورشید نے کم و بیش پچیس مرثیے کہے لیکن آج ان کا پتہ نہیں ملتا۔"
(اذکار محسن، ص ۶۱)

مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ نے "تاریخ لکھنؤ" میں ان کے مرثیوں کے چند مطلع لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ان کے مراثی میں مظلوم کربلا کے حال میں جو مرثیہ ہے اس کا مطلع یہ ہے

"رخصت ہے اب حرم سے شہِ مشرقین کی"۔

۲۔ حضرت عباسؑ علمدار کے حال میں ان کے مرثیے کا مطلع یہ ہے

"پھر آج کلک رواں بہر نظم نکلتا ہوں"۔

۳۔ جناب عونؑ و محمدؑ کے حال میں مرثیہ کا سرنامہ یہ ہے

"تا ظہر لٹا رن میں (جو) دربارِ حسینی

۴۔ حضرت حرؑ کی عبرت افزا حالت اس مرثیہ میں نظم کی ہے

"ہاں بیاں خوبیِ الفاظ و معانی دکھلا"

اس کے علاوہ خود حضرت خورشید نے بحور مرثیہ کے بیان میں چاروں متداول بحروں میں اپنے چار مرثیوں کے مطلع لکھے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مداحِ بادشاہِ عراق و حجاز ہوں۔

۲۔ ہے دشت میں آمد بِن قتال عرب کی۔

۳۔ شکرِ احسانِ جنابِ احدی کرتا ہوں۔

۴۔ خدا کرے نہ کسی باغ میں خزاں آئے۔

اس طرح حضرت خورشید کے آٹھ مرثیوں کا تو پتہ چل گیا مگر باقی بیالیس مرثیوں کے بارے میں کوئی نشاندہی نہیں ہوتی۔

حضرت مہذب لکھنوی نے تلاش و جستجو سے ان میں کا ایک مرثیہ حضرت ابوالفضل العباسؑ کے حال کا حاصل کر کے ''اذکارِ محن'' میں شائع کیا اور بس یہی مرثیہ محفوظ رہ گیا۔

## مرثیہ کا خاکہ:

اس مرثیہ میں کل ستاسی بند ہیں۔ اس کا چہرہ دعائیہ ہے جس کے بعد انھوں نے تاریخ فرشتہ کی ایک صحیح حکایت کو نظم کیا ہے جس کے مطابق احمد نگر دکن کے بادشاہ کا چھوٹا بیٹا بیمار ہوا اور ایسا کہ کوئی علاج اور کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ اس بات نے بادشاہ کے عقیدہ کو متاثر کیا اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی عقیدہ کی خرابی کی وجہ سے صحت کے لیئے اس نے برہمنوں اور پنڈتوں کا سہارا لینا شروع کیا حتیٰ کہ بت خانوں میں بتوں پر نذر چڑھانے لگا۔ اس کے دربار میں ایک سید تھے جن کا نام شاہ طاہر تھا اور پیرو محمدؐ و آل محمدؐ تھے۔ انھوں نے ایک دن بادشاہ سے کہا کہ میری ایک تجویز ہے۔ اس پر عمل کیجیے گا تو بچے کو انشاءاللہ صحت ہو جائے گی۔ مگر مجھے خوف ہے کہ اگر آپ کو وہ تجویز اپنے عقیدہ کے خلاف معلوم ہوئی تو میں آپ کے عذاب کا شکار ہو جاؤں گا۔ اس لیئے آپ وعدہ کیجیے کہ مجھ پر کسی بھی حالت میں کوئی عذاب نازل نہیں کیجیے گا ورتجویز سے اختلاف کی صورت میں مجھے فوراً حج کے لیے جانے کی

اجازت دے دیجیئے گا۔ جب بادشاہ نے ہر طرح وعدہ کر لیا تو ان مردِ مومن نے کہا کہ آپ اللہ سے اس طرح نذر کریں کہ اگر آج شب کو میرا بیٹا شفایاب ہو جائے تو میں فوراً دینِ رسول کی پیروی اختیار کر لوں گا۔ بادشاہ نے بیٹے کی صحت یابی کے لیئے یہ شرط منظور کر لی۔ اسی رات کو خواب میں حضورِ اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی زیارت کی اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کا بیٹا بالکل شفایاب ہو چکا ہے۔ آخر اس نے اپنی منت پوری کی۔ یہیں سے حضرت خورشید نے کربلا کی طرف گریز کیا۔ آگے حضرت ابوالفضل العباسؑ کا حال اور آخر میں شہادت و مصائب ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ اس طرح کی روایات نظم کرنے سے مرثیہ میں عموماً بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا دامن شعریت سے خالی ہو جاتا ہے۔ مگر حضرت خورشید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی شعریت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اپنے جذبات مودت کے رنگ بھر کے اس حصہ نظم کو بھی دلکش بنا دیا۔

اب مرثیہ کے کچھ اقتباسات نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں

چہرہ:

پھر آج کلکِ رواں بہرِ نظم اٹھتا ہوں
سبھوں کو زورِ قلم بزم میں دکھاتا ہوں
وفورِ شوق میں بے خود ہوا ہی جاتا ہوں
نشانِ تباہی اوراقِ دل کے پاتا ہوں
نظر میں طبعِ سخن سنج آج تلتی ہے

اور مصرع ہے کہ:

ہوا بندھی ہوئی مدت کے بعد کھلتی ہے
بڑھائے نشہ جو یارب وہ جامِ کوثر دے
دہن کو موتیوں سے میرے آج تو بھر دے

نہ جاہ و مال مجھے دے نہ دولت و زر دے
زباں کو قوتِ دیرینہ پھر عطا کر دے
عدو ہوں دیکھ کے بے چین اور میں چین کروں
اسی طرح سے ثناخوانیِ حسینؑ کروں

پورے بند میں کس قدر زور، سلاست اور روانی ہے۔ سُبحان اللہ۔

اور یہ پورا بند ملاحظہ ہو:

وہی ہو زورِ قلم اور وہی روانی ہو
اسی طریق سے مولاؑ کی مدح خوانی ہو
وہی فصاحتِ الفاظ و خوش بیانی ہو
بڑھے وہ جوش کہ دریا بھی پانی پانی ہو
جو دیکھیں آب تو موجوں کی جستجو نہ رہے
کسی نظر میں سمندر کی آبرو نہ رہے

سبحان اللہ۔ پورا بند قابل داد ہے اور بیت کا تو جواب نہیں۔

اس کے بعد کے بند کا چوتھا مصرع اور بیت

کہ مدحِ شاہؑ ہو نغمہ کشِ برنگِ ہزار
جہاں میں بحر کی توقیر ہے تو بہنے سے
حصولِ بلبلِ تصویر بن کے رہنے سے

کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

## حکایت:

اب یہاں سے حکایت شروع ہوتی ہے:

چنانچہ ایک حکایت بیان کرتا ہوں
ثنائے آلِ رسالت بیان کرتا ہوں
انھیں کی شفقت و رحمت بیان کرتا ہوں

بہت صحیح روایت بیان کرتا ہوں

عیاں کیا ہے یہ راز ایک دل برشتہ نے
رقم کیا ہے اسے قاسم فرشتہ نے

یہاں سے بادشاہ کا ذکر اور اس کے بیٹے کی بیماری کا حال بیان کیا ہے۔ بیماری کی شدت اس بند سے ظاہر ہوتی ہے۔

بڑھا تھا ضعف، کسی طرح چھوڑتا تھا نہ غش
پڑا تھا فرش پہ مانندِ مردہ وہ مدہوش
زباں میں کانٹے پڑے تھے، یہ تھا وفورِ عطش
بلند ہر بنِ مو سے تھے شعلۂ آتش
یقیں تھا صورتِ شمع لگن پگھل جاتا
جو نبض دیکھتا، دستِ طبیب جل جاتا

اللہ اکبر۔ مبالغہ میں یہ مصرع داد طلب ہے۔

طبیب جان لڑائے ہوئے تھے گو کہ، مگر
دوائیں کرتی نہ تھیں کچھ ذرا بھی اپنا اثر
ہوا شفا سے جو مایوس آخر اس کا پدر
تو فرق اس کے عقیدوں میں آ گیا یکسر
کلام برہموں تک کے آزمانے لگا
بتوں کے پاس وہ لے لے کے نذر جانے لگا

تھے ایک سید ذیجاہ، شاہ طاہر نام
ہر ایک علم میں بے مثل، حجۃ الاسلام
اسی خیال میں رہتے تھے ہر سحر ہر شام
کہ دینِ حقۂ اسلام کا ہو شہرہ عام

روانج پائے یہی دین ، دل یہ کہتا تھا
خیال آپ کو ہر دم اسی کا رہتا تھا

وطن کو چھوڑ کے رہتے تھے کچھ دنوں سے وہاں
سوا ہر ایک سے قدر ان کی کرتا تھا سلطاں
نظر جب آیا انھیں اس طریق کا ساماں
تو ڈرتے ڈرتے کیا بادشاہ سے یہ بیاں

خدا کے فضل سے کیا راہ میں نے پائی ہے
شفا ہو اس کو ، وہ اک بات دل میں آئی ہے

وہ بات ایک بند کے تیسرے چوتھے مصرع اور بیت میں ہے کہ

حضور نذر کریں اس طرح سے پیشِ خدا
کہ آج شب کو شفا پائے گر پسر میرا

تو جتنے وسوسے ہیں دل میں ، سب کو کھوتا ہوں
ابھی میں پیروِ دینِ رسولؐ ہوتا ہوں

سمجھ چکا تھا جو سلطاں شفا کو امر محال
تو ایسی نذر میں کچھ کی نہ کسی نے قیل و قال

اس کے بعد:

کھلی جو آنکھ تو اس نے یہ خواب میں دیکھا
کہ اک بزرگ ہوئے میرے گھر میں جلوہ نما

عیاں جلالِ خدائے جہاں ہے چتون سے
خجل ہے مہر کی ضو روئے صاف و روشن سے

اسی جمال کے بارہ بزرگ ہیں ہمراہ
ہر اک کا چہرۂ روشن ہے رشکِ مہر و ماہ
مجال کیا کہ جو ٹھہرے کسی کے رخ پہ نگاہ

دکھائی دیتی ہے آنکھوں کو صاف شانِ الٰہ
وفورِ جلوہ گری ہے خدا کے نور کی طرح
چمک رہے ہیں در و بام کوہِ طور کی طرح

کیا عمدہ بیت ہے۔ جزاک اللہ۔

اس کے بعد کا بند چھوڑ کے اگلا بند:

یہ بڑھ کے ایک سے تب بادشاہ نے پوچھا
کہ یہ بزرگ ہیں کون، ان کا نام پاک ہے کیا
اور ان کے ساتھ ہیں جو صاحبانِ مجد و علا
یہ سب ہیں کون مجھے ان کا حال جلد بتا
کبھی نصیب میں ایسا شرف نہ لکھا تھا
یہ حسن خواب میں بھی آج تک نہ دیکھا تھا

دیا جواب تب اس نے کہ جلد ہو آگاہ
یہی تو ختمِ رسلؐ ہیں محمدؐ ذیجاہ
اور ان کے ساتھ یہ بارہ امامؑ ہیں واللہ
کہ جن کی شان میں ہے "انما یرید اللہ"
فضائل ان کے ہر اک انس و جن پہ ظاہر ہیں
مثالِ احمدؐ مرسل یہ پاک و طاہر ہیں

یہ ذکر تھا کہ بڑھ آئے رسولؐ ربِ علا
اٹھا کے ہاتھ کو برہان شاہ سے یہ کہا
کہ تیری نذر ہوئی مستجاب پیشِ خدا
عطا کی اس ترے فرزندِ ناتواں کو شفا
نہ اپنی بات کو برہان اب مکرنا تو

کہا ہے جو مرے فرزند نے وہ کرنا تو

یہ خواب دیکھ کے بے تاب ہو کے وہ اٹھا اور پھر اپنے بیٹے کا حال دیکھنے آیا تو کیا دیکھا کہ:

تپ شدید کجا ، تھا نہ اس کا کوئی اثر

صحیح آیا نظر اس کو اپنا نورِ نظر

اگلا بند:

یہ حال دیکھ کے خوش ہوگیا وہ نیک انجام

بلا کے سیدِ طاہر سے تب کیا یہ کلام

کہ سارے آپ کے باعث سے بن گئے سرے کام

بس اب سکھایئے آئینِ حقۂ اسلام

خدا گواہ غضب اشتیاق ہے مجھ کو

اب اک گھڑی کی بھی تاخیر شاق ہے مجھ کو

سبحان اللہ کیا برجستگی ہے۔ نظم کو سہل ممتنع بنا دیا۔

زہے کرامتِ آلِؑ محمدؐ ذی شاں

نہ کیوں ہو مدح میں قاصر ہر اک بشر کی زباں

بس ایک آن ہی میں کیا سے کیا ہوا ساماں

شفا پسر کو ، پدر کو عطا کیا ایماں

جدا ہر ایک خیالِ خراب و زشت ہوا

جو دوزخی تھا وہی قابلِ بہشت ہوا

سبحان اللہ ، سبحان اللہ ۔ کیا بیت ہے۔ ان سارے بندوں کی سلاست اور روانی قابل داد ہے۔ ہر مصرع سلیس نثر کا ایک جملہ معلوم ہوتا ہے۔

یہاں سے کربلا کی طرف گریز ہے۔

کروں نہ کیوں ترے ہاتھوں سے اے فلک فریاد

کبھی نہ تو نے کیا دوستوں کے دل کو شاد
چلی کچھ ایسی جہاں میں ہوائے بغض و عناد
جہاز آلِ پیمبرؐ کا ہو گیا برباد
بیان کیا ہو جو اجزا کا حال آہ ہوا
کوئی عرب میں عجم میں کوئی تباہ ہوا

اس پورے بیان واقعہ کو دیکھیے جس کو میں نے مختصر کر کے یہاں درج کیا ہے اور یہ دیکھیے کہ حکایت یا روایت کی نظم میں جو بے کیفی ہوتی ہے اس کو شاعرانہ مہارت اور جذبہ مودت سے حضرت خورشید نے کس قدر وجد آور اور پر کیف بنا دیا ہے۔ کوئی مصرع شعریت سے خالی نہیں ہے اور اول سے آخر تک حکایت میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

اس گریز کے بعد ایک بند کی بیت اس تذکرہ کو امام حسینؑ تک لے جاتی ہے۔

تمام لٹ گیا گھر مظہر العجائبؑ کا
ہوا حسینؑ پہ بس خاتمہ مصائب کا

حواس و ہوش کو کیونکر نہ ہو پریشانی
ہے صفحہ صفحہ کو مرغوب رختِ عریانی
لہو ہے خشک یہ ہے سوزِ غم کی طغیانی
دواتیں بچتی ہی جاتی ہیں دم بدم پانی
قلم سے خارِ الم گڑ گئے ہیں آنکھوں میں
یہ پیاس ہے کہ گڑھے پڑ گئے ہیں آنکھوں میں

اس بند کا چوتھا مصرع کس قدر نیا ہے اور معنوی حیثیت سے کتنا بلیغ ہے۔ یہ تخیل شاعرانہ کا کمال ہے۔

دوسرا بند: جناب قاسمؑ شہید ہو چکے جس کا اثر جناب عباسؑ پر جو ہوا وہ اس بند میں ملاحظہ ہو:

ہوئے جو ابنِ حسنؑ بھی شہیدِ راہِ خدا
دل اور حضرت عباسؑ کا نڈھال ہوا
یہ جوش آتا تھا رہ رہ کے دل میں مرنے کا
بھرے تھے آنکھ میں آنسو، عرق جبیں پر تھا
نگاہ تیغ کے قبضہ سے جھک کے لڑتی تھی
وفورِ غیظ سے تلوار اگلی پڑتی تھی

بیت میں ان جذبات کی کیسی عجیب تصویر کشی ہے۔ جزاک اللہ۔

اس کے بعد جناب عباسؑ امام حسینؑ سے پانی لانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ یہاں سے رخصت تک کے بند سب بہت پر اثر ہیں مگر عام روش کے ہیں۔ میں اختصار کی خاطر ان کو درج نہیں کر رہا ہوں۔ صرف زوجۂ حضرت عباسؑ کی زبان سے رخصت طلبی پر ان کی مدح میں ایک بند اور خصوصاً بیت ملاحظہ کر لیجئے جس میں ان کی شجاعت، دلیری اور غیظ و غضب کی حالت کا بیان ہے۔

میں سچ کہوں انھیں غصہ خدا کرے کہ نہ آئے
ذرا سمجھتے نہیں، لاکھ پھر کوئی سمجھائے
سپاہ شام تو کیا ہے کہ آنکھ میں جو سمائے
جہاں ہو ایک تو تاب ان کی ضربتوں کی نہ لائے
مطیع کس کے، نظر کردہ کس دلیر کے ہیں
غلام بھائی کے، بیٹے علیؑ سے شیر کے ہیں

کس تیور کی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

مندرجہ ذیل بند میں زوجہ سے رخصت ہوتے ہوئے حزن و ملال کی کیفیت میں امام حسینؑ کا سامنا ہوا تو امامؑ کے رنج و ملال کے خیال سے کس طرح حضرت عباسؑ نے اپنی حالت بدل دی۔ یہ ایک نفسیاتی منزل ہے۔

پہلے بند کی بیت:

وفورِ گریہ تھا ایسا وداع ہوتے ہوئے
کہ نکلے خیمہ کے باہر بھی آپ روتے ہوئے

[illegible]

نہ ہوتا بڑھ کے جو مانع خیالِ شاہِ امم
کسی طریق سے ہوتا وہ جوشِ اشک نہ کم
مگر جو ہیں نظر آیا رخِ شہِ اکرم
ادب سے ہوگیا فوراً ہی خشک دیدۂ نم

[illegible] دی جاتی۔

حضورِ سید والا جو بڑھ کے جانے لگے
عوض میں رونے کے عباس مسکرانے لگے

[illegible] سبحان اللہ

[illegible] رخصت [illegible] میدان [illegible] مقام پر [illegible] کی تعریف
میں تین بند:

ادب سے شہ کو کیا رخصتی جری نے سلام
فرس پہ چڑھ کے چلا جانبِ سپاہِ شام
لگا کے ایڑ ذرا چھیڑ دی جو اس کی لگام
ہوا ہوا فرسِ خوش عنان و کبک خرام

اور فرس کی تیز روی پر بیت ملاحظہ ہو:

اڑا چمک کے جو رنگِ رخِ سحر کی طرح
نظر سے دم میں نہاں ہوگیا شرر کی طرح

[illegible] تیز روی [illegible] تشبیہیں [illegible]

وہ جھوم جھوم کے چلتا تھا چال مستانہ
ہر ایک دیدۂ گلگوں تھا مئے کا پیمانہ
نہ کیوں ہو دیکھنے والے کا قلب پروانہ
شرارت اس میں تھی مثلِ نگاہ جانانہ

کلیجے ٹکڑے تھے عشاق کے کتاں کی طرح
ہزار رنگ بدلتا تھا آسماں کی طرح

اس بند کے چوتھے مصرع بلکہ پورے بند میں تغزل کا کیف قابل دید و قابل داد ہے۔
یہ بند خاص طور سے ملاحظہ ہو:

کہوں جو کبک تو انداز یہ وہاں کب ہیں
شرر کہوں تو شرریوں سبک عناں کب ہیں
جو بجلیاں کہوں تو بجلیاں رواں کب ہیں
ہوا کہوں تو ہوا میں یہ گرمیاں کب ہیں

زباں سے مدح ہو اس کی کہاں یہ طاقت ہے
شرف ہے ختم بس اس پہ کہ اس کی قدرت ہے

گھوڑے کی تعریف میں یہ بند لکھتے ہوئے صاحب قلم بجلی کی طرح سبک خرام ہو گیا ہے۔ سبحان اللہ۔

اس کے بعد شمر کی مکارانہ گفتگو حضرت عباسؑ سے۔ اس کے بعد فوج کا آپ پر ایک دم حملہ اور آپ کا جوابی حملہ اور اس سے میدان جنگ کی جو حالت ہوئی اس کا نقشہ۔ تیسرا چوتھا مصرع اور بیت ملاحظہ ہو:

خدنگِ ظلم چلانے لگا جو کل لشکر
جلال آ گیا، بدلے ہژبر کے تیور

ہزارہا جو شغال اک جگہ نظر آئے

سپاہ شام پہ تلوار تول کر آئے

صفوں میں شیر کے آنے سے پڑ گئی ہلچل

ادھر الف ہوئے گھوڑے، ادھر گرے پیدل

پرے کے پشتوں سے یوں دم میں بھر گیا مقتل

دکھائی دیتا تھا لاشوں کا ہر طرف جنگل

ہوا سے تیغ کے جھونکے جو چلتے تھے بن میں

بگولے اٹھتے تھے خونِ جہندہ کے رن میں

[illegible]

چمک سے تیغ کی کیوں برق شرمسار نہ ہو

نظر کی طرح سے چار آئینوں کے پار نہ ہو

گرے سروں پہ تو مطلق تنوں پہ بار نہ ہو

پکارتے ہیں ملک، دیکھو ذوالفقار نہ ہو

زمیں پہ لوٹ رہے ہیں کسی قتیل کی طرح

ہمارے پر بھی نہ کٹ جائیں جبرئیل کی طرح

کیا کہنا ہے۔ سبحان اللہ۔

نہ مرغِ جاں رہے، یوں جسم کے قفس توڑے

ہرن ہوئے تھے سواروں کو پھینک کر گھوڑے

کیا مصرعے ہیں سبحان اللہ۔

خجل ہوئے تھے خطاؤں پہ اپنی کیا تھوڑے

کماں نے ٹوٹ کے بھی تھے دونوں ہاتھ جوڑے

نگاہِ غیظ سے اس شیر نے جہاں دیکھا

ہر ایک تیر کو انگشت در دہاں دیکھا

چھٹے مصرع میں تخئیل و تمثیل کا حسن حسن تعلیل کے ساتھ کیا ہی مزہ دے رہا ہے۔ اگلا

بند:

اجل پکاری، نہ کیوں حال فوج شر ہو خراب
کیا کسی نے نہ اللہ و مصطفیٰؐ سے حجاب
عبث نہیں ہے علمدار شاہِ دیں کو (کا) عتاب
جری کو کس لیے لے جانے دی نہ مشکِ آب
جلا دیا ہے سبھوں کو شرر فشانی نے
لگائی ہے لب دریا یہ آگ پانی نے

بچا نہ سکتے تھے جانیں کسی طرح اعدا
وہ کشمکش تھی کہ ملتا نہ تھا کہیں رستا
کوئی شقی کسی تدبیر سے جو بچ بھی گیا
تو بڑھ کے موت نے دی تیغ تیز کو یہ صدا
کہاں تلک کوئی کرتے ترقی جفا کے لیے
ادھر بھی دیکھ لے منھ پھیر کر خدا کے لیے

تلوار کی تعریف کے ان بندوں میں کتنے مضامین اور تشبیہات و استعارات بالکل نئے ہیں۔ یہ خود حضرت خورشید کے کمالِ فن کا کمال ہے، کہیں سے مستعار نہیں ہے نہ کسی کی خوشہ چینی ہے۔ چھ مصرعے دوبارہ ملاحظہ ہوں

ہمارے پر بھی نہ کٹ جائیں جبرئیل کی طرح
ہرن ہوئے تھے سواروں کو پھینک کر گھوڑے
ہر ایک تیر کو انگشت در دہاں دیکھا
لگائی ہے لب دریا یہ آگ پانی نے

یہ تو محض چند مثالیں ہیں ہے ورنہ جتنے بند آپ کے سامنے ہیں اگرچہ پورا مرثیہ پیش نظر

نہیں ہے۔

اس کے دو بندوں کے بعد شہادت۔ موقع یہ ہے کہ اس ہنگامہ میں شمر لعین پر آپ کی نظر پڑی اور آپ نے اس کو ٹوکا۔ اس سے گفتگو کے دوران آپ کا حملہ رک گیا

یہ ہاتھ روکے ہوئے کر رہے تھے آپ ارشاد
کمیں میں چھپ رہے دو بانیِ دغا و فساد
جفائے دہر کے ہاتھوں سے اے فلک فریاد
بس اتنا وقفہ غضب ہوگیا، بڑھے جلاد
پئے جفا و ستم ہم قسم ہوئے دونوں
لگائے وار تو شانے قلم ہوئے دونوں

یہاں سے صرف تین بند شہادت اور مصائب کے ہیں اور پھر مقطع کا آخری بند

قریب لاشۂ عباس ہیں شہِ خوش ذات
سیہ زمانہ ہے آنکھوں میں، دن ہوا ہے رات
یہ عرض کرتا ہے خورشید آپ سے اک بات
پکاریں "احسن ربی لک العزا" حضرات
اٹھیں نہ مجلس ماتم سے دل میں پچھتا کے
سروں کو پیٹیں، بس اب روئیں خوب چلا کے

حضرت خورشید کے واحد دستیاب مرثیہ سے یہ چند بند پیش کیے گئے جو بہر حال ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں اندازہ لگانے کے لیے چند جھلکیاں فراہم کرتے ہیں۔ زورِ بیان، سلاست، روانی، خلاقیِ مضامین، تخئیل کی بلندی، تشبیہ و استعارات کی ندرت، جدت خیال اور اثر آفرینی سبھی کچھ ان میں نمایاں ہے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے صاحب کمال مرثیہ گو تھے۔ اور اسی وجہ سے لکھنؤ کے باہر پٹنہ اور کلکتہ وغیرہ تک مجلسیں پڑھنے اور مرثیے پیش کرنے کے لیے مدعو کیے جاتے۔ شاعری میں ان کی استادی کا درجہ مانا جاتا تھا۔ کاش ان کے اور

مرثیے بھی دستیاب ہوتے تو رثائی ادب کا دامن اور کتنے ہی لعل و گہر سے مملو ہو جاتا۔
مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی حتی کہ مشورۂ سخن بھی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ افادات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے مرثیہ گوئی میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ جو کچھ برا بھلا کہا یا اب کہتا ہوں وہ اپنا ہی کہا ہوا اور اپنا ہی دیکھا ہوا ہوتا ہے۔ مشورہ تک دوسرے کا نہیں ہوتا''۔ (افادات۔ ص ۳۵)

## نوحہ گوئی اور سلام نگاری:

ابتداء میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز ہی نوحہ گوئی سے ہوا۔ مجلسوں میں سلام چونکہ منبر سے پیش کیے جاتے تھے اس لیے انھوں نے سلام بھی کہے ہوں گے مگر ان میں سے اب کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔

## رباعی:

رباعی گوئی بھی مرثیہ گو شعراء کے لیے ضروری تھی اس لیے کہ مرثیہ پیش کرنے سے پہلے مرثیہ گو دو چار رباعیاں ضرور پیش کرتا تھا جس کا مقصد سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور مجلس کو جمانا تھا۔ حضرت خورشید کی ایک رباعی جناب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ نے ''تاریخ لکھنؤ'' میں درج کی ہے جو حسب ذیل ہے

کب حالِ دل اپنا کہنے والے ہم ہیں
غم شمع کی طرح سہنے والے ہم ہیں
روشن ہے کھلوں پہ صبر اپنا خورشید
جل جل کے خموش رہنے والے ہم ہیں

(تاریخ لکھنؤ۔ ص ۱۶۱)

تو نہ واقف ہو تو آگاہ میں کردوں تجھ کو
خلق کہتی ہے جہاں میں جسے سرکار نظام

اس کے آخر میں انھوں نے اسلام کے حق میں دس دعائیہ شعر نظم کیئے اور نظام کی مدح کو نہایت اختصار کے ساتھ بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تا ابد دہر میں قائم رہے سرکارِ نظام     اسی دولت کی بدولت ہے نمودِ اسلام
گرکہ تھا قصد، کہوں مدح میں بھی کچھ اشعار     پر کہا دل نے کہ بہتر نہیں اس کا انجام
حق تو یہ ہے کہ زباں میں نہیں طاقت اتنی     مدح سلطاں ہو ادا کیا، یہ گدا کا نہیں کام
چپ ہو خورشید نہیں پاسِ ادب کچھ تجھ کو     شببِ کلک کی اب روک لے ہاتھوں سے لگام
شکر صد شکر کہ جو قصد تھا وہ ختم ہوا     کر دعا ہاتھ اٹھا کر، یہ دعا کا ہے مقام
یا خدا دہر میں جب تک کہ رہیں لیل و نہار     صبح روشن رہے جس وقت تک اور تیرہ شام
نور جب تک کہ ہے خورشید میں ذروں میں چمک     جلوہ گر چرخ پہ جب تک کہ رہے ماہ تمام
کوہ سے سیل کے جب تک رہیں دریا جاری     کاہ کو قوت نامیہ سے جب تک رہے کام
ابر رحمت کی رہے خلق میں جب تک بارش     تازہ و تر رہیں جب تک گل و گلزار تمام
ہند پر کچھ نہیں موقوف، زمانہ بھر میں     روز افزوں ہو ترقی و عروجِ اسلام

(آمین یا رب العالمین)([illegible] ص ۲۰۶)

پورا قصیدہ نہایت شاندار، اپنے موضوع کی مناسبت سے بہت مکمل اور قصیدہ کے تمام لوازم سے آراستہ ہے۔ اس قصیدہ کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خورشید مرثیہ کی طرح قصیدہ کے بھی بادشاہ تھے اور اردو کے بڑے بڑے قصیدہ نگاروں کے ہم پلہ تھے۔

## غزل:

حضرت خورشید غزل کے بھی نامور شاعر تھے۔ ان کی غزل گوئی کے تین دوار ہیں

۱۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا نوحہ گوئی سے کی مگر ان کے سگے چچا زاد بھائی و استاد حضرت امید نے ان کو غزل گوئی کی طرف مائل کیا اور انھوں نے غزلیں کہنا شروع کیں۔

۲۔ جب انھوں نے مرثیے کہنا شروع کیے تو غزل گوئی ترک کر دی۔

۳۔ آخر میں مختلف حالات کے تحت جن میں کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ مرثیہ کیا چیز ہے، غزل کہو تو جانیں اس قسم کے طعن و تعریض کا دباؤ، شاگردوں کی فرمائش اور اصرار اور ان کی غزلوں پر اصلاح دینے کے سلسلہ میں مرثیہ کے ساتھ غزل گوئی دوبارہ شروع کر دی۔

اسی طرح رنگ غزل کے بھی تین دور ہیں۔

۱۔ اپنے استاد حضرت امید کے زیر اثر ایسی غزلیں کہیں جن میں عشقیہ عنصر نہیں ہوتا تھا۔ بقول حضرت خورشید:

> ''وہ (حضرت امید) طرز عاشقانہ مطلق نہ فرماتے تھے۔ یہاں تک لفظ یار بھی ان کے کلام میں اگر ڈھونڈیے تو معشوق کے معنوں میں نہ ملے گی۔ یار حمد و نعت میں یا مدح ائمہ علیہم السلام میں فرماتے تھے اور جو غزلیں یا اشعار ان سے خاص ہیں ان میں حسرت آمیز و عبرت خیز مضامین ہیں۔ خلاصہ معشوقان مجازی کی مدح میں جو طرز ہم سب کا ہے وہ کبھی کوئی شعر نہ فرماتے تھے۔ وہ مضامین عالی ہی فرماتے تھے اور نازک خیالیوں ہی کی جانب توجہ تھی۔'' (افادات۔ ص ۱۹)

حضرت امید نے غزل میں جو اصلاحی تحریک شروع کی تھی اسی کو حالی نے اپنی طرف سے مقدمہ شعر و شاعری میں بغیر امید صاحب کے حوالے سے پیش کر دیا تھا۔ اس پر حضرت امید کے بیان میں گفتگو ہو چکی ہے۔

۲۔ حضرت امید کے انتقال کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی اور ان کے دوسرے شاگردوں کی طرح حضرت خورشید بھی عشقیہ شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے اور عاشقانہ رنگ کی غزلیں کہنے لگے۔

چنانچہ افادات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اسی زمانے سے وہ رنگ جو پیشتر میں کہا کرتا تھا وہ ترک کیا اور عاشقانہ

ہی کہنے کا طرز پسند آیا۔ چنانچہ آج تک وہی طرز ہے۔ اول تو غزل اسی کا نام ہے۔ اگر قصیدہ کہے تو جس قدر مضامین اور نازک خیالات چاہے وہ صرف کرے۔ غزل میں تو یہی طرز چاہیئے"۔ (افادات۔ ص ۲۷)

۳۔ تیسرے دور میں وہ اپنے خسر معظم جناب مہدی حسین صاحب ماہرؔ کے رنگ سخن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کے بڑے مداح تھے اور کہتے تھے کہ ان کی جیسی طبیعت کا کوئی شاعر ہوا ہی نہیں۔ ماہرؔ صاحب غزل کم کہتے تھے۔ مرثیوں پر زیادہ توجہ تھی۔ حضرت خورشیدؔ کو غزل کی طرف ان کی کم توجہی کا بہت قلق تھا۔ یہ حال حضرت ماہرؔ کے بیان میں آچکا ہے۔

حضرت ماہرؔ کی غزلوں میں عاشقانہ رنگ اور مضمون آفرینی دونوں کا بڑا خوبصورت امتزاج تھا۔ اسی لیئے خورشیدؔ صاحب نے اس رنگ کو زیادہ پسند کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"اگر عاشقانہ شعروں میں مضمونوں کی چاشنی بھی ہو تو سبحان اللہ اس کا کیا کہنا جیسا کہ بھائی صاحب قبلہ جناب سید مہدی حسین صاحب ماہرؔ مدظلہم العالی نے طبیعت پائی ہے ...... میں نے تو اس طبیعت کا شاعر نہیں دیکھا"۔ (افادات۔ ص ۲۸)

مگر انھوں نے اپنی غزلوں اور رنگ غزل کو دو ہی ادوار میں تقسیم کیا ہے اور دور اول اور بعد کے دور کے چھ اشعار بطور نمونہ افادات میں درج کیئے ہیں جن سے ان کی غزل گوئی کے دونوں رنگ سامنے آجاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

## طرزِ اول:

طرز اول کے اشعار میں انھوں نے اپنی پوری غزل درج کی ہے جو ایک قافیہ کی پابندی کے ساتھ کہی تھی۔ قافیہ "گریباں" اور ردیف "کا" ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ

"میں نے ایک غزل جناب منشی منیرؔ مرحوم کی ایک ہی قافیہ کی پابندی

کے ساتھ دیکھی تھی تو اپنی طبیعت کا امتحان مجھے خود منظور ہوا کہ دیکھوں مجھ سے
بھی اس قید سے ایک ہی قافیہ میں کچھ شعر نکل سکتے ہیں یا نہیں''۔

(افادات، ص۳۲)

اس غزل میں کل بیالیس شعر ہیں جو سب کے سب گریباں کے قافیہ میں ہیں۔ یہ ان کی قدرت نظم اور کمال فن کا بین ثبوت ہے۔ سارے اشعار یہاں نقل کرنا تو طوالت کا سبب ہوگا۔ صرف چند اشعار اس کتاب کے قارئین محترم کی ضیافت طبع کے لیے درج کر رہا ہوں۔

## غزل:

جنوں ہے جوش پر عشق دہانِ غنچہ رویاں کا — در شہرِ خموشاں چاک ہے جیب و گریباں کا
بہایا خون اپنے حسرت و اندوہ و حرماں کا — بنا جوشِ جنون نشتر اگر تارِ گریباں کا
سلامت رکھ الٰہی تا قیامت دست وحشت کو — کہ یہ دامن ہے مجھ کو بس کہ دامن و گریباں کا
وہ سودائی ہوں دست قاصد جاناں میں تھما کر — بجائے نامہ پرزا دے دیا جیب و گریباں کا
لب جو حباب آب سے وحشت نہ ہو کیوں کر — کہ نقشہ ہے مری چشم تر و چاک گریباں کا
یقینی مردم آبی بھی غرق بحر وحشت ہیں — کہ ہے انداز اک موج میں چاک گریباں کا
ہیں عالی طبع جو خورشید ان کے سامنے جھک — نہیں دشوار کچھ کہنا مضامین گریباں کا

(افادات، ص۳۰)

## طرزِ حال:

اور اب طرز حال یعنی اس کے بعد کے دور کے اشعار جو عشقیہ شاعری کا نمونہ ہیں۔

خفا ہو کیوں جو لیا نام بے وفائی کا — گلہ تھا اپنی ہی قسمت کی نارسائی کا
وہ منھ کو پھیر کے کہتے ہیں میرے لاشے پر — نہ دیکھے کوئی، یہ کشتہ ہے بے وفائی کا
نکل ہی آئے گا مطلب کہ ضد مزاج میں ہے — وفا کا شکوہ کروں شکر بے وفائی کا
یہ عضو عضو الگ ہو کے قبر میں بولا — تری طرح کوئی کشتہ نہ ہو جدائی کا

اتنے ہی عرصہ میں ساری زندگی کا لطف تھا  حلق پر بسمل کے جتنی دیر تک خنجر رہا
وہ سرِ تربت یہ آ کر کہہ گیا  حق تو یہ ہے تو بڑے غم سہہ گیا
خاک اڑتی ہے لحد پر آج تک  رہ کے دنیا میں وہ غم میں سہہ گیا
خفا ہوئے ہیں تو ہوں دل کا آسرا تو نہیں  یہ بت حسین و طرحدار ہیں، خدا تو نہیں
ستم کیجئے تو کیجئے اب تو صاف ہو مجھ سے  جو کچھ ہوا وہ ہوا، یہ کہو خفا تو نہیں
طلب پہ بوسے کی کیوں اس قدر بگڑتے ہو  زبان ہی سے کہا تھا، چلو، لیا تو نہیں
تحریر ہے نہیں کی جگہ ہاں جواب میں  لکھتے تو کچھ تھے لکھ گئے کچھ اضطراب میں
قاصد کسی کے ہنسنے سے ہم بھی سمجھ گئے  چتون پکارتی ہے جو لکھا جواب میں
ہر آن مائلِ ستم و جور ہو گئے  تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے

(افادات، ص ۳۲)

"غزل کے اشعار آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ یہ ان کا پسندیدہ رنگ تھا۔ تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے۔ غزل کس قدر خوب صورت اور بھرپور شاعری ہے۔ غنیمت ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ چند اشعار محفوظ کر دیے تھے ورنہ سارا شعری سرمایہ تو دریا برد ہو ہی گیا۔ حضرت مہذب نے لکھا ہے کہ "غزلیات کا ایک مکمل دیوان تھا جو کسی صورت سے شاہ جہاں پور کے ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مسمّی زینا صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا اور اب خدا معلوم کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ (افادات، ص ۶۱)

**تلامذہ:**

حضرت خورشید کے ایک نامور شاگرد اور بھتیجے مولوی سید کاظم صاحب جاوید کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی استادانہ صلاحیتوں، علمی، ادبی، فکری اور فنی عظمتوں کے پیش نظر بڑے بڑے صاحبانِ علم و اہلِ قلم ان کے شاگرد ہوئے جن کا نام اب تک دنیائے ادب میں زندہ و تابندہ ہے۔ ان میں حکیم منے آغا صاحب آفتاب، پروفیسر سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی، پروفیسر سید محمد تقی صاحب شاداں (پروفیسر مدرسہ عالیہ رامپور)

عبدالرحیم صاحب قلم لکھنوی، سید ساجد حسین صاحب قیم وغیرہ سے بہت سے شعراء مرثیہ گو ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔

## وفات:

مہذب صاحب لکھتے ہیں۔ ایک سال حضرت خورشید نے ایک رباعی پڑھی جس کا مقطع نہایت مشہور ہے "مرجائیے یا حسین کہتے کہتے" (یہ سن ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء کی بات ہے) وہ ہر سال محرم میں پٹنہ کے ایک رئیس نواب بادشاہ نواب صاحب کے یہاں مجلس خوانی کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس سال بھی گئے وہاں ہیضہ میں انتقال کیا اور وطن سے دور دیس عظیم آباد کے ایک قبرستان میں لکھنؤ کے شعری، ادبی اور علمی افق پر ضیاء پاشی کرنے والا یہ مہتاب اور دبستان دبیر سے مرثیہ گوئی کی دنیا کو روشنی دینے والا یہ خورشید منوں قبر کے نیچے غائب ہو گیا اور یوں ان کی یہ حسرت پوری ہوئی کہ مرجائیے یا حسین کہتے کہتے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

نوٹ: دیگر شعراء کے علاوہ جناب مہدی حسین ناصری نے تاریخ وفات کہی جس سے ہجری تقویم سے ۱۳۱۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ تاریخ حضرت آغا مہدی صاحب قبلہ نے "تاریخ سلطان العلماء" میں درج کی ہے مگر کتابت و طباعت کے نقص کی وجہ سے بعض مصرعے صحیح طور پر پڑھنے میں نہیں آتے۔ جس قدر پڑھا جا سکتا ہے وہ لکھ رہا ہوں۔

آں محمد مصطفیٰ خورشید ( ) معتمد ۔۔۔ صاحب فضل و کمال و صاحب علم و خرد

[illegible] آبرو رفتہ سوئے گلزار ارم ۔۔۔ انما کانت علیہ رحمت اللہ الصمد

آفتاب آسمان شاعری [illegible] غروب ۔۔۔ ہست [illegible] مہر منور [illegible]

برد عمر خود بسر در مدح سلطانِ غریب ۔۔۔ جاں بہ غربت داد، ذوق باطنش شد مستند

نقش زد سالِ وفاتش را بہ حسرت ناصری ۔۔۔ "تمیری ہند رفتہ سوئے اللہ الصمد"

۱۳۱۹ھ

(تاریخ سلطان العلماء، ص)

# اولادِ غفرانمآبؒ کی جرأت اور عوام میں مقبولیت

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے حضرت سلطان العلماء سے کچھ خلاف شریعت مسائل پر فتوے مانگے۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ آخر بادشاہ اس حد تک ناراض ہوئے کہ یہ حکم دیدیا کہ سلطان العلماء کا مکان توپ سے اڑا دیا جائے۔ شہر میں اس خبر سے ہلچل مچ گئی۔ امرائے دربار سلطان العلماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ بادشاہ سے معافی مانگ لیں۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ صبح شاہی فوج کے کپتان نے دو توپیں نکلوائیں۔ ایک حضرت سلطان العلماء کے شریعت کدہ پر چڑھا دی اور دوسری بادشاہ کے محل پر۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو ہوش و حواس جاتے رہے۔ فوج کے کپتان کو طلب کر کے اس سے بازپرس کی۔ اس نے کہا کہ میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ بادشاہ دین کا مکان توپ سے اڑادوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے۔ اس لیے میں آج اپنی دین و دنیا دونوں کو ختم کر رہا ہوں۔ یہ سن کر بادشاہ کا احساس مذہب بیدار ہو گیا۔ اپنے حکم پر شرمندہ ہوا۔ کپتان کو اس کے جوشِ ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا مگر سلطان العلماء کی طرف سے کبھی دل صاف نہیں ہوا گو کہ تمام مذہبی امور انھیں کے ہاتھوں انجام پاتے رہے۔

غیر خدا سے بے خوفی اور حکومت کے رعب و داب سے متاثر نہ رہنا حضرت غفرانمآب اور ان کی اولاد امجاد کی سیرت کا نمایاں پہلو تھا جو ایسے ہی متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ (ماخوذ از ''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ'' ص ۵۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# شاعرانی حضرت حسین لکھنوی

## نام ونسب

اسم گرامی سید صادق علی عرفیت چھنگا صاحب، تخلص حسین (بروزن تحسین بمعنی خوش و بہادر) ان کے حقیقی نام سے لوگ کم واقف تھے۔ عموماً چھنگا صاحب حسین کہے جاتے تھے اور اسی پورے نام سے معروف تھے۔

## سلسلۂ نسب:

سید صادق علی عرف چھنگا صاحب، سید حسن صاحب جائسی کے فرزند ارجمند اور جناب مولوی سید صادق صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن جناب سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ رضوان مآب ابن مولانا سید دلدار علی صاحب غفران مآب علیہ الرحمہ کے نواسے تھے۔ اس طرح خاندان اجتہاد جناب چھنگا صاحب حسین کی ننھیال تھی۔ اس کے علاوہ وہ خاندان اجتہاد کے نامور مرثیہ گو جناب میر مہدی حسین صاحب ماہر کے داماد تھے۔ خاندان کے دوسرے نامور مرثیہ گو جناب بندے کاظم صاحب جاوید ان کے بہنوئی تھے۔

چھنگا صاحب کے نانا مولوی سید صادق صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن جناب سلطان العلماء سید محمد صاحب قبلہ کے انتقال پر مفتی محمد عباس صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے بے مثال تاریخ وفات کہی:

''رسم عزائے صادق آل محمد است''

اس مادہ تاریخ کی بلاغت اور معنویت پر جس قدر غور کیجیے گا اتنا ہی لطف آئے گا۔

## تاریخِ پیدائش:

چھنگا صاحب حسینؔ کی بالکل صحیح تاریخ پیدائش تو محقق نہیں ہے مگر ان کی تاریخ وفات سے تاریخ پیدائش کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا انتقال بقول حضرت مہذبؔ لکھنوی ساٹھ سال کی عمر میں ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا۔ (اذکار محن۔ ص ۳۹) اس اعتبار سے ان کی ولادت تقریباً ۱۸۸۰ء میں ہوئی ہوگی۔

مگر ان کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ شمس الادبا جناب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس لکھنوی مدظلہ نے ''تاریخ لکھنؤ'' میں ان کی تاریخ وفات ۱۹۳۱ء لکھی ہے۔ حضرت شمس ماشاء اللہ ابھی زندہ و سلامت ہیں۔ میں نے اس مسئلہ پر ان سے گفتگو کی تو انھوں نے فرمایا کہ مہذب صاحب کا نقطہ نظر درست نہیں ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ۱۹۳۰ء میں وہ لکھنؤ ہی میں تھے اور چھنگا صاحب حسینؔ کا انتقال ان کے سامنے ہوا تھا۔ وہ ان کی نماز اور دفن وغیرہ میں خود شریک تھے۔ ان کی نماز جنازہ ممتاز العلماء مولوی سید ابوالحسن صاحب عرف مولوی منن صاحب قبلہ مجتہد نے امام باڑہ غفران مآب میں پڑھائی تھی اور وہیں وہ دفن ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں بسلسلۂ ملازمت شمس صاحب نے لکھنؤ چھوڑ دیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں وہ لکھنؤ میں تھے ہی نہیں۔ اس لیے یہی صحیح ہے کہ چھنگا صاحب کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت مہذبؔ کے مضمون میں کتابت کی غلطی ہو۔

اس اعتبار سے اگر وقت وفات ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی تو ان کی ولادت ۱۸۷۰ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ زبدۃ العلماء جناب مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ طاب ثراہ نے ''تاریخ لکھنؤ'' ج ۲، ص ۹۷ پر ان کی ولادت کی تاریخ ۱۳۰۳ھ اور وفات کی

زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

صاحبانِ ذوق دیکھیں کہ اگر ماحول مناسب مل جائے اور قدرت کی طرف سے طبیعت بھی موزوں عطا ہو جائے تو ایک بے پڑھا لکھا انسان بھی اپنے زورِ تخیل اور آمدِ طبع و زبان کی خوبیوں اور روزمرہ کی بندشوں کے نازک راستوں سے کس کس سبک روی کے ساتھ گزر جاتا ہے"۔

(اذکارِ سخن۔ ص ۳۸)

حضرت مہذب لکھنوی نے یہ دونوں مندرجہ بالا تبصرے نہ صرف جناب چھنگا صاحب حسین کی علمی استعداد اور ان کے قطعی ان پڑھ ہونے پر مفصل روشنی ڈالتے ہیں بلکہ ان کی مرثیہ گوئی کی اعلیٰ صلاحیتوں اور مرثیوں کے اعلیٰ معیار کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس موضوع پر کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہیں رہتی۔

## ذریعۂ معاش:

حضرت حسین کی ایک مختصر سی پنشن تھی۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھی اور اسی میں وہ اپنی خودداری کو مجروح کیے بغیر گزر بسر کرتے تھے۔

## ازدواجی زندگی:

حضرت حسین کی شادی نواب مولوی سید مہدی حسین صاحب ماہر کی ایک دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔ حضرت ماہر کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ وہ خاندانِ اجتہاد کے نامور شاعر اور مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے مشہور رؤسا اور جاگیرداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ چھنگا صاحب حسین کی آمدنی بہت مختصر تھی مگر انھوں نے کبھی اپنے خسرِ معظم کی دولت پر نظر نہیں رکھی۔ ایسے لوگ اپنی سسرال میں بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اسی سبب سے ان کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہوتی ہے۔ یہی صورت حال چھنگا صاحب کی ازدواجی زندگی پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

منوایا۔ چنانچہ مولانا سید محمد باقر صاحب شمس نے "تاریخ لکھنؤ" میں لکھا ہے "ایسے باکمال شاعر تھے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سے بڑا بھی کوئی شاعر تھا"۔ (ص۔ ۷۴۹)

## دولھا صاحب عروج کا خراج تحسین:

حضرت شمس مدظلہ العالی نے "تاریخ لکھنؤ"، (ص ۷۵۰) پر "ان بزم شعراء کے تذکرہ" کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ دولھا صاحب عروج نے ان کی (ایک) مجلس مرثیہ خوانی میں بلند آواز سے کہا "آپ فخر ہندوستان ہیں"۔ مزید لکھا ہے کہ ان کے کمال فن کے سبھی معترف تھے۔ خاندان انیس کے ایک معروف و مقبول مرثیہ گو کی طرف سے خانوادۂ اجتہاد کے ایک اہم مرثیہ گو کو یہ خراج تحسین مرثیہ گوئی میں ان کے کمالات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حضرت مہذب کی رائے ان کی شاعری کے متعلق اوپر درج کی جا چکی ہے۔ وہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرماتے تھے مگر مرثیہ سے خاص شغف تھا اور اس کی طرف خاص توجہ تھی۔ مرثیہ کی طرف ان کی خاص توجہ کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ حضرت ماہر جیسے نامور مرثیہ گو کے داماد تھے۔ ان کے گھر کا ماحول مرثیہ کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ گو کہ ان سے تلمذ نہ تھا مگر ماحول تو اثر انداز ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے ہم زلف یعنی ماہر صاحب کے دوسرے داماد مولوی مدن صاحب خورشید تھے جو خود ایک اعلیٰ درجے کے مرثیہ گو اور اساتذہ لکھنؤ میں سے تھے۔ ان سے اچھے روابط بھی یقیناً صاحب کے شوق مرثیہ گوئی کو مہمیز کرتے ہوں گے۔ بہرحال اس ماحول کی دین ہو یا موہبت قدرت نے ان کی شکل میں اردو مرثیہ کو ایک بے مثال شاعر عطا کر دیا جس کا کئی اعتبار سے کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہوا۔

## تلمذ:

حضرت ماہر کے داماد ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے تلمذ اختیار نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ حضرت فخرالعلماء اعلی اللہ مقامہ کے حالات میں بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی حضرت ماہر کی و

گیا ہے۔ گیا آپ اور میں الگ الگ ہوں'۔ عارف خاموش ہوگئے اور مرثیہ
رکھ لیا پھر اسے بنا کر دو روز بعد واپس کر دیا"۔
نوٹ: میاں سے مراد عارف صاحب اور نانا باوا سے مراد جناب انیس و نفیس ہوتے
تھے۔ (دانش)

یہ اطلاع بہت اہم تھی اس لیے اس کا یہاں درج کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس
اطلاع کے بعد حضرت محسن قبلہ کی "تلخیص دیوان جاوید" میں یہ لکھا دیکھا کہ حضرت جاوید
کے دو سو شاگرد تھے۔ ان میں حضرت حسین بھی شامل تھے جو حضرت جاوید کے برادر نسبتی
تھے۔ وہی چالیس شاگرد حضرت جاوید نے حضرت خورشید کے فرزند ارجمند جناب جنہ
صاحب اختر کے سپرد کر دیے تھے مگر جن ڈیڑھ سو شعرا کو اپنی شاگردی میں رکھا ان کی
فہرست میں پھنگا صاحب کا نام رقم کر دیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ حضرت حسین بعد میں
حضرت عارف سے اصلاح لینے لگے تھے۔

## مرثیہ گوئی:

شاعری میں جناب حسین کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی مرثیہ گوئی ہے جس کے
بارے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے مقالے میں خاندان اجتہاد کے ایک شاعر اور مرثیہ گو
حضرت تاثیر نقوی کے ایک خط کے اقتباس سے یہ عبارت نقل کی ہے

"ان کے مراثی پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی نو مشق کا کلام ہو سکتا
ہے۔ ان کے استاد بندہ کاظم جاوید کی زندگی تک [illegible] کا گمان تھا کہ
ان کا کلام خود ان کا نہیں ہوتا مگر استاد کے انتقال کے بعد کلام سے اور زیادہ
پختگی کے اظہار نے لوگوں کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا"۔

حضرت مہذب نے "اسرار محن" میں اس رائے کا اظہار کیا ہے

"یہ ضرور ہے کہ مرثیے کم کہے مگر جو کچھ کہا ایسا کہا کہ بڑے بڑے خوش
گویان لکھنؤ کے دانت کھٹے کر دیے"۔ (اسرار محن ص۔۲۔)

**جب شورِ آمد آمدِ مہرِ مبیں ہوا**

چہرے میں صبح ہونے کے منظر کی تصویر کشی بڑے حسن سے کی ہے اور بہار خوب خوب نظم کی ہے۔ سترھویں بند سے گریز ہے۔

۲۔ ''اسرارِ محن'' میں جو مرثیہ ہے اس کے چہرے میں موسم سرما میں سفر سید الشہداء اور جاڑے کا بے مثال منظر نامہ ہے جو ان کا امتیاز خاص اور قوت نظم جدت خیال تخیل کی بلندی اور مضمون آفرینی کی عظیم صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔

اس میں پہلے بند سے چودھویں بند تک روضۂ رسول مقبولؐ کی تعریف اور امام حسینؑ کی سفر کربلا پر روانگی کا حال نظم کیا ہے۔ پندرھویں بند سے جاڑا نظم کیا ہے۔ بیان مصائب میں شہزادہ علی اصغرؑ کی شہادت کا ذکر ہے۔ کل بند ۵۳ ہیں۔

یہ مرثیہ حضرت مہذب لکھنوی کو سرسی ضلع مراد آباد کے سید ہاشم رضا صاحب قمر سے حاصل ہوا۔ یہ حضرت مہذب کی تلاش و جستجو کا کمال تھا۔ ان کا ایک مرثیہ بہت ہی مقبول ہے جو اب تک سوز خواں حضرات پڑھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ مرثیہ کس کا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

آج مقتل میں عجب بے سروساماں ہیں حرم

یہ سوز خوانی کا مرثیہ ہے اور تقریباً ستر بہتر سال سے پورے برصغیر میں سوز خواں حضرات اس کو پڑھتے آئے ہیں۔ اس میں اکیس (۲۱) بند ہیں۔ مرثیہ چونکہ خاص طور سے سوز خوانی کے لیے لکھا گیا ہے اس لیے بہت مشکل ہے۔ مطلع ہی سے رنج و غم کی فضا بن جاتی ہے۔ پہلا مصرع خود ایک مکمل مرثیہ ہے۔ ستر بہتر (۷۰ ـ ۷۵) سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ مجھ کو اس کی تلاش کی بہت فکر تھی مگر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال جوئندہ یابندہ جناب محترم سید آلِ محمد نقوی صاحب زائر امروہوی صاحب قبلہ کی مساعی جمیلہ سے یہ مرثیہ دستیاب ہو گیا۔ الحمد للہ۔ آلِ محمد نقوی صاحب زائر امروہوی کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وہ یہاں کے انتہائی معروف و مقبول

سوزخواں اور بہت عمدہ شاعر بھی ہیں اور میرے کرمفرما بھی۔ سوزخوانی کے فن میں ماہر ہیں۔ مندرجہ ذیل نے سوزخوانی کی ہے جیسے انھیں آواز عطا کی [illegible] فن میں مہارت کی [illegible] ایک ہے۔

چونکہ مرثیہ بہت مختصر ہے اس لیے مناسب یہی معلوم ہوا کہ پورا مرثیہ نقل کر دوں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں۔

آج مقتل میں عجب بے سر و ساماں ہیں حرم
دل ہے مجروح کھلے سر ہیں پریشاں ہیں حرم
قتلِ شبیرؑ سے بیتاب ہیں گریاں ہیں حرم
وارثوں میں نہیں اب کوئی تو حیراں ہیں حرم
ذکر مظلومیِ شہِ مدنی کرتے ہیں
کبھی آہیں تو کبھی سینہ زنی کرتے ہیں

رو کے فرماتی ہیں یہ خواہرِ سلطانِ انام
اٹھو سجادؑ کہ اب دن ہوا جاتا ہے تمام
جھٹ پٹا وقت ہے کچھ دیر میں ہونے کو ہے شام
اب نہ قاسمؑ ہیں، نہ عباسؑ، نہ اکبرؑ، نہ امامؑ
دلِ پژمردہ پہ اک غم کی گھٹا چھائی ہے
رات ہونے کو ہے اور عالمِ تنہائی ہے

کان میں پہنچی جو سجادؑ کے زینبؑ کی صدا
کھول کر آنکھ یہ کی عرض بصد آہ و بکا
کیا کہوں آپ سے قابو میں نہیں دل میرا
تپ زیادہ ہے تو غفلت بھی ہے کچھ آج سوا
کون مارا گیا اور کون جدا ہوتا ہے

مجھ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے

پھر یہ کی عرض کہ اے خواہرِ سلطانِ ہدا
لایئے شہ نے بنائی تھی جو فردِ شہدا
دیکھ لوں یہ تو مرے دل کو تسلی ہو ذرا
نام تحریر ہے اس فرد میں کس کا کس کا
جو گئے خلد میں اب خواب ہے صورت ان کی
جو مرے ساتھ ہیں لازم ہے حفاظت ان کی

سن کے یہ کہنے لگی زینب تفتیدہ جگر
لے گئے لوٹ کے اسباب تو سب بانیٔ شر!
اسی اسباب میں وہ فرد بھی تھی اے دلبر
سن کے کہنے لگے سجادؑ یہ بادیدۂ تر
قتل جو ہوئے نام ان سے رقم کردوں گا
فکر کچھ اور میں پابندِ الم کر لوں گا

کہہ کے یہ لکھنے لگے خاک پہ نامِ شہدا
یاد آئے جو وہ سب کرنے لگے آہ و بکا
دل پہ اک تیر لگا نام جو اصغر کا لکھا
غم جانکاہ سے تھرا گئے سارے اعضا
یاد کرتے تھے انھیں جب تو جگر ہلتا تھا
تین بچوں کا کہیں پر نہ پتہ ملتا تھا

رو کے کرنے لگیں سجادؑ سے زینبؑ یہ کلام
جائے افسوس ہے دن کوئی حزیں میں ہے تمام
ڈھونڈھنے بچوں کو جاتی ہوں کہ ہو جائے نہ شام

دو اجازت مجھے بیٹا کہ تمھیں اب ہو امام

راستہ بھول گئے ہیں نہ ادھر آئیں گے
دشت میں جا کے پکاروں گی تو مل جائیں گے

کہہ کے عابد سے چلیں خواہر سلطان ہدا
آ ذرا ساتھ مرے، مڑ کے یہ فضہ سے کہا
وہ بھی ہمراہ ہوئی کرتی ہوئی آہ و بکا
پاؤں رکھتی تھیں کہیں اور کہیں پڑتا تھا

جا بجا دشت میں لاشے جو نظر آتے تھے
دل دھڑکتا تھا قدم ضعف سے تھراتے تھے

آہ تھی لب پہ، رواں اشک تھے، دل تھا افگار
ہر طرف کو یہ چلی جاتی تھیں بحالت زار
ناگہاں دور سے دکھلائی دیا ایک سوار
بولیں فضہ سے یہ زینب کہ ذرا بڑھ کے پکار

منتیں اس کی کریں گے تو ترس کھائے گا
اس سے بچوں کا پتہ دشت میں مل جائے گا

حکم پاتا تھا کہ فضہ نے یہ دی بڑھ کے صدا
اے سوار اس طرف آ، اس طرف آ بہر خدا
کوئی تکلیف نہ دیں گے تجھے ہم اس کے سوا
ہم غریبوں کی ہے اک عرض اسے سنتا جا

دل ہے مجروح بہت روئی ہے جو بھائی کو
تجھ سے کچھ پوچھنا ہے فاطمہؑ کی جائی کو

متوجہ ہوا وہ سنتے ہی فضہ کی صدا

پاس آکر کہا کیا پوچھتی ہے اے دکھیا
بولی یہ خواہرِ شبیرؑ کہ اے مردِ خدا
کسی بچہ کو تو دیکھا نہیں یہ مجھ کو بتا
تشنہ لب ہیں وطن آوارہ ہیں دکھ پڑے ہیں
ساتھ سے چھوٹ کے جنگل میں چلے آئے ہیں

عرض کی اس نے جگر تھام کے بادیدۂ تر
ابھی صحرا میں جو اک سمت پڑی میری نظر
دیکھا اک لاشۂ پُرخون ہے زمین پر بے سر
بچی اک چھوٹی سی بیٹھی ہوئی روتی ہے ادھر
رونے لگتا ہے اُدھر جس کا گزر ہوتا ہے
اس کے نالوں سے عجب دل پر اثر ہوتا ہے

رو کے فرمانے لگیں زینبؑ مجروح جگر
مہربانی کا صلہ دے تجھے ربِ اکبر
بس بچے کا کیا احسان ہوا تیرا مجھ پر
کہہ کے اس سمت چلیں گریہ کناں خاک بسر
اشک خوں بہتے تھے قابو میں دلِ زار نہ تھا
ایک فضہ کے سوا دوسرا غمخوار نہ تھا

پہنچیں القصہ وہاں پایا تھا جس جا کا پتہ
دیکھا اس جا پہ ہے، اک نور سے معمور گڑھا
لاش اک اس میں پڑی ہے کہ نہیں سر جس کا
اور سکینہؑ وہیں بیٹھی ہوئی کرتی ہے بکا
غش جو ہوتی ہے مزہ موت کا مل جاتا ہے

چونک پڑتی ہے تو دل سینہ میں ہل جاتا ہے

آئیں نزدیک غرض زینب تفتیدہ جگر
بیٹھ کر لے لیا آغوش میں بادیدۂ تر
بولی لپٹا کے کلیجہ سے میں قرباں تجھ پر
تو نے پہچان لیا باپ کا لاشہ کیونکر
ہجر سے مادر ناشاد موئی جاتی ہے
بی بی اب گھر میں چلو رات ہوئی جاتی ہے

عرض کی اس نے پھوپھی سے یہ بصد آہ و بکا
فرقت شہ سے تڑپنے جو لگا دل میرا
آ کے اک سمت میں چلائی کہ بابا بابا
دی پھوپھی مجھ کو اسی لاشۂ بے سر نے صدا
آئی ہوں سینۂ شبیر پہ سونے کے لیئے
کہا زینبؑ نے کہ بس گھر چلو رونے کے لیئے

یہ تو بہلاتی تھیں اور روکے وہ دیتی تھی جواب
آتش غم سے وہ ننھا سا کلیجہ تھا کباب
گود میں مچلی ہوا دل جو زیادہ بے تاب
پیار کر کے اسے زینبؑ نے بچشم پر آب
لیں بلائیں کبھی، گہہ آنکھوں سے آنسو پونچھے
خون سرور سے بھرے تھے جو وہ گیسو پونچھے

دونوں بچوں کو چلیں ڈھونڈنے پھر وہ مضطر
ناگہاں جا پڑی اک سمت بیاباں میں نظر
دیکھتی کیا ہیں کہ وہ باغ نبیؐ کے گل تر

باہیں گردن میں ہیں اور سو رہے ہیں زیرِ شجر
گرد اس طرح ہے ان چاند سے رخساروں پر
ابر باریک ہو جس طرح سے سیاروں پر

آئیں نزدیک جو روتی تو یہ نقشہ دیکھا
ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں پیاس جو ہے حد سے سوا
مٹی سرکا کے وہ بیٹھے ہیں وہاں ماہ بقا
جس جگہ پہ ہے تری کچھ ہو گیا ہے ٹھنڈا
باپ کا سینہ نہیں ماں کی بھی آغوش نہیں
ایسے غافل ہیں کہ تن کا بھی انھیں ہوش نہیں

نیند سے جب ہوئے ہوشیار نہ وہ رشکِ قمر
جھک کے پھر غور سے کی چہروں پہ زینب نے نظر
دم نہ پایا تو یہ فرمانے لگیں پیٹ کے سر
ہائے ان دونوں کا بھی ہو گیا دنیا سے سفر
دشتِ غربت میں کیا ہم سے کنارا بچو!
ہائے بے موت تمھیں موت نے مارا بچو!

عرض کرنے لگی زینبؑ سے یہ فضہ غمگیں
بی بی بے ہے مرے دل کو تو یہ ہوتا ہے یقیں
لوٹ کر خیموں کو جانے لگی جب فوجِ لعیں
آئے گھوڑوں کی ٹاپوں میں یہ خورشید جبیں
حال ان کے جگر و قلب کو تڑپاتے ہیں
پھول سے جسموں پہ سب نیل نظر آتے ہیں

## سوز

اے چرخ تیری شرم و حیا آج کیا ہوئی
زینبؑ سے تو یہ پوچھ بلا آج کیا ہوئی
کل کیا ستم ہوئے تھے جفا آج کیا ہوئی
بھیجی تھی جو خدا نے ردا آج کیا ہوئی

بلوہ میں گاہ جاتی ہو گہ قید ہوتی ہو
زینبؑ کہو حسینؑ کو کس وقت روتی ہو

میں نے اس مقالہ میں اکثر مثالوں میں کئی کئی بند درج کیے ہیں حالانکہ کم بندوں پر بھی اکتفا کی جا سکتی تھی مگر اس کا سبب صرف یہ تھا کہ بیشتر مرثیے غیر مطبوعہ ہیں اور بعض نہایت خستہ حالت میں ہیں اس لیے خیال کیا کہ اسی طرح ان میں سے کچھ محفوظ رہ جائے تو بہتر ہے۔ چھنگا صاحب حسینؑ کے ۱۰۰۰ مرثیے اگرچہ مطبوعہ ہیں مگر تقریباً اب سے شائع صرف چند حضرات کے پاس ہیں۔ عموماً دستیاب نہیں ہیں۔ اس لیے خیال تھا کہ دونوں مرثیے پورے درج کر دیے جائیں مگر اس سے مقالہ کی طوالت بہت بڑھ جاتی۔ اس لیے میں نے اب یہ مناسب سمجھا ہے کہ ان کے صرف اقتباسات ہی درج کیے جائیں۔

اس سے پیشتر کہ میں ان کے دونوں مرثیوں کے مختلف اجزا سے ترتیب کے چند نمونے پیش کروں یہ ضروری ہے کہ میں جاڑے والے مرثیہ کے بارے میں چند نکات کی وضاحت کر دوں۔

### جاڑا، چھنگا صاحب حسینؑ اور شمیم امروہوی:

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے مقالہ "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جاڑے پر سب سے پہلے حضرت شمیم امروہوی نے مرثیہ کہا۔ جس کے شعر میں خاندان

اجتہاد کے مرثیہ نگار چھنگا صاحب حسین نے امام کے سفر کو سردیوں میں فرض کر کے مرثیہ کا چہرہ تعمیر کیا۔ انھوں نے حضرت شمیم امروہوی مرحوم کے متعلقہ مرثیہ کا ایک بند بھی مثال میں درج کیا ہے۔ مگر اس سے کئی بات کی وضاحت نہیں ہوتی۔ مثلاً

۱۔ مرثیہ میں جاڑا نظم کرنے کا موقع و محل کیا ہے۔

۲۔ جاڑے کا یہ منظر کربلا میں دکھایا گیا ہے یا کہیں اور۔

۳۔ شمیم صاحب کے مجموعہ مراثی "ریاض شمیم" میں یہ مرثیہ شامل ہے یا نہیں، ان کی کوئی اور جلد شائع ہوئی ہو تو اس میں ہے یا نہیں، یا کسی تذکرہ میں اس کا ذکر ہے؟

۴۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ "تیغ دودم کی شعلہ فشانی تو مرثیوں میں لکھی جاتی رہی مگر شمیم امروہوی جدت مضامین میں یہ گوشہ لے کر آئے۔" مذکورہ بند کا پہلا مصرع ہے "تیغ دودم کی آب سے یہ انقلاب تھا" اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ آب شمشیر نے موسم سرما پیدا کر دیا۔ کیا یہی تخیل ہے یا کچھ اور؟

جب تک یہ تفصیلات نہ معلوم ہوں کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مرثیہ کب تصنیف کیا گیا۔ بہر حال ۱۹۱۴ء سے پہلے کی تخلیق ہوگی جو حضرت شمیم کے انتقال کا سال ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کے جاڑے سے متعلق سارے بند سامنے آئیں تو کوئی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

## حضرت مہذب لکھنوی کی تحقیق

بہر حال ہلال نقوی صاحب کے اس ادعا کے مقابلہ میں کہ مرثیہ میں سب سے پہلے جاڑا جناب شمیم امروہوی نے نظم کیا، حضرت مہذب لکھنوی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جاڑا چھنگا صاحب حسین نے نظم کیا۔ ان کی عبارت درج ذیل ہے

"جو مرثیہ پیش کیا گیا ہے اس میں موصوف نے نہایت برمحل جاڑا ...

نومبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ شمیم صاحب کے مرثیہ سے اہلِ لکھنؤ ۱۹۵۱ء تک بے خبر تھے۔ اہلِ علم اور مرثیہ گو حضرات کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔ اگر شمیم صاحب نے یہ مرثیہ کہا ہوگا تو یقیناً ۱۹۵۱ء بلکہ ۱۹۱۴ء سے بھی پہلے کہا ہوگا۔ پھر مہذب صاحب اور مرزا افداعلی خنجر جیسے صاحب نظر کا بلکہ پورے لکھنؤ کا اس سے بے خبر ہونا چہ معنی دارد۔

## پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب مرحوم کا قول:

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جناب پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب مرحوم کا رثائی ادب کا مطالعہ بہت وسیع اور اردو کے کلاسیکی مرثیوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ میں نے ان کو مرثیہ پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ جب وہ انیس و دبیر کے بعد کے کسی مرثیہ گو کا مرثیہ پڑھتے تھے اور اس میں مرثیہ گو کے اسلاف میں سے کسی کے بند یا بیت یا مصرع کی جھلک نمایاں ہوتی تھی تو فرماتے تھے ''کوئی بات نہیں، گھر ہی کا مال ہے''۔ ایسے صاحب نظر نے جب اثر جلیلی مرحوم کے مرثیہ ''برف نامہ'' پر اظہار خیال کیا جو ''عکس کربلا'' نامی ان کے مجموعہ مراثی میں شامل ہے تو جذبے پر ان کے مرثیہ سے پہلے صرف جناب چھنگا صاحب حسین کے مرثیہ کا ذکر کیا ہے۔ شمیم امروہوی صاحب کا کوئی مرثیہ اس موضوع پر ہوتا تو یقیناً ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا اور وہ چھنگا صاحب کے ساتھ ان کے مرثیہ کا بھی ذکر کرتے۔ میں ''عکس کربلا'' سے ان کی عبارت ذیل میں نقل کر رہا ہوں

> ''حضرت حر کے حال میں مرثیے کے چہرے میں انھوں (اثر جلیلی) نے کوئٹہ کی برف باری دکھائی ہے۔
>
> برف باری پر اردو میں ایک اور مرثیہ ہے اور خوب ہے۔ یہ مرثیہ میر صادق علی چھنگا حسین کا ہے (نام یوں لکھنا چاہیے تھا سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسین۔ سحر)۔ ان کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے مطلق نہیں تھے۔ مگر ان کے مرثیوں کو پڑھ کر ان کی طباعی پر

ایمان لانا پڑتا ہے۔ ان کا مرثیہ اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مرثیہ نگاروں نے اردو شاعری میں کتنا تنوع پیدا کر دیا اور اردو کا دامن ہر نوع کے مضامین سے مالا مال کر چکے ہیں"۔ (عکس کربلا)

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین صاحب جیسا صاحب نظر بھی شمیم امروہوی صاحب کے کسی ایسے مرثیہ سے واقف نہیں تھا جو انھوں نے جاڑے کے موضوع پر کہا ہو۔ ملحوظ رہے کہ انھوں نے اثر جیلی صاحب کے مرثیوں پر یہ اظہار خیال ۷ جولائی ۱۹۸۶ء کو کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک کسی کو شمیم صاحب کے اس مرثیہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔

شمیم امروہوی صاحب کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۱ء تک یعنی شمیم صاحب کے انتقال کے سینتیس برس بعد تک جب "اسرار حسن" شائع ہوئی، کسی کو بھی شمیم صاحب کے مبینہ جاڑے والے مرثیہ کے بارے میں کوئی خبر نہ ہوئی بلکہ ہلال نقوی صاحب کے مقالہ کی اشاعت یعنی شمیم صاحب کے انتقال کے قریب اسی بیاسی سال بعد تک بھی کسی پر یہ راز منکشف نہیں ہو سکا۔ حضرت نسیم امروہوی جن کے پاس اس مرثیہ کا ہونا بتایا گیا ہے وہ ۱۹۸۷ء کی ابتداء تک بقید حیات تھے اور پھر بھی اس مرثیہ کا وجود ایک راز رہا۔ یہ عجیب ماجرا ہے۔

## بحث کا منطقی نتیجہ:

ان سارے حقائق اور اس بحث کا ایک ہی منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حضرت شمیم امروہوی نے جاڑے پر کوئی مرثیہ کبھی بھی نہیں کہا۔ ہلال نقوی صاحب نے جس مرثیہ کو شمیم صاحب کے نام سے منسوب کیا ہے وہ ہرگز ان کا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس میں جاڑے کے بند الحاقی ہیں۔ بظاہر ان کے کسی خیر خواہ نے ان کی اور وطن کی محبت میں جھنگا صاحب کے مرثیہ سے بعد جاڑے کے کچھ بند نظم کر کے شمیم صاحب کے کسی مرثیہ میں شامل کر دیئے یا پورا

مرثیہ کہہ کر ان کے نام سے منسوب کر دیا تاکہ اس موضوع پر مرثیہ کہنے میں چھنگا صاحب حسینؔ کے مقابلہ میں ان کو اولیت کے شرف سے نوازا جائے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ ادبی بددیانتی کی بدترین مثال ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ ہلالؔ نقوی صاحب نے ہرگز ایسا نہیں کیا ہے۔ اس لیئے شمیمؔ صاحب کے اس پورے مرثیہ کا منظر عام پر آنا ضروری ہے، خود انھیں کی تحریر میں تاکہ ایسے تسامحات کی تصدیق یا تردید کی جا سکے۔ جب تک یہ نکات صاف نہیں ہوتے اس وقت تک ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کے اس دعوی کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ جاڑے پر پہلا مرثیہ شمیمؔ امروہوی نے لکھا۔

ہلالؔ صاحب نے اس مرثیہ کا جو بند اپنے مقالہ میں لکھا ہے وہ بقول خود ان کے شاعر آل محمد حضرت شمیم امروہوی مرحوم کے پاس مرثیہ زیر بحث کے ایک قلمی نسخہ سے اقتباس کیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس قلمی نسخہ کو ایک فوٹو کاپی کے طور پر شائع کر دیا جائے تاکہ رثائی ادب کے شائقین ایک ایسے اہم مرثیے سے روشناس ہو سکیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مقالہ کے صفحہ ۸۲ پر حضرت شمیمؔ امروہوی کی تحریر کا جو عکس عظیمؔ امروہوی صاحب کے کتب خانہ میں موجود شمیمؔ صاحب کے ایک مرثیہ سے اقتباس کر کے شائع کیا ہے وہ کسی کی خطی و رعموی تحریر کا عکس بھی نہیں ہے۔ واضح طور پر وہ کسی اچھے کاتب کی تحریر ہے۔ روزمرہ کی عمومی تحریر ایسی نہیں ہوتی۔ اس لیئے عکس ان کی اصلی تحریر کا شائع کرنا چاہیے تھا نہ کہ کتابت کا خواہ وہ کتابت انھیں کے ہاتھ کی ہو۔

## چھنگا صاحب حسینؔ اور مرزا فدا علی خنجرؔ:

ہلالؔ نقوی صاحب کے مقالہ میں چھنگا صاحب کے جاڑے والے مرثیے کے بارے میں مرزا فدا علی خنجرؔ کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس پر ایک زاویہ فکر سے گفتگو ہو چکی۔ اب اس قول کے ایک اور جزو کا جائزہ لینے کے لیئے اسے دہرا رہا ہوں۔

مرزا فدا علی خنجرؔ نے اپنے مضمون ''اردو کے ان پڑھ شاعر'' میں چھنگا صاحب کے اس مرثیے کے چند بند نقل کیے ہیں اور اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے ''اگرچہ یہ جدت خلاف

واقعہ ہے تاہم حسین کی مضمون طرازی طبیعت کا آئینہ ضرور ہے"۔ اس سلسلہ میں گزشتہ سطور میں "جدت" کے فن پر ایک نقطہ نظر سے اظہار رائے ہو چکا اب اس کے دوسرے رخ کو ملاحظہ کیجیے

جناب خنجر نے کہا ہے کہ "یہ جدت خلاف واقعہ ہے"۔ میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ مدینہ منورہ سے کربلا تک کا سفر پانچ مہینے سے کچھ زائد عرصہ میں طے ہوا تھا۔ امام باختلاف روایت ۲۸ رجب کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۲ محرم کو کربلا پہنچے۔ وہاں پہنچنے کا زمانہ شدید گرمی کا زمانہ تھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پانچ مہینے کے اس طویل سفر کے دوران موسم تبدیل نہیں ہوا ہوگا اور ابتدائے سفر میں یا اس سے کچھ بعد موسم سرما نہیں آیا ہوگا۔ اس لیے اس کو خلاف واقعہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔

چونکہ صاحب جدت نے اس مرثیہ میں مختلف منزلوں پر موسموں کے اختلاف کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ مدینہ سے روانگی پر لکھتے ہیں

اس طرح ملتا ہے مشہور کتابوں سے پتا
چوتھی شعبان کو رخصت ہوئے سب سے آقا

اس کے بعد:

فصل ایسی ہے کہ سردی کا زمانہ آخر
کہرا پڑنے سے نہیں دھوپ بھی ہوتی ظاہر

یہ اس سفر کی ابتدا تھی۔ اس سفر کا پہلا ختم مکہ معظمہ میں ہے

الغرض وارد کعبہ ہوئے جب شاہ امام

اس وقت موسم کیسا تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

اب وہ دن ہیں کہ جنھیں کہتے ہیں ایام بہار
ابتداء موسم گرما کی ہے اور دھوپ ہے بار
گرم چلتی ہے ہوا اٹھتا ہے جنگل میں غبار

ضو سے ذروں کی زمیں دشت کی ہے آتشبار
چادرِ خاک اسی آگ سے تو جلتی ہے
دوپہر ہوتی ہے جب، گرم ہوا چلتی ہے

موسموں کے اس تعین میں سو فیصد تاریخی حقائق سے مطابقت نہ بھی ہو تو بھی یہ حقیقت سے قریب ترین ضرور ہیں۔ اس لیئے جاڑے کے اس بیان کو خلاف واقعہ جدت نہیں کہا جا سکتا یہ تو تاریخ کے پس منظر میں موسموں کی تغیر پذیری پر ان کی عمیق نظر اور گہرے مشاہدہ کا ثبوت ہے۔ اب رہی جاڑے میں شدت کی بات تو سب جانتے ہیں کہ عراق و حجاز میں جتنی شدت سے گرمی پڑتی ہے اسی شدت سے سردی بھی پڑتی ہے۔ حضرت ظریف لکھنوی جب وہ میرے یہاں بطور مختار کار مقرر رہتے تھے تو سفر عتبات عالیات میں میرے والد گرامی جنت مکانی نواب مولوی سید اختر حسین صاحب مصور اعلی اللہ مقامہ اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ وہ بھی شامل تھے۔ اتفاق سے وہ زمانہ سردیوں کا تھا اور عراق وغیرہ میں بہت سخت سردی پڑ رہی تھی جو ان کی قوت برداشت سے زیادہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خاص رنگ میں ایک نظم لکھ کر لکھنؤ میں اپنے احباب کو بھجوائی۔ مبالغہ تو اردو شاعری کی جان ہے مگر اس کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے جس پر مبالغہ کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ ظریف صاحب کی نظم میں بھی شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ وہاں جاڑے کی شدت کا حال بڑے دلچسپ انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ یہ نظم ان کے دیوان "دیوان جی" میں یقیناً شامل ہوگی جو دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لیئے مرزا اوج اعلی تنجر کا یہ کہنا کہ یہ جدت خلاف واقعہ ہے قابل قبول نہیں ہے۔ البتہ جاڑے کی منظر نگاری میں مبالغہ کے عنصر و نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کے بغیر شاعری خصوصاً ایسی شاعری میں رنگ نہیں بھرے جا سکتے اور اسی سے شاعر کی قوت تخئیل و تخلیق کا پتہ چلتا ہے۔

## جاڑے کے بند:

اب اس مرثیہ زیر بحث سے جاڑے کے بند ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت مہذب نے

اہل نظر سے کہہ کہ "اس مرثیہ کا ایک ایک مصرع بغور پڑھیے اور لطف اٹھائیے"۔

جاڑے کے بندوں سے پہلے کا بند:

قافلہ چھوٹا سا وہ اور پُر آشوب سفر
منزلوں تک نظر آتی نہ کہیں شکل بشر
مار و اژدر کہیں پنہاں تو کہیں شیر کا ڈر
ساتھ بچے، کہیں گرمی کہیں سردی کا خطر
شہ کو پر فکر نہیں ردِ بلا کرنے کی
ہے خوشی وعدۂ طفلی کے وفا کرنے کی

اور اب جاڑے کے بند ملاحظہ ہوں:

فصل ایسی ہے کہ سردی کا زمانہ آخر
ہر پڑنے سے نہیں دھوپ بھی ہوتی ظاہر
برف باری سے نشیمن میں ہیں پنہاں طائر
زمزمہ کرنے سے بلبل کی زباں ہے قاصر

کیسا پرلطف مبالغہ ہے۔ کیا کہنا۔

دھیان آتا ہے تو جس سے جگر کانپتے ہیں
ایسی ٹھنڈی ہے ہوا جس سے شجر کانپتے ہیں

یہ [illegible] عجیب ہے۔ سبحان اللہ۔

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال
پ[illegible] سے زمیں ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں ہیں
اوس میں بھیگ کے شبنم کا برا ہے احوال

کیا بات کہی ہے۔ سبحان اللہ۔

چیں جو ہے بن میں، سب اس پہ بھی [illegible]

گر بشر کھائیں ہوا واں کی تو ہوں تن نیلے
آج تک ہیں اسی دن سے لبِ سوسن نیلے

یہ حسنِ تعلیل بھی خوب ہے۔ کیا کہنا۔

اوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں
طائروں کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں
انقلاب ایسا نہ آیا ہے تہہِ چرخِ بریں
بلبلیں بیٹھی ہیں لالہ کی انگیٹھی کے قریں

مصرع ہے کہ موتیوں کی لڑی، جدتِ خیال کا جواب نہیں۔ یہ شاعری کی معراج ہے۔ جزاک اللہ۔

بال و پر اوس سے بھیگے ہوں تو راحت کیسی
آتشِ گل میں برودت ہے حرارت کیسی
حکماء کو بھی ہے اب مہر کی حدت میں کلام
دھوپ بھی چاندنی کی طرح سے دیتی نہیں کام
بردِ اطرافِ بیاباں کی زمیں کو ہے تمام
سر کھلے رہتے ہیں، فواروں کو کیوں ہو نہ زکام

واہ واہ۔ مضمون آفرینی کا جواب نہیں۔ تخیل کا یہ کمال ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوسکتا۔

آب میں تھی جو روانی وہ تھمی جاتی ہے
دھار ہر ایک برودت سے جمی جاتی ہے
جامِ بلور بعینہ ہوا ہر ایک حباب
مچھلیاں پانی کے جمنے سے پھنسی ہیں تہہِ آب
ہیں شکنجے میں تو جنبش نہیں کھاتے گرداب
دانت بجتے ہیں گہر کے نہیں سردی کی جو تاب

جو حباب آب میں ہے غنچۂ سر بستہ ہے
اس پہ کیا آج تلک آب گہر بستہ ہے

کیا بیاں کیجئے اللہ رے سردی کا اثر
[illegible]
ہے حبابوں کا یہ عالم کہ اٹھاتے نہیں سر
[illegible]

[illegible]

پانی جم جانے سے موجہ تو کہاں اٹھتا ہے
منھ سے گرداب کے ہر بار دھواں اٹھتا ہے

برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید
وہ اسود تھا جو پہلے وہی سارا ہے سفید
[illegible]
سنگِ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید

پانی جمنے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج
[illegible]

بالکل نئی تشبیہ ہے۔ سبحان اللہ۔

[illegible]
برف باری سے ہیں سب باغ میں بیلیں پامال
ہیں سفید آج کے دن سنبل پیچاں کے بھی بال

یہ بھی تخیل ہے۔ سبحان اللہ۔

بس ہو تو دھوپ کی چادر میں لپٹ جائیں نہال

کیا عمدہ مصرع ہے۔ واہ

[illegible]

کونپلیں خوف سے سردی کے نہیں پھوٹتی ہیں

واہ وا پہلے مصرع میں تغزل کا حسن اور دوسرے میں حسنِ تعلیل کمالِ شاعری کا خوبصورت نمونہ ہیں۔

آج گل کانپتے ہیں دیکھ کے جو جو سوئے آب
دھوکا پانی کا انھیں دے کے ڈراتا ہے سراب
عقل کہتی ہے کہ سردی کی جولائے نہیں تاب
کرۂ نار کے پاس اٹھ کے گئے اس سے سحاب
مختصر یہ کہ برودت کی وہ ارزانی ہے
مہر کے ظرف میں بھی آگ نہیں پانی ہے

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

کچھ بھی حدت ہو تو سردی کا یہ عالم جائے
باغ سے اڑ کے ہر اک قطرۂ شبنم جائے
کانپنا مہر کا بھی وقت سحر تھم جائے
نہ جلیں دل، نہ رگِ گل میں لہو جم جائے

تغزل کا یہ حسن بھی قابلِ داد ہے۔

نالہ کش بلبل شیدا نہ رہے ایذا سے
پھوٹ کر بو نکل آئے گل سربستہ سے

واہ کیا کہنا

کیوں نہ عالم کے ہو ہر کام میں کہرے سے فتور
شب تیرہ سے سوا اس کا اندھیرا ہے ضرور
زمزمہ سنج اسی سے نہیں گلشن میں طیور
رات دن ایک ہوں تو عقل کا کیا اس میں قصور

روشنی غرب سے تا شرق نہیں پڑتے ہیں
رات اور دن میں کوئی فرق نہیں پاتے ہیں
قمریاں سرو پہ جاتی ہیں نہ بلبل سوئے گل
کوہیں جا کے چھپی ہیں تہہ زلف سنبل
کرۂ نار میں بھی نار نہیں اب بالکل
مشعل مہر درخشاں بھی ہوئی اس سے گل
سرد وہ دھوپ کی چادر ہے کہ جلتی ہی نہیں
آگ پتھر سے نکالو تو نکلتی ہی نہیں

کیا عمدہ بیت ہے۔ جزاک اللہ۔

جانور جانوں سے بیزار نظر آتے ہیں
برف کے دشت میں انبار نظر آتے ہیں
طرفہ دنیا کے کچھ آثار نظر آتے ہیں
یعنی بلور کے اشجار نظر آتے ہیں
بلبلیں باغ میں بیکار ہی اب روتی ہیں
برگ ہیرے ہے جو قطرے ہیں تو گل موتی ہیں

ایسی سردی میں چلے جاتے ہیں سلطان ہدا
وہ ہوا سرد، پُر آشوب وہ بٹ پڑ صحرا
جسم سُن ہو گئے ایسا ہے بہ شدت جاڑا
تیر کی طرح سے آتا ہے ہوا کا جھونکا
آج کل بارشِ شبنم سے زمیں گیلی ہے
ہے برودت کی یہ حد، جلدِ فلک نیلی ہے
راہواروں کی بھی سردی سے ہے اب کم رفتار
وہ بھی مضطر ہیں بلندی پہ ہیں جو ناقہ سوار

زرہیں بھیگی ہوئی، برف ہوئے ہیں ہتھیار
اینٹھتی ہیں تو کڑکتی ہیں کمانیں ہر بار

تخئیل کی بلندی کے ساتھ منظر نگاری کس عروج پر ہے۔ سبحان اللہ۔

جوہر تیغ گلابی ہوں تو دھانی ہو جائیں
تیر ترکش سے نکل آئیں تو پانی ہو جائیں

اٹھ نہیں سکتے ہیں سردی سے پیادوں کے قدم
تھرتھراتی ہیں، سنانوں کا ہے اب یہ عالم
لپٹے جاتے ہیں پھریروں کی رداؤں میں علم
برف کے بار سے تیغیں بھی ہوئی ہیں سب خم

تینوں مصرعے حسن تعلیل کی کیسی حسین مثال ہیں۔

لہر آتی نہیں ہے آب میں تلواروں کی
باگیں اینٹھی ہوئی ہیں بھیگ کے رہواروں کی

تخئیل نے کیسی قوت مشاہدہ سے کام لیا۔ اللہ اکبر۔

اوس پڑنے سے ہر اک شے ہے جہاں کی سیلی
پتیاں ڈھالوں کے پھولوں کی ہوئی ہیں نیلی
ہے پر از آب کھڑی دشت کی مٹی گیلی
ڈاٹیں کمروں کی کسی جاتی ہیں جو تھیں ڈھیلی

واہ وا۔ سبحان اللہ۔

بن میں سبزے پہ بچھے ہیں گل تر شبنم کے
کلغیوں میں فرسوں کی ہیں گہر شبنم کے

کیا اچھی فکر اور کیسی جدت خیال ہے۔ واہ وا!

تیز ایسی ہے ہوا جس سے لرزتے ہیں جگر

آگ پتھر سے نکالو تو نکلتی ہی نہیں
ڈالیں کمروں کی کسی جاتی ہیں جو تھیں ڈھیلی
کلغیوں میں فرسوں کی ہیں گہر شبنم کے

ان چند مصرعوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے کا یہ مطلب نہیں کہ بس یہی مصرعے لائق توجہ ہیں۔ جاڑے کے سارے بند آپ کی نظر میں ہیں اور سب بے نظیر ہیں۔ ایک ایک لفظ موتیوں میں تولے جانے کے قابل ہے۔

ان بندوں کے مطالعہ سے جناب چھنگا صاحب حسینؔ کے مرثیوں میں مرثیہ کے سارے اجزائے ترکیبی یعنی بہار، تغزل، منظر نگاری اور اس میں حسنِ تخیل اور جدت مضامین وغیرہ کا معیار پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں مزید مثالوں کی ضرورت نہیں۔ چونکہ ان کے اس مرثیہ میں ساقی نامہ اور رزمیہ وغیرہ نہیں ہے کہ ان کا موقع و محل نہیں تھا، اس لیے ان اجزائے مرثیہ کی مثالیں دوسرے مرثیہ سے پیش کرتا ہوں۔ ان سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ چھنگا صاحب نے صرف ایک ہی مرثیہ اتنا بلند پایہ نہیں کہا۔ ان کے دوسرے مرثیے بھی اسی معیار کے ہیں۔

**دوسرا مرثیہ:**

دوسرے مرثیے کے لیے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت ابوالفضل عباسؑ کے حال میں ہے۔ اس میں ۱۰۳ بند ہیں۔ ساقی نامہ اور رزمیہ بھی شامل ہے۔ اس کا مطلع ہے

جب شورِ آمد آمدِ مہرِ مبیں ہوا

صبح ہونے کے منظر کی شاعرانہ تصویر کشی اور بہاریہ بھی ان کے نمایاں خصوصیات ہیں

صبح ہونے کے منظر سے مرثیہ کا چہرہ کھلتا ہے۔ ابتدا کے چند بند ملاحظہ ہوں

جب شورِ آمد آمدِ مہرِ مبیں ہوا
ہم رنگِ خونِ شفق سے سپہرِ بریں ہوا
کافورِ صبح غازۂ روئے زمیں ہوا

ذرہ ہر ایک غیرتِ ذرِ شمس ہوا

بے نور ماہتاب کا خالی ایاغ ہے
ذرہ ہر ایک اب گہرِ شب چراغ ہے

پورا بند ملاحظہ کیجیے۔ خاص طور سے بیت اور سب سے بڑھ کر چھٹا مصرع:

جب صبحِ شامِ غم کا فلک پر ہوا ظہور
مشرق سے جلوہ گر ہوا ناگاہ خطِ نور
تارہ سحر کا ہو گیا ضو میں چراغِ طور
صحرا میں روشنی ہوئی اک بار دور دور
سبزہ میں لہر آنے لگی آب جو کی طرح
سرخی شفق کی پھوٹ کے نکلی لہو کی طرح

سبحان اللہ۔

ذیل کے بند میں چوتھا مصرع اور بیت داد طلب ہے۔

دریائے نور میں جو تلاطم ہوا عیاں
چھپنے لگی نگاہ سے بس نہرِ کہکشاں
دھارا بہا نسیمِ سحر کا جو ناگہاں
گردوں پہ ڈوبنے لگیں تاروں کی کشتیاں

کیا عمدہ تخئیل ہے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

سرکا جو ابرِ تیرۂ شب، آسماں کھلا
جنبش جہازِ نور نے کی، بادباں کھلا

کیا عمدہ بیت ہے جزاک اللہ۔

یہ پورا بند قابلِ داد ہے۔

سب اوس میں کھڑے ہیں نہائے ہوئے شجر

زیور پہن کے پھولوں کا پھولے ہیں رات بھر
پتے لیئے ہوئے ہیں کفِ دست پر گہر
نرگس کی ان کی سمت ہے جادو بھری نظر
پہنچا ، بہار آنے کی جس کو خبر لگی
نیلے وہ پھول ہو گئے جن کو نظر لگی

پورا بند تغزل کا کیسا خوبصورت نمونہ ہے۔ سبحان اللہ۔

رکھتی نہیں صبا بھی قدم آن سب اصول
لپٹی ہوئی ہیں شاخوں سے بیلوں کا ہے یہ طول
خوش پھر رہی ہیں بلبلیں ، اصلا نہیں ملول
مرجھا گئیں آہ ، رہ سے نازک ہیں ایسے پھول

کیا حسنِ تغزل ہے۔ واہ وا۔

مہکا وہیں ہوا نے جو دامن کو چھو دیا
شبنم کے بار سے رگِ گل نے لہو دیا

یہ نازک خیالی ہے۔ سبحان اللہ۔ تغزل کا [illegible] ہے۔

یہ بند بھی آپ سے دادطلب ہے۔ ملاحظہ ہو:

شفاف و صاف آب ہے دریا کا اس قدر
بطنِ صدف میں صاف نظر آتے ہیں گہر
منہ دیکھتے ہیں آئینۂ آب میں شجر
پانی میں لطف دیتے ہیں ڈوبے ہوئے ثمر

بیت ملاحظہ ہو:

آلودۂ غبار تھے جو پھل وہ دھو گئے
جن کے مزاج گرم تھے وہ سرد ہو گئے

کیا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔ لطفِ زبان اور حسنِ بیان دونوں کی داد نہیں دی جا سکتی۔

یہاں سے گریز ہے۔ چوتھا مصرع اور بیت:

اے نہر تشنہ لب ہے ید اللہ کا پسر

کام آئی تو نہ فاطمہؑ کے نورِ عین کے

پیاسے ہیں تین روز سے بچے حسینؑ کے

پھر نمازِ صبح کا وقت ہوتا ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے رفقاء تلاوت کے بعد نمازِ صبح ادا کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔ بیت ہے:

مانگی اذاں کے بعد دعا جھوم جھوم کے

قرآں سبھوں نے بند کیے چوم چوم کے

کیسی ایمان افروز اور وجد آور بیت ہے جو ان خاصانِ خدا کی عبادت کا تقدس اور پاکیزگی مجسم کر کے نظروں کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ جزاک اللہ۔

اس کے بعد دن نکل آیا۔ فوجِ خدا کا علم بن گیا۔ اس موقع کا بند ہے

ظاہر ہوا فلک پہ جو خورشیدِ خاوری

میداں میں پھیلی دھوپ کی زردی ذری ذری

سونے کا اک ورق تھا، نہ تھا چرخِ چنبری

کمریں کسے ہوئے تھے جوانانِ حیدری

عالم نیا نظر جو پڑا تحت و فوق میں

اور یہ مصرع ملاحظہ ہو:

چہروں کا نور بڑھ گیا مرنے کے شوق میں

کیا کہنا۔ جذبۂ ایثار و سرفروشی کا کیسا دلکش بیان ہے۔

اس کے بعد جناب عباسؑ کی رخصت ہے۔ اختصار کے خیال سے میں رخصت کے بند درج نہیں کر رہا ہوں۔ اب ساقی نامہ کے چند بند

ساقی ، میں جھومتا ہوا آتا ہوں لا شراب
بھر بھر کے جام سرخ میں مجھ کو پلا شراب
جس سے لہو جگر کا بڑھے وہ دوا شراب
کوثر میں سلسبیل کی بھی کچھ ملا شراب
مداح ہوں ترا مجھے انعام چاہیے
دو آتشہ شراب کے دو جام چاہیے

کیا پُر کیف بند ہے۔ سبحان اللہ۔

اس مے کا میں ازل سے ہوں شوقین ساقیا
طوبیٰ کی چھاؤں میں ہے جو ساغر وہی اٹھا
خالی جو ہیں رکھے ہوئے ، بھر کر وہی اٹھا
جس کو رسولؐ پیتے تھے اکثر ، وہی اٹھا
رکھے ہوئے ہیں جو لبِ کوثر ، وہی اٹھا
تو نے دوا نہ کی جو مرے اضطراب کی
تارِ نظر سے روح کھنچے گی شراب کی

ساقی نامہ میں سات بند ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں نے صرف ایک دو بند نمونتاً پیش کیے۔ آٹھویں بند سے رزمیہ کی طرف گریز ہے۔

ہاں مے پلائی تو نے لہو دل کا بڑھ گیا
ساقی بس اب نجف سے میں جاتا ہوں کربلا

اور اب:

وہ چمکی ، وہ گری وہی بجلی سپاہ پر
سرخی سے خوں کی آگ لگی وہ اِدھر اُدھر
وہ جل گئے سیاہ پھریرے ، گردِ نظر

اٹھا وہ دودِ آہ ، وہ اڑنے لگے شرر
دھاریں چلیں وہ خوں کی وہ زخمی گلے ہوئے
گرنے لگے زمیں پہ وہ نیزے جلے ہوئے

قہرِ خدا ہے ، تیغ کے جوہر ہیں آتشیں
پرتو سے اس کے رن کی دہکنے لگی زمیں
برقِ طپیدہ کیوں نہ کہیں اس کو اہلِ کیں
ہے سب کہیں پہ دشت میں اور پھر کہیں نہیں
اس میں چمک وہ ہے کہ مہہ نو بھی ماند ہے
جب گر پڑی تو برق ہے ، اٹھی تو چاند ہے

سبحان اللہ۔

غضب کی کارزار میں زمیں سے غبار اٹھ رہا ہے

وجہ:

گیتی سبک ہو جلد ، اٹھا اس لیئے غبار

بیت

ہرگز فلک پہ ابر نہیں یہ دھواں نہیں
اب چھ طبق زمین کے ہیں ، ساتواں نہیں

کیا عمدہ بات کہی ہے۔ سبحان اللہ۔

میدان کارزار کی حالت۔ چاروں مصرعوں میں رزمیہ کا زور دیکھیے

اٹکل پہ بھاگے جاتے ہیں جنگل میں راہوار
واں مفت ہاتھ آرہے ہیں شیر کو شکار

کیا حسن زبان ہے۔ سبحان اللہ۔

تیغیں لگا کے فوج کا ستھراؤ کر دیا

سقے نے خوں کا دشت میں چھڑکاؤ کر دیا

چاروں مصرعے بے مثال ہیں۔ کیا کہنا۔

پائی جو راہ شیر نے ، دریا پہ جا پڑا
روکے تھے گھاٹ جو ، انھیں اعدا پہ جا پڑا
فسر کو مار کر صفِ ہیجا پہ جا پڑا
ٹھہرے جہاں شریر اسی جا پہ جا پڑا

اس مصرعے میں تکرار لفظی نے کیسا مزہ دیا۔ واہ وا۔

ہلچل نہ کس طرح ہو عدو کی سپاہ میں
دریا لہو کا بازو پہ ہے رزم گاہ میں

یہ بیت بھی ملاحظہ ہو:

کتنی کمانیں توڑ کے صحرا میں پھینک دیں
تو ریں چھین چھین کے دریا میں پھینک دیں

اور آخر میں:

مقتل میں آ رہی ہے یہ اک شیر کی صدا
یوں نہر چھین لیتے ہیں اے فوجِ اشقیا

اس کے بعد شہادت اور بیانِ مصائب:

اب سنیے حال وہ کہ ہو ٹکڑے دل و جگر
ناگاہ ایک گرز لگا فرقِ پاک پر
تیورا کے گر پڑا اسد اللہ کا پسر
آواز دی کہ آئیے یا شاہِ بحر و بر
مشتاق ہوں زیارت شاہِ انام کا
دیدارِ آخری بھی میں دیکھوں امام کا

آئی یہ کان میں شہِ مضطر کے جب صدا
اکبرؔ کو ساتھ لے کے بڑھے سوئے اشقیا
پہنچے قریب نہر کے جب شاہِ کربلا
دیکھا کہ خوں میں لوٹ رہا ہے وہ مہ لقا
رخسار پر تھے اشک شہِ تشنہ کام کے
اکبرؔ قریب بیٹھ گئے دل کو تھام کے

یہ مصرع پورا مرثیہ ہے۔

زانو پہ سر کو رکھ کے یہ پھر پیار سے کہا
عباسؑ اپنا حال کہو ہم سے بھی ذرا
ہم بھی تو یہ سنیں کہ ہوئی تم پہ کیا جفا
کھولو تو آنکھ اے پسرِ شیرِ کبریا
بیتاب تم بہت تھے ہماری جدائی سے
اب عرضِ حال کیوں نہیں کرتے ہو بھائی سے

پھر منہ پہ منہ کو رکھ کے یہ بولے شہِ ہدا
عباسؑ تم نے بھائی نہ مجھ کو کبھی کہا

اور بیت

آخر میں کچھ دعائے دلِ بے دیار لو
اک بار بھائی کہہ کے بھی ہم کو پکار لو

اور آخری بند:

بس اے حسینؑ غم سے جگر اب ہے آب آب
یاد آرہا ہے شاہؑ کے بچوں کا اضطراب
اعداء پہ کربلا میں نہ نازل ہوا عذاب

ان سب پہ ظلم کرتے تھے وہ خانماں خراب

دریا تھا پاس اور ترستے تھے آب کو

پانی تو دیتے آلِ رسالتمآب کو

یہاں یہ مرثیہ تمام ہوا۔ پورے مرثیہ میں ایسے ایسے بند اور بیتیں ہیں کہ پڑھ کر روح وجد کرتی ہے مگر طوالت سے بچانے کے لئے میں نے صرف ادھر ادھر سے کہیں ایک مصرع، کہیں بیت اور کہیں ضرورتاً پورے پورے بند بھی نقل کیے۔ اس سے قارئین بہر حال ان کے فکر و فن کی بلندی، زورِ سخن اور لطفِ زبان و بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت حسینؑ کا ایک اور معرکہ آراء مرثیہ:

جناب چھنگا صاحب حسینؔ نے ایک مرثیہ میں طوفانِ نوحؑ نظم کیا ہے اور قلم توڑ دیئے ہیں۔ کسی اور نے آج تک طوفانِ نوحؑ نظم نہیں کیا۔ اس مرثیہ کی ایک بیت لکھنؤ میں اب بھی ان حضرات کے زبان زد ہے جنھوں نے یہ مرثیہ خود ان سے سنا یا سننے والوں سے یہ بیت سنی۔ طوفانِ نوحؑ میں پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی گزر گیا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت نوحؑ کا نافرمان بیٹا جو باپ کی خواہش کے خلاف ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا تھا کہ طوفان کا پانی یہاں تک نہیں آ سکتا، اس کو بھی پانی کی موجیں بہا لے گئی تھیں۔ اس طوفان میں موجوں کی بلندی اور پانی کی گہرائی ظاہر کرنے کے لیے چھنگا صاحب نے یہ بیت کہی

ٹکرا رہا تھا مہر بلندی سے آب کی

پانی کو ناپتی تھی کرن آفتاب کی

جتنی بلندی موجوں کی تھی، انسانی امکان میں اتنی ہی بلندی اس تخیل کی ہے۔

میں نے ایک ناواقف رموزِ سخن محقق کو یہ بیت سنائی تو انھوں نے یہ فرمایا کہ یہ تو ایک غزل کا مطلع ہے۔ میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس بیت کو غزل کا مطلع کہنا سخن فہمی کا شاہکار ہے۔ میرے اظہارِ حیرت پر انھوں نے فرمایا کہ ان کے پاس وہ کتاب موجود ہے جس میں یہ غزل چھپی ہوئی ہے۔ مگر وعدوں کے باوجود وہ کتاب مجھے نہیں دکھا سکے۔ پھر انھوں نے یہ

حکم بھی لگایا کہ چھنگا صاحب نے کسی مرثیہ میں طوفانِ نوحؑ نظم ہی نہیں کیا۔ کیا معرکہ کی تحقیق ہے۔ شاعر آلِ محمدؐ حضرت نسیم امروہوی مرحوم نے جو میرے خاندان یعنی خاندان اجتہاد سے کوئی انس نہیں رکھتے تھے، خود مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ جیسا طوفانِ نوحؑ چھنگا صاحب حسینؔ نے نظم کر دیا کوئی کر نہیں سکتا۔ اس مرثیہ کی تو اتنی شہرت ہے کہ اس سے انکار کرنے والے کے متعلق لوگ اچھی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ افسوس یہ ہے کہ میری حتی المقدور کوشش کے باوجود یہ مرثیہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حسینؔ صاحب کی اولادِ نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا سارا کلام تلف ہو گیا۔ مگر شمس الادباء جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمسؔ مدظلہ العالی نے اپنی معروف کتاب ''تاریخ لکھنؤ'' میں اس مرثیہ کے وہ چند بند درج کیے ہیں جو ان کو زبانی یاد تھے۔ میں وہ بند یہاں درج کر رہا ہوں تاکہ جو کچھ دستیاب ہے وہ محفوظ ہو جائے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کتاب ''تاریخ لکھنؤ'' آج سے کوئی اٹھائیس سال قبل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج کی بات نہیں ہے کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ بند وغیرہ اس میں بعد میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت شمسؔ مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''(چھنگا صاحب نے) ایک مرثیہ میں طوفان نوحؑ نظم کیا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں

جس جس جگہ تھی ریت وہاں دھارے ہو گئے
بہتے ہوئے حباب بھی تیارے ہو گئے
ذرے زمیں کے ٹوٹے ہوئے تارے ہو گئے
ابھرے رہے جو نخل وہ فوارے ہو گئے
ملتی تھیں موجیں عرش معلیٰ کے کاخ سے
کونپل کے بدلے دھار نکلتی تھی شاخ سے

کیا کہنا۔

تھا جو کہیں اتار زمیں کا کہیں چڑھاؤ
پانی کا اس سبب سے نہ تھا ایک سا بہاؤ

ٹھہرے ہوئے میں تھا خس و خاشاک کا جماؤ
اور زور تھا جہاں پہ وہاں کوہ بھی تھے ناؤ
پھر بھی انقلاب نیا اک دکھا گئے
مغرب کے جو پہاڑ تھے مشرق میں آ گئے

ایسے طوفان کے بیان میں یہ مضامین کو مبالغہ نہیں کہہ سکتے۔

میدان سارے غرق تھے اور سبزہ زار غرق
کیا ذکر ہے مکانوں کا، تھے کوہسار غرق
بڑھتا جو اور، ہوتی جہنم کی نار غرق
المختصر تھی ہستیِ ناپائدار غرق
یہ وجہ تھی جو موت ہر اک کو پسند تھی
راہ عدم نہ ہوتی تو ہر راہ بند تھی

مضموں آفرینی کی اس قوت اور بلندیِ فکر کی داد نہیں دی جا سکتی۔ سبحان اللہ۔

ڈوبے ہوئے تھے آب میں اس طرح کوہسار
جس طرح سنگریزے ہوں ہر تہہ میں آشکار
قہرِ خدا محیط تھا، موجیں تھیں بے قرار
تھے مچھلیوں کے واسطے گرداب کے حصار
تھرا رہا تھا مہر بلندی سے آب کی
پانی کو ناپتی تھی کرن آفتاب کی"

(تاریخ لکھنؤ ص ۷۴۹-۷۵۰)

حضرت شمس نے "تھرا رہا تھا مہر" لکھا ہے۔ میں نے لکھنؤ میں "کمر رہا تھا مہر" سنا تھا۔ ہلال نقوی صاحب نے اپنے مقالے میں حضرت نشتر نقوی مرحوم کے حوالے سے اس بیت کا صرف مصرعِ ثانی لکھا ہے۔ مصرعِ اولیٰ نہیں لکھا۔ بہر حال چونکہ حضرت شمس مدظلہ نے پہنچا

صاحب کو متعدد بار سنا۔ ان کی مجالس میں شریک ہوئے حتیٰ کہ ان کے انتقال پر ان کے دفن میں بھی شریک ہوئے اور وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا اس لیئے ان کی بات اور ان کی یادداشت زیادہ بھروسے کے قابل ہے۔ ویسے بھی مصرع دونوں طرح چست و درست ہے۔

اس مرثیہ کے متعلق ہلال نقوی صاحب نے حضرت تاثیر نقوی مرحوم کا یہ قول اپنے مقالہ میں درج کیا ہے کہ:

> "وہ (چھنگا صاحب) عشرۂ محرم سلیم پور میں پڑھتے تھے۔ راجہ صاحب نے اصرار کیا کہ وہیں نیا مرثیہ کہیں اور اس میں جناب موسیٰ کا دریائے نیل عبور کرنا اور فرعون کی غرقابی کا حال بھی نظم کیا جائے۔ ان کا یہ مرثیہ ان کے چند یادگار مرثیوں میں سے ایک ہے۔ یہ مرثیہ میں نے ان سے امام باڑہ سوداگر میں سنا۔ رود نیل کی گہرائی کا جس بند میں بیان ہے، بند کا آخری مصرع اب تک دل پر نقش ہے۔ فرماتے ہیں 'پانی کو تاپتی تھی کرن آفتاب کی'"۔

یہ بیان بادی النظر میں محل نظر ہے۔ بیشک حضرت تاثیر نقوی اعلی اللہ مقامہ بھی خاندان اجتہاد کے ایک بزرگ تھے مگر ان کا اس مرثیہ کو حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعہ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ جب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فرعون اور اس کے لشکر سے بچنے کے لیئے دریائے نیل تک پہنچے تو دریا عبور کرنے کا مسئلہ درپیش آیا۔ حضرت موسیٰ نے حکم خدا پانی پر اپنا عصا مارا اور قدرت خدا سے اسی وقت دریا کا پانی داہنے اور بائیں طرف دو حصوں میں بٹ گیا جس کے درمیان راستہ بن گیا اور حضرت موسیٰ معہ اپنے ساتھیوں کے اس راستہ پر چل کر دریا کو عبور کر گئے۔ اتنی دیر میں فرعون کا لشکر بھی ان کا پیچھا کرتا ہوا اسی مقام پر پہنچا اور اسی راستہ سے دریا عبور کرنے لگا۔ مگر جب وہ لوگ بیچ دریا میں پہنچے تو خدا کے حکم سے دریا کا پانی پھر برابر ہو گیا اور فرعون اور اس کا پورا لشکر دریائے نیل میں غرق ہو گیا۔ یہ کہیں نہیں ہے کہ دریا میں کوئی بہت بڑا طوفان آیا ہوا تھا اور پانی کی موجیں آسمان سے ٹکرا رہی تھیں اس لیئے مرثیہ کو واقعہ فرعون و موسیٰ سے متعلق

کرنا درست نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت تاثیر نقوی نے یہ بیان کیوں دیا۔ غور کرنے سے یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت تاثیر نقوی مرحوم کی عمر چھنگا صاحب کے انتقال کے وقت صرف دس گیارہ برس کی تھی۔ ان کی ولادت ۱۹۲۰ء میں اور چھنگا صاحب کی وفات ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی۔ جب تاثیر صاحب نے یہ مرثیہ ان سے سنا ہوگا ان کی عمر اس سے بھی کم ہوگی۔ اس کے علاوہ انھوں نے چھنگا صاحب سے اور مرثیے بھی سنے ہوں گے۔ چنانچہ بچپن کی یادداشت نے دو تین مرثیوں کو خلط ملط کر دیا۔ اس طرح طوفان نوح اور موسیٰ و فرعون کے دونوں مرثیوں میں ان کی یادداشت الجھ کر رہ گئی۔ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ مذکورہ بیت طوفان نوح کے مرثیہ ہی کی ہے۔

## حضرت حسین کی زود گوئی اور قوت نظم

بہرحال تاثیر نقوی صاحب کے اس بیان سے حضرت حسین کی زود گوئی اور قوت نظم کی بھی تصدیق ہوئی کہ چھنگا صاحب کی پوری فرمائش پر جو یقیناً حضرت حسین کا امتحان لینے کے لیے ہوگی، انھوں نے دس دن میں مقرر کردہ موضوع پر مرثیہ بہ سہولت پیش کر دیا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ ساری گفتگو اور ان کے مرثیوں کے اقتباسات دیے جانے کے بعد ان کی مرثیہ گوئی پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل نظر خود اس کے متعلق اندازہ اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کر کے بحیثیت مرثیہ گو ان کے مرتبہ و مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔ البتہ ضرور کہوں گا کہ رثائی ادب کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ چھنگا صاحب کے بیشتر مرثیے ان کے دوسرے کلام کی طرح تلف ہو گئے۔ جن میں طوفان نوح والا عظیم مرثیہ بھی شامل ہے۔ مجھے یقین ہے یہ مرثیہ کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ جن صاحب کے پاس بھی ہو اگر وہ اسے منظر عام پر لے آئیں تو یہ رثائی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوگا اور ادب کی زبردست خدمت ہوگی۔

## سلام گوئی:

حضرت شمس لکھنوی مدظلہ العالی نے چھنگا صاحب حسینؔ کے ذکر میں "تاریخ لکھنؤ" میں لکھا ہے کہ:

"(چھنگا صاحب) غزل، قصیدہ، مرثیہ سب کہتے تھے۔ آخر میں صرف مرثیہ کہتے تھے"۔ (تاریخِ لکھنؤ ص۴۷۹)

مرثیہ کے ذوق کی بناء پر سلام گوئی کا بھی ان کو شوق تھا۔ مشاعروں کی طرح مسالمے بھی طرحی ہوتے تھے۔ جن میں حضرت حسینؔ برابر شریک ہوتے تھے۔ یوں تو ان کے دوسرے کلام کی طرح ان کے سلام بھی تلف ہو گئے مگر خوش قسمتی سے ایک مجلس کے رقعہ میں ان کے دو سلام شائع ہو گئے تھے جو باقی رہ گئے ہیں۔ رقعہ کا عنوان ہے "رقعہ مجلس امام انام بہ گلدستہ سلام"۔ یہ رقعہ کا تاریخی عنوان ہے۔ اس سے ۱۳۳۹ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ خطیب اعظم ملک الناطقین مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کے خطاب کی یہ مجلس سلطنت منزل، حامد روڈ لکھنؤ میں منعقد ہوتا تھی۔ بانیان مجلس میں سید ارشاد حسین خاں عرف راجہ نواب اور سید مہدی حسین خاں عرف سکندر نواب پسران نواب حامد حسین خاں کے نام ہیں۔ مجلس کی تاریخ ۲۴ صفر ۱۳۴۵ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سلسلہ مجالس ۱۳۳۹ھ میں قائم ہوا اس لیئے کہ رقعہ کے عنوان سے یہی تاریخ نکلتی ہے اور سال کے سال اسی عنوان سے مجالس کے رقعہ چھپتے رہے۔ اس میں حسینؔ صاحب کے علاوہ اور بھی تین چار شعراء کے سلام شامل ہیں۔ الحمد اللہ کہ اس رقعہ کی عکسی نقل میرے پاس محفوظ ہے۔ جناب ڈاکٹر سید سکندر آغا نے بھی مرزا اوجؔ پر اپنے مقالے میں اسی رقعہ کے حوالہ سے چھنگا صاحب کا ایک سلام شامل کیا۔ ایک اور بات جو ان کے مقالہ سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ وہ مسالمہ جس کیلیئے یہ سلام کہا گیا وہ ۱۹۲۰ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور اس کا مصرع طرح حسب ذیل تھا۔

## دے دیا سر راہِ حق میں حضرت شبیرؑ نے

یہ مسالمہ حضرت وحیؔ کے انتقال کے بعد منعقد ہوا تھا۔ اس مسالمہ میں عہد اوجؔ کے ممتاز شعرا شریک ہوئے تھے جن میں جناب چھنگا صاحب حسینؔ بھی شامل تھے۔ ان کا سلام ملاحظہ ہو

دور سے مانگی اماں ہر ظالم بے پیر نے
پیاس کی شدت میں وہ نعرے کیے شبیرؑ نے

سامنے قاصد کے شہ بیٹھے کلیجہ تھام کر
وہ اثر دل پر کیا بیمار کی تحریر نے

ضعف کی شدت، گلے میں طوق بیڑی پاؤں میں
راہ طے کی ہوگی کیوں کر عابدِ دلگیر نے

گود سے بانو کی لے کر جب چلے میداں کی سمت
نرگسی آنکھوں سے دیکھا شاہ کو بے شیر نے

اے حسینؔ ایسا بھی حیدرؑ نے کیا تھا ایک وار
دم لیا تھا جب پرِ جبریلؑ پر شمشیر نے

اسی رقعہ میں حضرت حسینؔ کا یہ دوسرا سلام بھی شامل ہے۔ ملاحظہ ہو

شہ چلے ہیں رن میں تیغیں تیر کھانے کے لیے
امتِ محبوبِ حق کو بخشوانے کے لیے

ظالمو، جن سے کہ ہے پرنور قبرِ مصطفیٰؐ
آئے ہو تم ان چراغوں کو بجھانے کے لیے

زرد ہے رنگ رخ کا کانپتے ہیں دونوں ہاتھ
شہ چلے ہیں لاشِ اکبرؑ یوں اٹھانے کے لیے

بابِ خیبر کو تکاں دے کر یہ کہتے ہیں علیؑ
در کیا یوں بند قوت آزمانے کے لیے

خواب گہہ میں صبحِ عاشورا کے ماں نے یہ کہا
دو اذاں اکبرؑ، میں آئی ہوں جگانے کے لیے

وقتِ آخر کیوں نہ بڑھ جاتا علی اصغرؑ کا حسن
تیر کھایا تھا گلے پر مسکرانے کے لیے

چل رہی ہے ذوالفقارِ حیدری خندق پہ
آئے ہیں جبریلؑ پر اپنے بچانے کے لیے

خیمۂ عصمت میں سب روتے ہیں اک کہرام ہے
عون و جعفرؑ آئے ہیں مقتل میں جانے کے لیے

تربتِ اصغرؑ کے تر کرنے کو تھے اشکِ حسینؑ
اور آہوں کا دھواں تھا شامیانے کے لیے

کہتے تھے عباسؑ فوجِ شام سے للکار کر
روک لو آئے ہیں ہم دریا پہ جانے کے لیے

مصطفیٰؐ کو نذر کیا دے گا جناں میں اے حسینؔ
رو غمِ شبیرؑ میں موتی بنانے کے لیے

حضرت حسینؔ کے یہ دو سلام ہی اس صنفِ سخن میں ان کے طرزِ فکر اور قدرتِ کلام کا

بین ثبوت ہیں۔ زبان کی سادگی، لفظوں کا برمحل استعمال، حسب موقع مضامین میں جدت اور کربلا کی الم انگیز فضا کے اندر رہتے ہوئے خیال آفرینی کے ساتھ مصرعوں کی برجستگی اور روانی سلام گوئی کے سارے تقاضے پورے کرتی ہے اور سلاموں کو ایک اعلیٰ عزائیہ معیار اور اثر عطا کرتی ہے۔

## رباعیات:

سلام گوئی کی طرح چھنگا صاحب نے رباعیات بھی بڑی تعداد میں کہی تھیں۔ مگر افسوس کہ ان کی ایک بھی رباعی دستیاب نہیں ہے۔

## غزل گوئی:

غزل گوئی بھی حضرت حسینؔ کا خاص مشغلہ تھا لیکن دوسرے سارے کلام کی طرح ان کی غزلیں بھی اب ناپید ہیں۔ ان کی غزل کا صرف ایک شعر حضرت شمسؔ مدظلہ العالی کو یاد ہے اور اتفاق سے وہی ایک شعر حضرت مہذبؔ نے بھی ان کے حالات میں درج کیا ہے۔

حضرت مہذبؔ ''اذکار محسن'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''استاد کی شفقت اور اپنی طبیعت داری کی بدولت غزل اور مرثیہ دونوں میں مہارت حاصل ہوگئی۔ اختصار کے پیش نظر صرف ایک شعر غزل کا ملاحظہ ہو جس سے ان کے زور طبیعت کا اندازہ ہو جائے گا

کھینچا ہے جو ناوک تو سرک جاؤ ادھر سے
اب خون نہیں آگ نکلتی ہے جگر سے

(اذکار محسن ص ۳۹)

بے شک یہ ایک شعر ہی ان کی غزل گوئی کے تیور بتا دیتا ہے اور ندرت فکر اور شدت احساس کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔

کاش شعر و ادب کا اتنا بڑا سرمایہ ضائع نہ ہوتا اور آج اردو کا دامن ان گہر ہائے آبدار سے خالی نہ ہوتا جو اس کے طرۂ دستار فضیلت میں در شہوار کی طرح چمکتے دکھتے۔

## وفات:

جیسا کہ حضرت حسین کی تاریخ ولادت کی بحث کے سلسلہ میں لکھا جاچکا ہے کہ ان کی وفات ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی اور وہ خاندان کے امام باڑہ غفراں مآب میں دفن ہوئے جس کے چشم دید گواہ جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی ہیں جو ان کے دفن وکفن میں شریک تھے۔ جناب مولانا آغا مہدی صاحب کا قول بھی درج کرچکا ہوں کہ پھنگا صاحب کی وفات ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ بظاہر عیسوی اور ہجری سنین سے مطابقت میں چند روز یا چند ماہ کے فرق سے دونوں بیانات میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کا فرق آگیا۔

اس طرح آسمانِ شعروادب کا یہ آفتاب بے مثال منزل حد کمال کو پہنچ کر قبر کی تیرگی میں ڈوب گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

# بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف وعظ

حضرت غفرانمآبؒ کے وقت میں نواب آصف الدولہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ انھیں بھنگ سے بہت رغبت تھی۔ حضرت غفرانمآبؒ نے عراق و ایران سے واپسی کے بعد مواعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک دن سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں وزیر اعظم اودھ مجلس وعظ میں آصف الدولہ بہادر کو بھی لے آئے اور حضرت غفرانمآبؒ سے چپکے سے کہا کہ وہ (آصف الدولہ) بھنگ کے عادی ہیں۔ لہٰذا آپ اس کے متعلق کچھ نہ کہئے گا۔ لیکن اس دن حضرت غفرانمآبؒ نے مسکرات (نشہ آور چیزوں) کی حرمت ہی پر وعظ فرمایا۔ آصف الدولہ کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ رہ رہ کے اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتے تھے۔ وزیر اعظم کی نظر ان پر تھی۔ دل میں سہمے لگے ہوئے تھے کہ دیکھیے خدا آج کیا دکھاتا ہے۔ ابھی موعظہ تمام نہ ہوا تھا کہ آصف الدولہ نے بلند آواز سے کہا کہ بابا جان کے سر کی قسم جو آج سے بھنگ کو منھ لگایا ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غفرانمآبؒ کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا جو دلوں کو بدل سکتا تھا اور وہ دل دیا تھا جو سوا خدا کے کسی سے نہ ڈرتا تھا۔

(تاریخ لکھنؤ از حضرت شمس، ص ۳۱۰)

لسان الشعراء حضرت شاعرؔ اجتہادی لکھنوی
۱۸۸۹ء تا ۱۹۵۷ء
(مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للّن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ)

عطیہ: برادرم سید کلب ہادی صاحب قبلہ مرحوم
خلف عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ ذاکر شام غریباں

تذکرے نور کے مٹ جائیں گے گر مرثیہ میں
آگ لے لے کوئی بجھتی ہوئی چنگاری سے

رباعی:

پیری نے دیا عجب ٹھکانہ مجھ کو
ناچیز سمجھتا ہے زمانہ مجھ کو
کل آئینہ کہتا تھا قسم دے دے کر
غیرت ہو تو اب منھ نہ دکھانا مجھ کو
(شاعر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لسان الشعرا حضرت شاعرؔ لکھنوی

## نام و نسب:

اسم گرامی سید اولاد حسین صاحب۔ عرفیت مولوی للّن صاحب۔ تخلص شاعرؔ۔
القاب لسان الشعرا، سید الواعظین اور خطیب اکبر۔

## نسب:

سید اولاد حسین صاحب خلف ذو العلم جناب سید فرزند حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ، ابن میر وارث حسین صاحب مرحوم (برادر نسبتی استاد الاساتذہ حضرت فاخر اعلی اللہ مقامہ) میر وارث حسین صاحب کے فرزند حضرت فاخر، حضرت فاخر کے بھانجے اور خاندان اجتہاد کے جید عالم مجتہد اور فقیہ، فقیہ اہلبیت علیہم السلام، مولانا سید مصطفی عرف میر آغا صاحب مجتہد اعظم کے خویش (داماد) تھے۔ اس طرح میر وارث حسین صاحب مرحوم کی ذات خاندان اجتہاد کے افراد میں شامل ہوئی۔ اس کے علاوہ مولوی للّن صاحب قبلہ اپنی والدہ و جدہ کی طرف سے بھی خاندان اجتہاد کے رکن رکین تھے۔ نقوی سادات میں سے تھے۔

## ولادت:

ولادت لکھنؤ میں حضرت عماد العلماء کے شریعت کدہ میں ذی الحجہ ۱۳۰۸ھ مطابق جولائی ۱۸۹۱ء میں ہوئی مگر ان کے فرزند جناب سید شمس الحسن تاج مرحوم کی بیاض سے جو سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب عرف مولوی بچن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

ذاکرِ شام غریباں کی دختر نیک اختر ہیں، میرے نام ایک مکتوب میں ان کی تاریخ ولادت اپریل ۱۸۸۹ء لکھی ہے جو ہجری تقویم کے اعتبار سے شعبان ۱۳۰۶ھ ہوتی ہے۔ ان معظمہ فرمانا ہے کہ یہ تاریخ خود حضرت شاعر نے بتائی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر اڑسٹھ سال تھی۔ اس اعتبار سے بھی ۱۸۸۹ء ہی صحیح تاریخِ ولادت قرار پاتی ہے۔

## تعلیم وعلمی استعداد:

حضرت شاعر اپنی اعلیٰ علمی استعداد کی بنا پر ۱۹۱۵ء میں ٹراونکور میں ہز ہائی نس مہارانی ریجنٹ کے استاد و اتالیق مقرر ہوئے۔ ہز ہائی نس نواب سید غلام علی خاں صاحب مرحوم بیگن پلّی کے بھی استاد رہے۔

حضرت شاعر عالمِ دین تھے۔ عربی، فارسی اور علومِ دین وغیرہ میں اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ آپ کی کمسنی نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ (راقم الحروف کے جد اعلیٰ) کی آغوشِ شفقت میں گزری جو لکھنؤ میں نواب صاحب نرہی کے نام نامی سے مشہور تھے۔ نرہی اس محلّہ کا نام ہے جہاں حضرت فاخر کی رہائش تھی۔ حضرت شاعر نے ابتدائی تعلیم اردو اور ابتدائی تعلیم فارسی نرہی ہی میں مولوی نثار حسین صاحب مرحوم، مولوی باقر حسین صاحب (مفتی گنج) مولوی ظہیر حسین صاحب (محلہ جھنوائی ٹولہ) اور مولوی علی حسین صاحب (محلہ مفتی گنج) سے حاصل کی۔ نرہی اس وقت مرکزِ علم و ادب تھا۔

۱۹۱۲ء سے خطابت کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب، ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن صاحب، مولانا سید محمد صالح خلف حضرت نجم العلماء، مولانا سید عالم حسین صاحب اور مولانا محمد رضا صاحب مرحوم سے درسیات پڑھے اور صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ خاندانِ اجتہاد کے علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھنے والے افراد کا عموماً صاحب علم ہونا فطری بات تھی۔ اس کے علاوہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ خصوصیت کے ساتھ تاریخ اسلام اور تاریخ اقوام ان کے مطالعہ کے نہایت

اہم موضوع تھے جن میں انھوں نے بے مثال مہارت اور بے حد درک حاصل کیا تھا۔ ان کی خطابت کا مقبول عام موضوع ہی تاریخ تھی۔ نہ صرف خطابت بلکہ شاعری اور خاص کر مرثیہ گوئی میں بھی انھوں نے تاریخ اسلام کو اپنا موضوع قرار دیا۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر نہایت اعلی درجہ کی نظمیں بھی لکھیں۔

## ذریعۂ معاش:

ان کا ذریعہ معاش صحافت، ذاکری اور ملازمت تھا جو غالباً ایک آسودہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی نہ تھا جس کی وجہ سے تلاش معاش میں حضرت شاعر کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ان کے فرزند گرامی جناب مہدی نظمی مرحوم نے ان کے مرثیہ ''اسلام اور مزدور'' میں ''بیان حال'' کے عنوان سے ان کے حالات لکھے ہیں۔ چنانچہ معاش کے سلسلہ میں یوں تحریر کیا ہے:

> ''دنیوی زندگی میں معاش و معیشت کی بہت سی مجبوریاں پرورشِ شخصیت کے امکانات کو رقص بسمل کا تماشہ بنا دیتی ہیں اور ارباب تسلیم و تفکر اس تماشہ کو تعبیر کرتے ہیں ''تقدیر'' سے جسے پلٹ دینے کی قوت یک گونہ شہید کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو بھی میسر نہیں آئی۔ میرے والد مرحوم کی شخصیت بھی رقص بسمل کا تماشہ بنی رہی اور رامپوری بائیس سالہ ملازمت نے جس کا سلسلہ یکم جون ۱۹۴۲ء کو منقطع ہوا ان کی علمی و ادبی شخصیت کو جس مقصد کے لئے قدرت نے اسے تخلیق کیا تھا اس مقصد کے برعکس رقص بسمل کا تماشہ بنائے رکھا''۔ (ص ب)

رامپور میں ان کا عہدہ ''افسر امورِ خیر'' تھا۔ رامپوری ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ ایک سال تک سابق ریاست دتیہ کے دیوان جناب عین الدین صاحب مرحوم کے مہمان رہے۔ یہ حضرت مہدی نظمی کا بیان ہے مگر ان کی بہو صاحبہ یعنی اہلیہ شمس الحسن تاج صاحب کا

ارشاد ہے کہ وہ جون ۱۹۴۵ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک دتیا اسٹیٹ میں رہے۔ میں ان کے قول کو مہدی نظمی صاحب کے قول پر ترجیح دیتا ہوں اس لیئے کہ ان کے بعض دوسرے اقوال بھی تحقیق طلب ہیں۔

## ازدواجی زندگی:

حضرت شاعر کا پہلا عقد ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ان سے ایک بیٹی تھیں جن کا انتقال اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے تین دن بعد ہو گیا۔ دوسرا عقد ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ زوجہ ثانی سے ان کی ایک بیٹی اور پانچ بیٹے ہوئے۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوش گوار تھی۔ زوجہ اولی کی دائمی مفارقت اور ایک بیٹی کے سات سال کی عمر میں انتقال کے سوا انھیں ازدواجی زندگی میں کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔

## اولاد:

اولاد کے معاملہ میں حضرت شاعر بہت خوش نصیب تھے۔ ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سبھی نے بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی۔ ان میں

۱۔ فرزند اکبر جناب سید ابن الحسن تھے جنھوں نے مہدی نظمی کے نام سے شہرت پائی۔ لاتعداد کتابوں کے مصنف، نہایت گراں قدر شاعر اور بہت بڑے مرثیہ گو ہوئے۔ شاعر ہندوستان کہے جاتے تھے اور مرثیہ گوئی کے حوالے سے انیس عصر لقب پایا تھا۔

۲۔ دوسرے صاحب زادے جناب شمس الحسن تاج اپنی ہنرمندی اور صناعی کے حوالے سے صرف ہندوستان ہی میں نہیں بیرون ملک بھی شہرت رکھتے تھے۔

۳۔ تیسرے بیٹے سید شہریار حسین اجتہادی جو جبریل تخلص کرتے تھے بڑے خوش فکر و خوش گو شاعر تھے۔ سنجیدہ و مزاحیہ ہر قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے تھے۔ مگر نہ تو باقاعدگی سے شاعری کی نہ کلام کو محفوظ رکھا۔ نہایت دلچسپ ادبی اور مجلسی شخصیت کے مالک تھے۔

۴۔ چوتھے فرزند شریف الحسن ناظر خیامی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی شاعری

طنز و مزاح کی نہایت اعلیٰ درجہ کی مثال تھی۔ اپنی شاعری کے حوالہ سے وہ ہندوستان بھر میں اتنے ہر دل عزیز اور مقبول تھے کہ جس مشاعرہ میں پہنچ جاتے تھے سامعین بڑے سے بڑے غزل گو شاعر کو بھی سننے سے انکار کر دیتے تھے اور صرف ناظر خیامی کے پڑھنے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کے منظومات کا ایک مجموعہ لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ افسوس کہ حضرت شاعر کے یہ چاروں فرزند اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور اب صرف ان کے سب سے چھوٹے بیٹے

۵۔ سید رشید الحسن ہیں جو ساغر خیامی کے نام سے اپنی مزاحیہ شاعری کی بدولت صرف برصغیر ہی میں نہیں مشرق وسطیٰ اور امریکہ تک شہرت رکھتے ہیں اور بہت مقبول شاعر ہیں۔ ان کی مزاحیہ نظموں اور قطعات کا ایک مجموعہ کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

حضرت شاعر کی دونوں بیٹیاں بھی اس دنیا سے رحلت کر چکی ہیں۔

## حلیہ:

متوسط قد و قامت، گندمی رنگ اور پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ خاندانی شرافت اور علمی وجاہت کا نور چہرے سے عیاں تھا۔ نماز اور نماز شب کبھی ناغہ نہ ہوئی۔ تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی تھی۔

## مزاج و اخلاق:

مزاج خوش مزاجی اور خلق حسن اخلاق سے عبارت تھا۔ طبیعت میں انکسار بہت تھا۔ انتہائی خلیق و ملنسار تھے۔ مگر خوددار و نازک مزاج بھی تھے۔ غلط بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ نہایت ہنس مکھ، بذلہ سنج اور خوش گفتار تھے۔ شفقت و محبت ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ بچپن سے لطیفہ گو تھے۔ ایک سال انھوں نے نخاس لکھنؤ میں میرے غریب خانہ پر ایک مجلس عزا سے خطاب کے دوران منبر سے یہ بات کہی تھی کہ بچپن ہی سے میرے جد مجد نے ان کی ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کو نکھارنے پر توجہ دی۔ ان کا حکم تھا کہ روز ایک

نیا لطیفہ سنایا کرو۔ چنانچہ روز وہ ایک نیا لطیفہ تصنیف کرتے تھے اور ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ انعام میں ان کو ایک چونی یعنی اس زمانے کے سولہ پیسے اور آج کے حساب سے پچیس پیسے ملتے تھے۔ آج کے پچیس پیسوں کی حیثیت اس زمانے کے سولہ پیسوں یا چونی کے مقابلہ میں کنکر پتھر سے بھی گئی گزری ہے۔ ایک روپیہ ایک تولہ چاندی کا ہوتا تھا۔ تین ماشہ چاندی کی چونی ہوتی تھی۔ اس اعتبار اور آج کل کے حساب سے ایک چونی بیس بائیس روپیہ کے برابر ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک چونی کا انعام بہت بڑی بات تھی۔

## شخصیت کی ہمہ گیری:

مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی نے حضرت شاعرؔ کے متعلق یہ لکھا ہے۔

"مولانا اولاد حسین حرف للن صاحب تخلص شاعرؔ بڑے ذکی، ذہین، حدیث و تاریخ کے بحرِ ذخار، شعلہ بیان خطیب، بلند پایہ شاعر (اور) ظریف الطبع (تھے)"۔　(تاریخ لکھنؤ، ص۱۶۱)

حضرت شاعرؔ کی ایسی ہمہ رنگ، ہمہ جہت، ہمہ گیر اور ہمہ صفت شخصیت میں نے نہ دیکھی نہ سنی۔ مشاہدہ ہے کہ کوئی شخص تقریر میں ماہر ہوتا ہے تو کوئی تحریر میں۔ اہل قلم میں کوئی نثر نگاری میں نام پیدا کرتا ہے کوئی شاعری میں۔ اس میں ہر ایک کے شعبہ بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ فن تقریر کا ماہر شاعری سے نسبت نہیں رکھتا۔ کبھی کبھی کچھ شعر کہہ لینا الگ بات ہے مگر تقریر ہی کی طرح شاعری میں بھی ناموری اور کمال حاصل کرنا الگ ہے۔ سیاسی مقررین سے لے کر مذہبی خطیبوں تک ایسی لاتعداد مثالیں ملیں گی جنھوں نے فن تقریر و خطابت میں اپنے نام کے ڈنکے بجا دیئے۔ مگر بس۔ اس سے آگے تحریر کے میدان میں ان کا اشہب قلم جولانیاں نہ دکھا سکا۔ اسی طرح اہل قلم میں کوئی ادیب و نثر نگار ہوا تو شاعری اس کے احاطۂ فکر سے باہر رہی اور شاعری کی ایک صنف میں کمال حاصل کرنے والا دوسری صنف سخن سے دامن کش رہا۔ غالبؔ کی عظمت مسلم مگر بس غزل کی حد تک۔ جب سلطان العلماء خلف حضرت غفراں مآب علیہ الرحمۃ نے ان سے فرمائش کی کہ مرثیہ کہیں تو بمشکل

تین بند کہہ کے قلم چوم کے رکھ دیا کہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ سودا نے قصیدہ نگاری میں جو کمال حاصل کیا وہ غزل میں نہ کر سکے۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں خود کہا

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیئے میں یہ غزل جاؤں گا

میر تقی میر غزل میں خدائے سخن کہلائے مگر قصیدہ ان کی دسترس سے باہر رہا۔ میر حسن، نواب مرزا شوق لکھنوی، آفتاب الدولہ قلق لکھنوی اور پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے مثنوی نظم کرنے میں ایسا نام پیدا کیا کہ شاید و باید مگر دوسرے اصناف سخن میں ایسے کارنامے انجام نہ دے سکے۔

اس ناقابل تردید حقیقت کے پیش نظر جب ہم لسان الشعرا سید الواعظین خطیب اکبر جناب مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب شاعر کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ خطابت میں بے مثال نثر نگاری میں بے عدیل اور شاعری میں صاحب کمال تھے۔ وہ بے نظیر مورخ اور اعلیٰ پائے کے عالم بھی تھے۔

خطابت میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کی مجلسوں میں ٹوٹ پڑتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک جگہ وہ مجلس سے خطاب کر رہے تھے۔ مکان مجلس کشادہ نہ تھا جس کی وجہ سے لوگ چھتوں تک پر بیٹھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بعض نوجوان دیواروں پر اور بعض پاس لگے ہوئے درخت پر بھی بیٹھے تھے۔

## ایک ذاتی تجربہ:

خاندان اجتہاد کی مشہور و معروف امام بارگاہ، امام باڑہ غفران مآب میں عشرۂ محرم کی مجالس صبح دس بجے ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں ذاکر شام غریباں عمدۃ العلما مولانا سید کلب حسین صاحب عرف مولوی کبن صاحب قبلہ طاب ثراہ ان مجالس سے خطاب فرماتے تھے۔ امام باڑہ کے سامنے وسیع و عریض صحن ہے جو قبرستان ہے۔ اسی صحن میں کچھ دور پر نواب علی کا مقبرہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس کے چاروں طرف

دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ اس میں داخلہ کا دروازہ اتنا پتلا ہے کہ بیک وقت دو آدمیوں کا اس میں سے گزرنا مشکل ہے۔ ایک سال ایسا ہوا کہ امام باڑہ میں مولوی کبن صاحب قبلہ کے خطاب کے فوراً بعد اس مقبرہ میں مولوی للّن صاحب قبلہ یعنی حضرت شاعر اعلی اللہ مقامہ مجلس سے خطاب کرتے تھے۔ لوگ امام باڑہ کی مجلس ختم ہوتے ہی مقبرہ کی طرف دوڑ لگاتے تھے کہ بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔ اس زمانہ میں میری پیٹھ میں پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ میں بھی شوق سماعت میں دوڑتا ہوا مقبرہ تک پہنچا۔ داخلہ کے دروازہ پر لوگوں کے پہلے اندر پہنچنے کی کوشش میں کشمکش تھی۔ کئی کئی لوگ بیک وقت اندر جانا چاہتے تھے۔ میں نے بھی کوشش کی اور اس کوشش میں اندر داخل ہوتے ہوئے دروازہ کی چوکھٹ کی رگڑ لگنے سے میرا پھوڑا پھوٹ گیا مگر میں نے خیال نہیں کیا اور اسی طرح مجلس میں بیٹھا رہا۔

ان کی تقریر کا موضوع تاریخ اسلام اور تاریخ عالم و آدم ہوتا تھا۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی کا انتقام خونِ حسینؑ پر آمادہ ہونا اور قاتلان حسینؑ و قاتلان شہدائے کربلا کو گرفتار کر کے ان سے انتقام لینا تاریخ بعد کربلا کا ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو حضرت شاعر نے بہت تفصیل سے نظم کیا ہے جس کا نام مختار نامہ ہے۔ اس واقعہ سے متعلق ان کی تقاریر کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ جہاں کہیں اس واقعہ کے موضوع تقریر ہونے کا اعلان ہوتا تھا لوگ والہانہ طور پر ان مجالس میں شرکت کرتے تھے۔

ان کی تقریر اس قدر شگفتہ ہوتی تھی کہ سماعت وجد کرتی تھی اور سامعین جوش مسرت اور جوش ایمانی سے جھوم جھوم جاتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔

تحریر میں ان کی نثر نگاری کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے کسی موضوع پر ان کا قلم نہ رکتا تھا نہ ٹھوکر کھاتا تھا۔ انھوں نے کئی ماہنامے اور ہفتہ وار اخبار جاری کیے۔ ان میں اول سے آخر تک سب کچھ انھیں کا لکھا ہوتا تھا۔ اداریہ ہو یا سیاسی تبصرہ، ناول ہو یا فسانہ، افسانے بھی مزاحیہ ہوں یا تاریخی یا اصلاحی غرض یہ کہ نثر نگاری کی کوئی صنف ان کی دسترس سے باہر نہیں تھی۔ پورا پورا رسالہ خود مرتب کرتے تھے مگر تحریریں سب فرضی قلمی ناموں سے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس میں بھی صورت حال یہی تھی۔ غزل، نظم، مثنوی، قصیدے، مرثیہ، سلام، نوحے، رباعیات وقطعات تاریخ وغیرہ کون سی صنف سخن تھی جس میں انھوں نے نہایت اعلیٰ معیار کی تخلیقات نہ پیش کی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحافت ہو یا خطابت، نثر نگاری ہو یا شاعری، ان کی پہلو دار علمی ادبی اور شعری شخصیت اور ہمہ گیری کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ان کے فرزند اکبر حضرت مہدی نظمی نے ان کی ان گوناگوں صفات کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان کی طویل العمر تاریخ میں جتنے بھی معروف و ممتاز، نمایاں اور جلی نام ہیں ان میں ایک بھی ایسا نام نہیں ہے جو اپنی تنہا شخصیت کے اعتبار سے مورخ بھی ہو، دین کا عالم واعظ اور خطیب بھی ہو، ادیب و شاعر، داستان گو، ناول نگار اور کہانی کار بھی ہو۔ جو صحافت میں ظفر علی خاں اور جالب و سالک کا ہمسر قرار پائے، قومی و وطنی شاعری میں حالی و جوش اور منظوم مزاح نگاری میں اکبر الہ آبادی کے برابر ٹھہرے۔ جس نے ۱۵ (شاعر) کے قلم سے "بھابھی کی سرگذشت" لکھ کر اردو زبان میں بذلہ سنجی اور مشہور طنز نگاری کا ایک معیار قائم کیا ہو۔ جس کے حسن تغزل نے بہت سے شعرائے کرامی کے شعری مجموعوں کو چار چاند لگائے ہوں۔ جن کی قصیدہ نگاری کے شکوہ اور سلام نگاری کی دل سوزی نے بہت سے قصیدہ نگاروں اور سلام نظم کرنے والے شعراء کو مقبول عوام بنا دیا ہو۔ جن کے ذہن و شعور سے پیدا ہونے والے ڈرامے اور نغمے بہت سے ڈرامہ نویسوں اور نغمہ نگاروں کے لیے بنائے شہرت بنے ہوں، اس لیے میں بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ مختلف النوع اصناف شعر و ادب اور علم دین کے مختلف شعبوں میں مہارت تامہ رکھنے کی بنا پر میرے والد مرحوم علم و ادب کے دوسرے نمایاں ناموں پر ایک طرح کی ترجیح بھی رکھتے ہیں اور ایک طرح کی فضیلت بھی"۔ ([illegible])

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسی عظیم اور ہمہ رنگ شخصیت کو اردو کی شعری و ادبی دنیا میں وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جوان سے کہیں کمتر شخصیتوں کو حاصل ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو ان کی مذہبی شخصیت اور منبر نشینی تھی جس کی وجہ سے وہ شعری و ادبی دنیا کی عوامی زندگی سے دور تھے۔ مشاعروں میں جانا یا دوسری ادبی تقریبات میں شرکت کرنا اور اسی قسم کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینا ان کے وقار کے منافی تھا۔ دوسرے وہ فطرۃً گوشہ نشین تھے۔ ایسے حضرات عموماً لوگوں کی بے توجہی کا شکار ہوتے ہیں۔

حضرت مہدی نظمی نے اپنے پدر بزرگوار کی شعری و ادبی زندگی کے اس پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''معتبر و مستند تنقید نگاروں یا ادبی مشاہیر کے سوانح اور ان کے کارناموں کی تحقیق کرنے والے اساتذہ اور طلبا کی نگاہ میرے والد مرحوم کے علمی و ادبی اوصاف تک نہیں پہنچی''۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''جوشؔ ملیح آبادی کو شاعر انقلاب بھی کہا جاتا ہے اور جدید مرثیے کا امام بھی۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ والد مرحوم کا کلام اہل نقد و نظر کے سامنے نہیں آیا۔ ان کا ایک مرثیہ ''اسلام اور مزدور'' ........ کا عنوان ہی ایسا ہے جس میں پروستاریت بھی ہے اور جدت بھی ...... (حضرت شاعر کے) مرثیے جب چھپ کر اہل نظر کے سامنے آئیں گے تو رثائی ادب کے سلسلہ میں انھوں نے جو کلیے قائم کیے ہیں ان میں سے اکثر کلیے ٹوٹ جائیں گے''۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> ''خاندان اجتہاد کی علمی روایت کے ماحول نے میرے والد مرحوم کو بھی واعظ و ذاکر اور مولوی بنادیا اور جوشؔ ملیح آبادی مرحوم کے بقول ''یہ اچھا ہی ہوا کہ مولویت تمھارے کاندھے کا بھاری بوجھ بن گئی ورنہ تم میرے حریف و

## شاعری:

شاعری کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ غزل سے لے کر مرثیہ تک انھوں نے ہر صنف سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے اور اپنے فکر و فن سے انھیں درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ ذیل میں مختلف اصناف سخن میں ان کی تخلیقات کے نمونوں کے طور پر ان کے کلام سے مثالیں پیش کی جائیں گی جن سے اہل نقد و نظر ان کے کمالات شاعری اور جمالیات سخن کا کچھ اندازہ کر سکیں گے۔

## مرثیہ:

مرثیہ نگاری میں حضرت ساحرؔ نے نئی راہیں نکالیں اور نیا انداز و آہنگ پیدا کیا جس کی نقل کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہ ہوا۔ یہ لکھ چکا ہوں کہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی سے ان کے بہت ہی قریبی اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ جوشؔ صاحب اشتراکی خیالات کے حامل تھے جبکہ حضرت ساحرؔ خالصتاً مذہبی انسان تھے۔ طبیعتوں کے ان متضاد رجحانات کے باوجود دونوں کے دوستانہ مراسم میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جوشؔ صاحب نے اشتراکی نظریات کے زیر اثر اپنے مسدسوں میں انقلاب اور انقلابی فکر کی ترجمانی کی۔ مگر اشتراکیت کا بنیادی مقصد جو غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی حمایت اور محنت کی عظمت وغیرہ کو نمایاں کرنا تھا وہ اس کو اپنا موضوع قرار نہیں دے سکے۔ ان کے برخلاف حضرت ساحرؔ نے ایک مذہبی شخصیت ہوتے ہوئے عظمت مزدور کو اپنے مرثیہ کا موضوع قرار دیا اور ''اسلام اور مزدور'' کے عنوان سے ایک ایسا معرکہ آرا مرثیہ لکھا جس میں اسلامی فکر و نظر کے اعتبار سے اور ان انبیاؑ و ائمہؑ کے حوالوں سے جو خود مزدور پیشہ تھے، محنت کی عظمت اور مزدور کی عزت و وقار کو نمایاں کیا اور اسے شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ یہ مرثیہ صرف موضوع کے اعتبار ہی سے منفرد نہیں ہے بلکہ حضرت ساحرؔ کے شاعرانہ کمالات کا بھی آئینہ دار ہے۔ میں ان کی مرثیہ گوئی کے حوالہ سے اسی مرثیہ کے اقتباسات پیش کروں گا۔

اہل سرمایہ نہیں ہوتے ہیں جراروں میں
دم ہے مزدور کا چلتی ہوئی تلواروں میں

کیا اچھی بات کہی ہے۔ سبحان اللہ

سیم و زر کان سے لایا ہوا مزدور کا ہے
ہیرا پتھر تھا، بنایا ہوا مزدور کا ہے
نقدِ اقبال لٹایا ہوا مزدور کا ہے
تختِ طاؤس بچھایا ہوا مزدور کا ہے
بادشہ کون سا اس ذات کا محتاج نہیں
خونِ مزدور ہے یہ لعلِ سرِ تاج نہیں

کیا ہی اچھی بات کہی ہے۔ سبحان اللہ

بھانپ اور برق کی دنیا کو بسایا کس نے
زور سے سینہ کے کشتی کو چلایا کس نے
راستہ اہلِ تجارت کو بتایا کس نے
ڈھیر سرمایہ کا ڈیوڑھی پہ لگایا کس نے
کس کا لایا ہوا یہ مال ہے بازاروں کا
نام ہے اہلِ دول کس کے نمک خواروں کا

مزدور کی عظمت کے بیان میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

ایک گلدستہ چمن محفلِ مزدور کا ہے
پیکرِ شمع میں شعلہ دلِ مزدور کا ہے
شہر اک نقشِ قدم منزلِ مزدور کا ہے
جامِ جمشید کا سانچا گلِ مزدور کا ہے
صاف بتلاتا ہے صناع کا برتر ہونا
آئینہ ساز کا دنیا میں سکندر ہونا

آپ صیاد بھی مزدور ہے ، نخچیر بھی ہے
وارث طبل و علم صاحب شمشیر بھی ہے
سیکڑوں رنگ سے رنگیں خط تقدیر بھی ہے
خود مصور بھی ہے ، صورت بھی ہے ، تصویر بھی ہے
حاصل دشت و جبل ، حاصل دریا اس کا
آئینہ خانہ میں ہر سمت ہے جلوہ اس کا

اخترِ صبح ، حشم اخترِ مزدور کا ہے
نیزہ چھوٹا سا قلم دفترِ مزدور کا ہے
درفش ایراں کا ، علم لشکرِ مزدور کا ہے
قتل ضحاک ، کرم خنجرِ مزدور کا ہے
انقلابات زمانہ کو دگرگوں کردے
دستِ مزدور جسے چاہے فریدوں کردے

برسوں آدمؑ نے زمینوں پہ زراعت کی ہے
نوحؑ نے ناؤ بنانے میں مشقت کی ہے
سوزن ادریسؑ کو جنت سے عنایت کی ہے
یعنی اللہ نے مزدور کی عزت کی ہے
تا بنی ، شئے تھی جو مزدور کو درکار ، ملی
اک کو سوزن ملی اور ایک کو تلوار ملی

گلہ بانوں کے تھے سردار ، لقب جن کا خلیلؑ
پیشوا اہل تجارت کے ، کسانوں کے کفیل
آخرت میں بھی جہاں میں بھی سرافراز وجلیل
ان کے مہماں کبھی جبریلؑ کبھی میکائیلؑ

میہماں دوست بھی، خوش خلق بھی، طباع بھی تھے
ریگ کو آرد گندم کیا، صناع بھی تھے

صاحب تیغ بھی تھے اشجع و جرار بھی تھے
بت شکن تھے، پدرِ حیدرِ کرار بھی تھے
آگ کو باغ کیا، واقف اسرار بھی تھے
کعبہ شاہد ہے کہ مزدور بھی معمار بھی تھے

اپنے مزدور پہ خالق کا کرم باقی ہے
سنگ کعبہ پہ ابھی نقش قدم باقی ہے

کعبہ تو بن گیا کیا کہیئے جو اجرت پائی
بعض بیٹوں نے زمانے میں نبوت پائی
ایک نے پشت پہ گر مہرِ رسالت پائی
ایک نے صحن میں کعبہ کے ولادت پائی

کعبہ انگشتر خالی تھا، نہیں حق نے دیا
وہ مکاں کر گئے تیار نگیں حق نے دیا

آج گو پیشۂ مزدور زمانے میں ہے عیب
کار مرسل تھا یہی اس میں نہ شک کوئی نہ ریب
طور پر جس کی نظر نے کیا نظارۂ غیب
تھے وہی حضرت موسیٰ بھی مزدور شعیبؑ

کام امت کا کیا شرکتِ ہارونی سے
یہ خالق کو تھا سرمایۂ قارونی سے

تھا نہ حدادوں میں داؤدؑ پیمبر کا نظیر
مالک تخت سلیماںؑ تھے بناتے تھے حصیر

پیٹھ پہ بوجھ اٹھاتا تھا علیؑ کل کا امیر
فاطمہ صاف [illegible] کرتی تھیں اجرت پہ شعیر
پنجتن کی تھے غذا فاقوں کی مجبوری میں
جو یہودی سے جو مل جاتے تھے مزدوری میں
[illegible] دیتی تھیں کی تھیں صفائی خود ہی
کبھی گہوارہ جھلایا کبھی چکی پیسی
گرچہ اصرار تھا فضہ کا کہ میں ہوں لونڈی
میں کروں کام تم آرام سے بیٹھو بی بی
حشر میں مالکۂ تاج شفاعت تم ہو
بنتِ محبوب کی خاتونِ قیامت تم ہو
ہنس دی وہ فاقہ کش و خشک دہن جب یہ سنا
کہا تو اہلِ محبت سے ہے فضہ فضہ
سجنِ مومن ہے یہ دنیا نہ قلق کر اس کا
آج سب کام جو تو نے کیا کل کیا ہوگا
سامنا عادل و عالم سے ہے مجبوروں کا
سب برابر ہیں یہاں، گھر ہے یہ مزدوروں کا

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ [illegible] نے محنت کو جس قدر با عظمت بنایا [illegible] [illegible] ت [illegible] تحقیق سے جس بلند مقام پر فائز کیا ہے جو انبیاء و اوصیاء و ائمہ معصومین کی منزل ہے [illegible] حضرت شاعر مرحوم نے تاریخ سے علم و شعور سے کتنی قدر پر اثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ [illegible] نظر میں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی [illegible] فلسفے [illegible] کی تحقیق [illegible] [illegible] بات [illegible] کی ہے [illegible] بھی [illegible] نظریہ [illegible] اور نظریہ [illegible] [illegible] عظمت [illegible] نہیں [illegible] ط و امتیاز ہے [illegible]

نظریات سیاسی ضرورتوں اور وقتی اور ذاتی مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقی معنوں میں نہ تو سچائی ہوتی ہے نہ خلوص نہ پچھڑے ہوئے انسانوں سے حقیقی ہمدردی نہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے تعلق۔ محض سیاسی مفادات کے لیے اس طرح کے نعرے لگائے جاتے ہیں جن کا مشاہدہ ہم سب کرتے ہی رہتے ہیں۔

مرثیہ کے لیے اتنے بالکل نئے اور جدید ترین موضوع کا انتخاب کرنا حضرت شاعر کی وسعتِ فکر و نظر اور سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

میں نے اپنے غریب خانہ پر یہ مرثیہ دو مرتبہ پیش کیا۔ سامعین میں معروف شاعر صاحبِ ذوق و صاحبِ نظر حضرت ثاقب ظفر پوری بھی تھے۔ وہ میرے یہاں کی اسی مجلس میں ہر سال سلام پیش فرماتے تھے۔ اس مرثیہ کو سن کر انھوں نے کہا۔ انھوں نے آج تک ایسا مرثیہ نہیں سنا تھا۔ اسی سے اس مرثیہ کی عظمت و اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

## منظر نگاری:

حضرت شاعر نے اس مرثیہ میں جنگِ احزاب نظم کی ہے جو جنگِ خندق کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ جاڑے کے زمانے میں واقع ہوئی تھی۔ کلاسیکی مرثیوں کی طرح اس میں منظر نگاری کے امکانات بہت کم تھے لیکن حضرت شاعر نے اختصار کے ساتھ منظر نگاری کا بھی حق ادا کیا اور جناب چھنگا صاحب حسین کے جاڑے پر بے مثل مرثیہ کی طرح خود بھی اس موسم کے بارے میں تین بند نظم کیے جو منظر نگاری کا حصہ ہیں۔ چھنگا صاحب حسین نے تو خیر جاڑے کے بیان میں قلم توڑ دیے مگر حضرت شاعر کے یہ تین بند بھی لاجواب ہیں۔ بندوں سے پہلے کے بند بھی درج کر رہا ہوں جن میں منظر نگاری ہے۔ ملاحظہ ہوں

آج خندق کا ہے دن جمع ہیں سب کفار
بت پرست اور یہود ایک ہوئے ہیں اس بار
ہیں تباہیِ مدینہ کے لیے قول و قرار
دیکھ خندق وہ بناتے ہیں رسولؐ مختار

ساتھ اصحاب کے بہتا ہے پسینہ دیکھو
اس کو کہتے ہیں مساوات ، قرینہ دیکھو

[illegible]

رجزیں پڑھتے ہیں انصار اٹھاتے ہیں جو سنگ
گلِ فردوس ہے یا چہرۂ عمارؓ کا رنگ

کیسی خوب صورت تشبیہ ہے۔ واہ

یہ بڑھاپا یہ ابوذرؓ میں جوانی کی امنگ
شہسوارانِ تہامہ سے ہے مزدوروں کی جنگ

ہمت اہلِ وفا اور بڑھی جاتی ہے
[illegible] خندق سے صدا آتی ہے

[illegible]

خندق غرب میں جب ماہ منور آیا
جاڑا بڑھتا ہوا اصحاب کے سر پر آیا
دامنِ شام لیے چادر و بستر آیا
چھوڑ کر کام مصلے پہ پیمبرؐ آیا

روئے احمد دم مغرب قمر [illegible] دیکھا
[illegible]

کیا اچھی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

لیلیٰ شام عرب جلوہ کناں ہونے لگی
فوج اسلام میں مغرب کی اذاں ہونے لگی
لب احمدؐ سے جو تمجید بیاں ہونے لگی
سطر قرآں کی تلاوت میں زباں ہونے لگی

آسماں دیکھتا تھا جذبۂ ایمانی کو
سجدہ خود چومتا تھا نور کی پیشانی کو

کیا کہنا۔

سجدۂ شکر سے فارغ ہوا ہاشم کا جو لال
رکھ کے تسبیح اٹھائی شہ والا نے کدال
دین و دنیا میں ہے بس فرقِ جلال اور جمال
جس کو مٹھی میں دبائے تھا پیمبر کا کمال

زہد میں لطف نہ رہبانیتِ عام میں ہے
دین و دنیا کی سلامت روی اسلام میں ہے

اور مصرعِ ثانی پھر کیا کہنا۔

ساتھ احباب ہوئے ہونے لگی سنگ کنی
جاڑوں کی رات وہ اصحاب کی عریاں بدنی
مفلسی عام مگر یاد! کہ اللہ غنی
وہ اندھیرا تھا کہ شرمائے شب اہرمنی

ہاتھ مزدور کا ظلمت میں کہاں اٹھتا ہے
خاک کو لوگ سمجھتے تھے دھواں اٹھتا ہے

ابر کے پیچ کو آب تھے کہ پھانے میں تھے داغ
آڑ میں گیسوے سنبل کے چھپا تختۂ باغ
روشنی کا نہ زمیں پر نہ فلک پر تھا سراغ
کالی ناگن نے بجھائے تھے ستاروں کے چراغ

سایۂ ابر سے ظلمت کا اثر دونا تھا
کالی مخمل کا زمانے نے لحاف اوڑھا تھا

ایک بھولا ہوا افسانہ بنا جلوۂ طور

آگ جلتی نہ تھی، رن کے خس و خاشاک تھے تر
شعلے سرکاتے نہ تھے منھ سے دھوئیں کی چادر

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کیسا نیا مضمون ہے۔

سب ادھر جاتے تھے امید ہو گرمی کی جدھر
خس مژگاں سے لپٹ جاتی تھی تھرا کے نظر

جزاک اللہ۔ کیا اچھا مصرع ہے۔

خاک نیلی، طبق افلاک کے زنگاری تھے
تارے بھی چرخ پہ بجھتی ہوئی چنگاری تھے

اس سردی میں تھے سرگرم مشقت اصحاب

منظر نگاری ملاحظہ کی۔ چھنگا صاحب حسینؑ کے معرکہ آرا مرثیہ کے بعد جاڑے کا بیان اور وہ بھی اس معیار کا یہ حضرت شاعر ہی کا حصہ تھا۔

## رخصت:

جنگ احزاب میں کربلا کی صورت حال تو تھی نہیں کہ ایک مجمع شہادت کی اجازت لے کر رن کو جاتا تھا اور سارے اہل حرم اس یقین کے ساتھ اسے رخصت کرتے تھے کہ اب وہ زندہ سلامت دشت قتال سے واپس نہیں آئے گا۔ لہذا فطری طور پر اس کی رخصت پر غم و اندوہ کا جو طوفان امڈتا تھا اور جس طرح اس کی دائمی جدائی کے خیال سے سب تڑپ تڑپ کے آہ و بکا کرتے تھے اس کا بیان کلاسکی مرثیوں میں نہایت دردانگیز اور پر اثر ہوتا ہے۔ جنگ احزاب میں بھی حضرت شاعر نے رخصت کا ایک پہلو نکالا۔ یعنی عمرو بن عبدود کے مقابلے کے لیے جناب علیؑ کا تشریف لے جانا۔ یہ گریہ خیز نہیں، ولولہ انگیز رخصت ہے۔

ملاحظہ ہو:

اتنے میں پھر جو عدو نے کی مبارز طلبی
ہمت جنگ مگر کر نہ سکی فوج نبیؐ

رگِ حیدرؑ میں شرر بن گیا خونِ عربی
غش کی اب سہی جاتی نہیں یہ بے ادبی
اتنے میں بولا کوئی، عمرو ہے، پہچانتے ہو؟
مڑ کے فرمایا کہ ہم بھی ہیں علی، جانتے ہو؟

دیکھا جب چشمِ نبوت نے امامت کا غضب
کہا اب روؤں تو ہو جائے گی توہینِ ادب
جوش کی حد ہوئی اب رو کے سے رکتے ہیں کب
کہا جو مصلحت اللہ کی جو مرضیِ رب
اپنا عمامۂ خاص آپ کے سر باندھیں گے
آج ہم اپنے سپاہی کی کمر باندھیں گے

کس تیور کا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

کہہ کے یہ سینے سے حیدرؑ کو لگایا اک بار
باپ کی طرح سے آیا جو بڑے بھائی کو پیار
بوسے ہونٹوں پہ دیئے چومے جبین و رخسار
سر پہ عمامہ رکھا باندھی کمر میں تلوار
کہا انساں ہوں لرزتا ہے کلیجہ بھائی
جائیے جائیے اللہ کو سونپا بھائی

پھر یہ کہنے لگا خالق سے وہ عالی درجات
اے میرے سامع الاصوات مجیب الدعوات
بوعبیدہ کی ہوئی بدر کے زخموں سے نجات
ختم احد میں ہوئی حمزہؑ سے بہادر کی حیات
خانداں والوں میں کوئی مرا غمخوار نہیں

اب یداللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں

یوں تو بازوئے نبوت بھی نہ کم تھا اصلا
طالبِ نصرتِ ہاروں ہوئے تجھ سے موسیٰ
میری قوت کو یداللہ کی طاقت سے بڑھا
تاکہ ہم دونوں کریں خاک پہ سجدہ تیرا
غیر کو کب غم انساں کی خبر ہوتی ہے
بھائی ہو ساتھ تو مضبوط کمر ہوتی ہے

لاریب۔ بے شک

جانب دشت جو حیدر چلے باعزت و شاں
لب احمد ہوئے وا، کھلتا ہے جیسے قرآں

کتنی اچھی تشبیہ ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

بلند آواز سے کہنے لگا دیں کا سلطاں
کل ایماں ہیں علی جانب کل کفر رواں
عمرو کے گھوڑے کا دم دیکھو نہ کاوا دیکھو
مرکز کفر پہ ایمان کا دھاوا دیکھو

دھاوا کیا اچھی لفظ صرف کی ہے سبحان اللہ۔ کیا لطف زبان ہے۔

آمد:

اور اب میدان جنگ میں حضرت علیؑ کی آمد کا ولولہ انگیز اور ایمان افروز منظر

پا پیادہ جو وہ خورشید ہے راہی رن میں
سینۂ عمرو کی پھیلی ہے سیاہی رن میں
صید کی تاک میں ہے شیرِ الٰہی رن میں
چوں کہتی ہے کہ آتا ہے سپاہی رن میں

وہ جزاک اللہ۔ آمد کے تیور آنکھوں سے دکھا دیے۔

چھوٹ رخسار کی بالے فلک پڑتی ہے
ہر قدم کی دلِ دشمن پہ دھمک پڑتی ہے

## سراپا:

اب سراپا ملاحظہ ہو:

کاکلیں دوش پہ اور سر پہ عمامہ کالا
تا گلو تحتِ حنک چاند پہ جیسے ہالا
خطِ عارض کا چمن جیسے پھبکنے والا
چشم و رخ تختۂ نرگس پہ دہکتا لالہ

کیا خوب صورت تشبیہ ہے۔

ہر قدم زور سوا طاقت ایمانی میں
سورۂ فتح چمکتی ہوئی پیشانی میں

کیا تغزل ہے اور کیا ایمان افروز مصرے ہیں۔ سبحان اللہ۔

فکرِ دشمن نہ غمِ اسپ طبیعت وہ غنی
وہ لبِ سرخ تصدق ہو عقیقِ یمنی
پنجہ کو پنج اصولی کہو یا پنج تنی
انگلیاں وہ کہ نہاں طاقتِ خیبر شکنی

کیوں پیادہ نہ رواں بادشہِ قنبر ہو
کُل ایماں ہیں، شریک آج قرآں کیونکر ہو

بالکل نیا مضمون ہے۔ کیا کہنا۔

گُرتا محتاجوں کا اور عزم جہاں بانی کا
ہمتِ نوح میں رخ موجۂ طوفانی کا

چلنا کہتا تھا یہ اس زورقِ ایمانی کا
وہ سفینہ ہے جو محتاج نہیں پانی کا
بحر و بر کیا یہ فلک سے نہیں جھکنے والی
کشتیِ آلِ پیمبرؐ نہیں رکنے والی

بے شک۔ لاریب

کرتے پر ساتھ زرہ، خود نہ ہمرہ سر پر
صرف عمامہ و پیراہن و شمشیر و سپر
پاؤں نعلین میں، ڈوبی ہوئی غصے میں نظر
تیغ اللہ کی، باندھی ہوئی احمدؐ کی کمر
پیچھے حامی نہ کوئی راہ نما آگے تھا
کل ایماں تھے، نبیؐ پیچھے، خدا آگے تھا

چہرہ گلفام کہ چلتا ہوا پھولوں کا طبق
خط رخسار پہ شبنم تھی کہ چہرے کا عرق
دو قدم اور بڑھا تھا اسدِ بیشۂ حق
کل ایماں کو نظر آیا وہ کفرِ مطلق
شعلہ ور نارِ حسد غیظ سے گرمایا ہوا
جاڑے میں آتش تقریر کا بھڑکایا ہوا

پورا بند قابل داد ہے۔ پہلے تین مصرعے تو تغزل کا بہترین نمونہ ہیں۔ چھٹے مصرع کا مضمون بھی بے مثل ہے۔ اب یہ بند بھی ملاحظہ کیجیے جس میں رجز کے تیور ہیں

طرۂ کفر مسلماں کے لیے تھا دشنام
موردِ طعن نبیؐ تھے کبھی اہلِ اسلام
تا بہ کہ بڑھ کے علیؑ نے یہ کیا اس سے کلام
جن کو جانتے نہیں کیوں لیتا ہے ان لوگوں کے نام

حالت ظن زبوں ذلت و عارے باشد
تو چہ دانی کہ دراں گرد سوارے باشد

## ساقی نامہ:

اب ساقی نامے کے دو چار بند ملاحظہ کیجیے۔ ساقی نامہ عام روش سے ہٹا ہوا بالکل نیا ہے۔ یہ مضامین متقدمین سے متاخرین تک کسی کے یہاں نظر نہیں آئیں گے

کم نہ ساقی ہو جہاں دے اسی میخانے سے
دے وہ سب اور جو بڑھ جائے جھپٹ جانے دے
پوچھنے کی نہیں حاجت کسی مستانے سے
بانٹ دے بوذرؓ و سلمانؓ کے پیمانے سے
ہم کو پہچانتے ہیں جو ہیں پیمبرؐ والے
ہم قدیمی ہیں، وہی، ساقی کوثر والے

بند ملاحظہ ہو:

دن تپتوں میں شجر باغ کے تھالے میں پیے
مگسِ شہد ہے کم ظرف جو لالے میں پیے
جس سے پہچانی نہ ہو ویسے وہ اجالے میں پیے
جو ہو نوکار وہ کس کس کے پیالے میں پیے
ساقیا غرق مسلمان کی دنیا کر دے
جنگِ احزاب ہے، اس بادے سے خندق بھر دے

ساقیا رات ہے جاڑوں کی جو تر ہوتی ہے
مئے ابلتی ہو تو تسکین جگر ہوتی ہے
ہم مسلمان ہیں کملی میں بسر ہوتی ہے
آفتابی دے کہ دم بھر میں سحر ہوتی ہے

جام بلور کا سادا قمر آرا چمکے
در مخانۂ مشرق کھلے ، تارا چمکے

ساقیا نشہ چلا ، طاقتِ رندانہ دے
جام کو چھوڑ کلید درِ میخانہ دے
مئے سے عجز کا نام ہے دم ، ہمت مردانہ دے
جس میں کل کفر سما جائے وہ پیمانہ دے

تیرے متوالے ہیں جو کرکے وضو پیتے ہیں
یوں پیوں جیسے کہ دشمن کا لہو پیتے ہیں

کیا کہنا۔ کیا جذبۂ تولا ہے۔ اور کیا تیور ہیں۔ سبحان اللہ۔

یہ وہ بادہ نہیں واعظ سے ہو جس میں تکرار
گود میں احمدؐ مختار کے پی ہے سو بار
سر کٹا کر جو پئیں ، ہیں وہ پرانے میخوار
تیغ کی دھار سے ہم ناپتے ہیں بادہ کی دھار

قلعوں سے پست نہ ذوقِ دلِ رندانہ ہو
کھول دیں گر درِ خیبر درِ میخانہ ہو

بادہ کش تو ہیں مگر پیشِ نظر ہیں احکام
ہر دم بادہ سے بڑھتے ہیں قوائے اسلام
ہم سمجھتے ہیں کہ کیا شئے ہے نجس اور حرام
آب شمشیر سے دھولیں گے سر عمرو کا جام

منتظر دیر سے ہے سید والا اپنا
پائے احمدؐ سے چھواتا ہے پیالا اپنا

اس ساقی نامہ میں کیسی نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے مضامین آپ نے ملاحظہ کیے اور کیسے کیسے

پر لطف، وجد آور اور پر کیف مصرعے، بیتیں اور بند آپ نے دیکھے جو شاید ہی پہلے نظر سے گزرے ہوں۔

## جنگ:

اب جنگ کا حال اختصار کے ساتھ۔ عمرو ابن عبدود غیظ و غضب کے عالم میں جناب علیؑ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا:

ابر کی طرح گرجتا ہوا آیا غدار
بجلی کی طرح سے چمکاتا روپہلی تلوار
کنپٹی، مونڈھا، کمر، کرنے لگا وار پہ وار
جیسے ساون کی گھٹاؤں سے گرے دھار پہ دھار

یہاں بھی تشبیہ وہ مثالی ہے۔ سبحان اللہ۔

پیش و پس تیغ چلانے پہ وہ دیوانہ تھا
شمع حق بیچ میں تھی رقص میں پروانہ تھا

پھر ایسی جنگ تھی، مقصود نہ تھے گھاؤں گراؤں
پینترے کا کھیل تھا ضائع کوئی کرتا نہ تھا داؤں
کھنڈے کے ہاتھ، اٹل پینترے، جمتے ہوئے پاؤں
برق پھیلی تھی میدان میں تلواروں کی چھاؤں

رعبِ شمشیر کا میداں سے نہ بار اٹھتا تھا
یا علیؑ کہتا ہوا رن کا غبار اٹھتا تھا

کیا اچھا مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

اس بند کے چوتھے مصرع میں مشاہدہ کی قوت، تخئیل کی بلندی، نزاکت خیال اور مضمون آفرینی کا جواب نہیں ہے۔ حضرت شاعر سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی۔ سبحان اللہ۔ اس طرح چھٹے مصرع کا مضمون بھی بالکل نیا اور حسن تعلیل کی حسین مثال ہے۔

ترپسینوں سے جبینیں تھیں لگا تھا ٹپکا
ذرے بھی دیکھتے تھے آنکھوں کو جھپکا جھپکا
عکسِ شمشیر کا تھا گرد کے سر پر چھپکا
جب چلی تیغِ علیؑ، ابر میں کوندا لپکا
چرخ تک جا کے چمک خاک پہ ہر بار آئی
لوگ یہ جانتے تھے دوسری تلوار آئی

کیا کہنا۔ عرش سے دوسری تلوار آنے کی تخئیل بالکل نئی ہے اور مضبوط دلیل کے ساتھ کہی گئی ہے۔ پورے بند میں لطفِ زبان بھی قابلِ داد ہے۔

ناگہاں عمرو نے حیدرؑ پہ لگائی تلوار
صاف عمامہ کٹا خوں کی چلی فرق سے دھار
سینہ و ریش و گلو کو کیا خوں سے گلنار
عمرو چلایا کہ وہ مارا، اسے کہتے ہیں وار
بازوئے احمدؐ و خالق کے ولی کو مارا
ختم اسلام ہوا، میں نے علیؑ کو مارا

اس طرف ضیغمِ احمدؐ نے جو چرکہ کھایا
خاصہ شیر کا تھا زخم سے جی جھنجلایا
خون بہنے سے دبا زور ابھر کر آیا
کفر کے سر پہ یداللہ نے ڈالا سایا
دفعتاً ضو جو گئی آنکھوں میں مستانہ ہوا
تھی پری تیغِ علیؑ، سائے سے دیوانہ ہوا

دور کی چوٹیں یداللہ دکھاتا ہی رہا
تاکا پالٹ کو مگر سر کو بتاتا ہی رہا

چوٹ کے روکنے کو ڈھال وہ لاتا ہی رہا
اڑ گئی ران تماچے کو بچاتا ہی رہا
گر پڑا پاؤں نے جب گردشِ تقدیر کی
فاتحانہ اسد اللہ نے تکبیر کہی

جنگ کے بیان میں مندرجہ بالا بندوں میں سے پہلے، دوسرے اور آخری بند میں شمشیر زنی کے مختلف داؤں پیچ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاعر فنِ سپہ گری سے بھی خوب واقف تھے۔

## مصائب:

آخر میں مصائب۔ حضرت علیؑ کا اہل حرم کو امام حسنؑ کے سپرد کرنا۔ جناب عباسؑ کا ہاتھ امام حسینؑ کے ہاتھ میں دینا۔ دنیا سے رحلت اور پھر کربلا کے حوالے سے ایک بند

دیکھ کر زخم سرِ پاک کو روئے حضرتؑ
اشک کو راہ ملی صبر نے پائی رخصت
رو کے حیدرؑ سے یہ کہنے لگے باصد رقت
ابن ملجم کی اسی جا پہ پڑے گی ضربت
آج تو بیٹھے ہیں ہم اشک بہانے کے لیے
کل نہ ہوگا کوئی سینے سے لگانے کے لیے

مسجدِ کوفہ میں آئے گا لئیم ابن لئیم
قاتل و جاہل و سفاک و ستم گار و اثیم
ہوگا یہ فرق دمِ سجدۂ اللہ دو نیم
رمضاں میں میرے بچوں کو بنائے گا یتیم
ظلم دیں تیغ سے جلاد کی برہم ہوگا
خوش عدو ہوں گے میری قبر پہ ماتم ہوگا

الغرض چھا گیا وہ وقت جہاں کے سر پر
جس کی چھتیس برس پہلے بتائی تھی خبر
سجدے میں تیغ سے جلاد کی زخمی ہوا سر
غش ہیں بستر پہ علیؑ، گھیرے ہیں ازواج و پسر
شمعیں لرزاں ہیں ہوا بند ہے دل پارہ ہے
آخری ڈوبتے مہتاب کا نظارہ ہے

ناگہاں چہرۂ بیمار پہ سرخی آئی
نرگسِ مست کھلی جیسے کلی مرجھائی
لبِ حیدرؑ پہ جو جنبش سی حسنؑ نے پائی
کہا شبیرؑ سے کچھ کہتے ہیں بابا، بھائی
ہاتھ اٹھائے ہیں وداعِ آل سے ہونے کے لیے
آنکھیں کیا کھولی ہیں منھ دیکھ کے رونے کے لیے

پھر بلا کر شہِ مرداں نے حسنؑ کو نزدیک
کیئے تعلیم امامت کے رموزِ باریک
دل میں پھر الفتِ اولاد کی پا کر تحریک
حلقۂ حفظِ حسنؑ میں کیا اک اک کو شریک
جعفرؑ و عونؑ کو بھی ساتھ میں شبرؑ کے دیا
ہاتھ اک ایک کا خود ہاتھ میں شبرؑ کے دیا

ہو چکے سب جو سپردِ حسنؑ نیک خصال
رنج سے مادرِ عباسؑ کا ابتر ہوا حال
دل میں یہ سوچ کے بیتاب تھی با حزن و ملال
کچھ خطا وار ہے عباسؑ جو آیا نہ خیال

ایک اک کو حسنِ سبز قبا کو سونپا
باپ نے کیوں نہ میرے ماہ لقا کو سونپا

ماں کے کاندھے پہ رکھے ہاتھ کھڑے تھے عباسؑ
تھرتھری جسم میں، چہرے کی طرح دل بھی اداس
دیکھا حیدر نے جو فرزند کا یہ عالمِ یاس
کہا یوں روتے ہو عباسؑ، آؤ میرے پاس
یہ ہے غمخوارِ حسینؑ اس لیے ہیں غمخوارِ حسینؑ
یہ وہ وصف ہے کہ جس کے ہیں خریدارِ حسینؑ

نبضِ غیب ابھی جاری تھی ابھی ہوتی تھی بند
گرد بستر کے فغاں کر رہے تھے حسرت مند
ناگہاں صبح ہوئی آنکھ علیؑ کی ہوئی بند
کہا جبریلؑ نے گردوں سے بہ آوازِ بلند
اپنے مولا سے سب اربابِ ولا چھوٹ گئے
آج ایمان و ہدایت کے ستوں ٹوٹ گئے

مرثیہ ختم کر اے شاعرِ بیمار و نزار
جوشِ گریہ سے نہیں طاقت و تابِ گفتار
عمر پوری ہوئی جینے کے نہیں لیل و نہار
اور جو روز ہیں وہ مدحِ ائمہ میں گزار
نہ زباں کو ہے بقا اور نہ دہن باقی ہے
مدحِ ممدوح کی باقی ہے سخن باقی ہے

یہاں یہ مرثیہ تمام ہوا۔ اس کا ڈھانچہ کلاسیکی مرثیہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے جس میں
اس نے سارے اجزائے ترکیبی یعنی چہرہ، منظر نگاری، رخصت، آمد، ساقی نامہ، جنگ اور

بیانِ مصائب سب کچھ شامل ہے۔ البتہ چہرہ میں ''اسلام اور مزدور'' کو موضوع قرار دیا گیا ہے جو جدید سے جدید مرثیوں سے بھی زیادہ جدید ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے اعتبار سے بھی منفرد اور بے مثال ہے۔ زبان و بیان کی شیرینی، نئی نئی تخئیلیں اور تعبیریں، نئی نئی باتیں جو پہلے کبھی نہیں کہی گئیں اس مرثیہ کو اردو کے رثائی ادب میں بلند ترین مقام پر فائز کرتی ہیں۔ تاریخی شعور اور صداقتیں اسلام میں عظمتِ محنت اور مزدور کی عزت و توقیر اور مرتبہ و مقام کو نمایاں کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں جن کی طرف عموماً کسی کی نظر نہیں جاتی۔ یہ اسلام کی بہت اہم خدمت ہے۔

## تاریخِ عزاداری:

حضرت شاعر کا ایک اور معرکہ آرا مرثیہ ''تاریخ عزاداری'' کے موضوع پر ہے جس میں انھوں نے برصغیر میں عزاداری سید الشہداء کے آغاز اور اس کے فروغ کی تاریخ بیان کی ہے۔ تاریخ اسلام سے ان کی حد درجہ دلچسپی اور اس کا وسیع مطالعہ بھی اس مرثیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق امیر تیمور جب برصغیر میں آیا تو اپنے ساتھ عزاداری سید الشہداء کا سامان بھی لایا۔ وہی اس کا نقطہ آغاز ہے۔ اس کے علاوہ یہ اس قوم کی بے حسی اور بے عملی کا مرثیہ بھی ہے جس نے اپنے کردار و عمل سے بے مثال عزت و عظمت حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے مقالہ میں اس مرثیہ کے دو بند نقل کیئے ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ مرثیہ میرے پاس ہے۔ میں مطلع سے لے کر سلطان تیمور کے تذکرہ تک اس کے چند بند یہاں درج کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہوں:

### تاریخ عزاداری:

تھا وہ اک عہد کہ معروف تھے مشہور تھے ہم
گوہرِ منتخبِ دیدۂ جمہور تھے ہم
کہیں سلطان کہیں حاکم کہیں دستور تھے ہم
اور جہاں کچھ بھی نہ تھے، کام کے مزدور تھے ہم

صبح سے دھوپ میں ہنگامِ شفق آتا تھا
سائے کے نام سے ماتھے پہ عرق آتا تھا

اسد الملبیوں کو دشت و جبل کا نہ تھا ڈر
ڈیرے تھے سبز شجر، ارض خدا تھی بستر
رات بھر حفظ خد رکھتی تھی آغوش میں سر
اس کو دیس بنا ہی کہیے، کیا جس دیس میں گھر

رزق دیتا تھا خدا دیکھ کے رغبت میری
ظرف صد رنگ ثمر کرتے تھے دعوت میری

مالک ارض تھا میں، پیش نظر تھی دنیا
کرۂ چشم میں سب یابس و تر تھی دنیا
میرے خالق کی تھی دنیا، مرا گھر تھی دنیا
پاؤں مضبوط تھے، ٹیکے ہوئے سر تھی دنیا

نوبتیں شاہوں کے در کی مرا دم بھرتی تھیں
کلغیاں تاجوں کی تسلیم کیا کرتی تھیں

واہ واہ واہ۔ کتنا خوب صورت مصرع ہے۔ سبحان اللہ۔

تھے قلمدانِ وزارت مرے سرکاروں میں
آلِ ایوب نے رکھا تھا علمداروں میں
تھے صہیب اور بلال اپنی ہی توروں میں
یوسفِ فاطمہؑ تھا مصر کے بازاروں میں

ہے شبِ ماریہ ممنون مرے گیسو کی
دولتِ عضدیہ اک رگ تھی مرے بازو کی

رنگ اچھالا جو رنگیلے نے مٹا دینے کو

ذرۂ نادری اٹھوایا چکا دینے کو
آئے ہوتے نہ اگر صرف سزا دینے کو
ملک راضی تھا ہمیں تخت پہ جا دینے کو
تاجداری نہ لی خوں کرکے پسینا ہم نے
جس کو بھائی کہا گھر اس کا نہ چھینا ہم نے

جو مجھے کہتے ہیں ظالم انھیں شرم آتی نہیں
مال جانے کا سبب عقل بھی سمجھاتی نہیں
صرف جنگ میں یہ چیز کہاں جاتی نہیں
کیا وہ دولت ہوئی، تاریخ بھی بتلاتی نہیں
کبریائی نہ پسند آئی مسلماں کے لیے
تخت طاؤس گیا شاہ خراساں کے لیے

بہمنی شاہِ دکن ہوگئے حیدرؑ کے غلام
عادلیہ نے عدالت کا لیا ہاتھ میں کام
اولیا میں لکھیں، ایسا ہے قطب شاہ کا نام
مکہ مسجد کے نمازی اسے کرتے ہیں سلام
حیدر آباد میں نام اس شہ ذیجاہ کا ہے
چار مینارہ عزا خانہ اسی شاہ کا ہے

ہم نے شاہی کی مگر رنگ ولایت نہ گیا
تھے خداوند مگر جذبۂ طاعت نہ گیا
تاج ماتھے پہ رہے، شوق عبادت نہ گیا
سجدے اتنے کیے، اک سنگ سلامت نہ گیا
مسجدیں راہوں کی چھٹتی تھیں نہ دیندروں سے
سجدے کرنے کو اتر پڑتے تھے رہواروں سے

اک لٹیرا جو ہوا والیِ بین النہرین
بہرِ زر لوٹ لیا روضۂ شاہِ کونین
یہ خبر سن کے اڑا دیدۂ تیمور سے چین
بولا، ہم زندہ ہیں تو لٹ نہیں سکتے ہیں حسینؑ
روز لٹتے رہیں شبیرؑ یہ منظور نہیں
نہ الٹ جائے جو بغداد تو تیمور نہیں

کوئی چرواہا کہے، کوئی گدا و مزدور
ہم کہیں فاتحِ چیں، ہو شربائے فغفور
ایشیا کے سرِ اقبال کا دیہیمِ غرور
ذرۂ خاکِ درِ حیدرِ صفدر، تیمور
جس نے شبیرؑ کا غم ہند میں منوایا تھا
تعزیہ تاج کی جا سر پہ بٹھائے آیا تھا

ڈٹ گیا تھا کہ در شہ سے نہ اب جاؤں گا
اور کیا تم سے بڑی چیز ہے جو پاؤں گا
ہوا ایسا، نہ غم ہجر میں تڑپاؤں گا
تعزیہ میرا جہاں ہوگا وہاں جاؤں گا
ہند میں رنگ دکھائے گی شہادت میری
اب تو خوش ہے کہ ترے گھر میں ہو تربت میری

ایک تربت بنی بھر خاکِ شفا سے سردست
زندگی بھر رہا تیمور مئے عشق سے مست
اپنے ہی دعووں سے ہوتی ہے مورخ کو شکست
کون اس کو کہے ظالم جو ہو مظلوم پرست

چتر کے سائے تھے تلواروں کے یا سائے تھے
اس طرح ٹھاٹھ سے دلی میں حسینؑ آئے تھے

اسی طرح دیگر شیعہ صاحبانِ اقتدار و وزرا اور روسا وغیرہ کا ذکر ہے جو اس قوم کی آبرو تھے۔ اس مرثیہ کی شاعرانہ عظمت اتنی بلند ہے کہ تعریف کے لیئے الفاظ نہیں مل سکتے۔ ایسے ایسے بند، ایسی ایسی بیتیں اور ایسے ایسے مصرعے ہیں کہ جیسے فصاحت وسلاست کے دریا بہہ رہے ہوں۔ ایک تذکرہ میں پورے پورے مرثیے نقل نہیں کیئے جا سکتے۔ یہ مجبوری ہے۔ ورنہ قارئین خود ملاحظہ کرتے کہ یہ مرثیہ شاعری میں معجز نمائی کی شان رکھتا ہے۔ موضوع اس قدر نیا اور تاریخ پر اس قدر عبور دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

## مسلمانوں کا عروج وزوال:

جناب مہدی نظمی مرحوم نے ''اسلام اور مزدور'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

''راز یزدانی مرحوم اور میں نے ابا جان مرحوم سے اصرار کر کے ایک مرثیہ کہلوایا جس کے چہرے میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ نظم کی گئی ہے۔ یہ مرثیہ تقریباً چار سو بندوں پر مشتمل ہے اور ابا جان مرحوم کی تاریخ دانی، حب الوطنی اور دین فہمی کا شاہکار ہے''۔

## مرثیوں کی تعداد:

خوش قسمتی سے یہ مرثیہ بھی میرے پاس ہے مگر بدقسمتی سے اس کے بیشتر بند کاغذ کی خستگی اور کتابت کے خراب ہو جانے سے پڑھنے میں نہیں آتے۔ اس کا مطلع ہے

حق نے اسلام کو جو دی تھی وہ دولت نہ رہی

میرے پاس جو اس کی نقل ہے، اس میں چار سو نہیں صرف ایک سو ستر بند ہیں۔ ہلال نقوی صاحب کا بیان بھی بظاہر درست نہیں ہے کہ اس میں ۳۰۱ بند ہیں۔ ممکن ہے کہ مرثیہ نقل کرنے والے نے پڑھنے کے لیئے اس کی تلخیص کر کے صرف ایک سو ستر بند نقل کیئے ہوں۔

جناب مہدی نظمی مرحوم کا بیان ہے:

''یوں تو ابا جان مرحوم نے نجانے کتنے مرثیے کہے جو دوسروں کے ہاتھ لگ گئے اور اب انہیں کی ملکیت ہیں......... لیکن ان کے چار مرثیے جو میرے چھوٹے بھائی عزیزی سید شمس الحسن تاج کے پاس محفوظ ہیں، ان کی شاعری کے اعلیٰ معیار کے ثبوت کے لیئے کافی اور بہت کافی ہیں''۔

(اسلام اور عزاداری ص، ش)

ان چار مرثیوں میں سے دو مرثیوں کے اقتباسات آپ نے یہاں ملاحظہ فرمائے جن سے حضرت شاعر کی شاعری کے علی معیار کا بہت واضح اور ناقابل تردید ثبوت ملتا ہے۔

## مرثیہ گوئی کا انداز اور زود گوئی

ڈاکٹر ہلال نقوی نے ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں قیصر امروہوی صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''اولاد حسین شاعر نے کثرت کے ساتھ مرثیے کہے۔ ان کا انداز بالکل نیا تھا اور اس قدر زود گو تھے کہ ایک نشست میں پورا مرثیہ املا کرا دیا کرتے تھے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ چشم دید حقیقت ہے''۔ (ص ۲۸۸)

چونکہ قیصر امروہوی صاحب رامپور کے تعلق سے حضرت شاعر کے بہت قریب رہے تھے اس لیے ان کی زود گوئی کے متعلق ان کی چشم دید شہادت پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر میرے مشاہدہ میں ذاتی طور پر یہ بات نہیں آئی اس لیئے میں اس کی تصدیق تو نہیں کر سکتا لیکن میں نے خود یہ دیکھا ہے کہ ان کے مکان کی باہری بیٹھک جس میں سفید چاندنی کے فرش پر دو کاتب حضرات بیٹھے ہوتے تھے، حضرت شاعر اس کمرہ میں اس سرے سے اس سرے تک ٹہلتے جاتے تھے اور دونوں کو مرثیہ املا کراتے جاتے تھے۔ ان کی بہو صاحبہ کا بیان ہے کہ صرف دس پندرہ منٹ میں آٹھ دس بند لکھوا دیتے تھے۔ اس سے جناب قیصر امروہوی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

## سلام ونوحہ گوئی:

### حضرت مہدی نظمی نے لکھا ہے:

"والد مرحوم نے بلا مبالغہ ہزاروں نوحے اور سلام کہے۔ یہ نوحے اور سلام لکھنؤ اور حیدرآباد کی ماتمی انجمنیں اب بھی پڑھتی ہیں لیکن ان کا کوئی ذخیرہ محفوظ نہیں ہے"۔

میں نے آج سے کوئی پچاس پچپن سال پہلے لکھنؤ کی ایک مشہور ماتمی انجمن عابدیہ کاظمیہ سے جواب کراچی میں بھی قائم ہے، حضرت ساحر کا ایک سلام بہت مشکل قوافی میں سنا تھا۔ اس کے دو تین شعر مجھے یاد ہیں جو درج ذیل ہیں

نبی کی آل کو جس سے گزند ہوتی ہے وہ کس شریف کو دنیا پسند ہوتی ہے

ابھی زمانے نے چھوڑا نہیں ہے عترت کو ہوا بھی ساتھ اسیروں کے بند ہوتی ہے

پھر ایک بار ذرا مسکرا دو اے اصغر اخیر وقت ہے، اب قبر بند ہوتی ہے

اس سلام میں انھوں نے سمند اور کمند وغیرہ ایسے مشکل قوافی کو نظم کرنے میں پہل کر دی ہے۔ ان تین اشعار ہی سے ان کی سلام گوئی کا بلند معیار نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

## مختار نامہ:

میر وارث حسین صاحب مرحوم نے اپنے فرزند دعبل ہند حضرت ساحر کو غزل گوئی سے زیادہ مذہبی شاعری اختیار کرنے کا مشورہ دیا جو کار ثواب بھی ہو۔ اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ مختار نامہ نظم کریں۔

یہ ذکر آچکا ہے کہ مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی وہ شخص تھے جنھوں نے واقعہ کربلا کے بعد انتقام خون حسینؑ پر کمر باندھی اور قاتلان حسینؑ اور ذمہ داران قتل آل رسولؐ کے خلاف خروج کر کے تمام قاتلوں کو گرفتار کیا اور ان سے عبرتناک انتقام لیا۔ یہ تاریخ اسلام بعد کربلا کا ایک اہم واقعہ ہے۔

اپنے پدر بزرگوار کے حکم پر حضرت ذاکر نے اپنے بھائی خطیب اعظم مولانا سبط حسن صاحب فاطر مرحوم کے ساتھ مل کر مشترک طور پر مختار نامہ نظم کرنا شروع کیا اور سات ہزار اشعار کہے۔ یہ مختار نامہ مثنوی کی ہیئت اور بحر میں ہے۔ بعد میں انھوں نے اپنے فرزند ارجمند حسن الشعرا مولانا اور حسین صاحب عرف مولوی للّن صاحب شاعر اعلی اللہ مقامہ کو اس پر مامور کیا کہ وہ اس کام کو مکمل کریں۔ چنانچہ حضرت شاعر نے اس میں گیارہ ہزار اشعار کا اضافہ کر کے اسے اٹھارہ ہزار اشعار تک پہنچا دیا۔ مگر نظم اس کے بعد بھی نامکمل رہی۔

حضرت مہدی نظمی مرحوم نے "سلام اور مزدور" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ان کے والد بزرگوار حضرت شاعر نے مختار نامہ میں پچیس ہزار اشعار کا اضافہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ فردوسی کے شاہنامہ کی طرح اس مثنوی کو بھی ساٹھ ہزار اشعار تک پہنچا دیں مگر زندگی نے وفا نہیں کی۔

حضرت مہدی نظمی کا یہ بیان تصدیق طلب ہے۔ حضرت شاعر نے ۱۹۵۰ء تک مختار نامہ میں گیارہ ہزار اشعار کہے تھے جیسا کہ انھوں نے خود ہفتہ وار "سحاب" کی ۱۹۵۰ء کی ایک اشاعت میں لکھا تھا۔ ستمبر ۱۹۵۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک سات سال کے عرصہ میں انھوں نے مختار نامہ پر مزید کام کیا یا نہیں۔ اور کیا تو مزید کتنے اشعار کا اضافہ کیا۔ حضرت مہدی نظمی کے بیان کی تصدیق کسی اور تحریر سے نہیں ہوتی۔ اس لیئے یہ بیان تصدیق طلب ہے۔

صرف ایک نظم میں گیارہ ہزار اشعار کہنا بھی ان کی قوت نظم، زود گوئی اور تاریخ اسلام پر عبور کی ایک روشن دلیل ہے۔ کسی دوسرے شاعر کے یہاں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

## قصیدہ نگاری:

حضرت شاعر جتنے عمدہ مرثیہ گو تھے اتنے ہی اعلیٰ درجے کے قصیدہ نگار بھی تھے۔ [illegible] ردیف و قوافی میں ان کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

بابِ معصومین پر ہوتا پہنچ جاؤں گا میں

فاصلہ کوثر کا میرے گھر سے چودہ[۱۴] میل ہے

اسی طرح ایک قصیدہ انھوں نے اردو اور ہندی کی ملی جلی زبان میں کہا جو دونوں زبانوں پر ان کی حاکمانہ قدرت کا عکاس ہے۔ اس کا مطلع ہے

پھر تیرہ رجب ہے، دیر عرب ہے، شمع میں حسن کاشی ہے
ہاں مورے چندرما درشن دکھلا آج تو پورن ماشی ہے

## ایک دلچسپ واقعہ:

ہندوستان کے شہر ممبئی میں ایک قصیدہ خوانی کی محفل منعقد ہوئی۔ حضرت شاعر بھی اس محفل میں تشریف فرما تھے۔ ایک شاعر صاحب نے حضرت شاعر کا ایک قصیدہ جو دھائیں دھائیں اور ہائیں ہائیں وغیرہ کے قوافی میں غیر مردف ہے ان کی موجودگی ہی میں اپنے نام سے پڑھ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت شاعر اعلی اللہ مقامہ نے ہفتہ وار ''سحاب'' لکھنؤ میں یہ واقعہ لکھ کے یہ لکھا:

''نہ تو میں ہجرت کر کے پاکستان گیا نہ میری جائیداد بحق سرکار ضبط ہوئی۔ پھر میری یہ جائیداد (قصیدہ) کسی کو کیسے الاٹ ہوگئی''۔

## فارسی کلام:

حضرت شاعر کے فارسی کلام کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو

السلام اے شہِ خوبانِ غریب الوطنی
حائری ، کرب و بلائی ، نجفی و مدنی
خامسِ آلِ عبا ، تکملۂ پنجتنی
لالہ رخ ، سرخ قبا ، معدنِ لعلِ یمنی

چوں دو نفسیں بسا طلعتِ زیبا داری
''انچہ خوباں ہمہ دا رند ، تو تنہا داری''
(تضمین)

فاطمی ، مصطفوی ، مرتضوی ، مطلبی
ہاشمی و قرشی ، قدس مکین و عربی
فلکی و ملکی ، نوری و عالی نسبی
نسبت بوالبشر از تو کہ عجب خوش لقبی

قاب قوسین دنیٰ منزل نظارۂ تو
طائرِ سدرہ پر انداخت بہ گہوارۂ تو

حضرت ساحرؔ کی نظموں کے مشہور مجموعے ''سبد گل'' میں ہز ہائینس نواب صاحب رامپور کی مدح میں ان کا ایک قصیدہ شامل ہے جس کی ردیف قصیدہ کے لیے بہت مشکل ہے مگر انھوں نے اس کو سہل ممتنع بنا دیا۔ قصیدہ ملاحظہ ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## ظفرنامہ

بہ پیش گاہ فلک جاہ حضور پرنور فرماں روائے دارالسرور رامپور خلد اللہ ملکہٗ دام اقبالہٗ

وہ بہار آئی برائے فتح میدانِ ظفر　سرو نے کھولا ہے پرچم پا کے سامانِ ظفر
رعد ہے یا طبلِ فتح خسروئے ملکِ چمن　ابر میں بجلی ہے یا شمشیرِ برانِ ظفر
مرسل فاتح تھی بہر مدعی خود فصل گل　سبزۂ گلزار تھا طومار فرمانِ ظفر
فوج بادل تیغ بجلی جائے پیکاں بوندیں　دامنِ سبزہ نشانِ نور افشانِ ظفر
سرو کی صف میں جوانانِ جری ثابت قدم　اور نقیب فوج طائر مدح خوانانِ ظفر
جب صنوبر کے پیادوں کی قطاریں جم چکیں　سبزۂ گلشن پہ جم بیٹھے سوارانِ ظفر
یوں خزاں کی سمت دل بادل جو فوجوں کے بڑھے　رعد چلایا کہ ہم لے لیں گے میدانِ ظفر
دب گئی فوج خزاں بارش سے تیروں کی ہوئی　سر سے اونچا ہو گیا کانٹوں کے طوفانِ ظفر
جھک گئے خاروں کے نیزے ہٹ گئی فوج خزاں　ہو گیا نرگس کو سکتہ دیکھ کر شانِ ظفر

خونِ دشمن کے نشاں گلہائے رنگین بن گئے ۔۔۔ دامن گلزار سے ملتا ہے دامان ظفر
غیظ میں دشمن کو سنبل نے کیا ہے قتل یوں ۔۔۔ بل رہی ہے دوش پر زلفِ پریشان ظفر
خونِ دشمن سے زمین باغ کے جاگے نصیب ۔۔۔ دیر تک برسا کیا گھر گھر کے باران ظفر
قلعۂ امید دشمن سر کیا اس شان سے ۔۔۔ خود پکار اٹھی ہزیمت بھی کہ قربان ظفر
بازگشت آرزو کی اب نہیں امید بھی ۔۔۔ کردیا پسپا غرض تا حد امکان ظفر
کون یہ فاتح، بہار آرائے باغِ رامپور ۔۔۔ دم قدم سے جس کے ہو آباد بستان ظفر

کون وہ حامد علی خان شاہ و سلطان ظفر
جن کا اک پیکِ صبا رو ہے سلیمانِ ظفر

فتح اسلام کا بازو کی رگ میں ہے لہو ۔۔۔ آپ کو شایاں ظفر ہے آپ شایان ظفر
آپ کا ہے اخترِ اقبال تاجِ فرقِ مہر ۔۔۔ جانتے ہیں رمز یہ اختر شناسانِ ظفر
روزِ میثاق اور کیا رکھتا ہے معنی گر نہیں ۔۔۔ استوار اس دامنِ دولت سے پیمانِ ظفر
عمر دائم ملک قائم حکم جاری، عدل بیش ۔۔۔ ہو عطا اللہ کی جانب سے فرمانِ ظفر
روبرو دشمن کے فطرت منقلب ہو اس طرح ۔۔۔ ہو سگِ در آپ کا شیرِ نیستانِ ظفر
یونہی یارب شاہد مقصد کے گیسو بنتے جائیں ۔۔۔ آج تک سنورا کیے جس طرح سامان ظفر
ہر قدم دشمن پہ خالق آپ کو غالب کرے ۔۔۔ دے فتوحات اس قدر جتنا ہے امکان ظفر

ہے دعا پر ختم اے شاعر دعا گوئی کا حق
بڑھتی جائے شان سے سرکار کی شان ظفر

اس قصیدہ سے آپ کو ان کی قصیدہ گوئی کے معیار کا بخوبی علم ہوسکتا ہے اور یہ بھی کہ وہ کس طرح سنگلاخ زمینوں میں بہتے ہوئے پانی کی طرح مصرعوں کو رواں کر سکتے تھے۔

## رباعیات:

یہ لکھا جا چکا ہے کہ حضرت شاعر ہر صنف سخن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ رباعی گوئی تو یوں بھی مرثیہ گو شعرا کا خاص میدان تھا۔ انھوں نے بھی بہت رباعیاں کہیں مگر اس وقت

عصر کے ہنگام کرتی ہیں شعاعیں زر نثار
مہر ہے چوٹی پہ جن کی، کوہ ہیں وہ تاجدار
ہیں زمرد پوش گھر آثار سے برسات کے
خلعتِ شاہی کے جوہر ہیں مکاں دیہات کے

کوہ زر پوش آسمان زر ریز صرصر زر فشاں
ہے ڈلا سونے کا عکسِ مہر سے اک اک مکاں
طیرِ نورِ شمس کا ہے ذرہ ذرہ آشیاں
سنگریزے انجم بن جائیں جو چن لے آسماں
کھینچ لے جذبِ فلک ان کو جو ہیں چھوٹے ہوئے
یہ ستارے رہ گئے ہیں رات کے ٹوٹے ہوئے

وہ فرازِ کوہ سے دامانِ صحرا کی فضا
کھیل سوجھا ہے اترتی چڑھتی پھرتی ہے ہوا
کوہ سے کچھ دور پر میداں میں ہے چشمہ کی جا
جس کا پانی شہد جس کی موجیں آیاتِ شفا
چشمۂ صافی کو یوں گھیرے ہے سبزہ پاس کا
جیسے میناکار انگوٹھی پر نگیں الماس کا

چشمہ کے لب تک ہے سبزہ کوہ دامن دار کا
یہ مکاں ہے منبع گل غم نہیں ہے خار کا
ہے یہ جلوہ گاہ اک دوشیزۂ کہسار کا
چشمہ آئینہ ہے جس کے چاند سے رخسار کا
پانی گلہ کو دکھایا سیر ہونے کے لیئے
خود بھی آ بیٹھی کنارے پاؤں دھونے کے لیئے

[illegible] میں چھوٹے شجر کے سنگ پر جلوہ گیا
بانسری پہلو میں رکھی ہاتھ سے چھوڑی عصا
تنگ تھی گھٹنے پہ ساری کی جو بندش اک ذرا
ہاتھ سے الٹ کنارہ پاؤں کو پھیلا دیا
گورے گورے پاؤں پانی میں نظر آنے لگے
جو نوں کے پھول تھے چشمہ میں شرمانے لگے

بانسری چرواہوں کی سینوں کو برمانے لگی
لے لیے پیلو کی جنگل میں ستم ڈھانے لگی
ذرہ ذرہ سے صدائے الرحیل آنے لگی
گنگنا کر نوجواں لڑکی بھی کچھ گانے لگی
حسن میں ڈوبے ہوئے نغمے اثر دکھلا گئے
جانور سمجھے کہ جنگل میں کنھیا آ گئے(۱)

اس جواں لڑکی میں بھی ہے حسن فطرت کا ظہور
گوہری ٹیکے سے بالاتر ہے پیشانی کا نور
مسکراہٹ میں ہے بجلی کی شباہت تو ضرور
یہ حیات افزا ہے اور قاتل تھی برق کوہ طور
لن ترانی کیوں ہو یوں، چہرہ تہ دامن نہیں
یہ زمین ہند ہے کچھ وادی ایمن نہیں

ناک میں وضع خرامہ(۲) پر وہ نتھ [illegible] جس کا مول
جس سے ظاہر ہے کہ غربوں سے رہا بے میل جول
فرق تک بھی وہ ساری جو سر پر آ کے ڈول

---

(۱) کنھیا جی ہندوؤں کے مشہور بانسری نواز اوتار ۱۲۔
(۲) خرامہ عربی زیور جو گجراتی نتھ سے مشابہ ہوتا ہے۔

پردہ دار جوشِ فطرت ترچھے آنچل کا وہ جھول

رنگ رخ سے ماند پڑ جائے اوجالا چاند کا
سادے چہرے پر وہ آنچل جیسے بالا چاند کا

کالے کالے تا کمر لٹکے ہوئے ریشم سے بال
ایک اک حلقے میں فطرت کے نہاں سو سو کمال
ہر خم گیسو میں الجھے مدتوں حسن خیال
سوئے پیشانی کا دیکھو گورے ماتھے پر جمال

آنکھ میں شرم آ چکی اب وقت پردہ ٹھیک ہے
کہتا ہے گھونگھٹ دلھن بننے کا دن نزدیک ہے

حسن کا ماتھے پہ تارا روئے روشن آفتاب
مسکراہٹ لب کی خنقی آنکھ میں شرم و حجاب
مچھلیاں تھیں انگلیاں پاؤں کی چھپ کر زیر آب
پاؤں کی مٹی کو آنکھوں سے چھڑاتے تھے حباب

شوق سے جذبے حبابوں پر تمام ڈھانے لگے
پاس سے لے کھینچ کھینچ [illegible] آنے لگے

دیکھتی تھی وہ ہٹا کر پاؤں چشمہ کی بہار
ٹوٹتی تھی بن کے سو سو بار موجوں کی قطار
مہر کا تھا عکس پانی میں کہ قلب بے قرار
اس کو حیرت تھی کہ کیوں دل ہے حبابوں کا فگار

چشم قاتل میں جو تھا اس تیر سے واقف نہ تھی
وہ موثر تھی مگر تاثیر سے واقف نہ تھی

پاک و پاکیزہ دل معصوم کا تھا ہر خیال

کون سمجھاتا کہ شاعر سا ولی کوئی نہ تھا

یہ نظم آپ نے ملاحظہ کی۔ میں نے اس کی طوالت کو کم کرنے کے لئے بہت سے بند حذف کر دیئے مگر تسلسل کا خیال رکھا ہے۔

اب دوسری نظم ''برسات''۔ یہ بھی مسدس کی ہیئت میں ہے اور تاریخی جھلکیوں سے آراستہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

## برسات

۱۔ ابر تو سیاح ہے قصہ کوئی اس سال کہہ
ذکرِ عہدِ ہند کر، حالات ملک و مال کہہ
تو نے چشمِ تر سے جو دیکھا ہے وہ احوال کہہ
اے ہوائے سرد ٹھنڈی سانس میں کچھ حال کہہ
چھیڑ اک درکار ہے آنسو بہانے کے لیئے
ہم بھرے بیٹھے ہیں رو رو کر رولانے کے لیئے

۲۔ جستجو کس کی ہے تو کیوں پھر رہا ہے دربدر
بے قرار و مضطرب ناسور دل شوریدہ سر
چشمِ تر، آلودہ دامن، دل حزیں و نوحہ گر
کب چمک جائے گی کب ٹھہرے گا یہ دردِ جگر
تیرے نالوں کا اثر ہے صاحبانِ داغ میں
مور بن میں چیختا ہے اور کوئل باغ میں

۳۔ تو اگر سیاح ہے تو ہم ہیں تیرے قدرداں
آ تجھے دکھلائیں سیرِ کشورِ ہندوستاں
تو مسافر ہے اگر تو ہے ہماری میہماں
ہند والے ہیں ہمیشہ سے مبارک میزباں

کون کون اس کشور معروف میں آباد نہیں
کس نے کس نے ہم غریبوں کا ستم ڈھایا نہیں

۴۔ دشت میں کیا رکھا ہے آ شہر کے بازار دیکھ
قلعۂ دہلی میں چل تاریخ کے آثار دیکھ
خاص دیواں دیکھ چابکدستیٔ معمار دیکھ
شہ نشیں بے شمع دیکھ اجڑی ہوئی سرکار دیکھ
خشک حوضوں سے ہے بے چینی سی خاص و عام کو
ساتھ لائی ہو اگر پانی تو بھر حمام[1] کو

۵۔ دیکھ جمنا کے کنارے قلعہ کی بارہ دری
خشک ہیں نہریں مگر حسرت تو ہے ان میں بھری
قد میں فواروں کی ہے مستور شانِ دلبری
موتی مسجد کی ہے آب و تاب اب تک گوہری
دیکھ لے مسجد مصلّے تک گذر دشوار ہے
تھا جو اس موتی کا مالک[2] وہ سمندر پار ہے

۶۔ آگرہ چل دیکھ آ جنت کے نقشہ کا مکاں[3]
نام ہے تاج اور سرتاجِ عماراتِ جہاں
کوہ پر کیوں جھک، ادھر آ، ہے یہ شاہی آستاں
دشت میں قدرِ وفتاں کیوں ہے یہاں ہو گلفشاں
ہے شبِ وصلِ غریباں گرچہ شامِ تار ہے

---

(۱) قلعہ دہلی کے مشہور حمام۔
(۲) آخری بادشاہ دہلی کی وفات رنگون میں ہوئی ہے۔
(۳) تاریخ [illegible] میں ایک روایت یہ بھی بیان کی ہے [illegible]
شاعری میں بیان کرنا بے محل نہیں ہے۔

سیج گل کی اس مسہری کے لیئے درکار ہے

۷۔ آ اُدھر بھی دفن جس جا ہند کا فغفور ہے
چپ ہے درباں بھی کہ اکبر نیند میں مخمور ہے
بامِ خانہ پرنشانِ جائے کوہِ نور ہے
ظرف خالی ہے مگر یا دیدۂ بے نور ہے
بام پر رو، غم نہ کر، گر دور ہے تو شاہ سے
اشک کا قطرہ پہنچ جائے گا مٹی[1] راہ سے

۸۔ لکھنؤ چل ہم غریبوں کا وطن بھی دیکھ لے
جس کا بلبل تھا قفس میں وہ چمن بھی دیکھ لے
ہے جو رنڈ سالہ میں وہ تازہ دلھن بھی دیکھ لے
تو نے دیکھا ہے عروجِ مہ، گہن بھی دیکھ لے
وہ گہر پایا نہ پھر، ڈھونڈھا نہ کس کس درج میں
ہے ہمارا اخترِ تقدیر مٹیا[2] برج میں

۹۔ آصف الدولہ کی تربت اور عزا خانے کو دیکھ
دل کشا[3] ہے بستۂ دل عبرت کے افسانے کو دیکھ
چتر[4] منزل ہے کلب بن کر بگڑ جانے کو دیکھ
خاک اڑتی ہے در دولت[5] سے ویرانے کو دیکھ

---

(۱) سانڈرہ کی عمارت میں یہ ایک خاص صنعت بیان کی جاتی ہے۔

(۲) سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم کا تخلص اختر تھا اور کلکتہ سے متصل جس مقام پر قبر ہے اور جہاں آخری حیات کی پرحسرت گھڑیاں گزری ہیں اس کا نام مٹیا برج ہے۔

(۳) لکھنؤ کی ایک شاہی عمارت جو صدر بازار چھاؤنی کے قریب شکستہ پڑی ہوئی ہے۔

(۴) نصیر الدین حیدر بادشاہ مرحوم کا محل شاہی کوٹھی سے عبارت ہے۔

(۵) شاہی محل کا حصہ جس کا ایک دروازہ [illegible] کے قریب تھا۔

ابر رویا ، برق تڑپی ، رعد نے نالہ کیا
اک صدا آئی کہ شاعر ہائے تو نے کیا کہا
یاد کیوں دلوائی اُن کی جن کی قسمت پھر گئی
چشم تر میں کیا کہوں کس کس کی صورت پھر گئی

۱۳۔ کیوں بلاتا ہے مجھے کیا رکھا ہے بزار میں
اُس سے بچنا چاہیئے جو ملک ہو ادبار میں
ہو فساد اہل تمدن میں تو چل کہسار میں
خودغرض شہری ہوں ، تو بہتر ہے رہنا غار میں
نکتہ چینی خودپسندی شہر کو مرغوب ہے
تجربہ آخر ہوا گوشہ نشینی خوب ہے

۱۴۔ نفع خلقت سے مری رغبت پرانی ہے وہی
جو حیات تازہ دے کھیتوں کو پانی ہے وہی
ہے عبث قسمت میں جب زحمت اٹھانی ہے وہی
فصل بارآور سہی لیکن گرانی ہے وہی
کر نہیں سکتی مداوا بخت کے میں پھیر کا
پہلے من کا نرخ تھا اب رہ گیا ہے سیر کا

۱۵۔ سیر دہلی کو نہ کہہ چبتی ہے دل پر تیغ غم
میزباں جو تھا ہوا مہمانِ اقلیم عدم
اس سیہ طالع کو بخشش تھا لقب ابر کرم
مسکرا دیتا تھا وہ ، جب جھوم کر اٹھتے تھے ہم
سجدے کرتا تھا وہ نفع اہل دنیا کے لیئے
شکر ہے ابر آ گیا میری رعایا کے لیئے

۱۶۔ فکر پیدا ہوتی تھی اس کو مری تاخیر سے
تیغ تھیں [illegible] میں قوت [illegible] سے
ان سے [illegible] جب میں جاتی تھی [illegible] تدبیر سے
بعد میرے وہ بہلتے تھے مری تصویر سے
روک رکھنے کی تمنا تھی دل ناشاد میں
ساون اور بھادوں بتائے تھے ہماری یاد میں

۱۷۔ دل تڑپتا ہے قدیمی مہربانی کے لیے
میزبانی کے لیے اور میہمانی کے لیے
[illegible]
آئی ہوں قبروں پہ خونابہ فشانی کے لیے
قصد دید کا ہے اور ہمراہ یہ سامان ہے
برق شمع قبر ہے اور رعد قرآں خواں ہے

۱۸۔ صاحبان وضع اور اہل ہنر باقی نہیں
گرم خاکستر سہی لیکن شرر باقی نہیں
سجدہ گہ تھے جو زمانے کے وہ در باقی نہیں
[illegible] باقی نہیں
صاحب فن حاکم شرع مبیں باقی نہیں
آسماں جھکتا تھا جس سے وہ زمیں باقی نہیں

۱۹۔ وہ شریک میر شاہی مجتہد گر جس کا باپ
تاجدار کشور علم و عمل رضواں مآبؒ

---

[illegible]
[illegible]
مراقعے شرعی کا فیصلہ کرتے تھے۔

خاندانِ اجتہاد اُس مُہر سے تھا آفتاب
جس کے آگے میرا دامن تنگ وہ علمی سحاب
اُس نے جس چشمہ کو دیکھ بڑھ کے دریا ہو گیا
ملک و ملت کو جگا کر خود لحد میں سو گیا

۲۰۔ آتش و انشا و سودا، ناسخ و میر و وزیر
مصحفی و کامل و صابر، تعشق اور اسیر
فاخر و جاوید و عارف، بحر اور برق و امیر
رند و ہندی و رشید، انس و انیس اوج و دبیر
جس کو ڈھونڈو کھو گیا اور جس کو پوچھو مر گیا
صفحہ خالی ہو گیا اور جوف گیتی بھر گیا

۲۱۔ پہلے آنے کا مرے رہتا تھا سب کو انتظار
دو مہینہ قبل سے ہوتا تھا سامانِ بہار
پہلے سے بنتی تھی مصنوعی پہاڑوں کی قطار
تاکہ میرے آتے ہی ہو جائے جاری آبشار
سبزہ کی حد باندھ کر تیار ہوتے تھے چمن
رعد کی آواز سے بیدار ہوتے تھے چمن

۲۲۔ ایشیائی تھا مذاقِ باغ، تقلیدی نہ تھا
آ چکی تھی گو، مگر دھیمی تھی مغرب کی ہوا
جن میں خوشبو تھی انھیں پھولوں کی تھی گلشن میں جا
جوہی اور بیلا، چنبیلی، موتیا اور موگرا
دل کسی کا جس سے جل جائے وہ ڈھنگ آتا نہ تھا
... کے آگے کبھی نامِ فرنگ☆ آتا نہ تھا

☆ایک سرخ پھول۔

۲۳۔ [illegible]

[illegible]

صاف تھے [illegible]

میں خنبلی تھی وہیں پہنے ہوئے اودا لباس

نہر آئینہ تھی پیدا اپنا اپنا رنگ تھا

دھار میں فواروں کی قوس قزح کا رنگ تھا

۲۴۔ ہر طرف کنج چمن میں مختصر بارہ دری

سنگ مرمر کی بنی آراستہ جیسے پری

گنبد ان کے وہ سفید اور ان پہ وہ بیلیں ہری

میری شیدا بیگموں کی ان میں وہ جلوہ گری

میری صورت ایک اک کی وہ جوانی جوش پر

سرخ آنچل سر پہ اور دھانی دوپٹہ دوش پر

۲۵۔ [illegible]

فالسئی اور دھانی رنگ کی دل کو طلب

عطر خس کی وہ خنک خوشبو معطر باغ سب

میری ہم رنگی کی حسرت میں مسی آلود لب

چوڑیاں دھانی غضب برسات کے سامان میں

[illegible]

۲۶۔ [illegible]

جھولنے کا شوق اور اٹھتی جوانی کا وہ زور

گنگا جمنی پیڑے اور ان میں کلابتو کی ڈور

ہاتھ کی رسی سے جکڑے جاتے تھے مہندی کے پور

مٹھیاں گوری ہیں اور رنگِ رسن گلنار ہے
نقرئی فواروں سے اونچی لہو کی دھار ہے

۲۷۔　پینگ اترتا ہے جو اونچا ہو کے زیرِ آسماں
ہوتا ہے تختِ سلیمانؑ کے اترنے کا سماں
طائروں کو بھی ہے ان پریوں کے اڑنے کا گماں
پینگ جب آگے بڑھا بولا پپیہا پی کہاں
یوں زمیں پر پینگ آتے ہیں زمیں سے چھوٹ کے
آسماں سے جس طرح گرتے ہوں تارے ٹوٹ کے

۲۸۔　جا بجا میلے تھے، جس کو دیکھیئے دل شاد تھا
کوئی کوئل کے سوا کب مائلِ فریاد تھا
بادشہ زندہ تھے زورِ بذل و عدل و داد تھا
ذکر ہے اس عہد کا جب لکھنؤ آباد تھا
ہوگیا اندھیر شاعرؔ تیری قسمت سو گئی
جھلملاتی شمع جو باقی تھی آخر ہوگئی

یہ نظم بھی آپ نے ملاحظہ کی اور دہلی اور لکھنؤ کی کچھ تاریخی جھلکیاں دیکھیں۔ اس نظم کو بھی میں نے مختصر کر کے درج کیا ہے اور متعدد بند چھوڑ دیئے ہیں تاکہ اس کی طوالت کم کی جاسکے۔

ان کے علاوہ "سبدِ گل" میں اور بہت سی نظمیں ہیں اور اسی طرح پر کیف اور وجد آور ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تہواروں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور طویل نظمیں لکھیں۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے "پان کی گلوری" یہ نظم محاکات کا شاہکار ہے اور بقول حضرت مہدی نظمی شاید اس پایہ کی نظم اردو زبان میں نہیں ہے۔ افسوس کہ وہ مجھے دستیاب نہیں ہوسکی۔

## غزل گوئی:

حضرت شاؔعر غزل کے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزلیں ندرت وجدت خیال کا بہت اعلیٰ نمونہ تھیں۔ ان میں شاعری کا حسن بھی تھا اور غزل کی رنگینی بھی۔ حسن زبان بھی تھا اور شوخی بیان بھی۔ ان کے عہد کے دبستان لکھنؤ کی غزل کا خاص رنگ ان کی غزلوں میں جا بجا ہوتا تھا۔ نازک خیالی اور حسن ادا نے ان کی غزلوں کو نہایت دلکش رنگ و آہنگ کا نمونہ بنا دیا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر سحر حسن میں انگڑائی سے افزونی ہو
اس جوانی سے بچے کون جو دن دونی ہو

دیتے ہیں میرے بیاباں کے بگولے یہ صدا
بچ کے چلنا کروٹیں لیتی ہوئی زنجیر سے

تذکرے ورنہ مٹ جائیں گے گر مر گیا میں
آگ لے لے کوئی بجھتی ہوئی چنگاری سے

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے چھپیں گے غمخوار
دوست برسات کے تارے ہیں، یہ معلوم نہ تھا

شکوۂ بخت، فلک اب نہ کروں گا، توبہ
یہ بھی سب نام تمھارے ہیں، یہ معلوم نہ تھا

چشم تر دیکھ میں سمجھتا تھا کہ چاند اترا ہے
آپ تالاب کنارے ہیں، یہ معلوم نہ تھا

میں نے کانٹوں کی جگہ پھول چنے، جرم کیا
باغ دنیا کے تمھارے ہیں، یہ معلوم نہ تھا

قبریں جہاں بہت ہوں وہاں دفن کیجیے
ڈرتے تھے زندگی میں اکیلے مکاں سے ہم

وہ جلد ہٹ گئے آہستہ سے گلے مل کے
یہ ڈر تھا خون اگل دیں نہ آبلے دل کے

اسی سمت سے اودی بدلی اٹھی
جدھر جام پھینکے تھے توڑے ہوئے

خفا ہو کے اے جانے والے ٹھہر
کہاں تک چلوں ہاتھ جوڑے ہوئے

کچھ اسرار بندِ قبا تو سناؤ
یہ ٹوٹے ہوئے ہیں کہ توڑے ہوئے

وقت دیکھیں گے جو پھر قصۂ دل چھیڑیں گے
ایک بات آٹھ پہر کہہ نہیں سکتے ان سے

غزل کے اشعار آپ نے ملاحظہ کیجیے۔ ان سے آپ کو غزل گوئی میں ان کے کمالِ فن اور جمالِ سخن کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔

## طنزیہ ومزاحیہ شاعری:

یہ بات تو بار بار دہرائی جاچکی ہے کہ کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس پر حضرت شاعر کو کامل دسترس حاصل نہ ہو۔ چنانچہ طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ انھوں نے متعدد ایسی نظمیں کہی تھیں جن میں مزاح کے ساتھ معاشرہ کی خرابیوں پر بھرپور طنز بھی ہے۔ ان کی ایک نظم ''مسوری'' بہت مشہور تھی جو اس وقت دستیاب نہیں ہے۔ اس کے یہ دو مصرعے اور ایک دو بند حضرت مہدی نظمی نے لکھے ہیں جو قارئین کی نذر کر رہا ہوں

ایک موٹی عورت کا سراپا بیان کرتے ہوئے کیسی نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں ملاحظہ ہو۔ پورا بند یاد نہیں ہے:

مالدہ کی ایک کیری وہ بھی اونچی ڈال کی
چار کے کاندھوں پہ لد جائے تو پوری پالکی
اتنی موٹی جتنی اردو حضرت اقبالؔ کی

تینوں مصرعوں میں تشبیہات کی ندرت قابل داد ہے مگر حضرت اقبالؔ کی اردو سے تشبیہ دینا بڑی دلچسپ بات ہے۔

اسی طرح ایک دوست کے کنبہ کا، جو سر راہ بے پردہ گھومتا پھرتا تھا، اس طرح ذکر کیا ہے

اک ہمارے دوست بیرسٹر کا کنبہ زیب راہ
واؤ بیٹے، خود الف، ماں ہائے ہوز واہ واہ

یاد کس کو اب کرن پھولوں کی چہرے پر پھبن
اب تو ہیں لمبے ایئر رنگ اعتبارِ حسن زن
گر لگا دیں بیچ میں بندوں کے گھڑیوں اہل فن
چلتی پھرتی گھنٹہ گھر بن جائیں صاحب کی دلھن
بالیقیں وعدہ وفا اک اک پری ہو جائے گی

جائے گی کل زیبِ گردن جنتری ہو جائے گی

ایک جگہ بے جھجک، بیباک، بے تکلف اور بڑی حد تک بے غیرت ہندوستانی لڑکیوں کے خلاف انھوں نے کہا:

گر قدیمی راج ہوتا ہند کی سرکار کا
چشمِ بد میں بھونک دیتا پھلپلا تلوار کا

ڈراپ سین (ایک انگریزی رقص) کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے

کیمرے، اللہ اکبر ارتقائے فن کی حد
پاؤں سر کے پاس اور مثلِ الف قائم وہ قد
قدرِ تہذیب تمدن چیختی ہے المدد
ہر نگاہ دوربیں کی نکتۂ فطرت ہے زد
باپ خوش ہیں، نوجواں بیٹی کا پہلا پارٹ ہے
رقص عریاں کون کہہ سکتا ہے یہ تو آرٹ ہے

یہ مختصر سی چند مثالیں بھی ان کے طنز و مزاح نگاری کے معیار کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔

## مذہبی تصنیفات و تالیفات:

حضرت شاعر کی ایک کتاب "خصائص مرتضوی" بہت شہرت رکھتی ہے جو بہت عرصہ پہلے شائع ہوئی مگر اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔

ایک کتاب "علی نامہ" مسودہ کی صورت میں ان کے فرزند اکبر حضرت مہدی نظمی مرحوم کے پاس تھی جو وہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ شائع ہوئی یا نہیں۔ بظاہر وہ شائع نہیں ہوئی۔ اب یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ مسودہ ان کے انتقال کے بعد بھی محفوظ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو امید ہے کہ حضرت نظمی کے مداحوں اور ان کے ادبی حلقے کی شخصیتوں میں سے کوئی اس کی اشاعت کی خواہش کو ان کی وصیت سمجھ کے پورا کرے گا۔

نظموں کا مجموعہ ''سبدِ گل'' کے نام سے شائع ہوا۔ وہ اب کمیاب ہے۔

## صحافت:

حضرت شاعر کی علمی، ادبی اور قلمی زندگی کی ایک اور اہم خصوصیت صحافت تھی انھوں نے متعدد ماہنامے اور ہفت روزہ اخبارات و جرائد جاری کیے۔ ان میں ذوالفقار، سیارہ، میزان، جدت، سفینہ، ہمراہی اور سحاب وغیرہ شامل تھے ''سحاب'' آخری ہفت روزہ تھا۔ یہ سب اخبارات اور جرائد علمی اور ادبی لحاظ سے اعلی معیار کے تھے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ ہر جریدہ اول سے آخر تک انھیں کی تخلیقات سے مزین ہوتا تھا مگر سب کچھ فرضی قلمی ناموں سے۔ مثلاً ہفت روزہ ''سحاب'' میں ''دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا'' کے عنوان سے مضامین کا ایک مستقل سلسلہ تھا جس میں ان لوگوں کے حالات لکھتے تھے جن کو انھوں نے نوجوانی سے بڑھاپے تک دیکھا تھا۔ مگر یہ مضامین بھی وہ ''مورخ ہندی'' کے نام سے لکھتے تھے۔ اسی طرح بعض مضامین ''ذی شعور لکھنوی'' کے نام سے اور بعض ۱۷۵ (شاعر کے اعداد جمل) کے عددی نام سے لکھے۔

## نجوم و دست شناسی:

علم نجوم و دست شناسی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب حیدرآباد دکن کا سفر درپیش ہوا تو ان کی بیٹی کی حالت بہت خراب تھی۔ زندہ بچنے کے آثار نہ تھے۔ حضرت شاعر نے حیدرآباد کے سفر کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ جائیں یا نہ جائیں اپنا ہاتھ دیکھا اور زائچہ بنا کے کہا کہ میرے ہاتھ میں اب اولاد کا غم نہیں ہے۔ چنانچہ بیٹی کو سپرد خدا کر کے حیدرآباد چلے گئے جہاں بیٹی کے انتقال سے تین دن پہلے خود ان کا انتقال ہو گیا اور یہ بیچ ثابت ہو گیا کہ ان کے ہاتھ میں اولاد کا غم نہیں تھا۔

## اختتامیہ:

میں نے ان کے اس تذکرہ میں ان کی ہمہ رنگ، ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے

دفن کیا گیا۔ میں ان دونوں تاریخوں کے سلسلے میں اہلیہ جناب شمس الحسن تاج مرحوم کے قول کو ترجیح دیتا ہوں اس لیئے کہ اول تو خواتین کو یہ باتیں زیادہ یاد رہتی ہیں۔ دوسرے حضرت مہدی نظمی حصول معاش کے سلسلے میں بیشتر لکھنؤ سے باہر رہتے تھے۔ اس لیئے بھی یہ ممکن ہے کہ ان کے معلومات درست نہ ہوں۔

اس طرح علم و ادب اور شعر و سخن کی ایک کہکشاں اپنے دامن پر سجائے ہوئے قبر کے اندھیرے کو مطلع انوار بنانے کے لیئے یہ آفتاب علم و فن اسی منزل میں ڈوب گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ہ

سخنوری نہ رہی ، صاحب سخن نہ رہے
کسے سنائیں قصیدے کہ اہل فن نہ رہے

---

تم کہ ماتم کو شہیدوں کے فغاں کہتے ہو
ہم کہ شبیرؑ کا غم نعمتِ غم ہے ہم کو
(نظمی)

حاصل کی اور بی۔اے تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھا۔

## علمی استعداد:

جس زمانہ میں انھوں نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ہوگی اس زمانہ تک تعلیم کی سطح کی بڑی قدر تھی اور بی۔اے پاس کرنے والوں کی علمی استعداد یقیناً خاصی اچھی ہوتی تھی۔ مگر اس بات سے حضرت مہدی نظمی کی علمی استعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا پتہ تو ان کی تصنیفات و تالیفات سے چلتا ہے جن کی تعداد ان کو بعد مرگ خراج عقیدت پیش کرنے والوں نے دو سو سے زیادہ لکھی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فن اور شخصیت سے متعلق جناب ہاشم نقوی نے ان کے مختلف مداحوں کے مضامین پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ تذکرہ نویسی کے اعتبار سے اس میں بعض چیزوں کی کمی نقص کمال کے مترادف ہے۔ مثلاً ایک سے زائد حضرات نے ان کی کتابوں کی تعداد دو سو یا اس سے زیادہ لکھی مگر ان کی کوئی مکمل فہرست درج نہیں کی گئی جس سے ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد اور ان کے موضوعات کا پتہ چلتا۔ قطع نظر اس کے ان کے نظم و نثر کے ذخیرہ اور کسی فنی مضامین بھی ان کی اعلیٰ علمی استعداد کو ظاہر کرنے کے لیے یقیناً کافی ہیں۔

## ذریعۂ معاش:

مہدی نظمی صاحب ایک نہایت باعظمت علمی، ادبی اور دینی خاندان میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کے گھر میں دولت دنیا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ ہاتھ میں ایک زرنگار اور زریں رقم قلم لے کر دنیا میں آئے مگر منھ میں سونے کا چمچہ نہیں تھا۔ قلم نے آخری دم تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور سونے کا چمچہ کبھی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ اسی لیے تلاش معاش میں وہ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ گھومتے رہے۔ رامپور، دتی، کلکتہ، پٹنہ اور دہلی وغیرہ میں قسمت آزمائی کی۔ صحافت کو انھوں نے پیشے کے طور پر اپنایا اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

ان کی خاندانی میراث تھا۔ ہر ایک سے محبت سے ملتے اور محبت سے پیش آتے تھے۔ مزاج میں شائستگی اور ادب و آداب میں تہذیبی قدریں رچی بسی تھیں۔

## شاعری:

حضرت مہدی نظمی نے شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں پایا۔ وہ دعبلِ ہند حضرت ذاکر اعلیٰ اللہ مقامہ کے پوتے تھے جنھوں نے اپنے وقت میں غزل گوئی اور مرثیہ نگاری میں بڑی شہرت حاصل کی۔ لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اسی طرح وہ ایسے باپ کے بیٹے تھے جن کی ہمہ صفت، ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شخصیت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ بیک وقت تقریر اور تحریر دونوں پہ حاوی تھے۔ تحریر میں نظم و نثر دونوں پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ نثر میں ہر موضوع پر لکھتے تھے اور نظم میں کوئی صنفِ سخن ان کی دسترس سے باہر نہیں تھی۔ ان کا تفصیلی ذکر ان کے تذکرہ میں اس کتاب میں شامل ہے۔ جناب مہدی نظمی نے بھی اپنے پدر بزرگوار کی طرح نظم و نثر اور ان کے مختلف اقسام میں زبردست مہارت کا مظاہرہ کیا اور شہرت و مقبولیت کے بلند درجات پر فائز ہوئے۔ البتہ خطابت اور ذاکری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور اس طرح اپنے والد گرامی کے مقابلہ میں اس ایک فن میں پیچھے رہ گئے۔

''مہدی نظمی، فن اور شخصیت'' کے مرتب ناشر نقوی نے لکھا ہے

> ''مہدی نظمی نے شاعری کو نئی سمتوں سے آشنا کیا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں مسدس گوئی کا جب تذکرہ آتا ہے تو مولانا حالی اور جوش ملیح آبادی کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن موجودہ عہد میں مہدی نظمی کے مسدس دیکھ کر کہنا پڑے گا کہ مسدس کی صنف میں ان دونوں مشاہیر سے مہدی نظمی سبقت لے گئے''۔ (ص ۱۵)

## مرثیہ گوئی:

مہدی نظمی صاحب خاندانِ اجتہاد کے مرثیہ نگاروں کے آخری دور کے شاعروں میں

دبیر کی پیروی کی اور جوش صاحب کی طرح مرثیہ کو اشتراکیت کے مقاصد سے ہم آہنگ کرنے اور امام حسین کو ایک سیاسی انقلابی لیڈر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ان کے خاندان کی مثبت مذہبی سوچ اور ان کے گھر کے ماحول کی دین تھی۔

## مرثیوں کی تعداد:

ناشر نقوی صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے مرثیوں کے تقریباً دس مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں "مظلوم کربلا" اور "نذر اہلبیت" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (مہدی نظمی فن اور شخصیت، ص ۱۶)

حیرت ہے کہ جناب ناشر نقوی نے "نذر اہلبیت" کو ان کے مرثیوں کا مجموعہ قرار دیا ہے حالانکہ مسدس کی ہیئت میں وہ ان کی مدحیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ مرثیوں سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

## مرثیہ سے کچھ مثالیں:

اب میں ان کے مرثیوں سے مختلف اجزائے ترکیبی کے حوالوں سے کچھ مثالیں درج کر رہا ہوں:

چہرہ۔ ایک مرثیہ کا چہرہ اس بند سے کھلتا ہے۔ جناب علی اکبر کے حال میں

اے خالق حیات شہیدان کربلا
میرے قلم کو کر دے ثناخوانِ کربلا
کرنا ہے ذکرِ دلبرِ سلطانِ کربلا
اکبرؑ ہے باغبانِ گلستانِ کربلا
یہ خوش جمال جانِ بن بوتراب ہے
کردار میں شبیہِ رسالت مآبؐ ہے

سراپا: جناب علی اکبر کا سراپا ملاحظہ ہو جس میں تشبیہات کا بانکپن خاص طور سے دامن

شِ فکر و نظر ہے

روشن نگاہ جیسے چراغِ خدا کی لو
روشن جبیں کہ جیسے مہہ و کہکشاں کی ضو
روشن ضمیر خلد میں کوثر کی جیسے رو
روشن دماغ پرتوِ خورشیدِ صبح نو
نازک ہے جو حسینؑ کے احساس کی طرح
جرار ہے جو حضرت عباسؑ کی طرح

پورا بند قابلِ تحسین ہے مگر بیت تو بہت ہی عمدہ ہے۔ کیا کہنا۔

پیکر میں حسن پیکرِ سلطانِ انبیاء
گفتار میں فصاحتِ گفتارِ مرتضیٰ
عباسؑ کا جلال تو جعفرؑ کا دبدبہ
تشبیہِ حسنِ صورتِ تصویرِ مصطفیٰ
گردوں پہ جس کے دم سے فضیلت ہے فرش کو
جس کی نگاہ چھو کے پلٹتی ہے عرش کو

سبحان اللہ کیا اچھی بیت ہے۔ ایک مرثیہ میں جناب علی اکبر کا سراپا ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو

چہرہ میں نورِ شاہؐ رسولاں لیے ہوئے
ماتھے میں نجمِ بختِ مسلماں لیے ہوئے
دل میں شجاعتِ شہؑ مرداں لیے ہوئے
سینہ میں علم و حکمتِ قرآں لیے ہوئے
کمسن سہی، نبیؐ کا پسر ہوش مند ہے
قوت علیؑ کی، ہاتھ کی مٹھی میں بند ہے

کیا اچھا مصرع اور کیا عمدہ تخیل ہے۔ سبحان اللہ۔

**رخصت:** رخصت کے اس بند میں آلِ رسولؐ کی نظر میں جنابِ فضہؓ کے حوالہ سے ایک کنیز کی عزت و توقیر کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ جناب زینبؑ کبریٰ جناب علی اکبرؑ سے اذنِ رخصت کے جواب میں فرماتی ہیں:

اے میرے لعل مادرِ شیدا سے مل کے جا
لیلیٰ کی کوکھ جلتی ہے، لیلیٰ سے مل کے جا
تازہ ہے زخم کبریٰ کا، بیوہ سے مل کے جا
تہذیب ہے حسینؑ کی، فضہ سے مل کے جا
ہے یہ شعار آلِ عبا کی تمیز کا
ہم نے شرف بڑھایا ہے گھر کی کنیز کا

رخصت میں ایک اور بند ملاحظہ کیجیے۔ جناب زینبؑ ارشاد فرماتی ہیں

بولیں کہ دیر ہوتی ہے اب رن کو جائیے
دشمن کو اپنی تیغ کے جوہر دکھائیے
تنہا پدر ہے، حوصلۂ دل بڑھائیے
کوفہ کی فوج تا حدِ کوفہ بھگائیے
رکھ دو سپاہِ ظلم سروہی سے گود کے
دشمن بھی سمجھیں پالے ہو زینبؑ کی گود کے

سروہی سے گودنا حسنِ زبان کی کیا اچھی مثال ہے۔ اور مرثیوں میں میری نظر سے نہیں گزری۔ چھٹا مصرع بھی قابلِ داد ہے۔

یہ بند بھی دیکھیے:

اے میرے لعل اور مرے دل کے پاس آ
دو بول اپنے لب سے تشفی کے کہہ کے جا

چلتی ہے آج گھر میں مرے موت کی ہوا
میداں میں منتظر ہے تری دیر سے قضا
اولاد میں حسینؑ کی بدر منیر ہے
جا تیرا دست گیر خدائے قدیر ہے

پھوپھی سے رخصت ملنے کے بعد جناب علی اکبر اپنی مادر گرامی سے اذن رخصت طلب کرتے ہیں اور ماں کے اضطراب کو کم کرنے کے لیے اس طرح ان سے عرض کرتے ہیں:

بولا کہ ضبط کیجیے غم ، اب نہ روئیے
اے افتخار اہلِ حرمؑ اب نہ روئیے
ناموسِ بادشاہِ امم اب نہ روئیے
ہے آپ کو ہماری قسم اب نہ روئیے
صابر ہیں آپ ، شان ہیں آلِ رسولؐ کی
زوجہ حسینؑ کی تو بہو ہیں بتولؑ کی

ماں کا جواب جوان کے عزم، حوصلہ اور ایثار و قربانی کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے:

بولی نظر اٹھا کے یہ مادر کہ میرے لال
دنیا کا غم نہیں ہے کہ بکھرے ہوئے ہیں بال
رو کر دعا یہ کرتی ہوں اے میرے خوش خصال
ہدیہ مرا قبول کرے ربِ ذوالجلال
مقبول بارگاہِ الٰہی یہ پھول ہو
ماں نذر پیش کرتی ہے یارب قبول ہو

قربانی کے جذبے کی کیا اچھی ترجمانی ہے۔ جزاک اللہ۔
اور اب خود امام حسینؑ سے رخصت کی التجا:

زخموں سے چور چور بھی ہوں تشنہ کام بھی
فہرستِ کشتگانِ وفا میں ہے نام بھی
مشفق پدر بھی آپ ہیں میرے امام بھی
فرزندِ جاں نثار بھی ہوں اور غلام بھی
منزل یہ صبر کی ہے، فدا کیجیے مجھے
بابا گلے لگا کے جدا کیجیے مجھے

جنابِ عباسؑ کی طلبِ رخصت کے بارے میں ایک بند ملاحظہ ہو۔ چوتھا مصرع اور بیت میں جذبات و احساسات اور ادب و آداب کی یہ عمدہ منظرکشی ہے

دوپہر کا وقت ہے بڑھی ہوئی ہے تشنگی
اذنِ حرب و ضرب کیوں دیتے نہیں سبطِ نبیؐ
اک تحمل ہے مگر بیکل ہیں عباسؑ جری
یہ اطاعت ہے کہ ہے خاموش تصویرِ علیؑ
اس ادائے خاص میں انداز ہیں تقریر کے
سر جھکائے چپ کھڑے ہیں سامنے شبیرؑ کے

آمد: ایک مرثیہ سے میدانِ جنگ میں امام حسینؑ کی آمد کے بارے میں ایک بند ملاحظہ ہو:

صحرا مہک اٹھا تھا، پسینہ تھا مشکبار
انجم ملے ہوں جیسے عروسانِ نو بہار
بالیں تھیں حسنِ گردنِ مرکب سے زرنگار
نوشہ کے گلے میں ہوں جیسے گلوں کے ہار
پشتِ فرس پہ مہرِ رسالت مآبؐ تھا
رخ اس کا جس طرف تھا ادھر آفتاب تھا

ایسی رجز جو آہ کی تاثیر بن گئی
ایسی رجز جو نالۂ دل گیر بن گئی
ایسی رجز جو خوں فشاں شمشیر بن گئی
ایسی رجز جو چبھتا ہوا تیر بن گئی
ایسی رجز جو تیغِ الٰہی کی دھار تھی
سوکھے لبوں میں ہنستی ہوئی ذوالفقار تھی

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ پورا بند نہایت عمدہ ہے مگر چھٹے مصرع کا تو جواب نہیں۔

تلوار کی تعریف مہدی نظمی صاحب نے تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں کلاسیکی مرثیہ نگاروں کی طرح اپنا زورِ سخن دکھایا ہے اور وہ اس میں بھی بہت کامیاب رہے ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

دیکھا تھا کس نے جوہرِ تیغِ الٰہ کو
سب مانتے ہیں زورِ شہِ حق پناہ کو
مہلت نہیں قضا سے کسی روسیاہ کو
گویا اجل نے باندھ لیا ہے سپاہ کو
نقارہ ہائے جنگ پہ جھنکار چھا گئی
لاکھوں پہ ایک پیاسے کی تلوار چھا گئی

واہ۔ جزاک اللہ۔

بجلی کہیں ہے، شعلہ کہیں ہے کہیں کرن
چلتی ہے یوں کہ چلتی ہے جیسے کوئی دلھن
حسنِ ادا کہ اٹھتی جوانی کا بانکپن
جس پر نثار کرتے ہیں دشمن بھی جان و تن
اتنی رواں کہ تارِ نظر ہمسفر نہ ہو

اتنی سبک کہ سر پہ گرے اور خبر نہ ہو

یہ تیغ آب و تاب میں خورشید کی کرن
یہ تیغ شمع حکمت و انوار علم و فن
یہ تیغ آبروئے رخِ مرسلِؐ زمن
یہ تیغ نقش ابروئے خمدار کی شکن
قرآن کا وقار، امامت کی شان ہے
یہ تیغ کربلا کے سپاہی کی جان ہے

کیا کہنا۔ کیا اچھا مصرعہ ہے۔ سبحان اللہ

یہ تیغ پاسبانِ رسولؐ امم بھی ہے
یہ تیغ روشنیِ چراغِ حرم بھی ہے
یہ تیغِ بوترابؑ کا جاہ و حشم بھی ہے
یہ تیغ صرف تیغ نہیں ہے، قلم بھی ہے
حکم قضائے لشکرِ بے پیر لکھ گئی
یہ تیغ پوری فوج کی تقدیر لکھ گئی

شعلہ مزاج و شعلہ زباں تھی وہ برق رو
تکتی تھی جب بھی پیاس تو پیتی تھی وہ لہو
اتنی نڈر کی آتی تھی دشمن کے روبرو
مرتے تھے جس کی چال پہ اسلام کے عدو
شیرِ خدا کی آبرو، حیدرؑ کی شان تھی
بے شک یہ تیغ حق کے سپاہی کی جان تھی

پورے سارے بند تشبیہات، حسن بیان اور رنگ و آہنگ کے اعتبار سے بہت ہی خوب
ہیں۔

ایک اور مرثیہ سے تلوار کی تعریف کے چھ بند ملاحظہ ہوں

ناصرِ سبطِ نبیؐ کی تیغ جوہر دار دیکھ
اے نگاہِ قیصری جمہور کی تلوار دیکھ
جنگ کے بازو پہ تیغ امن کا ہر وار دیکھ
جس میں ہے سازِ اذاں کی گونج وہ جھنکار دیکھ
قبضۂ حمدِ خدا ہے صیقلِ تسبیحِ حق
وار میں تفسیرِ قرآں، ضرب میں آیاتِ حق

ملتا ہے اعمالِ بد کا ہر ستم آرا کو پھل
دھوم تھی شمشیر کی، ہر سمت تھا رقصِ اجل
واہ وا کے شور میں تلوار پڑھتی تھی غزل
ہو گیا دو لخت جس کا بھی سخن تھا بے محل

غزل کے حوالے سے سخن بے محل کا دو لخت ہو جانا بالکل نئی بات ہے۔ کیا کہنا۔

فوجِ دشمن کی بڑی تعداد رن میں گھٹ گئی
جو زباں گستاخ ٹھہری وہ دہن میں کٹ گئی

بیت بھی کیا خوب صورت ہے۔ سبحان اللہ۔

ایک اور مرثیہ سے تلوار کی تعریف کے دو بند پیش خدمت ہیں

وہ ناز وہ ادا وہ جوانی وہ بانکپن
وہ شاخِ گل لچک میں، نزاکت میں گلبدن
وہ آب و تاب جیسے کہ خورشید کی کرن
چوتھی کا لال جوڑا پہن کر چلی دلہن
رکھتی تھی دلبران کشش کج ادائی میں
نذرانہ سر کا لینے لگی منھ دکھائی میں

پورا بند حسن تغزل کی خوب صورت مثال ہے۔

[illegible]

"دلبری کی کشش" ہو:

تلوار جو پیام ہلاکت لیئے ہوئے
تلوار جو اجل کی شباہت لیئے ہوئے
تلوار جو سپاہ کی شامت لیئے ہوئے
زخموں کے پھول، پھول کی نکہت لیئے ہوئے

[illegible]
یہ پھول جب کھلیں تو کبھی سوکھتے نہیں

کیا اچھی بات کہی ہے۔ سبحان اللہ

[illegible]

دو بند ملاحظہ ہوں

وہ سناں جس کی لچک میں شاخ گلشن کی لچک
وہ سناں جس کی لپک میں برق تاباں کی لپک
وہ سناں جس کی چمک میں چشم بینا کی چمک
وہ سناں جس کی دمک میں شیشۂ حق کی دمک

[illegible]
[illegible]

وہ سناں جس کی انی میں لو دل بیدار کی
وہ سناں جس کی انی میں ہے تڑپ غم خوار کی
[illegible]
وہ سناں جس کی انی میں ہے چبھن کردار کی

وہ سناں جس کی انی میں تجلّی کی دھار ہے
دیکھنے میں جو سناں ہے چلنے میں تلوار ہے

سناں کی تعریف شعرائے عموماً نظم نہیں کی ہے۔ مہدی نظمی صاحب نے اس میں اپنی نظم کے جوہر دکھائے ہیں اور دونوں بندوں میں کیسی کیسی عمدہ تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ جزاک اللہ۔

## گھوڑے کی تعریف:

مرکب چلا بہ صورت طوفاں ہوا کے ساتھ
جیسے لڑے شمیم گلستاں ہوا کے ساتھ
جیسے چلے سحاب بہاراں ہوا کے ساتھ
جیسے رواں ہو تختِ سلیمانؑ ہوا کے ساتھ
اک ساتھ یوں اٹھیں نہ زمیں دلدل کی
جنت سے آگئی ہے سواری رسولؐ کی

وہ رنگ شوخ لالۂ گلزار سے سوا
وہ آنکھ چشم نرگسِ بیمار سے سوا
وہ چوکڑی جو آہوئے تاتار سے سوا
وہ چست چال برق شرر بار سے سوا
ریشم کی مثل نرم ایال سمند تھی

اور مصرع ملاحظہ ہو:

چاروں سموں میں وقت کی رفتار بند تھی

کیا عمدہ تخیل ہے۔ تعریف نہیں ہو سکتی۔ سبحان اللہ۔

اتنا سبک خرام تھا اسپِ قمر رکاب
رکھ دے قدم تو چور نہ ہو شیشۂ حباب

ایسا رفیق جس کی رفاقت تھی لاجواب
ایسی وفا کہ معتمدِ ابنِ بوترابؑ
ادراک کی نظر تھی نظر راہوار کی
تصویر تھا وہ آئینۂ اعتبار کی

اچھی بیت ہے۔ سبحان اللہ۔

دوسرے مرثیہ سے گھوڑے کی تعریف میں ایک بند ملاحظہ ہو:

عادتاً بیباک لیکن فطرتاً طاعت گزار
پیکرِ حسنِ وفا، مکرِ عدو سے ہوشیار
معتمد سرتا قدم، حق آشنا باطل شکار
تربیت عباسؑ سے جس کو ملی وہ راہوار
باگ کو ڈھیلا اگر فرزند سرورؑ چھوڑ دے
یہ فرس ٹھوکر سے لشکر کی صفوں کو توڑ دے

بند بہت عمدہ ہے طرزِ بیت زورِ بیان میں لاجواب ہے

اور مرثیہ سے چند بند:

رہوار اپنے حسن میں رشکِ غزال تھا
ٹھوکر سے منھ کے بل جو گرا، پائمال تھا
انبوہ میں غزالوں کے ضیغم خصال تھا
فعلاً عرب تھا، پیکرِ رف رف جمال تھا
کڑکا کبھی تو گرجا کبھی رعد کی طرح
بے حس نہ تھا سپاہ بن سعدؔ کی طرح
جھپٹے جو دشمنوں پہ تو ضرغام کی طرح
دوڑے عدو پہ موت کے پیغام کی طرح

بھاگے سپاہ، لشکر بدنام کی طرح
ٹھوکر لگائے کفر کو اسلام کی طرح
پامال کردے فوج کو ذرات کی طرح
دن بھی دکھائی دینے لگے رات کی طرح

سینہ کو حسن سینۂ غلماں کہیں تو کم
پنڈلی کو ساقِ نازکِ حوراں کہیں تو کم
آنکھوں کو برق ابر بہاراں کہیں تو کم
ماتھے کو رشک اختر تاباں کہیں تو کم
ایسی لگام گیسوئے جاناں کہیں جسے
کاٹھی کہ فرش تخت سلیماں کہیں جسے

کتنی عمدہ تشبیہیں ہیں اور کیسے نئے ... [illegible]

فوج یزید کے سپاہیوں کا سراپا حضرت مہدی نظمی نے ... مرثیہ نگاروں [illegible]
طرح فوج یزید کے سپاہیوں کا سراپا بھی لکھا ہے جس میں ... [illegible]

نکلا یہ سن کے فوج سے اک چیل تن شریر
دامِ ہوا و حرص و ہوس میں جو تھا اسیر
دولت کا وہ غلام، زر و سیم کا فقیر
مکار، شورہ پشت، شرارت میں بے نظیر
مستی میں فیل مست تھا، گینڈے کا ڈیل تھا
فطرت سے جو لعین و کمین و ذلیل تھا

وہ بدسیر تھا مرحب دعنتر بنا ہوا
صورت میں بولہب تھا ستمگر بنا ہوا
آیا تھا عبدود کا وہ ہمسر بنا ہوا

بادل لہو کا دشتِ ستم میں برس گیا
دشمن کی رستی گئی، ظالم کا کس گیا
گھوڑے سے گر کے خون کی دلدل میں پھنس گیا
یوں گونجی ضربِ تیغ کہ کانپی زمین بھی
شہپر سمیٹنے لگے روح الامین بھی

مکالمہ: مہدی نظمی صاحب نے مرثیوں میں مکالمے بھی نظم کیئے ہیں۔ مکالمہ مرثیہ کا ایک بہت جاندار حصہ ہوتا ہے۔ امام حسینؑ اور شمر کی گفتگو ملاحظہ ہو

غیرت نہیں ہے، صاحبِ ایماں نہیں ہو تم
سنگِ گرانِ راہ ہو، انساں نہیں ہو تم
ہر چند (کلمہ) گو ہو، مسلماں نہیں ہو تم
امیدوارِ رحمتِ یزداں نہیں ہو تم
ارضِ خدا بہشت ہے آدم کے واسطے
پیدا کیا ہے تم کو جہنم کے واسطے
کہنے لگا یہ شمرِ ستمگر کہ اے حسینؑ
مانا کہ تم ہو مرسلِؐ آخر کے نورِ عین
مانا کہ تم ہو جنتِ پیمبرؐ کے دل کا چین
لیکن یہ کربلا ہے، نہیں بدر یا حنین
ہے جنگ ابنِ فاتحِ بدر و حنین سے
لینا ہے انتقام علیؑ کا حسینؑ سے

امام حسینؑ کا فوجِ یزید کی طرف گفتگو برائے جنگ سے جواب میں یہ بند۔ امام فرماتے ہیں:

اصغر کا داغ دل میں ہے، پہلو میں درد ہے

شانہ چھدا ہے تیر سے، بازو میں درد ہے
سر میں، کمر میں، ہاتھ میں، زانو میں درد ہے
[illegible]
کچھ سوجھتا نہیں کہ اندھیرا نظر میں ہے
میں کیا لڑوں کہ دردِ مسلسل جگر میں ہے

[illegible] امام حسین [illegible] سے مخاطب ہیں

تشنہ جگر کی تیغ سے گھبرا رہے ہو تم
بیکس کے ایک حملہ سے تھرا رہے ہو تم
ٹھہرو، فرار ہو کے کدھر جا رہے ہو تم
بھاگو کہ زد پہ بھاگ کے بھی آ رہے ہو تم
یہ خوں بہا نہیں ہے اکبر کے خون کا
چھینٹا تمھارے منھ پہ ہے اصغر کے خون کا

شہادت اور مصائب حضرت مہدی نظمی عام جدید مرثیہ نگاروں سے برخلاف مرثیہ میں بیان مصائب کو ضروری سمجھتے تھے اور پھر پورے شدت سے مصائب نظم کرتے تھے۔

ملاحظہ ہو بیٹے جناب علی اکبر کی شہادت پر بند

دشمن کا سر اڑا دیا شمشیر نے، مگر
برچھی لگائی آڑ سے قاتل نے پشت پر
پہلو میں چاک ہوگیا مظلوم کا جگر
رن سے پکارے شاہ کو، لیجے مری خبر
سن کر صدا پسر کی چلے شاہ اس طرح
چلتی ہے موجِ درد رگِ دل میں جس طرح

جناب علی اکبر کی شہادت پر امام حسین کی بکا

سرورؑ پکارے ہائے جواں شیر مر گیا

دنیا سیاہ ہوگئی ، نورِ نظر گیا

سمتِ بہشت دشت سے تشنہ جگر گیا

ہم صورتِ رسولؐ جہاں سے گزر گیا

طاقت نہ تھی لڑائی کی یعقوب کے شاہ میں

بیٹے کی لاش ڈھونڈ رہے تھے سپاہ میں

اور اب شہادت حضرت عباسؑ سے متعلق ایک بند دیکھیے۔ چند مصرعے بے مثال ہیں۔ جناب عباسؑ وقتِ آخر امام حسینؑ سے عرض کرتے ہیں

تشنہ لب بچوں کو جو پانی پلا سکتا نہیں

ناوکِ شرمندگی سینہ پہ کھا سکتا نہیں

ناتواں بارِ ندامت کو اٹھا سکتا نہیں

مر کے بھی صورت سکینہؑ کو دکھا سکتا نہیں

یہ کہا اور درد سے دل کو پکڑ کر رہ گیا

چشمِ سرور سے بھی مشکیزہ کا پانی بہہ گیا

کربلا اور مقصدِ حسینؑ اس زمانہ میں اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ مرثیوں میں بیانِ مصائب کے بجائے مقصدِ حسینؑ واضح کرنا چاہیے۔ مقصدِ حسینؑ کیا تھے۔ ان کا تعین بھی ہم نے خود ہی کر لیا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ امام حسینؑ نے اس سلسلہ میں کیا ارشاد فرمایا۔ بہر حال یہ تو ایک الگ بحث ہے۔

حضرت مہدی نظمی نے کربلا و مقصدِ حسینؑ پر بھی نظر ڈالی ہے۔ پہلے کربلا سے متعلق چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

کربلا [illegible] انسان کی تہذیب ہے

آواز انقلاب مسلسل ہے کربلا

حق کے شکست [illegible] چاہت ہے

جبر سلطانی کے حد کی کربلا پہچان ہے

راب ایک بند:

ان غموں کا ایک مجموعہ ہے ارض کربلا
غم یہاں بہتے ہیں جیسے آبجوئے علقمہ
مرکز تسلیم و طاعت، محور صبر و رضا
کربلا دیکھے تو ہوگا آدمی غم آشنا
درد کا درماں کیا ہر زخم غم کو بھر دیا
کربلا نے آدمی کا رنج ہلکا کر دیا

اور اب مقصد حسینؑ سے متعلق تین بند:

جذبۂ امن و اماں کی قوت اظہار دیکھ
قیصری کی فوج سے جمہور کی پیکار دیکھ
پیاس کی شدت میں رخ پر سرخی ایثار دیکھ
اے مورخ پاسبان امن کے انصار دیکھ
ناتوانوں کے لیئے پر امن آبادی کا حق
کربلا کی جنگ کا مقصد ہے آزادی کا حق

چھوٹتا ہے ذہن و دل کا زنگ، لڑتے ہیں حسینؑ
لشکر جور و جفا سے جنگ [illegible]تے ہیں [illegible]
صبر میں ہے تشنگی کا رنگ، لڑتے ہیں حسینؑ
حریت کی سب سے پہلی جنگ لڑتے ہیں حسینؑ
روشنی ظلمت کی چادر میں لپٹ سکتی نہیں
رگ ضمیروں کی گلے کے ساتھ کٹ سکتی نہیں

کربلا ظلم و جفا کی مملکت سے جنگ تھی
حریت دشمن غرور و تمکنت سے جنگ تھی
حق کی باغی اور سرکش سلطنت سے جنگ تھی
سیکڑوں سے جنگ کی تھی ذہنیت سے جنگ تھی
جب کوئی خلقت کا دشمن فوج لے کر آئے گا
پاسبان تخلیق کا سینہ سپر ہو جائے گا

## ساقی نامہ:

نظمی صاحب نے اپنی جدید سوچ کے باوجود مرثیوں میں ساقی نامے بھی لکھے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

میدانِ کارزار میں پیتا ہے، وہ شراب
کونین جس شراب کی مینا ہے، وہ شراب
جس کا خمار عرش کا زینا ہے، وہ شراب
جو کبریا کے رخ کا پسینہ ہے، وہ شراب
ہجرت میں جو رسولؐ کے بستر پہ پی گئی
صحنِ حرم میں دوشِ پیمبرؐ پہ پی گئی

تبصرہ: میں نے حضرت مہدی نظمی کے مرثیوں سے مختلف اجزائے ترکیبی کے متعلق متعدد بند مثالوں میں پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ مصرع محلِ نظر ہے۔ ان کے ناقدین نے بھی ان کے مرثیوں میں بعض اسقام کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن اس کا جواز بھی پیش کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ بہت زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔ وہ ایک نظم کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کہتے چلے جاتے تھے جس کی وجہ سے انھیں ان پر نظرِ ثانی کا موقع بھی نہیں ملتا تھا جس کے بغیر اسقام کو درست نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی

ان کا بہت اہم کارنامہ تھا۔ اسی وجہ سے انھیں دعبلِ ہند کے علاوہ انیسِ نوحہ کا خطاب بھی دیا گیا تھا کہ مرثیہ نگاری میں جو مقام میر انیس کو حاصل تھا وہی مقام حضرت آخر کو نوحہ گوئی میں حاصل ہوا تھا۔

حضرت مہدی نظمی نے اپنے نامور جدِ امجد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نوحہ گوئی کو نہ صرف ایک نیا رخ دیا بلکہ اسے غالب کے مذاقِ سخن میں بھی ڈھال دیا۔ اپنی شاعری کے آغاز ہی میں انھوں نے غالب کی زمینوں میں نوحے کہنا شروع کر دیے تھے۔ اب ایک تو غزل کی زمینوں میں نوحہ کہنا اور انھیں حزن، غم انگیزی اور اثر آفرینی عطا کرنا دوسرے غالب کی ایسی پتھریلی زمینوں اور سنگلاخ چٹانوں میں نوحوں کی نہر جاری کرنا فکروفن کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ محض برائے شعر گفتن نہیں تھا بلکہ بیشتر مخصوص عزائی معیار کے اعتبار سے یہ نوحے غالب کی غزلوں سے بڑھے نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ یہ ان کے کمالِ فن اور کمالِ سخن کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ یوں تو دوسروں نے بھی غالب کی زمینوں میں کلام اور نوحے کہے مگر معیارِ فکروفن کے اعتبار سے حضرت نظمی کا جواب نہیں۔ انھوں نے اپنے ایک شعر میں اپنی نوحہ و مرثیہ گوئی کی طرف یوں اشارہ کیا ہے

جو یہ کہے کہ کس طرح رشکِ غزل ہو مرثیہ　　گفتۂ نظمی ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

۱۹۶۲ء میں ان کے ان نوحوں کا مجموعہ "نقشِ نظمی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں الف سے ہا (ہ) کی ردیف تک ایک سو انتیس (۱۲۹) نوحے شامل ہیں۔ یائے معروف ومجہول کی ردیف میں تقریباً سو نوحے ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکے۔ ان نوحوں کے بالاستیعاب مطالعے سے حضرت مہدی نظمی کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نوحے کے مزاج کے مطابق لفظوں کا انتخاب، فکری اعتبار سے مضمون آفرینی اور اس میں وسعت و گہرائی اور فنی اعتبار سے مصرعوں کی بندش، لفظوں کی نشست و برخاست، روانی وغیرہ ان کے تمام کمال پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

## نمونۂ کلام:

اب ان کے نوحوں سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے [illegible] نے [illegible] سے [illegible] کس طرح [illegible] جاری کر دیے:

دیکھ کر تشنہ دہانی اصغرِ معصوم کی
دل میں پانی کے لگی ایسی کہ دریا جل گیا

یہ بیکسی تھی اسیروں کی قید خانے میں
رفیقِ غم تو ملے تھے مگر در و دیوار

پہن کر بیڑیاں سجاد سجدہ کر کے کہتے تھے
الٰہی شکر یہ زیور مرے قابل پسند آیا

شجاعت بر محل اقدام ہے شبیر و شبر کا
کبھی طوفاں پسند آیا کبھی ساحل پسند آیا

فضا میں خیمۂ سرور کے شعلے تھرتھراتے ہیں
حرم کی بیکسی کو دیکھ کر ہے بیقرار آتش

پاسِ پردہ بھی ہے لیلیٰ کو غمِ اکبر بھی
[illegible]

فطرت نے کیا پردۂ زینب کا یہ ساماں
چھنتے ہی ردا گھٹ گیا خیموں میں دھواں اور

[illegible]
شہید پیاسے رہے عمرِ جاوداں کے لیے

اے علی اصغر گلے پہ زخم کھا کر تیر کا
مسکرا کر تم نے دیکھا، دل بڑھا شبیر کا

[illegible] بھی کاٹ دیتا ہے ستمگاری کی شاخ
تیغ کی صورت تبسم بھی لبِ بے شیر کا

چپ ہے اقوام کی تاریخ شجاعت نظمی
کوئی اصغر سا زمانے میں سپاہی نہ ہوا

جو کی جائے حمایت حرملہ کے زورِ بازو کی
تو اس دنیائے فانی میں کوئی بچہ جواں کیوں ہو

اصغر تمھارے جیسے سپاہی بنے وفا
نکلے ہنسی سے کام تو تلوار کیا کریں

اصغر نے جانا ہو تہ شہادت کو ایک کھیل
[illegible] صدائے [illegible] تیر سے [illegible] ہو

علی اصغر کو شہ نے سب سے آخر اس لیے رکھا
[illegible] آدھا سویرے سے نہاں کیوں ہو

کسی ماں کے تصور میں کسی کی مسکراہٹ ہے
[illegible] جھولا جھولتی ہے دل کی دھڑکن میں

زنداں میں بھی تصورِ بانوئے نامراد
[illegible] بیاباں نورد تھا

## نمونۂ کلام:

نمونۂ کلام کے طور پر ان کے ایک قصیدہ کی تشبیب اور مدح سے چھ اشعار درج کیے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قارئین ان کی قصیدہ گوئی کے معیار کا خود اندازہ کریں گے

زمینِ تشنۂ گلزار پر ابرِ کرم آیا
کہ چشمِ نرگسِ شہلا کے ہر ذرے میں نم آیا

چھپی لیلائے ظلمت دھند کر بکھرے ہوئے گیسو
کہ تیرہ خاکداں میں آفتابِ صبح دم آیا

عروسِ لالۂ نوخیز نے کی زینتِ عارض
چمن کی [illegible] گیسوؤں میں پیچ و خم آیا

نگارِ گل پہ شبنم نے نچھاور کر دیے موتی
دلِ آزردۂ بلبل کو ضبطِ جوشِ غم آیا

سرابِ ریگِ صحرائے وفا کے تشنہ کاموں کو
مبارک باد دیجیے ابرِ فیضانِ کرم آیا

لچکتی ڈالیوں کو آ گیا تسلیم کا انداز
بنے گل دستِ گلشن باغبانِ ذی حشم آیا

خزاں شداد کی جنت میں جا کی لے کے [illegible]
ہوا بدلی زوالِ موسمِ باغِ ارم آیا

سنا دے مطلعِ ثالث کہ نظمی اہلِ محفل میں
حرم کے ساتھ ذکرِ جشنِ مولودِ حرم آیا

حدیثِ عالمِ ہُو کا شغف سرِ عدم آیا
سرِ دنیائے حادث پیکرِ حسنِ قدم آیا

حسامِ دیں پناہ و طرۂ دستارِ پیغمبرؐ
مہِ بیت الحرام و نجمِ تابانِ حرم آیا

زمیں سے مل گیا ہے سلسلہ امواجِ کوثر کا
[illegible] زمزم [illegible] آیا

نہ پوچھو شادمانی و نشاطِ مرسلِؐ امی
نوشتِ مصحفِ قرآنِ باری کا قلم آیا

علی کی منتظر تھی مصلحت اعلانِ بعثت کی
علی آئے تو اعلانِ نبوت دم بدم آیا

ترے نازک لبوں سے لالہ و گل کو ہنسی آئی
تری زلفوں سے زلفِ زندگی میں پیچ و خم آیا

گلابوں میں مہک آئی ترے [illegible] کے پسینے سے
غزالوں کو تری رفتار کی شوخی سے رم آیا

ترے خنجر سے میں تیری خوئے نازک کی لچک آئی
تری شمشیر میں تیرے خطِ ابرو کا خم آیا

ترے وحشی اٹھے تو جھک گئی پیشانی [illegible]
ترے وحشی چلے تو ٹھوکروں میں جامِ جم آیا

سخی کے در پہ سائل آ گیا تو اس کے دامن تک
کرم امواج در امواج آیا یم بہ یم آیا

بت سے کوئی بولا ہوئی حیرت سے خیبر میں　　علم آیا علی آئے علی آئے علم آیا
مبارک آل ہاشم آل ابراہیم کو نظمی　　حرم سے جب صنم نکلے نبی بن حرم آیا

## غزل اور نظمیں:

مہدی نظمی صاحب نے غزلیں بھی بہت کہیں۔ ان میں بھی ان کی فکر کا ایک خاص رنگ تھا۔ انھوں نے غزل میں تجربے بھی کیے۔ غزل کی کلاسیکی روایت و عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے ''غزل غزل'' اور ''غزل محل'' شائع ہوئے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں

کریم غیر کے آگے نہ ہاتھ پھیلا کر　　بچا رہا ہوں ابھی تک تو آبرو تیری
بھولتے کیوں ہو اسی رات کی تصویر ہے یہ　　گھر کی تنہائی میں جب مہکا ہوا بیلا تھا

لیکن انھوں نے نظموں پر بہت زور دیا۔ بہت سی طویل قومی نظمیں لکھیں اور مختلف مذاہب کے مذہبی رہنماؤں کی تعریف میں بھی کئی مسدس لکھے۔ ان کی قومی شاعری کے پیش نظر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، سابق صدر ہندوستان انھیں شاعر ہندوستان لکھتے تھے۔ ان نظموں میں بھارت درشن، ہندوستان رزمیہ، شمع فروزاں وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ مذہبی رہنماؤں میں سکھوں کے رہنما گرو نانک کے بارے میں ''نذر نانک'' حضرت عیسیٰ کے بارے میں ''ابن مریم'' اہل ہنود سے متعلق ''رامائن'' اور اسلام کے عظیم رہنماؤں کے بارے میں ''پیغمبر اعظم'' اور ''بوتراب'' و ''بت شکن'' ان کی مشہور و معروف شعری تصانیف ہیں۔

## دیگر اصنافِ ادب:

انھوں نے تاریخی افسانے، ناول اور ریڈیو فیچر بھی بڑی تعداد میں لکھے۔

## صحافت:

صحافت ان کا پیشہ تھا جس میں انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ اپنی طالب علمی

کے زمانہ میں انھوں نے ابتداً خود ایک اخبار نکالا تھا۔ بعد میں متعدد جرائد و اخبارات میں ادارت کے فرائض انجام دیے اور کئی اخبار خود بھی نکالے۔ جن روزناموں میں کام کیا ان میں ناظم، رامپور، نئی دنیا، دہلی، پیام وطن، دہلی، انیس، لکھنؤ اور جمہور، رامپور شامل ہیں۔ ہفتہ وار اخبارات میں شیر پنجاب، ایشیا، کاروانِ وطن، نظارہ، پرچم اور دارالسلطنت ہیں۔ ماہناموں میں آستانہ، جمالستان اور حسینی آواز وغیرہ ہیں۔

## وفات:

یہ ہمہ صفت اور ہمہ رنگ شاعر ادیب اور صحافی ۲ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۹۸۷ء کو غازی آباد میں حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا اور دنیا ایک ایسی عظیم علمی و ادبی شخصیت کے وجود سے محروم ہوگئی جس نے ساٹھ سال کی زندگی میں دنیائے شعر و ادب میں اتنے گہرے نقوش چھوڑے جو مدت مدید تک چراغ راہ بن کر شعر و ادب کی راہوں کو منور کرتے رہیں گے۔

ہندوستان کے متعدد شعراء نے تعزیتی نظمیں اور قطعات تاریخ کہے۔ ان میں ایک بہت اہم نام جناب باقر رضوی امانت خانی کا ہے جنھوں نے حسب ذیل مصرع سے مادہ تاریخ وفات نکالا <u>مہدی نظمی شاد ہیں فردوس میں وا حسب</u>

(۱۹۸۷ء)

(مجلہ خراج خلوص، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰)

جناب ابراہیم حامی نے فارسی میں قطعہ تاریخ کہا جو حسب ذیل ہے

ادیب و شاعرِ بے مثل مہدی نظمی
نثار گشت بہ اولادِ سرورِ عالم
بسالِ عیسوی حامی بگفت سال وفات
<u>"انیسِ عصر رواں شد بہ سوئے کاخِ ارم"</u>

۱۹۸۷ء

(مجلہ خراج خلوص، ۱۹۸۸، ص ۳۸)

حضرت مہدی نظمی کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ اس اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور مداحوں نے مہدی نظمی میموریل کمیٹی قائم کی جس کی طرف سے کئی تعزیتی مجلے اور ایک کتاب "مہدی نظمی، شخصیت و فن" شائع کی گئی۔ اس کے علاوہ مہدی نظمی میموریل ایوارڈ کا اجرا بھی کیا گیا جو اب تک ہندوستان کی کئی اہم ادبی شخصیتوں کو دیا جا چکا ہے۔

## مدفن:

ان کا مدفن غازی آباد میں ہے جہاں ان کی رہائش تھی اور وہ روزانہ دو گھنٹہ کا ریل کا سفر کر کے دہلی آتے تھے جو ان کے حصول معاش کا مرکز تھا۔

# حضرت غفرانمآبؒ، ان کی اولاد اور شاہانِ اودھ

ایک جگہ کسی نے ایسی عبارت لکھی ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ موصوف کے نزدیک حضرت غفرانمآبؒ اور ان کی اولاد شاہانِ اودھ کی پروردہ تھی۔ یہ ایک حد درجہ افسوسناک اور خلاف واقعہ تاثر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک معنی میں خود شاہان اودھ ان کے پروردہ تھے۔ چنانچہ جناب غفرانمآبؒ کے عہد میں شاہانِ اودھ ان کے مطیع و فرمانبردار رہے۔ شاہانہ طبیعت کی نزاکت گاہے گاہے حضرت غفرانمآب اور ان کی اولاد پر عتاب کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی تھی مگر بالعموم شاہان اودھ ان کے حد درجہ معتقد و مقلد تھے۔ ایک واقعہ اس کی تصدیق کے لیئے کافی ہے۔ ملاحظہ ہو

امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ، مطابق ۱۸۴۲ء میں تخت حکومت پر بیٹھے تو مذہب امامیہ کے اس نقطہ نظر کے مطابق کہ حکومت امامؑ کا حق ہے اور غیبت امامؑ میں نائب امام یعنی مجتہد کا، وہ حضرت غفرانمآبؒ کے بڑے فرزند حضرت سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ رضوان مآب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تخت و تاج ان کو پیش کر دیا۔ حضرت سلطان العلماء نے ان کو اپنا نائب مقرر فرما کر ان کو حق حکومت بخش دیا اور اس طرح ان کی حکومت کو شرعاً جائز قرار دیا۔ (ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ ص ۳۳)

حضرت تاثیر نقوی اجتہادی لکھنوی

(جناب سید محمد مہدی مرحوم مغفور تاریخی نام [illegible])

۱۹۳۰ء تا ۱۹[illegible]ء

(عہد جوانی میں)

تاثیر میں نے پھولوں کو بخشی ہے زندگی
اپنی تمام عمر خزاں میں گزار کے

---

مجھ کو بخشی خلشِ خار تغافل اس نے
جس کے رخسار مہکتے ہیں گلابوں کی طرح
(تاثیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حضرت تاثیر نقوی

## نام:

اسم گرامی۔ سید محمد مہدی۔ تاریخی نام مظفر حسن۔ تخلص تاثیر

## سلسلۂ نسب:

سید محمد مہدی (تاثیر) خلف حکیم مولوی سید محمد احمد صاحب قبلہ ابن مولانا سید احمد صاحب قبلہ ملقب بہ علامہ ہندی ابن شمس العلماء مولانا سید ابراہیم صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ بن ممتاز العلماء مولانا سید تقی صاحب جنت مآب ابن سید العلماء مولانا سید حسین صاحب قبلہ علیین مکان ابن مولانا سید دلدار علی صاحب قبلہ غفران مآب علیہ الرحمۃ۔

## ولادت:

۸ شوال ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ کی ادب نواز سرزمین پر اس دنیا میں وارد ہوئے۔

## تعلیم:

ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں سلطان المدارس لکھنؤ اور مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں عربی، فارسی اور دینی تعلیم حاصل کی۔ خاندانِ اجتہاد علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ بڑے بڑے علماء، فقہاء و

مجتہدین کے وجود مسعود نے خاندان کو علم و ادب کا ایسا مرکز بنا دیا تھا جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ ایسی علمی و ادبی فضا میں پرورش پانے والوں میں حصول علم کا ذوق خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

## علمی استعداد:

سلطان المدارس اور مدرسۂ ناظمیہ جیسے تعلیمی مدرسوں میں علم حاصل کرنے والوں کی علمی استعداد بلند ہوتی ہے۔ اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ کون کون سے اسناد حاصل کیئے اور کس کس عالم سے اکتساب فیض کیا۔

## ذریعۂ معاش:

نصابی تعلیم کے علاوہ حضرت تاثیر نے اپنے ذاتی ذوق و شوق کی بناء پر خطاطی سیکھی۔ اس فن میں ان کے استاد جناب محمد جواد صاحب اعلی اللہ مقامہ تھے جن کا اپنے وقت میں وہاں کوئی مثل و نظیر نہ تھا۔ چنانچہ تاثیر صاحب خود بھی اس فن میں صاحب کمال ہوئے۔ اسی کو انھوں نے اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

اس کے علاوہ صحافت کو بھی بطور پیشہ اختیار کیا۔ اس طرح انھیں حصول معاش کے دو ذریعے دستیاب تھے۔

## ازدواجی زندگی:

بیس اکیس سال کی عمر میں لکھنؤ کے نامور شاعر علامہ آرزو کی صاحب زادی سے شادی ہوئی۔ چند سال کے بعد کچھ اختلافات کی بناء پر دونوں میں علیٰحدگی ہوگئی۔

اس کے بعد ان کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ان سے منسوب ہوئیں جن کے ساتھ ان کی زندگی بہت خوش گوار گزری۔

## اولاد:

تاثیر صاحب کی زوجۂ اولیٰ سے ایک بیٹی ہیں۔

زوجہ ثانی سے چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے ہیں۔ بیٹوں کے نام حسب ذیل ہیں

۱۔ سید مسعود حسن عرف عباس حیدر۔

۲۔ سید ممتاز حیدر جو بہ سلسلہ ملازمت دہلی میں مقیم ہیں۔

۳۔ سید محسن مظفر نقوی جنھوں نے حصول علم دین کی طرف توجہ کی۔ عربی و فارسی میں کامل استعداد حاصل کی۔ عالم دین کے درجہ پر فائز ہوئے۔ عربی شعر و نظم لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ قصیدے بھی عربی میں کہتے ہیں۔ کئی کتابیں تصنیف و تالیف کر چکے ہیں۔ مولوی ہونے کے باوجود مذہب کو حصول زر کا ذریعہ نہیں بنایا۔ سرکاری ملازمت اختیار کی، ہومیوپیتھی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اب ہومیوپیتھ ڈاکٹر کی حیثیت سے مطب کرتے ہیں۔ حضرت تاثیر کے متعلق بیشتر معلومات مجھے انھیں سے حاصل ہوئیں۔

۴۔ سید کاظم مہدی۔

۵۔ سید عبداللہ اختر۔

تاثیر صاحب کی یہ سب اولادیں شائستہ اخلاق و لائق ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ تربیت کا ثمرہ ہے۔

### حلیہ:

حضرت تاثیر درمیانہ قد، چھریرے بدن اور گندمی رنگت کے حامل تھے۔ شیروانی اور ٹوپی کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے تھے۔

### مزاج واخلاق:

مزاج میں نرمی، اخلاق میں شائستگی اور رہن سہن میں ادب و آداب کا خیال رکھتے تھے۔ خوش خصال و خوش سیر تھے۔ چھوٹے بڑے سب سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

### شاعری

شاعری کا ذوق خاندانی تھا۔ ان کے والد ماجد حکیم سید محمد صاحب مرحوم بھی ایک

خوش فکر شاعر تھے۔ ناصح تخلص کرتے تھے۔ نانا حضرت رضی لکھنوی کا شمار مستند شعرا میں تھا۔ جناب طاہر تونسوی نے "ملتان میں اردو شاعری" میں لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء سے شاعری کا آغاز کیا جب لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرہ کے لیئے غزل کہی مگر باقاعدہ شاعری ۱۹۴۱ء سے شروع کی۔

## تلمذ:

اردو کے نامور شاعر حضرت علامہ آرزو لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا جن کی صاحب زادی حضرت تاثیر سے منسوب تھیں۔ وہ خود بھی اچھی شاعرہ تھیں۔ اس لیئے یہ سببی رشتہ ان کے ذوق شاعری کو اور نکھارنے کا باعث ہوا۔ ان کا تخلص تاثیر بھی حضرت آرزو نے تجویز کیا۔ اپنی غزلوں کے مجموعہ "ارغواں" میں انھوں نے لکھا ہے کہ آرزو صاحب سے چند ابتدائی غزلوں پر اصلاح لی اور بس۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ قومی نظمیں تک لکھیں اور آخر میں دو مرثیے بھی کہے۔ مگر زیادہ توجہ غزل کی طرف تھی۔ جناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت احسان دانش جیسے شعرا سے خاص مراسم اور قربت تھی۔

اپنے دو مرثیوں پر انھوں نے شاعر آل محمدؑ حضرت نسیم امروہوی سے اصلاح لی۔ اس کے علاوہ اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

## تلامذہ:

رفتہ رفتہ انھوں نے خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور متعدد شعرا ان کے شاگرد ہو گئے تھے جن میں خصوصیت کے ساتھ ملتان کے کچھ معروف اور معتبر شعرا کے نام بھی شامل ہیں۔ مثلاً پروفیسر حسین سحر، ارشد ملتانی، اقبال ارشد، نور صابری، قمر لکھنوی اور خادم کیتھلی وغیرہ۔

## مرثیہ گوئی:

حضرت تاثیر نے دو مرثیے کہے۔ "لب جبرئیل" اور "آیات حق"۔ "لب جبرئیل"

دسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ "آیات حق" اکتوبر ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

پاکستان کے نامور اور مقبول ترین خطیب و ذاکر حضرت علامہ نصیر الاجتہادی اعلی اللہ مقامہ نے ان کے مرثیہ "لب جبرئیل" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ان کی مرثیہ گوئی پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

> "انھوں نے روایت کی کہنگی کو آفتاب تازہ کا شباب بخشا ہے اور جس عصر میں ان کا معاشرہ کرب فکر و نظر سے گزر رہا ہے اس سے جدید تقاضوں کو قدیم روایتوں سے اس طرح ملا دیا ہے جیسے اہرام مصر پاکستان کی سرزمین پر منتقل ہو گئے ہوں"۔

مگر ان کے دونوں مرثیوں کے مطالعے سے مجھے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے مرثیوں میں کلاسیکی مرثیوں کے اثرات بہت کم ہیں۔ ان مرثیوں کے اجزائے ترکیبی سے انھوں نے صرف نظر کیا ہے جن کے بغیر کسی مرثیہ کو قدیم یا کلاسیکی طرز کا مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتبار سے ان کے مرثیے سرتاسر جدید ہیں۔

دراصل ہر چیز کو قدیم و جدید کے معیار پر پرکھنا ضروری نہیں ہے۔ تائب صاحب کے مرثیے ان کے اپنے مخصوص رنگ میں ہیں جو کسی سے مستعار نہیں ہے۔ یہ ان کی انفرادی فکر کی تخلیق ہیں اور اس اعتبار سے منفرد ہیں۔

دوسری بات جو میں نے محسوس کی ہے وہ یہ کہ ان کے مرثیے قصیدہ سے زیادہ ہم آہنگ ہیں اور مرثیہ کے مخصوص مزاج کا پتہ ان میں کم ہے۔ دونوں مرثیوں کا مختصر سا جائزہ میری اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔

"لب جبرئیل" میں کل بہتر بند ہیں۔ اس کا مطلع ہے

ہر انقلاب خیر کے بانی حسینؑ ہیں

پہلے بند سے دسویں بند تک امام حسینؑ کی مدح ہے جس میں شہادت و ولایت کے حوالوں سے بھی مدحت سرائی ہے۔ گیارھویں بند سے امام حسینؑ کی [illegible] اپنے فضائل و اختیارات

کے بارے میں ہے جس میں رجز کا انداز پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں بند سے انتالیسویں بند تک حضرت علیؑ کی مدح ہے۔ چالیسویں بند کی بیت سے دو بندوں میں کربلا کی تعریف ہے۔ بیت یہ ہے:

میں کعبۂ شہادت کبریٰ بناؤں گا
جاں دے کر ایک شہر عقیدت بساؤں گا

اگلے بند کا پہلا مصرع:

وہ شہر جس کی خاک پہ سجدوں کو ناز ہو

اس کے بعد امام حسینؑ کی زبان مبارک سے اپنے انصار و اعزا کی وفاداریوں، جذبۂ ایثار اور شہادتوں کے متعلق کچھ اشارے ہیں۔ آخر میں تین بند جناب علی اصغر کی شہادت سے متعلق ہیں۔ بیانِ مصائب میں وہ شدت نہیں ہے جو دلوں کو تڑپا دے۔ یہ جدید مرثیہ گو حضرات کے مزاج کے مطابق ہے جو کہتے ہیں کہ مرثیہ رونے رلانے کے لیئے نہیں ہوتا۔

''آیات حق'' تو گویا پورے کا پورا حمدیہ قصیدہ ہے جس میں پہلے بند سے ساٹھویں بند تک حمد باری تعالیٰ ہے۔ باقی پندرہ بندوں میں کربلا کی طرف کچھ اشارے ہیں جو بیان مصائب کا حصہ ہیں۔ اسی لیئے میں نے عرض کیا کہ ان کے مرثیے قصیدہ سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

ان مرثیوں میں شاعری کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ الفاظ کا در و بست، مصرعوں کی بندشیں، زورِ سخن، سلاست، روانی، فکر کی تازگی، تخئیل کی بلندی اور مدح میں دلی جذبات عقیدت کو سمو دینے کی کیفیت نے ان مرثیوں کو شاعری کا ایک حسین مرقع بنا دیا ہے جن کو پڑھ کے وجدان متحرک ہوتا ہے اور ذوقِ سخن وجد کرتا ہے۔ مرثیوں اور مسدسوں سے کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

## حمد باری تعالیٰ:

"آیاتِ حق" سے حمد کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔ مطلع سے آغاز کرتے ہیں:

حمد و ثنائے خالقِ کون و مکاں کروں
افشائے رازِ حسنِ زمین و زماں کروں
کلکِ دودم کو ہمدمِ شمعِ زباں کروں
دل کا لہو ملا کے سیاہی رواں کروں
معبودِ کائنات بصیرت کو نور دے
یارب مجھے زبان و بیاں پر عبور دے

کلیوں کے لب ہلیں تو سنوں تیری گفتگو
گل مسکرا کے عرض کریں جو ہے آرزو
غنچے بتائیں کس کی عطا ہے یہ رنگ و بو
شاخیں کہیں، کہاں سے ملی قوتِ نمو
کس کی مہک ہے جس سے معطر گلاب ہے؟
وہ کون ہے جو سبزے کی تعبیرِ خواب ہے؟

گاتی ہیں جھوم جھوم کے کیا گیت ڈالیاں؟
کس نے کیا ہے گل کی رگوں میں لہو رواں؟
ہیں کس کی جستجو میں بہاروں کے کارواں؟
آتی ہے کس کے حکم سے گلزار میں خزاں؟
رقصاں چمن میں بادِ سحر کس کے ساتھ ہے؟
شاخوں کے ارتعاش میں یہ کس کا ہاتھ ہے؟

آغوش میں جو خاکِ تپیدہ کی تھا نہاں
اس تخم بے سواد کو کس نے کیا عیاں؟

کھولا سروں پہ کس نے درختوں کا سائبان؟
شاخوں کو کس نے پھولوں کی پہنائیں بالیاں؟
ہے نقش پنکھڑی میں یہ کس دستکار کا؟
کس نے پھلوں سے بھر دیا دامن بہار کا؟
دوشِ ہوا پہ کس نے گھٹائیں گذار دیں؟
بارش سے رنگتیں گلِ تر کی نکھار دیں؟
کس نے عروسِ ارض کی زلفیں سنوار دیں؟
ذروں میں کس نے مہر کی کرنیں اتار دیں؟
صحرا میں کارواں ہیں رواں کیوں غبار کے؟
کس نے بلند کر دیئے سر کوہسار کے؟
ساحل کے لب کو کر دیا تر کس نے آب سے؟
موجوں کو ہمکنار کیا پیچ و تاب سے!
شاعر کے دل کو توڑ کے گرزِ حباب سے!
اہلِ ریا کو درس دیا ہے سراب سے!
گھیرا ہے جو سفینۂ ہستی بلاؤں نے
ہے کون جس کو دی ہے صدا ناخداؤں نے؟
دریا سے کس نے خاک کو پر آب کر دیا؟
پانی میں مچھلیوں کو شعورِ سفر دیا
منہ موتیوں سے سیپیوں کا کس نے بھر دیا؟
ڈوبا جو تہہ میں اس کو صدف نے گہر دیا
دل میں ہے جو امنگ وہی جزر و مد میں ہے
کس کے کرم سے شورشِ سرا اپنی حد میں ہے؟

کانٹوں کا کس نے دشت میں بستر بچھا دیا؟
جس پر ہے بے تکان رواں آہوئے ہوا
جاتی ہے مشک لے کے ادھر سے ادھر صبا
آتے نہیں نظر کو نظر جس کے نقشِ پا
صحرا کو میرے قلب کی وسعت عطا ہوئی
پھر بھی نہ رسمِ آبلہ پائی ادا ہوئی

کس تیشے سے تراشی گئی چشمِ کوہسار
اشکوں کی طرح جس سے رواں ہیں یہ آبشار
کس تیرِ نیم کش نے کیا اس کا دل فگار؟
کس کے لیئے یہ رہتا ہے دن رات اشکبار؟
کس کے نفوذ سے دلِ سنگ آب آب ہے؟
کیوں برف کی پہاڑ کے رخ پر نقاب ہے؟

اٹھتا ہے قلبِ بحر سے دودِ دلِ حزیں!
کیوں بھیگتی ہے ابرِ بہاراں کی آستیں؟
کیوں اوس سے ہے پیرہنِ خاک شبنمیں؟
پیتی ہے اشکِ چشمِ فلک کس لیئے زمیں؟
برسائیں رحمتیں جو کرم کی سحاب نے
بھر بھر کے رکھ لیئے ہیں کٹورے گلاب نے

حمد باری تعالیٰ کے یہ بند آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ تقریباً ساٹھ بندوں میں سے میں نے انتخاب کرنے کے بجائے مطلع سے مسلسل دس بند درج کردیئے ہیں جو حمد کے دلنشیں انداز کو واضح کرنے کے لیئے کافی ہیں۔

اب ایک اور مسدس صبحِ ازل سے نعت رسول مقبولؐ کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔ اس میں

چھ ہی بند ہیں۔

یہ بند مرثیے کے نہیں ہیں مگر مندرجہ بالا حمد یہ بندوں کے حوالے سے نعت کے یہ بند بھی درج کرنا غالباً نامناسب نہیں:

اے محمدؐ! اے خدا کے نور کی پہلی کتاب
لفظ کن کی داستانِ حسن کے بے مثل باب
خسروِ کون و مکاں کے روئے انور کی نقاب
اے حسینوں کے حسیں، صبحِ ازل کے آفتاب
آپؐ کے پرتو سے روشن ماہ و اختر ہو گئے
آپؐ کی خوشبو سے دو عالم معطر ہو گئے

آپ جب آئے تو اپنے ساتھ لائے زندگی
آپ کے رخسار سے پھولوں نے مانگی دلبری
آپ کے شانوں پہ شب نے زلف اپنی کھول دی
آپ نے اُلٹی نقاب رخ تو پھیلی روشنی
رحمتیں آنے لگیں رندوں کی صورت جھوم کر
ہو گئیں سرشار ساقی کے لبوں کو چوم کر

نقشِ پا کی خاک سے چمکی جبینِ آسماں
جب گلے ذرے ملے تو مسکرائی کہکشاں
راہ میں جھک جھک کے مہر و ماہ نے چومے نشاں
اٹھ گئے پردے، کھلے اسرارِ بزمِ لامکاں
ملکۂ افلاک دامانِ قبا میں آ گئی
کاکلِ زنجیر در دستِ صبا میں آ گئی

ہو گئی آراستہ الجھی ہوئی زلفِ حیات

کے ولولہ انگیز اندازِ بیان کا خوب صورت نمونہ ہیں اس لیئے درج کر رہا ہوں

## علیؑ

علیؑ بلند ، علیؑ ارفع و علیؑ اعلیٰ
علیؑ بلند ، علیؑ برتر و علیؑ بالا
علیؑ ہے ساحلِ ہستی ، علیؑ ہے آبِ بقا
علیؑ ہے حسن ، علیؑ عکسِ شمعِ بزمِ دنیٰ

تلاش تھی رمِ آہوے جستجو کے لئے
بہت وسیع ہے میداں یہ گفتگو کے لئے

علیؑ شہید ، علیؑ شاہد و علیؑ مشہود
علیؑ سجود ، علیؑ ساجد و علیؑ مسجود
علیؑ مقدرِ انسانیت ، علیؑ مقصود
علیؑ کی حد نہیں کوئی ، علیؑ ہے لامحدود

جہاں ہے وہ ، وہاں جلتے ہیں جبرئیلؑ کے پر
کبھی پہنچ نہیں سکتا براقِ فکر و نظر

علیؑ انیس ، علیؑ مونس و علیؑ محرم
علیؑ نصیر ، علیؑ ناصر و علیؑ ہمدم
علیؑ حکیم ، علیؑ حاکم و علیؑ محکم
علیؑ علیم ، علیؑ عالم و علیؑ اعلم

جہاں حباب ہے اور بحرِ بے کراں ہے علیؑ
ہے کائنات زمیں اور آسماں ہے علیؑ

علیؑ ہے راہ ، علیؑ رہنما ، علیؑ رہبر
علیؑ ولی خدا ہے ، علیؑ ہے علم کا در

علیؑ ہے مالکِ تسنیم ، ساقیِ کوثر
علیؑ رسولِ خدا کے چمن کا ہے گُلِ تر

علیؑ کے نور سے پر نور آرزو کا جہاں
نفس نفس سے معطر ہے رنگ و بو کا جہاں

علیؑ کے سایۂ داماں میں صاحبانِ شعور
علیؑ کی لوحِ جبیں ہے امینِ جلوۂ طور
علیؑ کے نقشِ کفِ پا کا آفتاب میں نور
علیؑ کے واسطے یکساں ہے غیب ہو کہ حضور

علیؑ صحیفۂ ہستی کا نقطۂ اول
علیؑ عروسِ دو عالم کی آنکھ کا کاجل

علیؑ ہے عقدہ کشائے جہانِ بے تقدیر
علیؑ ہے دستِ مشیت کا ناخنِ تدبیر
علیؑ ہے احمدِ بے میم کی حسین تصویر
علیؑ ہر اک ورقِ دل پہ ہے جلی تحریر

کھلیں جو لب تو کھلیں لاکھ گل بلاغت کے
ہلے زباں تو رواں بحر ہوں فصاحت کے

علیؑ الست کی مے ہے، علیؑ ہے جام و سبو
علیؑ بہار ، علیؑ گلستاں ، علیؑ خوشبو
علیؑ ہے سبزہ ، علیؑ غنچہ ہے ، علیؑ گل رو
علیؑ سے خاکِ چمن کو ملا مزاجِ نمو

علیؑ کے زیرِ قدم ہے ہر اک مقامِ بلند
علیؑ کے بندِ قبا میں جہاں کے راز ہیں بند

علیؑ ہے فکر کا محور، علیؑ ہے حسنِ خیال
علیؑ ہے منبعِ عرفاں، علیؑ ہے حدِ کمال
علیؑ جمیل، علیؑ جملہ انبیاؑ کا جمال
علیؑ ہے صبر کا پیکر، علیؑ خدا کا جلال
علیؑ ہے فکرؔ کے قرآں کا اولیں پارہ
علیؑ وہ نقطہ جو ہو تحتِ بائے بسم اللہ

علیؑ خبیر، علیؑ مبتدا، علیؑ ہے خبر
علیؑ ہے بحر، علیؑ ہے صدف، علیؑ ہے [illegible]
علیؑ ہے برگ، علیؑ بار ہے، علیؑ ہے [illegible]
علیؑ قلم ہے، علیؑ شاخ ہے، علیؑ ہے [illegible]
علیؑ کتاب دو عالم کا دل نشیں عنواں
علیؑ زبور، علیؑ شرح سورۂ قرآں

مولانا [illegible] کی مدح [illegible] یہ بند [illegible] حسب [illegible] آئینہ دار اور حب علیؑ سے سرشار ہونے کی بین دلیل ہیں۔ [illegible] قوت نظم اور حسن سخن بھی نمایاں کرتے ہیں۔

اس کے بعد ان کے پہلے مرثیہ "[illegible]" سے [illegible] حسینؑ و نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا انداز ملاحظہ کیجیے:

ہر انقلابِ خیر کے بانی حسینؑ ہیں
کردار میں رسولؐ کے ثانی حسینؑ ہیں
محبوبۂ ازل کی جوانی حسینؑ ہیں
زندہ ہے جس سے حق وہ کہانی حسینؑ ہیں
مشکل پسندیاں کوئی آسان تو نہیں

کیسے رہیں خموش ، یہ قرآن تو نہیں

جو رد نہ ہو کبھی وہ شہادت حسینؑ ہیں
قائم ہے حشر تک وہ صداقت حسینؑ ہیں
قرآں کا علم اجرِ رسالت حسینؑ ہیں
جو سب پہ فرض ہے وہ عبادت حسینؑ ہیں
واجب سمجھتے ہیں جو محبت رسولؐ کی
اس آئینے میں دیکھ لیں صورت رسولؐ کی

زخموں نے ان کے دامن دل پہ کھلائے باغ
مہکا لباس زیست ، معطر ہوئے دماغ
صہبائے غم سے آنکھوں کے پُر ہو گئے ایاغ
پلکوں پہ آنسوؤں نے جلائے نئے چراغ
دانشوروں کی فکر کا عنواں بدل گیا
انسان انقلاب کے سانچے میں ڈھل گیا

دنیا ملوکیت کو سمجھنے لگی تھی حق
تاریکیوں میں نور کی باقی نہ تھی رمق
پیہم فصیلِ علم و عمل ہو رہی تھی شق
رنگیں تھے خونِ فکر سے قرآں کے ورق
تھا ختم فاصلہ حق و باطل کے درمیاں
آئے حسینؑ جادہ و منزل کے درمیاں

سر پہ کلاہِ تاجِ رسولانِ ذی وقار
بر میں قبائے معرفت ذات کردگار
چہرہ بھی پُر شکوہ ، کمر میں بھی ذوالفقار

مقتل کا خوف اور نہ تمنائے اقتدار

کاندھوں پہ یہ لیئے ہوئے بارِ پیمبری
رکھ لیں گے جان دے کے وقارِ پیمبری

امام حسینؑ کے حضور میں نذرانۂ عقیدت کے یہ مختصر سے بند حضرت تاثیر کی فکر و نظر، اسلوب کی ندرت واضح کرنے کے لیئے کافی ہیں۔ میں نے اس خلاصہ میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اس لیئے کہ ان کے دونوں مرثیے مطبوعہ ہیں اور صاحبانِ ذوق ان کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

ب۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ کی شان میں تین بند ملاحظہ ہوں

وفا کا قلب، وفا کا جگر، وفا کا ضمیر
وفا کی روح، وفا کا لہو، وفا کا خمیر
وفا کا ذہن، وفا کی نظر، وفا کا بصیر
وفا کی سیف، وفا کا علم، وفا کا امیر
زمیں پہ ہے وفاؤں کا آسماں عباسؑ
جہاں جہاں ہیں وفائیں وہاں وہاں عباسؑ

وفا میں حیدرِ کرار کی حسیں تصویر
بہادری میں بھی بے مثل، مثلِ خیبر گیر
وفا کی خونِ عمل سے لکھی ہوئی تفسیر
جبینِ وقت پہ جبریلِ عشق کی تحریر
وفا کی وحی کا پہلا کلام ہے عباسؑ
وفا کے دین کا آخر امام ہے عباسؑ

یہی ہے قوت بازوئے حضرت شبیرؑ
یہی ہے فاطمہؑ زہرا کے خواب کی تعبیر

اسی کے ہاتھ میں اہلِ وفا کی ہے تقدیر
اسی کا نام ہے مشکل میں آخری تدبیر
ہر ایک قلبِ شکستہ کی ہے صدا عباسؑ
ہر اک زباں پہ ہے اشکوں کے ساتھ یا عباسؑ

آخر میں ''اب جبریل'' سے مصائب کے چند بند جن میں امام حسینؑ کی زبانی جناب علی اصغرؑ کی شہادت کا بیان ہے:

اک زندہ انقلاب کا عنواں لیئے ہوئے
زخموں کا تن پہ اپنے گلستاں لیئے ہوئے
اصغرؑ سا پھول ہوں تہِ داماں لیئے ہوئے
قربانیوں کا آخری قرآں لیئے ہوئے
اب آرزو نہیں مجھے ذاتی بہار کی
زنجیر توڑ دی ہے غمِ روزگار کی

اصغرؑ کو میں اٹھا کے کروں گا سوالِ آب
ظاہر عدو میں ہوگا قیامت کا اضطراب
دیکھے گا ابنِ سعد جب آثارِ انقلاب
دیدے گا حکم، تیر [illegible]
کھا کر گلے پہ تیرِ ستم مسکرائے گا
کھلنے نہ پائے گا کہ یہ گل ٹوٹ جائے گا

آگے بڑھا صفوں سے کماں لے کے حرملا
باندھا نشانہ، چلّے سے تیرِ ستم چلا
ہاتھوں پہ میرے چاند مرا منقلب ہوا
دی میں نے آسماں کی طرف دیکھ کر صدا

اس کے لہو کا رخ پہ میں غازہ لگاؤں گا
یوں روزِ حشر سامنے نانا کے جاؤں گا

عزم و عمل کا ، عہد کا پیمان کا لہو
روحانیت کا ، خلق کا ، ایمان کا لہو
حق کا ، وفا کا ، عشق کا ، ایقان کا لہو
دشتِ بلا کے آخری مہمان کا لہو

ننھی سی قبر کھودوں گا [illegible] سے واسطے
قرآن ہے یہ خاک کے جزداں کے واسطے

تاثیر تابِ ضبط نہیں توڑ دے قلم
کوئی بیان کر نہیں سکتا یہ ہے وہ غم
دل سب کے پارہ پارہ ہیں آنکھیں ہیں سب کی نم
ارشادِ فاطمہؑ ہے کہ ہیں اشکبار ہم

تجھ کو صلا ملے گا مری بارگاہ سے
دلواؤں گی میں خلد رسالتؐ پناہ سے

## دیگر رثائی اصناف:

حضرت تاثیر نقوی اعلی اللہ مقامہ نے مرثیے کے علاوہ دیگر رثائی اصناف یعنی سلام، نوحہ، رباعیات اور قطعات وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی اور ان میں ایک قابل ذکر ذخیرہ چھوڑا جس میں کچھ مطبوعہ ہے اور کچھ غیر مطبوعہ۔

## سلام گوئی:

ہر مرثیہ نگار سلام ضرور کہتا ہے۔ حضرت تاثیر نقوی مرحوم و مغفور نے بھی متعدد سلام کہے۔ ان کے سلاموں کا ایک مجموعہ "صدائے غم" کے نام سے محفوظ بک ایجنسی، کراچی نے

پہنچا دے میرے مالک خیموں میں شاہِ دیںؑ کے — پیروں سے مضطرب ہیں موجیں اس آرزو میں

بولی اجل یہ بڑھ کر جب مسکرائے اصغرؑ — بس بس کہ جان دینا داخل ہے ان کی خو میں

انصارِ شاہؑ والا یوں گردِ شاہِ دیںؑ تھے — پروانے جیسے آئیں مرنے کی آرزو میں

اے مسکرانے والے دستِ شہِؑ ہدا پر — کیا کیا نہ کہہ گیا تو خاموش گفتگو میں

تیرِ مژہ سے اس کے خود موت کانپتی ہے — جو جنگ کر رہا ہو مرنے کی آرزو میں

یہ چند اشعار نمونۂ کلام کے لیئے کافی ہیں۔ ان میں تخیل کی بلندی بھی ہے اور قدرت و تازگی بھی۔ تغزل بھی ہے اور مرثیت بھی۔ جدت مضامین بھی ہے اور ندرت خیال بھی یہ صفات ان کو بجا طور پر اعلیٰ مرتبہ کے سلام نگاروں کی صف میں جگہ دیتے ہیں۔

حضرت تاثیر کو امام حسینؑ سے جو قلبی لگاؤ اور بے پناہ عقیدت تھی وہ ان کے سلاموں کے مقطعوں سے ظاہر ہے۔ چند مقطعے ملاحظہ ہوں

تاثیر کوئی شک نہیں اس کی نجات میں — جس کو ہوئی نصیب محبت حسینؑ کی

ہے ناز ان کی غلامی کا اس کو بھی یارب — گناہ بخش دے تاثیر کے بنامِ حسینؑ

اس طرح رویا غمِ شبیرؑ میں تاثیر میں — پڑ گیا تسنیم و کوثر میری چشمِ تر کا نام

غیر حق سے کیوں کروں تاثیر میں حاجت بیاں — واسطہ شبیرؑ کا دے کر جو مانگا مل گیا

نہ جب تک کربلا تاثیر جائے — خیالِ مرگ تڑپاتا رہے گا

تاثیر نارِ دوزخ اس پر حرام ہوگی — شبیرؑ کی محبت شامل ہو جس کی خو میں

یہ تمام اشعار حضرت تاثیر کے عقیدہ و عقیدت کے ترجمان ہیں اور شاعری کے اعتبار سے بھی قابلِ داد ہیں۔

## نوحہ گوئی:

تاثیر صاحب نے سلاموں کے ساتھ ساتھ نوحے بھی کہے ہیں۔ نوحہ گوئی کے متعلق میں استاذ الاساتذہ نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر علیہ الرحمہ کے مضمون میں ذرا تفصیل سے اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ نوحہ گوئی رثائی ادب کی بہت اہم صنفِ سخن ہے۔

یہ حقیقت میں بین مصائب اور غم انگیز اور درد انگیز مضامین سے عبارت ہیں۔ یہ سب ہماری نظر میں یہ بیان مرثیے حقیقت میں ایک مکمل صنفِ سخن ہے۔ حضرت ساحر کے نوحے اس صنفِ سخن کی تمام خصوصیات کے حامل ہیں۔ نمونے کا ایک نوحہ پیش خدمت ہے جو "صدائے غم" میں شامل ہے

## تابوت ہے یہ پردیسی کا

آتی ہے فلک سے غم کی صدا، تابوت ہے یہ پردیسی کا
دل تھام کے رو لو آہ و بکا، تابوت ہے یہ پردیسی کا

مارے گئے عباس و اکبر، قاسم بھی ہوئے قتل جب سے
سونا ہوا دشتِ کرب و بلا، تابوت ہے یہ پردیسی کا

سر پیٹ کے کہتی تھیں زینب، افسوس خزاں آئی رن میں
زہرا کا چمن برباد ہوا، تابوت ہے یہ پردیسی کا

اب کون ہے امت کا ہادی، اب کون ہے امت کا والی
مارے گئے رن میں شاہِ ہدیٰ، تابوت ہے یہ پردیسی کا

وہ ساقیِ کوثر کا بیٹا، قبضے میں خدائی تھی جس کے
افسوس اسے پانی نہ ملا، تابوت ہے یہ پردیسی کا

اعدا نے ستم کن کن سے کیے، جس پہ وہ تشنہ رن میں
پامال ہوا جس کا لاشہ، تابوت ہے یہ پردیسی کا

امت کی شفاعت کی خاطر خنجر پہ گلا جس نے رکھا
ماتم کرو اس کا اہلِ عزا، تابوت ہے یہ پردیسی کا

اکبر کی شہادت بھی دیکھی ، قاسم کا تڑپنا بھی دیکھا
شبیر کی ہمت کیا کہنا ، تابوت ہے یہ پردیسی کا

مولیٰ تری ہمت کے صدقے مولیٰ تری جرأت کے قرباں
امت کے لیئے سر اپنا دیا ، تابوت ہے یہ پردیسی کا

تاثیر کرو ماتم اس کا ، تاثیر بہاؤ اشک اس پر
ہے کوئی نہیں رونے والا ، تابوت ہے یہ پردیسی کا

## رباعیات اور قطعات:

تاثیر صاحب نے رباعیات اور قطعات بھی خاصی تعداد میں کہے مگر اس وقت ان اصنافِ سخن میں ان کا کلام میرے پیشِ نظر نہیں ہے اس لیئے قارئین کے ملاحظہ کے لیئے نمونتاً بھی اسے درج کرنا ممکن نہیں۔

## تاریخ گوئی:

حضرت تاثیر کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی اور اکثر بڑے صاف اور برجستہ تاریخی مادے نکالتے تھے۔ نمونے کے طور پر چند تاریخیں ملاحظہ ہوں جو اکثر اعزا و احباب کے انتقال پر کہی گئی تھیں۔

۱۔ تاریخ وفات سید محمد اکبر صاحب مرحوم (انڈیا)۔

سالِ رحلت اشکِ غم سے لوحِ تربت پر لکھو "جاوداں قبرِ محمد اکبر طاب ثراہ"
۱۴۰۰ھ

۲۔ تاریخ وفات حضرت عالی جونپوری مرحوم۔

کہا رضواں نے کہ لکھو تاثیر "آ گئے ہیں باغِ جناں میں عالی"
۱۴۰۴ھ

اس تاریخ میں حضرت تاثیر نے آنے کی یائے مجہول کے بیس عدد شمار کیے ہیں۔

## مختصر مرثیہ

خزاں میں حسن طلب چاہے پھول کی خوشبو
بسے دماغ میں باغ بتولؑ کی خوشبو
نہ کم ہو رحمتِ حق کے نزول کی خوشبو
میں سونگھتا رہوں زلف رسولؐ کی خوشبو

اثر زباں میں یہ پروردگار آجائے
بہار منھ سے کہوں اور بہار آجائے

بہار ایسی کہ دل باغ باغ ہوجائیں
گل اپنا رنگ بدل کر چراغ ہوجائیں
چراغ گل ہوں تو گل دل کے داغ ہوجائیں
میں چاہتا ہوں معطر دماغ ہوجائیں

ترے کرم کی گھٹا جھوم جھوم کر برسے
کہ مے چھلکنے لگے ساغر گل تر سے

وہ مے کہ پی کے جسے بے خودوں کو ہوش آئے
سروش جس کے لیے بن کے بادہ نوش آئے
دلوں میں لے کے جو کوثر کی مے فروش آئے
وہ مے جو پی کے انیسؔ و نسیمؔ و جوشؔ آئے

بفیضِ عشق خیالِ امامؑ آیا ہے
عروسِ فکر کے ہاتھوں میں جام آیا ہے

عروسِ فکر ہوئی محوِ گلشن آرائی
چمن میں بوئے چمن لے رہی ہے انگڑائی
دل و نظر پہ ہے جاری سجودِ رعنائی

بصد غرور نسیمِ سبک خرام آئی

نہ داغ دامنِ گل دھل سکا جو شبنم سے
کچھ اشک دیدۂ نرگس نے لے لیئے ہم سے

وہ اشک ، دور ہوا جن سے کربِ تیرہ شبی
وہ اشک ، جن سے ضیا چشمِ کائنات نے لی
وہ اشک ، جن سے ہے سرسبز باغِ دینِ نبیؐ
وہ اشک ، جن سے ہے رومالِ فاطمہؑ میں نمی

وہ اشکِ غم جو حریفِ غمِ جہاں ٹھہرے
حقیقتِ ابدی کے مزاج داں ٹھہرے

حقیقتِ ابدی وہ ، نہیں زوال جسے
بنا سکے نہ کوئی بدر سے ہلال جسے
نہ چھو سکے پرِ پروازِ ماہ و سال جسے
کرے سلامِ ادب جھک کے ہر کمال جسے

فلک سے جس کے لیئے جبرئیلؑ آئے ہیں
جناں سے دیکھنے جس کو خلیلؑ آئے ہیں

خلیلؑ ! جن کے لیئے آگ ہوگئی گلزار
لپک کے آ گیا شعلوں میں کاروانِ بہار
لہو لہو یہ پرِ طائرانِ لیل و نہار
کریں گے سایہ ، شفق رنگ ہو جہاں پہ غبار

جہاں خلیلؑ کو تعبیرِ خواب مل جائے
کتابِ حق کو شہادت کا باب مل جائے

وہ باب جس سے کھلیں روشنی کے باب ہزار

زمینِ کرب و بلا، اصلِ عالمِ انوار
طوافِ نقشِ کفِ پا میں گردشِ پرکار
رکے تو رکنے لگے نبضِ وقت کی رفتار
بقائے دینِ محمدؐ کے راز کھل جائیں
خود اپنے خون سے رنگیں، خون سے نہا جائیں

وہ خون، جس میں محمدؐ کے خون کی خوشبو
وہ خون، جس میں ہے شامل علیؑ کے دل کا لہو
وہ خون، جس سے کرے روح کائنات وضو
وہ پاک خون کہ جس سے ہوئی ہے حق کی نمو
گرے جہاں وہ زمیں امن پاک ہو جائے
کہ جو جبیں بھی جھکے تابناک ہو جائے

زمین وہ کہ جہاں حق کا کارواں ٹھہرا
ازل سے جس کو ہے گردش وہ آسماں ٹھہرا
نبیؐ کا لال، مشیت کا راز داں ٹھہرا
لبِ فرات غمِ بحرِ بے کراں ٹھہرا
چراغ خون سے ہر ایک نے جلائے ہیں
حسینؑ ساتھ بہتر چراغ لائے ہیں

حسینؑ ابنِ علیؑ میرِ کاروانِ حیات
ہے جس کا نقشِ کفِ پا نشانِ عزم و ثبات
بنی وجودِ خدا کی دلیل جس کی ذات
پڑھے جو نیزے پہ ام الکتاب کی آیات
اسی کا حق ہے کہ لہجے میں ان کے حق بولے

سکوت توڑ کے قرآں کا ہر ورق بولے

یہی بشارت ذبحِ عظیم کی تفسیر
یہی خلیل کے خوابِ گراں کی ہے تعبیر
زمیں پہ ابر، قائم ہیں، باعمل پہ ہے تیر
کہیں سناں، کہیں خنجر، کسی کے واسطے تیر

کچھ اور ہوگئی روشن امام کی صورت
یہ ہے حسین علیہ السلام کی صورت

جو دیکھا خون میں تر چہرۂ امام مبیں
زمیں سے مل گئی جھک کر جبین عرش بریں
فلک سے کہتے ہوئے آئے جبرئیل امیں
کسی زمانے میں ہم عصر تیرا کوئی نہیں

یہ برکتیں ہیں ترے خون میں نہانے کی
روش بدل گئی بدلے ہوئے زمانے کی

کھڑا ہے رن میں اکیلا یہ اب ہے صورت حال
نہ ظلم و جور کا شکوہ، نہ دل میں رنج و ملال
شہید ہونے کی پروا، نہ زندگی کا خیال
ہے صرف سامنے اسلام کی بقا کا سوال

وجودِ حق کے لیئے ہر دلیل لایا ہے
نمازِ عصر تہہِ تیغ پڑھنے آیا ہے

## قصیدہ گوئی:

تاثیرؔ صاحب کی قصیدہ گوئی کے نمونے آپ نے گذشتہ ورق میں مندرجہ ذیل [illegible] سے
[illegible] سے اقتباسات میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ انھوں نے [illegible] سے [illegible]

مسدس ہی کی ہیئت استعمال کی ہے جو لغوی اعتبار سے تو قصیدہ کی تعریف پر پوری نہیں اترتی مگر مدح کے اعتبار سے اس کو نعت و منقبت یا مدحیہ مسدس کہا جا سکتا ہے۔ اس باب میں ان کا مسدس ''مولائے کائنات'' بہت شہرت رکھتا ہے۔

## غزل:

تاثیر صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ اسی سے انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اسی صنفِ سخن کی بدولت حضرت آرزو لکھنوی سے قربت کے ساتھ تلمذ کا رشتہ بھی قائم ہوا۔

ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''ارغوان'' کے نام سے دسمبر ۱۹۷۰ء میں ملتان سے شائع ہوا تھا۔

اپنی غزل گوئی کے متعلق انھوں نے ''ارغوان'' میں ''بقلم خود'' کے عنوان سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرہ کے لیے انھوں نے اپنی غزل لکھی۔ مصرع طرح تھا:

مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

اس پر تاثیر صاحب نے گرہ لگائی اور کیا اچھی گرہ لگائی

کشش چشم فسوں ساز الٰہی توبہ
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

اپنی پہلی ہی غزل میں مصرع طرح پر ایسا عمدہ مصرع لگا دینا ہی میرے نزدیک یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فطرۃً غزل کے شاعر تھے اور بحیثیت غزل گو ان کا مستقبل بہت شاندار تھا۔

اسی غزل میں ان کا دوسرا شعر بھی بہت عمدہ اور کسی پختہ کار غزل گو کی فکری کاوش سے کمتر نہیں معلوم ہوتا۔ شعر ہے:

اپنی یکتائی پہ تم کو تھا بہت ناز مگر بات جاتی رہی تصویر کے کھنچ جانے سے

[illegible] کہ یہ شعر [illegible] یہ غزل انھوں نے [illegible] پڑھ دیا [illegible]
زیب دیتا جو اس وقت یہ کہتے۔

[illegible] گلستان [illegible]

[illegible] ان کی غزلوں سے چند اشعار [illegible]

حسن کیا سمجھے دلکشی کیا ہے — شمع کیا جانے روشنی کیا ہے
ہم نے راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں — ہم سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے
عمر بھر آنسوؤں سے کھیلے ہیں — ہم نہیں جانتے خوشی کیا ہے
جو نہ کہنا تھا وہ بھی کہہ گزرے — اور تاثیر بے خودی کیا ہے

مجھ کو بخشی خلش خار تغافل اس نے — جس کے رخسار مہکتے ہیں گلابوں کی طرح
سب پہ الطاف وکرم، سب پہ محبت کی نظر — صرف محفل میں تری میں ہوں نہ ہونے کی طرح
چٹکیوں کے ہیں مرے جسم پہ خوں رنگ نشاں — تم نے کانٹے بھی نکالے تو چبھونے کی طرح

تاثیر میں نے پھولوں کو بخشی ہے تازگی — اپنی تمام عمر خزاں میں گزار کے

اندھیری رات، ستارے اداس، شمع خموش — ہے دل [illegible] تو ہر چیز پر اداسی ہے

اشکوں سے لگی دل کی بجھائی نہیں جاتی — شبنم کبھی پیاسے کو پلائی نہیں جاتی

کھٹک سے اڑ گئی تاثیر نیند راتوں کی — مگر وہ کہتے ہیں یہ پھانس تو ذرا سی ہے

ہم کو دنیا سے شکایت نہیں تاثیر مگر — [illegible] ہم پتھر کے

اداس ہیں چاند اور تارے بجھے بجھے ہیں چراغ محفل — ہمی پہ کیا منحصر ہے اے دل یہاں کوئی شادماں نہیں ہے

ان کی تصویر ہے محفوظ ان آئینوں میں — دل کو دکھلاتی ہیں عکس رخ جاناں آنکھیں

مری آنکھوں کو پہلے دیکھنے کا حوصلہ دینا — اور اس کے بعد جب چاہے نقاب رخ اٹھا دینا
محبت کرنے والوں کے لیئے تاثیر آساں ہے — کسی کے واسطے خود کائنات دل لٹا دینا

قوس قزح کا دیکھا جو آنچل نچوڑ کر — آنکھوں کے آئینوں میں نظر آئے سات رنگ
دیکھا ہے میں نے ٹوٹتے تارے کو غور سے — تصویر ہو بہو مرے اشک رواں کی ہے

آپ کی آنکھوں کا دریا بھی عجب دریا ہے آئے جو پیاس بجھانے کو وہ پیاسا جائے
بری ہے کس نظر سے یہ شبنم نما شراب ہر پھول جس کے واسطے پیمانہ ہو گیا
تم کو بھی مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہا تم بھی بدل گئے مرے حالات کی طرح

حضرت تاثیر نقوی کی شاعری سے متعلق تین نامور صاحبان علم و ادب نے جو اظہار خیال کیا اور جوان کے مسدس "مواعظ کائنات" مطبوعہ ۱۴۲۱ھ میں شامل ہے۔ ان سے اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے حضرت علامہ نصیر الاجتہادی اعلی اللہ مقامہ کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

"بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جوش کے بعد جو شعراء پیدا ہوئے ہیں ان میں تاثیر ایک منفرد اور عظیم مقام کے مالک ہیں، پرواز خیال، ندرت اظہار، جدت تشبیہات، غنائیت، نغمگی، انتخاب الفاظ، معنویت، گہرائی، لہجہ کی صداقت، تجدد کے ساتھ تحفظ روایت یہ وہ خصوصیات ہیں جو آپ کو تاثیر کی شاعری میں ملیں گی۔ تاثیر کا اگرچہ اصل میدان مسدس نہیں بلکہ غزل ہے لیکن وہ جس میدان میں اترتے ہیں اس میں خصوصیت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے۔

آپ یہ مسدس پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ ایک ایسی وادی میں پہنچ گئے ہیں جہاں خواب ناک رنگ کے پیچھے حقائق کی شعاعیں برقندہ نقاب ہیں جن سے حسین اشارے استعارات، عقیدت کے نادیدہ عناصر رنگ و بو میں لپٹے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ تاثیر کا قلم قلبی واردات اور روحانی کیفیات کی بیتے حسن الفاظ اور روشن اسلوب کے ساتھ ترجمانی کرتا ہے کہ ہر دل کی دھڑکن اور ہر جبیں کا سجدہ اس کے ہم نوا ہو جاتا ہے۔ یا آخر سامع اس جزیرے میں پہنچ جاتا ہے جہاں ہر طرف نور، محبت، عقیدت و مودت، رنگ و کیف، صباحت و ملاحت کا ایک طوفان ہوتا ہے جس میں قاری ڈوب

فیضانِ فکر ان کے بعد بھی جاری ہے اور نئی ادبی نسلیں بھی ان سے اکتساب فیض کر رہی ہیں۔

ان کے یہاں اعلیٰ درجے اور اونچے مرتبے کی شاعری ملتی ہے۔ ہر بند، ہر شعر، ہر مصرع ان کے کمالِ فن کا نادر نمونہ ہے۔ ان کے اسلوب میں انفرادیت، امتیاز اور ندرت ہے۔ وہ جس موضوع یا مضمون کو لیتے ہیں اسلوب اور پیرایۂ اظہار کی نادرہ کاری کے سبب اسے اچھوتے اور دلکش و دلنشیں انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ حسبِ ضرورت زبان و بیان میں لطافت، فصاحت اور بلاغت کا جوہر پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ رواں، برجستہ، مترنم اور بے ساختہ اشعار کا ایک چشمہ رواں دواں ہے۔ ان کے یہاں نہایت قدرتِ کلام کے ساتھ موقع بہ موقع اور جا بجا تشبیہ، استعارہ، تمثیل، تلمیح صرف ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنی ہنرمندی سے منظر نگاری اور تصویر کاری کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے ممدوح گرامی کی صفات عالیہ اور فضائل جلیلہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ نقش ہمارے اذہان و قلوب کا حصہ بن جاتا ہے۔"

## صحافت:

پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت تاثیر نے صحافت کو بھی اپنا پیشہ بنایا۔ اس میں ان کا سب سے اہم کام پونا، مہاراشٹر (بھارت) سے پہلا اردو اخبار جاری کرنا تھا جس کا نام "قیم" رکھا۔ اس اخبار نے وہاں کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس کے علاوہ "سپاہی" اور "حسینی پیغام" بھی جاری کیا۔

۱۹۷۱ء میں ملتان کی سکونت ترک کر کے کراچی آ گئے اور ہفت روزہ "عظیم" سے منسلک ہوئے جس سے آخر وقت تک وابستہ رہے۔

## سیاست:

تاثیر صاحب نے ابتدائی زندگی میں سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ ۹۳۹

[illegible]

میں جبکہ ان کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی، مسلم لیگ کی تجدید ہوئی تو تاثیر نے سیاست و صحافت نے شاعرانہ جذبات کو کچل دیا اور سیاسی ہنگامہ آرائی کی ایک طویل فہرست زندگی کی داستان کا عنوان بنی رہی۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک لکھنؤ سے یکے بعد دیگرے مختلف روزنامے نکالے جو نکلتے اور بند ہوتے رہے۔ بالآخر کانگریسی وزارت کی ستم رانیاں اور قید و بند کی لطف اندوزیاں جب حد سے گزر گئیں تو ایک دن ایسا آیا کہ ترک وطن کر کے ممبئی جانا پڑا۔ وہاں بھی صحافت و سیاست شریکِ حیات رہیں۔

## وفات:

شاعری، صحافت اور سیاست کی ہماہمی میں زندگی گزارنے والی یہ شخصیت آخرکار کراچی میں چہارشنبہ (بدھ) ۵ اگست ۱۹۸۰ء کو عارضہ قلب میں دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئی۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

انا للہ و انا الیہ راجعون ہ

میں نے ان کا قطعہ تاریخ وفات کہا جو ان کی مجلس چہلم کے موقع میں شائع ہوا اور حسب ذیل ہے:

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات مداح بلبل حضرت تاثیر لکھنوی مرحوم

آہ تاثیر جا بسے آخر — اک مکان عدم سرشت میں آج
خاکساری جو تھی طبیعت میں — سو گئے کوئے خاک خشت میں آج
کیا غم انگیز سانحہ یہ ہوا — اس جہانِ خراب و زشت میں آج
ان کی تاریخ مرگ میں لکھوں — یہ بھی تھا میری سرنوشت میں آج

سال رحلت پکار اٹھا ساحر
کہہ دو "تاثیر ہیں بہشت میں آج"

۱۹۸۰ء

# جہاد اور حضرت سلطان العلماءؒ

نجم الغنی نے "تاریخِ اودھ" میں لکھا ہے کہ ہنومان گڑھی کے واقعہ میں علمائے اہلسنت نے بادشاہ کے موافق جبکہ سلطان العلماءؒ نے بادشاہ کے خلاف فتوی دیا۔ حضرات اہلسنت نے اس کی وجہ سے اپنے علماء کے لیئے گالیاں لکھ کر دیوار پر چسپاں کیں اور اپنی نماز پڑھ کر شیعوں کی مسجد میں سلطان العلماء کا موعظہ سننے کے لیئے آنے لگے۔ (بحوالہ ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ، ص ۵۳)

تاجِ سخن حضرت آفر اجتہادی لکھنوی اعلیٰ مقامہ

(نواب سید آفر حسین صاحب مرحوم)

(۱۹۰۶ء تا ۱۹۸۵ء)

بشکریہ: سید حسین آفر صاحب سلمہ

خلف حضرت آفر اعلیٰ اللہ مقامہ

مرثیہ سے گرمی کے بیان میں ایک بند:

تپتے ہوئے تھے زرد تو اشجار تھے نڈھال
حدت سے آفتاب کی ذرے ہوئے تھے لال
مرجھائی تھی کلی تو گلوں کا تھا غیر حال
سبزہ کو کروٹوں کی بھی باقی نہ تھی مجال
پانی کنویں کی تہہ میں جو تھا گرم ہوگیا
فولاد اس قدر کا تپا، نرم ہوگیا

(افسر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تاجِ سخن حضرت افسر لکھنوی

## نام ونسب:

اسم گرامی، نواب سید افسر حسین صاحب۔ تخلص افسر۔

## سلسلۂ نسب:

نواب سید افسر حسین صاحب بن نواب مولوی سید نور حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ بن استاذ الاساتذہ نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ ابن مولانا سید باقر حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن عضد الدین زین العلماء مولانا سید علی حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن مولانا سید حسین صاحب علیین مکان بن مولانا سید دلدار علی صاحب غفراں مآب رحمۃ اللہ علیہ۔

## ولادت:

آپ کی ولادت ۲۲ جولائی ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ آپ نواب مولوی سید نور حسین صاحب طاب ثراہ کی زوجہ ثانی کی اولاد سے تھے۔

## تعلیم:

آپ نے لکھنؤ کے تعلقدار کالج میں تعلیم حاصل کی جس میں خاص روساء اور ریاست جات سے تعلقدار حضرات کے بیٹے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

لکھنؤ سے ایم۔اے کی سند حاصل کر کے لندن چلے گئے جہاں پانچ سال تک قانون کی تعلیم حاصل کرنا تھی مگر کچھ خاندانی مسائل کی وجہ سے وقت سے پہلے لکھنؤ واپس آنا پڑا اس طرح ایل ایل بی کی سند لینے کے بعد بار ایٹ لا کی تکمیل نہ کر سکے۔

## علمی استعداد:

انگریزی تعلیم کے اعتبار سے ایم۔اے، ایل ایل بی کے سند یافتہ تھے۔ دینی و مشرقی علوم کی ابتدائی تعلیم گھر میں اور پھر مختلف معلمین سے حاصل کی۔ لندن کی تعلیم سے انگریزی زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ اردو فارسی گھر کی زبان تھی۔ اس لیئے ان کی علمی استعداد بہت بلند تھی۔

## ذریعۂ معاش:

قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اس کے علاوہ آبائی جائداد سے بھی آمدنی ہوتی تھی۔ اس طرح خوش حالی سے بسر کرتے تھے۔

## ازدواجی زندگی:

انتخاب العلما مولانا سید سبط محمد ہادی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ پرنسپل مدرسۃ الواعظین جو خاندان اجتہاد کے رکن رکین تھے ان کی بڑی صاحب زادی جناب نواب سید افسر حسین صاحب قبلہ سے منسوب تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یک رنگ خوشگوار زندگی گزاری۔

### اولاد:

آپ کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے سید بشیر افسر نقوی نے نصابی تعلیم کے علاوہ فائن آرٹ میں کمال حاصل کیا اور مختلف بین الاقوامی اشتہار سازی کے اداروں میں اعلی عہدوں پر فائز رہے۔ آج کل ممبئی میں کسی ایسے ہی ادارے سے وابستہ ہیں۔ خاندانی

ذہانت کے مالک ہیں۔ انھوں نے دس بارہ سال پہلے ہندو مسلم فسادات کی خونریزیوں کے حوالے سے ایک انتہائی موثر کارٹون فلم بنائی جو غالباً صرف تین منٹ کی تھی مگر اس کو پورے ہندوستان میں بہترین فلم قرار دیا گیا۔ بشیر نقوی کے نام سے اپنے ہم پیشہ فن میں مشہور ہیں اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب زادے سید حسین افسر ہیں۔ انھوں نے بھی نصابی تعلیم مکمل کر کے صحافت میں دلچسپی لینا شروع کی اور اسی کو ذریعہ معاش بنایا۔ ہندوستان کے کئی معروف اخبارات کے نمائندے رہے ہیں۔ قومی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں۔ خاندان کی عزت و وقار کے فروغ کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔

## حلیہ:

عم محترم مرحوم سید افسر حسین صاحب قبلہ گٹھے ہوئے مضبوط ورزشی جسم کے مالک تھے۔ قد درمیانہ اور ناک نقشہ جاذب نظر تھا۔ جوانی میں شہسواری کا شوق تھا جس سے جسم ورزشی ہو گیا تھا۔ خاندانی شرافت و وجاہت چہرے سے آشکار تھی۔

## مزاج واخلاق:

عم محترم اپنی خاندانی روایت اور لکھنؤ کی تہذیبی اقدار کے امین تھے۔ نرم گفتار اور شائستہ مزاج مگر اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے والے۔ وہ کئی سال لندن میں رہے مگر انگریزی تہذیب ان سے اتنی ہی دور رہی جتنا لکھنؤ سے لندن۔ وہ نہایت مذہبی خیالات کے حامل تھے۔ پابند صوم و صلوۃ، دیانت دار و صداقت شعار، جھوٹ ان کے لیے ایک قابل نفرت شے تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے جن کو اپنی پیشہ ورانہ ضروریات کے تحت خود بھی اکثر جھوٹ کو سچ ثابت کرنا ہوتا ہے اور اپنے موکلوں کو بھی مقدمہ جیتنے کے لیے غلط اور جھوٹے بیانات دینے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن وہ کبھی ایسے مقدمے لڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے جن کے متعلق انھیں احساس ہو جاتا کہ ان کا موکل ایک جھوٹا مقدمہ لے کر ان

کے پاس آیا ہے اور فریق مخالف کو جھوٹ بول کر مقدمہ میں ملوث کر رہا ہے۔ وہ اس اصول پر اتنی سختی سے قائم تھے کہ اگر ان کے پاس اس وقت اور کوئی مقدمہ نہ ہو اور پیسہ کی شدید ضرورت ہو تو بھی وہ ایسا مقدمہ ہاتھ میں لینا پسند نہیں کرتے تھے۔

## قومی اور سماجی خدمات:

آپ قومی اور سماجی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ کے مشہور شیعہ ایجی ٹیشن کے زمانہ میں انجمن تنظیم المومنین کے جنرل سکریٹری تھے جو ایجی ٹیشن چلا رہی تھی۔ اسی سلسلہ میں گرفتار بھی ہوئے اور کئی مہینے جیل میں رہے۔ کئی سماجی تنظیموں اور ایک یا دو انگریزی اسکولوں کے بورڈ آف گورنرز کے رکن بھی رہے۔ ہز ہائینس نواب صاحب رامپور کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ہز ہائینس نے ان کو ریاست کا وزیر اعلیٰ بنانے کی پیشکش کی لیکن انھوں نے قبول نہیں کی کہ دوست کی نوکری کرنا قبول نہیں۔

## شاعری:

آپ باقاعدہ شاعری نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی طبیعت ادھر رجوع ہوتی تو غزل سلام یا نعت و منقبت کے کچھ شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کو جمع کرکے نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے گھر کے ماحول میں شاعری رچی بسی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ بعض وجوہ کی بنا پر نویں درجہ سے میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور تلاش معاش میں بھی ناکامی کا سامنا تھا۔ میں گھر ہی پر رہتا تھا۔ میرے گھر کے سارے افراد شاعری کے دلدادہ تھے۔ میرے والد گرامی قدر جنت مکانی تو باقاعدہ شاعر تھے۔ مرثیہ کے علاوہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے سلاموں اور نوحوں کی کئی بیاضیں شائع ہو چکی تھیں۔ میرے چھوٹے چچا نواب سید اختر حسین صاحب اختر کو شاعری کا بے حد شوق تھا۔ میرے پھوپھا سید حسن عباس صاحب عباس لکھنوی کے نہ تھے مگر وہ بھی شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ حتی کہ گھر کی خواتین بھی اچھے شعر کہتی تھیں جن میں میری والدۂ گرامی مرتبت جنت مکانی نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ سب

سارے سارے دن مشق سخن کرتے تھے۔ شام کو گھر کے صحن میں تختوں سے پڑے پر صاف شفاف چاندنی کا فرش ہوتا تھا۔ رات کو سب اپنے اپنے کاموں سے فرصت پا کے وہاں جمع ہوتے تھے اور دن بھر میں جس نے جتنے شعر کہے ہوتے وہ سناتا تھا۔ اس طرح ایک چھوٹا موٹا مشاعرہ روز منعقد ہوتا۔ میرا شاعری کا ذوق بھی اسی ماحول میں پروان چڑھا۔ لیکن میرے بڑے چچا عم محترم حضرت افسر لکھنوی ان محفلوں میں شاذ و نادر ہی اپنا کلام سناتے تھے اس لیئے کہ یا تو ان کے پاس شعر گوئی کے لیئے وقت نہیں ہوتا تھا یا ان کی طبیعت ادھر زیادہ رجوع نہیں کرتی تھی۔ اس لیئے ان کا کوئی کلام نمونۃً بھی دستیاب نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے مسدس لکھا تھا جس میں میدان کربلا میں امام حسین کی جنگ سے اور گرمی کی شدت ظاہر کرنے کے لیئے ایک مصرع کہا

وہ زین پہ گرمی سے بدلتے ہوئے پہلو

بڑا عمدہ اور بالکل نیا خیال تھا۔ سرتاج الشعراء جناب سید [illegible] حسین صاحب عرف مولوی کلن صاحب شاعر قبلہ نے سنا تو بے حد تعریف کی۔

## مرثیہ گوئی:

۱۹۸۴ء میں جب میں لکھنؤ گیا تو وہ ان کی زندگی کا آخری سال تھا۔ اس سال انھوں نے ایک مرثیہ کہا تھا۔ مجھ کو وہ مرثیہ دیا کہ میں اس کا مطالعہ کر کے اس پر اپنی رائے دوں۔ مجھے وہ مرثیہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس سے مرثیہ کہنے کی اور افسوس اس کا کہ جس کا پہلا مرثیہ اس اعلیٰ معیار اور شاعرانہ حسن کا مرقع ہو اس نے زندگی کی آخری منزل میں ادھر کیوں توجہ کی۔ پہلے ہی سے اس میدان میں قدم کیوں نہیں رکھا۔

مجھے اس بات کی بھی بڑی خوشی تھی کہ وہ میرے جد اعلیٰ اور اپنے جد امجد حضرت فاخر اعلی اللہ مقامہ اور میرے درمیان مرثیہ گوئی کی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی ایک کڑی بن گئے۔ ان کے والد گرامی میرے جد امجد اور حضرت فاخر کے فرزند ارجمند جناب مولوی سید نور حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ شعر نہیں کہتے تھے۔ یہاں سے یہ زنجیر ٹوٹ گئی تھی۔ ان کے بعد

میرے والد گرامی خلد مکاں نواب سید اختر حسین صاحب المتخلص بہ مصور لکھنوی نے ...
اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر مرثیہ نہیں کہا۔ چنانچہ حضرت فاخر کے بعد میں پہلا ...
جس نے ان کی مرثیہ گوئی کی روایت کو زندہ کیا۔ اب عم محترم حضرت افسر لکھنوی کے مرثیہ
فرمانے سے میرے اور حضرت فاخر کے درمیان ایک کڑی کا اضافہ ہو گیا۔

## مرثیہ پر ایک نظر:

مرثیہ میں ۷۳ بند ہیں۔ اس کا چہرہ مدح سے کھلتا ہے۔ شہادت امام حسینؑ سے ...
خریاں تک اختصار کے ساتھ مصائب کا بیان ہے۔ اجزائے ترکیبی میں رزمیہ بھی ...
ہے جس میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی بڑے حسن سے نظم کی گئی ہے۔

مطلع اور اس کے بعد کے چند بند ملاحظہ ہوں

جی چاہتا ہے تذکرۂ کربلا کروں
جو اپنے دل سے وعدہ کیا تھا، وفا کروں
کچھ مدح اہلبیتِ رسولِؐ خدا کروں
حُبِ علیؑ سے اپنی فنا کو بقا کروں
خدمت سے اہلبیتؑ کی میں منھ نہ موڑوں گا
دامن علیؑ کا ہاتھ سے ہرگز نہ چھوڑوں گا

کیا جذبہ و فکر ہے۔ سبحان اللہ۔

حُبِ رسولِؐ پاک مرے دل میں آ بسے
آنکھوں میں میری گنبدِ خضرا پھرا کرے
یادِ حسینؑ دل کو غمِ لازوال دے
عشقِ امامؑ دل میں مرے اس طرح رہے

بیت ملاحظہ ہو

جیسے نگاہ رہتی ہے تجلی کے نور میں

یا بات زندہ رہتی ہے تحت الشعور میں

پہلے مصرع میں بالکل نئی اور اچھوتی تشبیہ ہے جو اس سے پہلے کسی نے یہاں نہیں دی تھی۔ یا
عمدہ بات کہی ہے۔

ہاں کون تھا وہ خالقِ عالم کا شاہکار
مرضیِ حق پہ جس نے کیا اپنا سب نثار
اسلام کی خزاں کو دیا موسمِ بہار
صحرائے کربلا کو کیا جس نے خلد زار
تھا وارثِ دارِ شرحِ مودت وہی حسینؑ
جس نے بچائی دین کی عزت، وہی حسینؑ
وہ جس کی نورِ حق سے چمکتی رہی جبیں
وہ جس کو کلِ حسن نے پیدا کیا حسیں
تھا جو ازل سے حاملِ شرحِ کتابِ دیں

کیا اچھا مصرع ہے۔ جزاک اللہ

جس نے سوالِ بیعتِ فاسق پہ کی "نہیں"
جو پاسبانِ شرعِ رسولؐ امام تھا
بھائی کا جانشین، خدا کا امام تھا
جس کو نہ تھی حکومت و دولت کی احتیاج
وقعت تھی اس کے سامنے کیا تخت و تاج
جس نے خلافِ ظلم کیا ڈٹ کے احتجاج
جس نے درست کر کے رکھا کفر کا مزاج
خطرے میں آ گئی تھی شریعت رسولؐ کی
دانستہ جس نے اپنی شہادت قبول کی

اس پورے بند میں امام حسینؑ کے کردار کی بہت عمدگی سے تعبیر کی ہے اور چھٹے مصرع میں دانستہ شہادت قبول کرنا کہہ کر امام حسینؑ کے اقدام کی صحیح تشریح کی ہے۔

اگلے بند کی بیت ملاحظہ ہو۔ خاص طور سے چھٹا مصرع

انسان کی گری ہوئی حالت سنبھال دی
جس نے قیامِ امن کی بنیاد ڈال دی

اس کے بعد حاکم مدینہ ولید کا امام حسینؑ کو بلا کر یزید کی بیعت کا سوال کرنے کا ذکر ہے۔ سوال بیعت پر یہ بند ملاحظہ کیجیے:

بیعت کی بھیک مانگ رہا تھا جو بد خصال
احساس کمتری میں نہ اس کو رہا خیال
ذلت ہے مانگنے میں، وہ بیعت ہو یا کہ مال

کیا کہنا۔

سکی اگر نہ چاہے تو جائز نہیں سوال
دنیا سے پوچھیے تو کہے گی، یہ ٹھیک ہے

اور مصرع ملاحظہ ہو:

مل جائے تو زکوٰۃ، جو مانگو تو بھیک ہے

سبحان اللہ۔ سبحان اللہ

اس کے بعد شب عاشور اور صبح عاشور کا مختصر بیان ہے جس میں منظر نگاری کا حسن قابل داد ہے:

مغرب میں آفتاب نے لی جا کے جب پناہ
اور چاند نکلا شرق سے با حالت تباہ
تاروں کی کربلا کی طرف جب گئی نگاہ
دیکھا کہ ایک دشت ہے بے آب و بے گیاہ
بچے ہیں اس پہ پیاس سے جو بیقرار ہیں

خیموں میں چند عابد شب زندہ دار ہیں

عاشور کی تھی رات ، برستی تھی بیکسی
روشن تھی شمع ماہ مگر تھی بجھی بجھی
تھی چاندنی ضرور مگر تھی رندھی رندھی
ہونے لگی جو صبح تو ظلمت ذرا چھٹی
نور سحر کے بڑھتے ہی روشن جہاں ہوا
ذکر خدا کے واسطے وقت اذاں ہوا

اس بند میں منظر نگاری بھی خوب صورت ہے اور زبان کا لطف مستزاد ہے۔

اذان جناب علی اکبرؑ کا اثر ملاحظہ ہو:

اکبرؑ نے دی اذاں ، کہا حی علی الصلوٰۃ
اٹھو کہ ہے اسی میں تمھارے لیئے نجات
جاگو کہ پھر خدا نے تمہیں بخش دی حیات
گونجی صدا فضا میں تو جاگ اٹھی کائنات
جو محوِ خواب تھے وہ سنبھلتے ہوئے اٹھے
ہاتھوں سے اپنے، آنکھوں کو ملتے ہوئے اٹھے

کیا اچھی منظر کشی ہے۔ سبحان اللہ

اکبرؑ کا لحن اور اذاں دینے کی ادا
مسحور ہو کے رہ گیا سب دشت کربلا
جب اشتیاق دید ہر اک کو سوا ہوا
نرگس نے بھی چرا کے نظر دیکھ ہی لیا
پنچھوں نے آنکھیں کھول دیں اور جھومنے لگے
اشجار بھی ادب سے قدم چومنے لگے

یو تھے مصرع اور بیت میں تغزل کیا خوب ہے۔ سبحان اللہ

اوراب حسنِ جناب علی اکبرؑ کا بیان:

وہ حسن اور اس پہ بھبکتا ہوا شباب
آنکھوں میں آ کے پہروں ٹھہرتا ہوا شباب
تھا بیبیوں کے دل کا دھڑکتا ہوا شباب
دشمن کی آنکھ میں وہ کھٹکتا ہوا شباب
دیکھو ، تو پھر درود نہ پڑھنا گناہ ہے
وہ حسن جو شبیہ رسالت پناہ ہے

کیا اچھا بند اور کیا عمدہ بیت ہے۔ جزاک اللہ۔

بند ملاحظہ ہو۔ چھٹا مصرع خاص طور سے قابلِ داد ہے۔ پورے بند میں کمالات

حسن بے مثال ہے۔ کیا کہنا۔

ہر گل نے جیسے دوسرے کے کان میں کہا
کیسا حسین ہے یہ شہ دیں کا دلربا
ہم جانتے تھے ہم سا نہیں کوئی دوسرا
اس نے تو آن کے ہمیں شرمندہ کر دیا
احساس کمتری کا مزہ یاد آ گیا
اکبرؑ کا حسن دیکھا ، خدا یاد آ گیا

اس سلسلہ کے اگلے بند کی بیت:

روشن ہوا تھا دشت وہ چہرے کا نور تھا
گویا حریفِ صاعقۂ کوہ طور تھا

اوراب اس کے اگلے بند کی بیت:

وہ حسن جس سے حسن جہاں ماند ہو گیا

ان کا شباب چودھویں کا چاند ہوگیا

یہ بھی۔ سبحان اللہ۔ تعریف کی بھی داد دیجئے اور صنعت کی بھی۔

اب رزم کا ایک بند:

حُرؔ و حبیبؔ و جونؔ و سعیدؔ و زہیرِ قینؔ
اصحاب با وفا ہوں کہ زینبؔ کے نورِ عین
جتنے تھے سب تھے فوجِ [illegible] کی زیب و زین
ہر ایک ان کا رن میں نظر آتا تھا حسینؔ
اکبرؔ لڑے تو فوج کے چھکے چھڑا دیے
قاسمؔ نے بھی لعینوں کے دھرّے اڑا دیے

یہ لطف [illegible] سبحان اللہ۔ [illegible] مصرع میں "دھرّے اڑا دینے" [illegible]
[illegible] مرثیہ میں پہلی بار [illegible] ہیں اور [illegible]

جناب علی اصغرؔ [illegible]

جیسے ہو پنکھڑی کسی کھلتے گلاب کی

دن نکلنے کا ایک منظر دیکھیے:

پھوٹی کرن، چمکنے لگے سارے بحر و بر
جلتے ہوئے دیوں سے بھرا دشت سر بسر
ذروں میں وہ چمک کہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
ہیرے جڑے ہوئے تھے زمیں کی بساط پر

یہ [illegible] ہے

دنیا وفورِ حسن سے سرشار ہوگئی
گویا زمین مصر کا بازار ہوگئی

کیا عمدہ بیت ہے۔ واہ وا

یہاں سے چند بندوں میں گرمی کا بیان ہے جن کو پڑھ کے جناب چھنگا صاحب حسینؔ کے ایک مرثیہ میں جاڑے کا بیان یاد آ جاتا ہے۔ جس طرح انھوں نے جاڑے کے بیان میں اپنی طباعی کا بےنظیر مظاہرہ کیا اسی طرح اس مرثیہ میں گرمی کے بیان میں عجب لطف ہے جو شاعر کی خلاقانہ فکر کا بیّن ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو

دشتِ بلا کی گرمی سے پیدا تھا اضطراب
خود آفتاب ڈھونڈتا تھا سایۂ سحاب
گرداب کا بھی خوف سے زہرہ تھا آب آب
دریا میں آبلے تھے پڑے صورتِ حباب
سورج چمک کے موت کا پیغام ہو گیا
آغاز جس کو سمجھے تھے، انجام ہو گیا

جھونکوں سے لو کے اڑتے تھے ذرے جو بار بار
چنگاریوں کے گھیرے میں تھے دشت و کوہسار
رخسار جھل رہے تھے، ہو میں ہو جیسے دھار
سب ہوش کھوئے بیٹھے تھے جتنے تھے ہوشیار
انسانیت کا عہدِ وفا جل کے رہ گیا
حد ہو گئی کہ ذہنِ رسا جل کے رہ گیا

اس بند کا تیسرا مصرع جدت و جودتِ طبع کی خوب صورت مثال ہے۔ بالکل نئی بات کہی ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

شعلے سے اٹھ رہے تھے زمیں سے کہ الاماں
ہوتا تھا جس پہ آتشِ نمرود کا گماں
جنگل تمام جیسے کہ کوہِ شرر فشاں
پگھلائے دیتا تھا جو زمیں اور آسماں

گرمی سے ایک حال تھا وہ بحر ہو کہ بر
چوپائے ہوں، پرند ہوں، دریا میں یا نگر
دنیا میں ایک کو نہ رہی ایک کی خبر
دریا کا دل دھڑکنے لگا سطحِ آب پر
ڈھونڈے سے بھی جو یاں میں نہ راہیں نجات کی

اور مصرع دیکھیے — پہلو بدل کے رہ گئیں موجیں فرات کی

کتنی عمدہ اور کس قدر نئی تخیل ہے۔ جزاک اللہ

اس بند کا چوتھا اور چھٹا مصرع بالکل نیا اور بے مثال ہے۔ جزاک اللہ۔

حدت سے پپڑیاں تھیں لبوں پر جمی ہوئی
حلقوم ایسے خشک، نہ جن میں تھی کچھ تری
کانٹے زبان میں تھے تو آنکھیں پھٹی پھٹی
سانس ایسے چل رہی تھی کہ جیسے ہو جانکنی
اترے ہوئے تھے چہرے، یہ رنج سے حال تھا
حد ہے کہ آہِ سرد بھی بھرنا محال تھا

کیا کہنا ہے۔ سبحان اللہ۔

یاں کربلا کے دشت میں ایسے بھی تھے جری
پکے تھے اپنے عزم کے اور بات کے دھنی
مشغول بندگیِ خداوندِ ایزدی
جو جانتے تھے موت ہے کیا، کیا ہے زندگی
رنج کا جن کو خوف نہ پانی کی چاہ تھی
بس تھی فقط تو فکرِ رضائے الٰہ تھی

اس کے بعد امام حسینؑ نے

منصوبہ بے تباہات شمس بنایا
ترتیبِ فوج کے لیے نقشہ بنالیا

## عزم جنگ:

مرنا ہو ناگزیر تو پھر ایسی جنگ ہو
رن میں جو لڑنے جائے وہ دیوارِ سنگ ہو
انسان کا ضمیر جھنجھوڑے وہ رنگ ہو
دنیائے ظلم دیکھ کے جس کو کہ دنگ ہو
مظلومیت کا وار ہو اور بے پناہ ہو
رن ایسا جم کے ہو کہ پلٹنا گناہ ہو

اور اب مرثیہ کے خاص اجزا یعنی گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں چھ بند ملاحظہ کیجئے اور شاعر کی ندرت فکر اور جدت خیال کی داد دیجئے۔

## گھوڑے کی تعریف:

تیزی میں اپنی برق صفت کوندنے لگا
گھوڑے نے اک زقند بھری، دوڑنے لگا
ٹاپوں سے اپنی رن کی زمیں روندنے لگا
اپنے سموں سے دشتِ بلا سوندنے لگا
طوفاں تھا، برق تھا کہ وہ اڑتا شرار تھا
آنکھیں جھپک رہی ہیں کہ میداں کے پار تھا

اس بند کے چوتھے مصرع میں سوندنے کی لفظ بھی مرثیہ میں پہلی بار استعمال ہوئی ہے۔ متقدمین سے متاخرین تک یہ لفظ کسی کے مرثیہ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ زبان کے اس حسن کا کیا کہنا۔

اور یہ بند خاص طور سے ملاحظہ ہو۔ گھوڑے کی تعریف میں پورے ... شاہکار ہے

اور بہت خوب ہیں:

جو روشنی کو چال سکھائے وہ چال تھی
جس تک نگاہ تیز نہ جائے، وہ چال تھی
انسان کی سمجھ میں نہ آئے، وہ چال تھی
جس کو خیال چھو بھی نہ پائے، وہ چال تھی
تھا فخر اس کو، مرکبِ جانِ بتولؑ ہے
اس کا سوار راکبِ دوشِ رسولؐ ہے

تھا فخر تو زمین پہ رکھتا نہ تھا قدم
ٹاپوں کی وہ صدائیں، قیامت کا زیر و بم
ایسی ایال جس میں غضب کا تھا پیچ و خم
ریشم کے لچھے اڑتے ہوئے جیسے دم بدم
کیا کہیے ایسے اسپِ عدیم المثال کو
ٹھوکر پہ مار دے جو زمانے کی چال کو

اس بند کے تیسرے اور چوتھے مصرع میں گھوڑے کی ایال کے لیے بالکل نئی تشبیہ اور غضب کا حسن ہے۔ چھٹے مصرع میں زمانہ کی چال کو ٹھوکر پر مار دینا جدت خیال کی خوب صورت مثال ہے۔

فوجوں میں گھس رہا تھا صفیں توڑتا ہوا
مردہ جو ہو گئے تھے انھیں چھوڑتا ہوا
بھاگی ہوئی سپاہ سے منھ موڑتا ہوا
ٹاپوں سے اہلِ شام کے سر پھوڑتا ہوا
فوجیں ڈھکیلتا ہوا اور مارتا ہوا
ٹاپوں سے ابن سعد کو للکارتا ہوا

اس بند کا چوتھا مصرع شہسواری کے فن سے شاعر کی مکمل واقفیت کی دلیل ہے اور چھٹے مصرع میں گھوڑے کا ٹاپوں سے ٹھکارنا بھی بالکل نئی بات ہے۔ سبحان اللہ۔

اس سے اگلے بند کا ایک مصرع ملاحظہ ہو

گھوڑا نہیں تھا، قدرتِ پروردگار تھا

ایک بند امام حسینؑ کی مدح میں ملاحظہ ہو جو جنگ پر آمادگی کے موقع سے متعلق ہے

پڑھتے رجز تو اس کی ضرورت نہ تھی انہیں
تعریف اپنی کرتے یہ عادت نہ تھی انہیں
اپنی مصیبتوں کی شکایت نہ تھی انہیں
حد ہے کہ دشمنوں سے عداوت نہ تھی انہیں

سبحان اللہ۔

خالق بھی کہہ اٹھے کہ یہ مشرقین ہیں
سبطِ نبیؐ ہیں، جانِ علیؑ ہیں، حسینؑ ہیں

اور اب تلوار کی تعریف میں چند بند دیکھیے

مجبور ہو کے شاہ نے تلوار کھینچ لی
اٹھی جو ذوالفقار فضا میں صدا "علیؑ"
حملہ سے فوجِ شام میں تھی ایک کھلبلی
اعدا کی موت پھر تو نہ ٹالے سے بھی ٹلی
ناگن تھی اس کی کاٹ کا جس سے بچا نہیں
دشمن کو بھاگنے کا بھی موقع دیا نہیں
لڑنے کو آگیا جو کوئی مارِ آستیں
ناگن نے یوں جھپٹ کے ڈسا، گر گیا لعیں
پہنچا وہ اپنے کیفرِ کردار کو وہیں

دل کی جو حسرتیں تھیں وہ دل ہی میں رہ گئیں

لذت بھی اس نے پائی نہ اپنے شباب کی
آنکھیں جھپک کے رہ گئیں جیسے حباب کی

فوجوں کے بیچ میں تھے شہنشاہ نامدار
کرتی تھی گھوم گھوم کے حملے جو ذوالفقار
لاشوں نے گر کے کھینچ دیا چار سو حصار
نزدیکِ شاہ خوف سے آئے نہ بدشعار
کشتوں کی گرد و پیش جو دیوار بن گئی
خود ذوالفقار نقطۂ پرکار بن گئی

کیا کہنا، کیا خوب صورت تخیل ہے۔

بجلی کی طرح چمکی ادھر اور کبھی اُدھر
خوں چاٹا اس کا، کاٹ لیا جس کے تن سے سر
اٹھلائی یوں کہ ہوگئے ٹکڑے دل و جگر
آنکھیں اگر کسی کی اٹھیں، کاٹ دی نظر
امید زیست ناریوں کی موت ہوگئی
دشمن کے واسطے ملک الموت ہوگئی

بیت میں پانچویں مصرع میں موت کے مقابل چھٹے مصرع میں ملک الموت قافیہ ہے جو علم ہوکر آیا ہے اس لیے ایطاء نہیں ہے۔

اس کے بعد کے بند کی بیت ہے:

تلوار یہ نہیں، غضب کردگار ہے
بھاگو، یہ کوئی اور نہیں ذوالفقار ہے

اور اس کے بعد کے بند کی بیت:

دوزخ نصیب سارے خطا کار ہو گئے
بجلی گری سروں پہ تو فی النار ہو گئے

شہادت کا بند

پاکر اشارہ شاہ کا مجبور تھی ، رکی
بھاگی ہوئی جو فوج تھی یک بارگی مڑی
شمشیر و تیر و نیزہ کی یلغار ہوگئی
سنبھلا نہ جب گیا تو فرس سے گرا جری

سجدہ میں پھر حسینؑ نے سر کو جھکا دیا
اس طرح اپنا وعدہ طفلی وفا کیا

[illegible] بندی، بیت [illegible] نہیں ہیں اس لیے یہ مرثیہ معروف ہونے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اب ایک
دو بند کربلا کے متعلق ملاحظہ ہوں:

کتنی حسین ہے تری تصویر ، کربلا
فتحِ مبیں کی بن گئی تفسیر کربلا
آرام گاہِ حضرت شبیرؑ کربلا
کیا خوب بن گئی تری تقدیر کربلا

دنیا میں کربلا تری توقیر ہوگئی
مٹی بھی تیری نازش اکسیر ہوگئی

ظلم و گنہ کے پاؤں کی زنجیر کربلا
تخریب کو مٹانے کی تعمیر کربلا
ایمان کی بنی تھی جو تقدیر کربلا
کس طرح ہوگئی تری تطہیر کربلا

مظلومیت کی آہ کی تاثیر بن گئی

بھٹکے ہوؤں کی راہ کی تنویر بن گئی

اور اب جناب زینبؑ کبریٰ کی جناب میں ہدیہ عقیدت

کس کی ہے یہ مجال شہادت بیاں کرے
بعد حسینؑ ظلم کی شدت بیاں کرے
جلتے ہوئے خیام کی حدت بیاں کرے
تشہیر اہلبیتِؑ رسالت بیاں کرے
کس کس طرح سے نصرت اسلام کر گئیں
زینبؑ یزیدیت کا بد انجام کر گئیں

تھیں صبر و شکر و ہمت و جرأت کی شاہکار
رنج و تعب میں شہؑ کی برابر کی حصہ دار
تھیں کربلا کے جملہ شہیدوں کی یادگار
بعدِ حسینؑ قافلہ والوں کی ذمہ دار
ہر باوفا کی قوتِ احساس ہوگئیں
زینبؑ وفا میں حضرتِ عباسؑ ہوگئیں

سبحان اللہ۔ کیا اچھا مصرع ہے۔
اور یہ بند اول تا آخر قابلِ داد ہے:

زینبؑ کے صبر اور شجاعت کو دیکھیے
بچوں کی دشمنوں سے حفاظت کو دیکھیے
اس سب کے باوجود عبادت کو دیکھیے
پابندیٔ اصولِ شریعت کو دیکھیے
بنت علیؑ تھیں، فاتح دربار شام تھیں
کردار ایسا پاک کہ گویا امام تھیں

بعد حسینؑ بچوں کو پانی کہاں ملا
مشغول لوٹنے میں رہے سارے اشقیا
سیدانیوں کے سامنے کس کس کا خوں بہا
لاشہ بھی ہر شہید کا رن میں پڑا رہا
اسلام والو آلِ نبیؐ سے یہ کیا کیا
تم نے تو خوب اجرِ رسالت ادا کیا

اور مقطع

اسلام کے اصولوں کو یکسر بھلا دیا
بعدِ رسولؐ کیسا زمانہ پلٹ گیا
اکثر جو راز دل کا تھا، کیسا عیاں ہوا
پلٹے وہ اپنی اصل پہ جتنے تھے شقیا
محنت رسولؐ پاک کی بیکار ہوگئی
تسبیح جو بنائی تھی زنار ہوگئی

واہ وا۔ سبحان اللہ۔

بعد رسولؐ اسلام کی زبوں حالی اس ایک ہی آخری مصرع میں کس طرح نہایت سے بیان کردی۔ "تسبیح جو بنائی تھی زنار ہوگئی" ایجاز کی کتنی عمدہ مثال ہے۔

تبصرہ: مرثیہ کے چھ بند آپ کے سامنے ہیں۔ کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ خاص طور سے گرمی کے بیان اور گھوڑے کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بے مثال ہے اور شاعر کی قوت فکر، ندرت خیال اور مضمون آفرینی کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ شعریت [illegible] ہے کہیں کہیں تغزل نے رنگینی اور دلکشی پیدا کردی ہے۔ زبان کی خوبی مستزاد ہے اور یہ سب اس کے باوجود ہے کہ انھوں نے اپنی ایک علالت کے دوران یہ مرثیہ کہا جس کا خاتمہ [illegible] وفات پر ہوا۔ اسی وجہ سے مجھ کو افسوس ہوا کہ انھوں نے مرثیہ کی طرف پہلے سے توجہ نہیں

# حضرت سلطان العلماءؒ کا معیارِ عدل

حضرت غفرانمآبؒ کے فرزند ارجمند حضرت سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ رضواں مآب علیہ الرحمہ نے امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی گزارش پر نظام حکومت میں اصلاحات تجویز کیں تو انھیں کی نگرانی میں محکمہ شرعیہ قائم کیا گیا۔ مختلف ذمہ داریاں اولاد غفرانمآب میں مختلف علماء کو تفویض کی گئیں۔ حضرت سلطان العلماء نے اہم مقدمات کا فیصلہ اپنے ہاتھوں میں رکھا۔ اس سلسلہ میں ایک مقدمہ کا حال ملاحظہ ہو:

صاحب ''تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلماء'' نے لکھا ہے کہ امجد علی شاہ نے کسی تاجر سے زر و جواہر نگار مسند تکیہ تیرہ لاکھ روپیہ میں خریدا۔ عملہ نے سات لاکھ روپیہ دبا لیے۔ تاجر نے محکمۂ شرعیہ میں دعویٰ دائر کر دیا۔ سلطان العلماء نے بادشاہ سے دعوے کا جواب طلب کیا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور بادشاہ کے خلاف فیصلہ ہوا۔ تاجر کو رقم ادا کی گئی۔ حکومت کے عدل و انصاف کی دھوم مچ گئی۔ (بحوالہ ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ ص ۳۵)

حضرت منصور اجتہادی لکھنوی

(نواب مولوی سید اختر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ)

ساحر لکھنوی کے پدر بزرگوار جنت مکاں

ساحر لکھنوی اپنے برادر خورد جناب سید ثابت حسین صاحب ثابت لکھنوی

عرف چھٹن نواب صاحب سلمہ کے ساتھ لکھنؤ میں ۱۹۸۵ میں

# ساحر لکھنوی اپنے خاندان کے کچھ علماء و مجتہدین عظام کے ساتھ

۱۔ درمیان میں حضرت سید العلماء علامہ سید علی نقی صاحب عرف مولوی نقن صاحب قبلہ طاب ثراہ
۲۔ بائیں طرف محسن الملت جناب مولانا سید محمد محسن صاحب قبلہ طاب ثراہ
۳۔ دائیں طرف ساحر لکھنوی (زمانہ تقریباً ۱۹۸۱ـ۸۲ء)

۱۔ بائیں طرف حضرت سید العلماء علامہ سید علی نقی صاحب عرف مولوی نقن صاحب طاب ثراہ
۲۔ دائیں طرف صادق الملت جناب مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب قبلہ مدظلہ العالی
۳۔ درمیان میں ساحر لکھنوی (زمانہ تقریباً ۱۹۸۲ـ۸۳ء)

۱۔ بائیں طرف دوسرے سید العلماء علامہ سید علی نقی عرف مولوی نقن صاحب طاب ثراہ
۲۔ دائیں طرف سے دوسرے جناب سید ذوالفقار حیدر نقوی اجتہادی مرحوم
۳۔ دائیں طرف سے پہلے ساحر لکھنوی (زمانہ تقریباً ۸۰-۱۹۷۹ء)
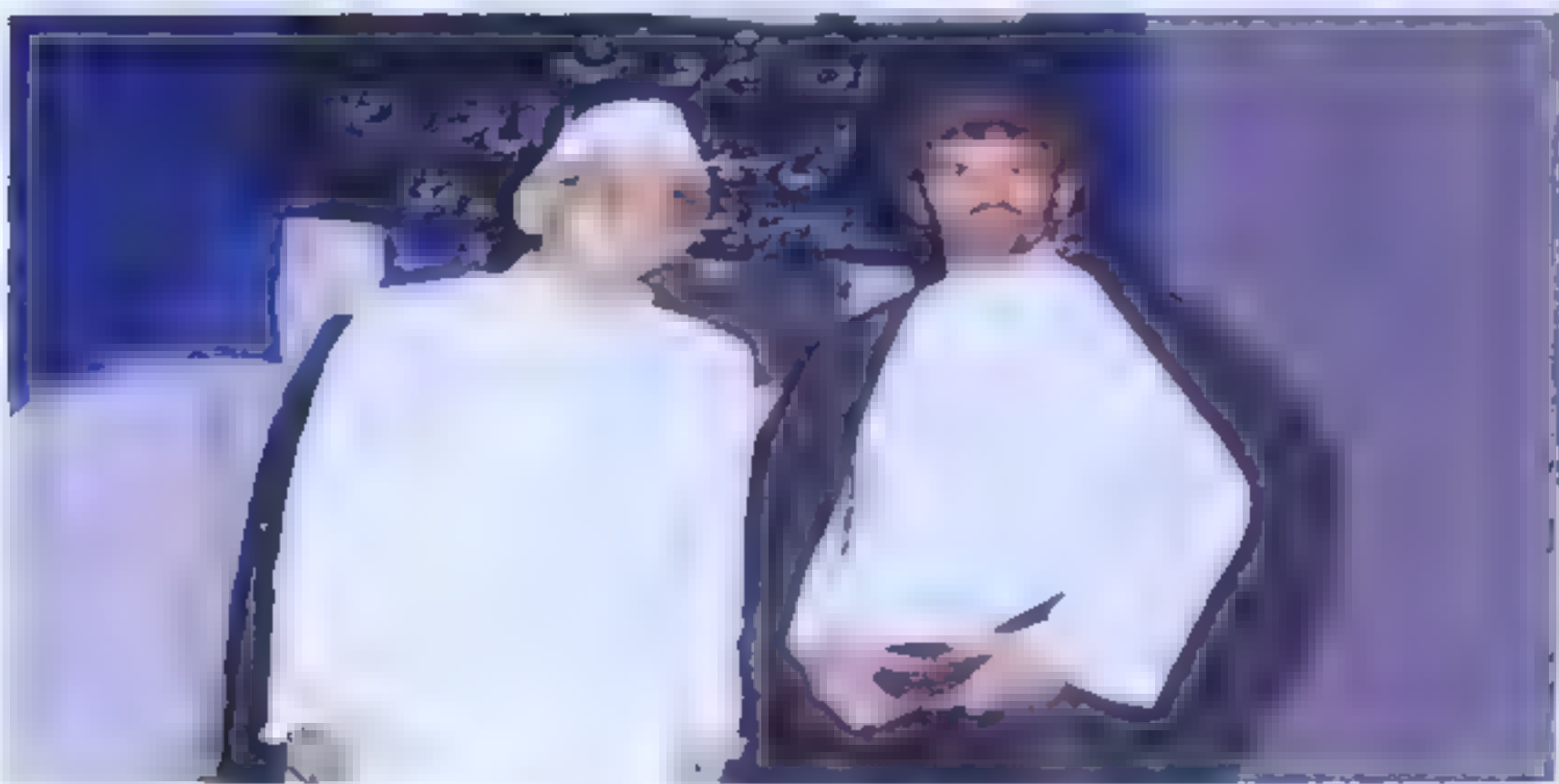
ساحر لکھنوی حضرت عمدۃ العلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد صاحب قبلہ مدظلہ العالی خلف حضرت سید العلماء علامہ سید علی نقی صاحب عرف مولوی نقن صاحب طاب ثراہ کے ہمراہ لکھنؤ کی امام بارگاہ سید تقی صاحب جنت مآب میں جہاں حضرت سید العلماء طاب ثراہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ زمانہ ۱۹۸۹ء

چپ: علامہ مولانا سید ابن حسن نجفی صاحب قبلہ مجتہد، صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد قبلہ
جناب سید کلب ہادی صاحب، جناب سید کلب باقر صاحب اور ساحر لکھنوی

۱۔ درمیان میں جناب محترم مولانا سید کلب جواد صاحب قبلہ مدظلہ العالی
خلف صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ طاب ثراہ
۲۔ دائیں طرف سے پہلے جناب آغا سید محمد حسین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور جن کے دولت کدہ پر
یہ تصویر کھینچی گئی تھی۔
۳۔ بائیں طرف سے پہلے ساحر لکھنوی (زمانہ تقریباً ۸۹۔۱۹۸۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ساحر لکھنوی

میں خود اپنے متعلق کیا لکھوں۔ ایک ہیچ مداں بے علم و بے ہنر کم سواد و کم نظر شخص ہوں۔ اس لیئے یہاں صرف وہ معلومات درج کروں گا جو میرے شخصی کوائف سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد فکر و فن پر تبصرہ کے لئے برادر محترم جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی کا ایک مضمون "ساحر اور ان کا شاعرانہ مرتبہ" کے عنوان سے ان کی کتاب "ہیچ آہنگ" سے اقتباس کر کے ہر اس مقالہ کی ترتیب و ضرورت کے مطابق حضرت شمس کی ضروری ترمیم و اضافوں کے ساتھ اس میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

## نام و نسب:

سید قائم مہدی۔ عرفیت، خورشید نواب جس کو میں نے بعد میں والد بزرگوار اعلی اللہ مقامہ کے اسم اقدس کی نسبت سے خورشید اختر کر دیا۔ تخلص، ابتداءً خورشید اور بعد میں ساحر۔ لکھنؤ کے قیام تک اپنے جد اعلیٰ استاذ الاساتذہ حضرت فاخر لکھنوی اعلی اللہ مقامہ کی نسبت سے ساحر فاخری کہلاتا تھا۔ ترک وطن کے بعد وطن کی شناخت کے خیال سے ساحر لکھنوی کہلانے لگا۔

تخلص کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھدوں۔

"والد بزرگوار جنت مکانی کے تخلص منصور کی نسبت سے میں ابتدا میں ہی تخلص تنویر رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت لکھنؤ میں ایک شاعر اسی تخلص سے موجود تھے جن کے متعلق یہ لطیفہ

مشہور تھا کہ ایک دن وہ کسی محفل میں اپنا کلام پیش کر رہے تھے۔ جس کرسی پر وہ تشریف فرما تھے اس کا ایک آگے کا پایہ خستہ و شکستہ تھا۔ جوشِ خوانندگی میں وہ پچھ اس طرح بڑھے کہ پایہ ٹوٹ گیا اور کرسی الٹ گئی۔ یہ اوندھے منہ گرے۔ یہ دیکھتے ہی فوراً کسی ستم ظریف نے یہ جملہ کسا "حضرات اب آپ تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کیجیے"۔

اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ یہ لطیفہ سن کر میرے دل سے یہ تخلص اختیار کرنے کی خواہش کی رخصت ہوئی۔

## نسب:

سید قائم مہدی خلف نواب سید اختر حسین صاحب المتخلص بہ مصور لکھنوی اعلی اللہ مقامہ ابن نواب مولوی سید انور حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہ ابن مولانا سید باقر حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن عمدۃ الدین زین العلماء مولانا سید علی حسین صاحب قبلہ صاحب ثراہ ابن مولانا سید حسین صاحب علیین مکاں ابن مولانا سید دلدار علی صاحب غفراں مآب علیہ الرحمۃ بانیٔ خاندانِ اجتہاد۔

## ولادت و جائے ولادت:

١٩٣١ء میں میرے والد اعلی اللہ مقامہ اور والدۂ ماجدہ جنت مکانی گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ زیارت عتبات عالیات کے لیے روانہ ہوئے۔ حضرت ظریف لکھنوی جو میرے یہاں مختار کار تھے وہ بھی ہمراہ تھے۔ کراچی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ عراق کی حکومت نے کربلائے معلی وغیرہ کا راستہ بند کر دیا ہے اور کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ راستہ کھلنے کے انتظار میں سب نے کھارادر کراچی کے علاقہ میں مسافر رحمت اللہ نامی ایک سرائے میں قیام کیا۔ اس وقت بڑے بڑے اقامتی ہوٹل تو ہوتے نہیں تھے۔ وہیں ٢٢ ربیع الثانی ١٣٥٠ھ مطابق ٦ ستمبر ١٩٣١ء کو میں نے اس عالمِ فانی میں قدم رکھا۔ حضرت ظریف لکھنوی نے تقریباً چودہ پندرہ اشعار پر مشتمل قطعہ تاریخ ولادت کہا جو لکھنؤ میں میرے پاس تھا مگر بعد میں کسی طرح ضائع ہو گیا۔ مجھ کو اس کا ایک آدھ شعر یاد رہ گیا۔

مادہ تاریخ کو خاص طور سے یاد کر لیا تھا۔ جو کچھ یاد ہے وہ درج کر رہا ہوں

شب یکشنبہ وقت صبح، جب تھی چھاؤں تاروں کی
سرائے رحمت اللہ میں خدا نے فضل فرمایا
سفر کی سب صعوبت مٹ گئی جوش مسرت میں
رہے مولود پر یارب سدا ماں باپ کا سایہ

حقیقت میں ہو یہ جمشید کی قسمت کا ہم پایہ
ظریف سب نوا سے ہاتف غیبی یہ کہتا ہے
"سمندر کے کنارے بے بہا گوہر وہ ہاتھ آیا"

۱۳۵۰ھ

مصرعہ تاریخ کی برجستگی اور مقام ولادت کی نسبت سے سمندر، بے بہا اور گوہر وغیرہ کی لفظوں کا برمحل استعمال حضرت ظریف کی قادر الکلامی اور تاریخ گوئی میں مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

## تعلیم:

تعلیم واجبی ہے۔ یو۔ پی بورڈ سے میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ کراچی میں اسلامیہ کالج (کراچی یونی ورسٹی) سے گریجویشن (بی۔ اے) کیا۔ اردو ادب میں ایم۔ اے کراچی یونی ورسٹی سے پرائیوٹ طالب علم کے طور پر کیا۔ ایس ایم لاء کالج (کراچی یونی ورسٹی) سے قانون میں گریجویشن (ایل ایل بی) کی ڈگری بھی اول درجہ میں حاصل کی۔ صنعتی و مزدور قوانین کا امتحان قانون کی تعلیم کے ایک پرائیوٹ ادارے سے پاس کیا جس میں اس شعبۂ قانون کے متعدد طلبا پورے پاکستان بشمول سابق مشرقی پاکستان سے شریک تھے۔ اس خاکسار نے اس امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور پورے پاکستان میں اول آیا۔

## علمی استعداد:

میں کیا اور میری علمی استعداد کیا۔ جاہل محض ہوں۔ جو کچھ شد بد ہے وہ گھر کے ماحول، خاندان کے اثرات، بزرگوں کی میراث اور ماں باپ کی نیک خواہشات اور تمناؤں کا ثمرہ ہے۔ جب کسی صاحبِ علم کو دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے اس طرح خجل ہو جاتا ہوں جس طرح مور اپنے پاؤں دیکھ کے شرما جاتا ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ حسرت و افسوس کے ساتھ اکثر خیال آتا ہے کہ کاش کچھ علم حاصل کر لیا ہوتا۔

## ذریعۂ معاش:

ملازمت ایک ادارہ میں سات سال تک اور پھر جرمنی کے ایک انجینئرنگ کے ادارہ میں تیس برس تک ملازمت یا مزدوری کی جہاں سے پرسونل مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن کے سربراہ کی حیثیت سے ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوا۔

## ازدواجی زندگی:

۳۰ نومبر ۱۹۵۸ء کو موضع ماہل، ضلع اعظم گڑھ، یوپی کے ایک معزز خاندان کے رئیس گرامی مرتبت جناب محترم سید مختار احمد صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی دختر نیک اختر سے عقد ہوا۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم دونوں زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ گو کہ کوئی سترہ (۱۷) سال سے میری اہلیہ صاحب فراش ہیں مگر میں روز خدا سے دعا کرتا ہوں کہ انھیں میرے بعد بھی صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔

## اولاد:

خدا کے فضل سے میری چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ چاروں بیٹیاں ماشاءاللہ اپنے اپنے گھروں میں پرمسرت زندگی گزار رہی ہیں۔

سب سے بڑی بیٹی اور داماد سید حسن عسکری جعفری سلمہٗ اپنے بچوں کے ساتھ ورجینیا امریکہ میں رہتے ہیں۔ دوسری بیٹی اور داماد سید لیاقت رشید رضوی سلمہٗ کا قیام معہ بچوں کے

گلشن اقبال، کراچی میں ہے۔ تیسری بیٹی اور داماد سید حسین حیدر زیدی سلمہ کا قیام بھی مع بچوں کے گلشن اقبال، کراچی میں ہے۔ چوتھی بیٹی جو میرے بیٹے سے چھوٹی ہے اپنے شوہر سید افتخار حسین عابدی سلمہ اور اپنے بچوں کے ساتھ ریاض، سعودی عرب میں ہے جہاں میرے داماد بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔

میرا بیٹا تین بہنوں سے چھوٹا اور ایک سے بڑا ہے۔ نام سید محمد مہدی اور عرفیت دانش ہے۔ انھوں نے لندن سے مارکٹنگ میں ایم۔ بی۔ اے کیا ہے اور ذاتی کاروبار میں قدم جمانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ قوم کے ایک سرگرم رہنما جناب محترم رسالت حسین رضوی صاحب قبلہ کی دختر نیک اختر ان سے منسوب ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کی عرفیت کی نسبت سے بھی ایک رباعی کہی تھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے

قبضہ میں کوئی ملک نہیں ، راج نہیں
قدموں میں کوئی تخت نہیں ، تاج نہیں
رکھتا ہوں مگر دولتِ دین و دانش
درویشِ درِ علم ہوں ، محتاج نہیں

خدا کا شکر ہے کہ میرا بیٹا، چاروں بیٹیاں، چاروں داماد اور بہو سب نہایت سعید اور محبت و احترام کرنے والے ہیں اور ہمارے لئے نعمت خداوندی کا درجہ رکھتے ہیں۔

## حلیہ:

معمولی شکل و صورت اور اوسط قد و قامت کا شخص ہوں۔ میری کتابوں پر میری تصویروں سے خود اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

## اخلاق و عادات:

میرے جاننے والے میرے اخلاق و عادات سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہیں۔ میں کیا عرض کروں۔ ہاں انکسار و خاکساری کو انسانیت کا جوہر سمجھتا ہوں۔ بزرگوں کا ادب و آداب گھٹی میں پڑا ہے۔ حافظ کے اس شعر کو گلے کا تعویذ بنایا ہوا ہے

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

اخلاقی اعتبار سے بزدل ہوں۔ کسی کے منفی رویوں اور جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کا جواب بھی نہیں دے سکتا کہ اس کو تکلیف نہ پہنچے۔ بس دل ہی دل میں حضرت جاوید کا یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو جاتا ہوں:

چلو کیا کام ہے اس داستاں سے
تمھی اچھے سہی سارے جہاں سے

اپنی تہذیبی قدروں کی حفاظت کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں۔ مخالفین سے بھی ملتا ہوں تو خلوص ومحبت کے ساتھ۔ ریاکاری سے نفرت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نہ منافق ہوں نہ ریاکار۔

## شاعری کی ابتدا:

شاعری کی ابتدا کم عمری میں ہوئی۔ عمر یاد نہیں۔ گھر کا ماحول شعر وسخن کی خوشبو سے بسا ہوا تھا۔ والد مرحوم اعلی اللہ مقامہٗ والدۂ ماجدہ جنت مکانی، دونوں عم محترم، پھوپھا اور گھر کی بعض خواتین سب شعر کہتے تھے۔ روزانہ ایک مختصر سی نشست ہوتی جس میں سب دن بھر میں جو کچھ کہا ہوتا وہ سناتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں بھی ذوق شاعری پروان نہ چڑھتا تو اور کیا ہو۔

بہر حال ابتدا سلام اور نوحہ سے کی۔ غزل بھی کہنا شروع کی۔ جب تلاش معاش میں لکھنؤ چھوڑا تو گھر والے مجھ کو ڈاک کے ذریعہ مصرع طرح بھجوا دیتے تھے اور میں جو کچھ ٹوٹے پھوٹے اشعار کہتا تھا وہ ان لوگوں کو بھجوا دیتا تھا۔ اسی طرح مشق سخن جاری رہی۔ جب تک لکھنؤ میں رہا صرف نوحہ سلام اور غزل تک محدود رہا۔ کراچی آیا تو کوئی دس سال تک شعر وسخن کا ماحول ہی نہیں ملا۔ ۱۹۶۵ء میں والد مرحوم کے انتقال پر ایک تعزیتی نظم کہی۔ اس زمانہ میں کورنگی، کراچی میں قیام تھا۔ وہاں شعر وشاعری کے شائقین اچھی خاصی تعداد میں

تھے۔ کئی بہت خوش فکر شاعر بھی تھے۔ اکثر منقبتی محفلیں اور مجلسیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ پروفیسر مظفر حسن صاحب ظفرؔ جونپوری کی شخصیت سب سے اہم تھی۔ ان سے اور بعض اور حضرات کے اصرار پر نعت و منقبت اور قصیدے کہنا شروع کیے۔ رفتہ رفتہ ان کے ساتھ کورنگی سے باہر کی محفلوں میں بھی شرکت ہونے لگی اور یوں میری شاعری کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔

## مرثیہ گوئی:

پہلا مرثیہ "مرثیہ قطب شاہ سے ساحرؔ تک" ۱۹۷۵ء میں کہا اور پہلی مرتبہ ۲۳ جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۲۱ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ بروز شنبہ جامعہ امامیہ، کراچی میں پیش کیا۔ پھر کراچی، خیرپور، راولپنڈی اور اسلام آباد کی متعدد مجالس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مولا کے کرم سے پہلے ہی مرثیہ کی اتنی زبردست پذیرائی ہوئی کہ وہیں سے حسد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طرح طرح کی باتیں کی گئیں۔ کان بھرے گئے۔ بڑی ہمت شکنی ہوئی۔ مگر بہرحال خدا کا شکر ہے کہ وہ دور گزر گیا اور مرثیہ گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔

اکتوبر ۱۹۹۸ء سے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے چار ساڑھے چار مہینوں تک ٹی بی کا علاج ہوتا رہا حالانکہ مجھے ٹی بی نہیں تھی۔ کئی مہینے تک مسلسل تیز بخار اور شدید کھانسی نے حالت خراب کر دی۔ اس پر غلط علاج نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ پھر تشخیص ہوئی کہ ٹی بی نہیں ہے کینسر ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ سال تک کینسر کا علاج ہوتا رہا۔ پھر پھیپھڑوں میں خرابیوں کا علاج شروع ہوا پھر دواؤں کے منفی اثرات نے ہڈیاں کمزور کر دیں اور ان کے ٹوٹ جانے کا ڈر پیدا ہو گیا۔ ان کا علاج بھی جاری ہے۔ اس قدر پے در پے طویل علالت نے ذہن کو بھی سست کر دیا۔ چنانچہ مرثیہ کہنے کے قابل نہیں رہ گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء سے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ دوسری طرف پھیپھڑوں کی خرابی کی وجہ سے سانس کی اتنی تکلیف ہوئی کہ مرثیہ پڑھنا بھی ترک ہو گیا۔ بلکہ قصیدہ تک پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ چار سال سے کہنے اور پڑھنے دونوں سے محروم ہوں۔ البتہ چند سلام اور قطعات تاریخ کہے۔

مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں پاکستان کے وہ کئی حضرات جو دانشور بھی سمجھے جاتے ہیں، مرثیہ نگاروں پر اپنے نظریات مسلط کرنے اور ان پر تنقید و تبصرہ کا اپنے آپ کو سب سے زیادہ مجاز سمجھتے ہیں وہ میرے مرثیوں میں کلاسیکی مرثیہ کے ہلکے سے اثرات کی وجہ سے مجھے مرثیہ گو تسلیم ہی نہیں کرتے اور احتیاط کرتے ہیں کہ مرثیہ نگاروں میں کہیں میرا نام نہ آنے پائے:

خیر اچھا کہا جس نے وہ برا بھی تو کہے

بہرحال میری نظر میں اس دانشوری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں مرثیے کہوں یا قصیدے سب اپنے ذوقِ تخلیق کی تسکین کے لیئے کہتا ہوں بقول لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی

نہ ان کے لیئے اور نہ ان کے لیئے
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیئے

اور ان ذوات مقدسہ کی بارگاہ میں ایک عاجزانہ، فقیرانہ اور غلامانہ ہدیہ نذر کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ اگر اس بارگاہ میں ایک مصرع بھی شرف قبولیت حاصل کرلے تو میرے لیے حشر میں بخشش کا پروانہ بن جائے گا۔ بقول حضرت مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ (ایک لفظ کے تصرف کے ساتھ):

ناقد (حاسد) سے صلہ بھی نہیں درکار ہے مجھ کو
سرکار حسینی سے سروکار ہے مجھ کو

اور ان باذوق اور مرثیہ شناس سامعین کے سامنے پیش کرتا ہوں جن کو میرے مرثیے سننے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ ایسے سامعین خدا کے فضل سے ہر جگہ ہیں۔ کراچی سے لے کر ہندوستان تک کہیں ان کی کمی نہیں ہے۔

۱۹۰۹ء میں جب میں لکھنؤ گیا اور پہلی بار ناظم صاحب کے امام باڑہ میں بزم مرثیہ خوانی کی طرف سے منعقد کی ہوئی مجلس میں مرثیہ پیش کیا تو تقریباً پچاس ساٹھ سامعین کا مجمع

ہوگا۔ پھر رفتہ رفتہ مجلسوں میں مجمع بڑھنا شروع ہوا۔ اب خدا کے فضل سے مجمع سیکڑوں میں نہیں ہوتا، ہزاروں میں ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے امام باڑہ غفراں مآب قدیم تو کے بعد دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا وسیع و عریض ہال سامعین سے بھرا ہوتا ہے اور اس کے سامنے صحن میں بھی سامعین کا بڑا مجمع ہوتا ہے۔ منبر کے بائیں طرف زیریں اور بالائی صحنچیاں خواتین سے بھری ہوتی ہیں حتی کہ کتنی ہی خواتین صحن میں زمین پر بیٹھی ہوتی ہیں۔ علما، ادبا ورشعرا بھی خاصی تعداد میں شریک مجلس ہوتے ہیں۔ سامعین ہر سال منتظمین سے تقاضے کرتے ہیں کہ اس حقیر فقیر کو مجلس کے لیے ضرور بلایا جائے۔ یہ عزت مولا نے دی ہے ورنہ میں کیا اور میری مرثیہ گوئی کیا۔

ہندوستان میں لکھنؤ کے علاوہ میں نے دہلی، علی گڑھ اور الہ آباد میں بھی متعدد جگہوں پر مرثیے پیش کیے اور خدا کے فضل اور مولا کے کرم سے ہر جگہ سامعین نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور ہمت افزائی فرمائی۔

## دیگر رثائی اصناف سخن:

دیگر رثائی اصناف سخن میں سلام، نوحے، رباعیات وقطعات شامل ہیں۔ سب کچھ کہا ہے مگر کم کہا ہے اس لیے کہ محض کوئی ایک صنف سخن میری فکر کا محور نہیں ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی مضامین لکھنا، تبصرے اور تقریظیں لکھنا، کتابیں لکھنا، پھر تحقیق و تنقید کے کام کے علاوہ شاعری میں بھی تہنیتی نظمیں، تعزیتی نظمیں اور تاریخ گوئی بھی کچھ میری مصروفیت میں شامل ہے۔ ان ساری اصناف سخن کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ اس لیے کہ ان پر تفصیلی تبصرہ معظم و محترم جناب مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی کے مضمون میں موجود ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ البتہ قصیدہ گوئی کے متعلق اتنا عرض کردوں کہ مرثیہ نگاری کی طرح قصیدہ گوئی بھی میرا اہم ترین مشغلہ اور پسندیدہ ترین صنف سخن ہے۔ مگر مرثیوں کی طرح میرے قصیدے بھی ہدف تنقید و مذمت ہیں۔ بڑے بڑے صاحبان علم اور استادان فن قسم کے حضرات کے لیے میرے قصیدوں کی زبان سمجھنا مشکل

ہے جو میرے جدید حسیت اور عصری آگہی سے نابلد ہونے کی بھی دلیل ہے۔ بھلا جس زمانہ میں اردو کے خلاف ایک کے بعد ایک تحریک چلائی جارہی ہو یہاں تک کہ اردو سے تمام فارسی اور عربی الفاظ خارج کردینے اور خالص اردو رائج کرنے کی باتیں کی جارہی ہوں اس میں قصیدوں کی پرشکوہ زبان اور شوکت الفاظ کی داد کیا دی جاسکتی ہے۔

بہرحال ۱۹۹۴ء میں میرے اٹھارہ منتخب قصیدوں کا ایک مجموعہ "صحیفۂ مدحت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یوں تو میں نے چھوٹے بڑے منتخب اور مقتضب سو کے قریب قصیدے کہے ہوں گے مگر منتخب قصیدوں کی تعداد پچاس کے قریب ہے جو حضرت سودا کے تقریباً کل قصیدوں کی تعداد کے برابر ہے۔

## نثر نگاری:

جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھ چکا ہوں کہ اس میں مضامین تبصرے اور تنقیدوں کے علاوہ کتابیں تصنیف و تالیف کرنا بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ میں نے ایک آدھ افسانہ بھی لکھا۔ یہ ۵۳۔۱۹۵۴ء کے درمیانی عرصہ کی بات ہے۔ میرے ایک بہنوئی جو ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے انھیں افسانہ نویسی کا بہت شوق تھا۔ دن رات فرصت کے اوقات میں افسانے لکھتے رہتے تھے۔ مگر ان کا کوئی افسانہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ مجھے ان کو دیکھ دیکھ کر افسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ میں نے "خواب" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ اس زمانہ میں وہ ماہنامہ "بیسویں صدی" کے خریدار تھے جو اپنے وقت کا معروف و مقبول ادبی رسالہ تھا۔ میں نے وہ افسانہ ان کو سنایا اور بذریعہ ڈاک "بیسویں صدی" کو بھجوادیا۔ وہ افسانہ اس رسالہ میں شائع ہوگیا۔ مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں اتنے زمانے سے افسانے لکھ رہا ہوں میرا کوئی افسانہ آج تک شائع نہیں ہوا اور تم نے ایک افسانہ لکھا اور وہ شائع ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے ایک آدھ افسانہ اور لکھا پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

## تلمذ:

سب سے پہلا سلام میں نے حضرت لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین صاحب

عرف مولوی لسّن صاحب قبلہ شاعر اعلی اللہ مقامہ کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا۔ انھوں نے اس کی اصلاح کر کے چار پانچ شعر اپنی طرف سے اضافہ کر دیئے۔ اس زمانہ میں اساتذہ کا یہی طریقہ تھا۔ اس طرح وہ میرے استاد اول قرار پائے۔ ان کا جیسا ہمہ صفت اور ہمہ رنگ صاحب قلم میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میری بدقسمتی کہ اسی زمانہ میں وہ لکھنؤ کا قیام ترک کر کے رامپور چلے گئے اور میں ان سے مزید اکتساب فیض سے محروم رہ گیا۔

ان کے بعد ان کے برادر خورد حسینی شاعر حضرت فضل نقوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ وہ میرے چچا بھی ہوتے تھے اور پھوپھا بھی۔ مجھ پہ بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ اپنے بیٹوں سے کہیں بڑھ کے مجھے چاہتے تھے۔ سلام گوئی میں وہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ جب تک میں لکھنؤ میں رہا انھیں سے فیض اٹھاتا رہا۔ اس طرح حقیقی معنوں میں میرے استاد وہی تھے۔

کراچی آنے کے بعد شاعر آل محمد حضرت نسیم امروہوی مرحوم سے مشورہ سخن شروع کیا۔ اس سے مجھ کو عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں کوئی کلام میں نے پیش کیا اور وہ کامیاب ہوا تو فوراً یہ ذہن میں آ جاتا تھا کہ نسیم صاحب نے کہہ کے دے دیا ہوگا۔ کوئی واہ واہ استاد کے نعرے لگاتا تھا۔ اس سے میری بہت ہمت شکنی ہوتی تھی۔ اور ایک طرح سے ذلت محسوس ہوتی تھی اس لیئے کہ میں نے ان سے کبھی ایک شعر بھی نہیں کہلوایا نہ اپنے نام سے پڑھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ سن لیجیئے۔ ایک سال مجھے ڈاکٹر یاور عباس صاحب کے یہاں کے مرثیوں کی مجلس میں سلام پڑھنا تھا۔ میں نے سلام کہا اور نسیم صاحب قبلہ کو دکھایا۔ انھوں نے مطلع کے دونوں مصرعے بدل دیئے۔ جب میں مجلس میں سلام پڑھنے منبر پر گیا تو یہ کہہ کے سلام شروع کیا کہ اس کا مطلع میرا نہیں ہے۔ چونکہ نسیم صاحب قبلہ نے دونوں مصرعے بدل دیئے ہیں اس لیئے یہ مطلع اب انھیں کا ہے۔ مجلس کے بعد میں نے نسیم صاحب قبلہ سے عرض کی کہ میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ جو مطلع میرا نہیں رہ گیا تھا اسے میں اپنے نام سے کیسے

پڑھتا۔

مشورۂ سخن اسے کہتے ہیں کہ آپ نے شعر سنایا۔ انھوں نے کہا مزہ نہیں آیا۔ اس پر آپ نے کوئی لفظ بدل دی انھیں پسند آئی تو کہہ یہ بہتر ہے نہیں تو انھوں نے کوئی دوسری تجویز کی آپ کو پسند آئی تو آپ نے کہا جی یہ بہتر ہے۔ نہیں پسند آئی تو خاموش ہوئے۔ میرا ان سے مشورۂ سخن کا یہی طریقہ تھا۔

حضرت نسیم امروہوی کے انتقال کے بعد کئی برس تک میں نے جو مرثیے اور قصیدے وغیرہ کہے ان پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ حضرت سبط حسن انجم کے گھر پر کئی برس پہلے ایک محفل میں مجھ سے ایک قصیدہ سن کے جو ان کا دیکھا ہوا نہیں تھا، نسیم صاحب قبلہ نے خود با آواز بلند یہ فرمایا تھا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹۹۲ء میں جب میں نے اپنے مرثیوں کا ایک مجموعہ "آیات درد" شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مناسب سمجھا کہ چھپنے سے پہلے میں ان پر نظر ثانی کرلوں اور کسی کو دکھا دوں۔ چنانچہ اس کے لیئے میں نے شمس الادبا جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی کا انتخاب کیا جو اس کام کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ شاعری میں ان کا تنقیدی شعور بہت بلند ہے۔ "شعور و شاعری" کے نام سے ان کی کتاب ان کے اعلیٰ درجے کے تنقیدی شعور کی آئینہ دار ہے جس میں انھوں نے بڑے بڑے شعرا کے کلام پر تنقید کی اور اس پر اصلاحیں دی ہیں۔ ان کا ذوق شعری اس قدر عمدہ ہے کہ میں نے کسی اور میں ایسا ذوق نہیں دیکھا۔ چنانچہ میں نے اشاعت سے پہلے وہ مرثیے ان کی خدمت میں پیش کیئے اور ان سے استفادہ کیا۔ اب بھی جو کچھ کہتا ہوں احتیاطاً ان کی خدمت میں ضرور پیش کردیتا ہوں اور جس طرح "شعور و شاعری" میں انھوں نے انیس و دبیر و اقبال وغیرہ کے کلام پر اصلاحیں دیں میرے کلام پر بھی دیتے ہیں۔

## مطبوعات:

نامناسب نہ ہوگا اگر میں یہاں اپنی اب تک کی شائع شدہ کتابوں کی فہرست بھی

دے دوں۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ ''مرثیہ، قطب شاہ سے ساحر تک'' مطبوعہ　۱۹۷۶ء　کراچی
۲۔ ''علم اور علما'' (شخصی مرثیہ)　۱۹۹۰ء　مطبوعہ دہلی (بھارت)
۳۔ ''علم اور علما''　۱۹۹۲ء　(باردوم) کراچی
۴۔ مرثیہ ''فقر و شمشیر''　۱۹۹۲ء　مطبوعہ دہلی (بھارت)
۵۔ ''آیات درد'' (مجموعہ مراثی)　۱۹۹۴ء　کراچی
۶۔ ''صحیفۂ مدحت'' (مجموعہ قصائد)　۱۹۹۷ء　کراچی
۷۔ ''احساس غم'' (مرثیوں کا دوسرا مجموعہ)　۲۰۰۱ء　کراچی
۸۔ ''فن تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ''　۱۹۹۹ء　کراچی
۹۔ ''یقین کامل'' (مذہبی موضوعات)　۱۹۹۹ء　کراچی
۱۰۔ یمانی سہ پارے (مرتب ...) (مذہبی مضامین)　۱۹۹۸ء　کراچی
۱۱۔ ''باتیں ہماری رہ گئیں'' (مرتب کردہ) (نسیم امروہوی مرحوم کے بارے میں)　کراچی
۱۲۔ ''خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو۔ مہر سے ساحر تک'' زیر طبع　کراچی

ان میں سے ''یقین کامل'' کا ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں بنگالی زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ وہاں کے شیعہ علما نے اس کو بہت پسند فرمایا اور ضروری سمجھا کہ اسے عام بنگالی مومنین تک بھی پہنچایا جائے۔ یہ اطلاع مجھے میرے کرم فرما جناب محترم سید حسین اکبری (سیدی) صاحب قبلہ سے ملی۔

## خانوادۂ اجتہاد کا آخری مرثیہ گو:

خاندان اجتہاد علم و ادب کا ایسا عظیم خاندان ہے جس میں حضرت غفران مآب بانی خاندان اجتہاد کی اولاد ذکور میں کم از کم تیرہ معروف مرثیہ گو اور اولاد اناث میں کم از کم سات معروف مرثیہ گو ہوئے ان کے علاوہ کم از کم چوبیس، پچیس غیر مرثیہ گو شعرا ہوئے۔ اس طرح تقریباً پچاس شعرا کے علاوہ دیگر صاحبان قلم بھی ہوئے جو نثر نگار تھے۔ تنی بڑی تعداد

میں کسی اور خاندان میں مرثیہ گو اور دیگر شعراء نہیں ہوئے۔ حضرت علی احمد دانش نے ''عطر زار'' میں میر خلیق علیہ الرحمہ اور ان کی اولاد ذکور میں مرثیہ گو حضرات کی تعداد دس لکھی ہے۔ اور دیگر شعراء و ادباء کو ملا کر کل تعداد تمیں پینتیس لکھی ہے جو خاندان اجتہاد کے بعد سب سے زیادہ ہے۔

بدقسمتی سے میں خاندان اجتہاد کا آخری مرثیہ گو ہوں۔ افسوس کہ تقریباً سوا سو سال پر محیط اس عظیم خاندان کی مرثیہ گوئی کی روایت میرے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ ہر عہد اور ہر دور کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہوتا ہے۔ مرثیہ گوئی کے چار عظیم خاندانوں میں سے تین میں مرثیہ گوئی بہت پہلے ختم ہو چکی ہے۔ مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ کی نسل میں ان کے پوتے مرزا محمد طاہر رفیع آخری مرثیہ گو تھے۔ ان کے بعد کوئی نہ ہوا۔ میر انیس کے یہاں یہ سلسلہ تادیر قائم رہا مگر ۱۹۴۴ء میں جناب خفر حسین صاحب عرف بابو صاحب فائق کے انتقال کے ساتھ آج سے کوئی چھپن سال پہلے ختم ہو گیا۔ وہ خاندان انیس میں ان کی اولاد میں آخری مرثیہ گو تھے۔ حضرت فائق کی ولادت ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ہوئی تھی (عطر زار ص ۱۳۸) جناب محترم مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی کا ارشاد گرامی ہے کہ فائق صاحب مرثیہ کے بہت عمدہ شاعر تھے اور ان کے زمانہ میں ان سے بہتر مرثیہ پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ حضرت عارف اعلی اللہ مقامہ کے بڑے فرزند تھے۔ ۲۱ شعبان ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء کو مکان انیس لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ یہی مکان ان کی جائے ولادت بھی تھا۔

حضرت عارف کے دوسرے بیٹے جناب میر محمد ہادی صاحب لائق کی مرثیہ گوئی کے متعلق دو رائیں ہیں۔ حضرت شمس مدظلہ جن سے ان کے بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے فرماتے ہیں کہ لائق صاحب مرثیے نہیں کہتے تھے بلکہ حضرت عارف کے مرثیے پڑھتے تھے۔

ان کے برخلاف حسینی شاعر حضرت فضل نقوی اعلی اللہ مقامہ نے ''مجمع التواریخ'' میں

ان کے قطعہ تاریخ وفات پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ وہ مرثیہ کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ (ص ۱۰۷) ان کے لائق فرزند جناب علی محمد ناطق نے ان کے حالات مندرجہ ''عرس زار'' میں یہ کھل کے نہیں لکھا کہ حضرت لائق مرثیہ کہتے تھے البتہ یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے کلام کو اپنے بزرگوں کے کلام سے کمتر سمجھتے تھے اس لیے اپنے بزرگوں ہی کے مرثیے پڑھتے تھے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ مرثیہ بھی کہتے تھے مگر حضرت ناطق نے ان کے کسی مرثیہ کا کوئی اقتباس نمونہ کلام کے طور پر درج نہیں کیا۔ صرف غزل اور سلام کے اشعار لکھے ہیں۔ بہر حال ان کا انتقال بھی آج سے کوئی چوبیس سال پہلے ۱۳۹۰ھ میں ہو گیا اس طرح چوبیس سال یا پچپن سال پہلے خاندان انیس سے مرثیہ گوئی ختم ہوئی۔ ان کی اولاد ذکور میں تو اور بھی پہلے ختم ہو چکی تھی۔ البتہ میرے استفسار پر حضرت علی محمد ناطق صاحب قبلہ نے ایک مکتوب گرامی میں بہت انکسار کے ساتھ یہ تحریر فرمایا ہے کہ وہ مرثیے کہتے ہیں مگر پڑھتے نہیں۔ اس طرح ان کے مرثیے بھی ان کے والد بزرگوار کی طرح منظر عام پر نہیں آتے ہیں۔

خاندان عشق میں مرثیہ گوئی اور دیر تک باقی رہی مگر حضرت مہذب کے ساتھ کوئی پندرہ برس پہلے وہ بھی ختم ہوگئی جن کا انتقال ۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

یہ اس صنف سخن کے زوال کی عبرتناک داستان ہے جس نے اردو شاعری کو سربلندیاں دیں، ادب کو معراج عطا کی، کائنات شعر و سخن میں جھنڈے گاڑ دیے اور اپنے نام کے ڈنکے بجوا دیے۔ خاندان اجتہاد کی مرثیہ گوئی کا بھی یہی مقدر ہے۔ یہ خیال ہی مدت سے میرے دل کا باعث ہے کہ اس خانوادہ میں مرثیہ گوئی کا دور طویل ترین ہو جو خدا کے فضل سے اب تک جاری ہے۔

میں نے اس کتاب کے نام کے ایک جزو کے طور پر ''ابتدا سے تا آخر تک'' کا جو عنوان قائم کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ میں اپنے آپ کو اس عظیم خانوادہ کا آخری مرثیہ گو سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعری تو خاندان سے ختم نہیں ہوئی ہے مگر میری نظر میں .... تک

خاندان میں کوئی ایسا شاعر اب نہیں ہے جس سے مرثیہ گوئی کی توقع کی جا سکے۔ اس لیے
اس چراغ کو روشن رکھنے والا میں آخری اور واحد شخص ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد

کوئی چراغ جلے گا نہ روشنی ہوگی

کاش میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو اور میرے بعد بھی کوئی اس روایت کو آگے بڑھانے
والا پیدا ہو جائے اس مقولہ کے مطابق کہ ''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ آمین۔

## اختتامیہ:

میں نے اپنے ذاتی کوائف اور شعری و ادبی سرگرمیوں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کر دیا
ہے۔

اس کے ساتھ میرے معروضات تمام ہوئے۔ آپ کی زحمت مطالعہ کے لیے
شکر گزار ہوں۔

اعتذار۔ مجھ کو اس بات سے ندامت بھی ہے اور افسوس بھی کہ اس کتاب میں خود میرا تذکرہ
بہت طویل ہو گیا ہے مگر میرے بارے میں مضمون حضرت شمس الادبا، مولانا سید محمد باقر
صاحب شمس مدظلہ کا تحریر کردہ ہے اور مطبوعہ بھی ہے جس میں اس کتاب کی ترتیب اور
ضروریات کے مطابق ترمیم و اضافہ بھی کیا گیا ہے اس لیے ان کی اجازت کے بغیر مجھے اس
میں کوئی ترمیم و تنسیخ کا حق نہیں ہے اور انھوں نے اس کی اجازت عطا نہیں فرمائی۔ بہرحال
میں محترم قارئین سے مضمون کی طوالت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ساحر اور ان کا شاعرانہ مرتبہ

(ماخوذ از "پنج آہنگ" از مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ)

(نئی ترتیب اور اضافوں کے ساتھ)

جناب ساحر (سید قائم مہدی) ۱۳۵۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۱ء سرائے رحمت اللہ، قیصر باغ، کراچی میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب ان کے محترم والدین زیارات مقامات مقدسہ کے سفر کے دوران کراچی میں رکے تھے۔ ظریف لکھنوی نے تاریخ کہی:

"سمندر کے کنارے بے بہا گوہر وہ ہاتھ آیا"

وہ لکھنؤ کے خاندان اجتہاد کی اس شاخ کے ثمر ہیں جو پنج دولت مہدی کی وجہ سے نواب کہا جاتا تھا۔ وہ لوگ نوابی کی شان پیدا کرنے پر تو روپیہ ضرور صرف کرتے تھے لیکن نوابوں کی طرح دوسرے لہو ولعب اور نامشروع باتوں پر ان کی دولت صرف نہیں ہوتی تھی۔ مجلسیں بہت اہتمام سے کرتے تھے جن میں پلاؤ، قورمہ اور روٹی رومال میں بندھی ہوئی تقسیم ہوتی تھی۔ مشاعرے کرتے تھے۔ بعد ختم مشاعرہ شعرا اور شرکاء کے لیے دسترخوان بچھتا تھا جس میں پرتکلف کھانے پیش کیے جاتے تھے۔ جناب ساحر کے جد نواب سید صفدر حسین صاحب فاخر صورت شکل، شان وشوکت اور وجاہت میں تو نوابوں

سے بھی آگے تھے لیکن خاندانی اثر سے طبعاً مولوی تھے۔ ان کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سنا گیا۔ مجلسیں بھی اسی شان سے کرتے تھے جن میں حسب دستور پر تکلف کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ مشاعرے میں بھی اسی طرح دستر خوان بچھتا تھا۔ نادار شعراً، ادباً اور اہل علم کے وظائف مقرر تھے۔ خطیب اعظم مولانا سبط حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ کی علمی زندگی انھیں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھی۔ علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت میں بھی ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ میرے والد کی کتاب ''عضب اللہ المسقول فی ردالسیف المسلول'' انھیں کے روپیہ سے چھپی۔ شاعرانہ حیثیت سے ان کا شمار لکھنؤ کے اساتذہ میں تھا۔ سینکڑوں شاگرد تھے غزلوں کے کئی دیوان ہیں۔ مرثیوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے سلام اتنے کہے تھے کہ ایک ضخیم دیوان مرتب ہو کر شائع ہو گیا تھا۔ بعض اور شاعروں کے بھی سلاموں کے دیوان ہیں مگر بہت کم۔

حضرت فاخر کے صاحب زادے نواب انور حسین صاحب شاعر تو نہ تھے لیکن سخن فہمی اور نکتہ سنجی ان کی مشہور تھی۔ ان کے صاحب زادے نواب اختر حسین صاحب مصور جو ساحر صاحب کے والد تھے، شاعر تھے۔ میں نے ان کا اور کلام تو نہیں دیکھا لیکن نوحہ کی بیاضیں دیکھی ہیں۔ کلام استادانہ ہے۔

ساحر صاحب کے نانا نواب سید محمد ذکی علی صاحب ہاتف کا شمار لکھنؤ کے اساتذہ میں تھا مگر ان کا سارا کلام تلف ہو گیا اور یہ حادثہ انھیں کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ اکثر اساتذۂ لکھنؤ کا کلام مفقود ہے۔ جناب ساحر کو ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے شاعری میراث میں ملی ہے اس لیئے اگر یہ کہوں کہ ان کی شاعری دو آتشہ ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ وہ خاندانی اثر سے متقی اور پرہیز گار ہیں۔ راتیں ان کی عبادت میں گزرتی ہیں۔ دن کو سوتے ہیں اور اس

میں جو وقت ملتا ہے اس میں شعر کہتے ہیں۔

ساحر صاحب نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ رباعی، قطعہ، غزل، تہنیتی نظمیں، تعزیتی نظمیں، منظوم تقریظیں، تاریخ گوئی، ہجو گوئی، نوحے، سلام، قصیدے اور مرثیے سب کچھ کہا ہے اور کہہ رہے ہیں۔ نثر نگاری میں بھی ان کو خاص سلیقہ ہے۔ مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے مطبوعہ مضامین ان کی انشا پردازی کی خوبیوں کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

## مرثیہ نگاری:

مرثیہ کی تمہید کو چہرہ کہتے ہیں۔ اس کا کوئی مضمون معین نہیں ہے تعشق کے ایک مرثیہ کی تمہید ہے شبِ ہجر:

سچ ہے دنیا میں شبِ ہجر بلا ہوتی ہے

دوسرے مرثیہ کی تمہید ہے

پروانہ جانباز سوئے شمع رواں ہے

میر انیس نے ایک مرثیہ کی تمہید اپنے کلام کی مقبولیت کی دعا ہے۔ ایک مرثیہ کی تمہید میں امام حسین کا مدینے سے سفر اور پردہ کا اہتمام نظم کیا ہے۔ ایک مرثیہ کی تمہید میں فوجوں کی روانگی کا منظر ہے۔ ایک مرثیہ کی تمہید میں بیٹا باپ کے لیے کتنی عظیم نعمت ہے، اس کی تفصیلات ہیں۔ ایک میں صبح کا سماں ہے۔ ایک کی تمہید تعلّی شاعرانہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ مرثیہ کو تمہید میں آزادی ہے۔ جس طرح کا مضمون چاہے اسے تمہید قرار دے سکتا ہے لیکن یہ ساری تمہیدیں واقعہ کربلا کی ہیں جو اصل مرثیہ ہے۔ تمہید مرثیہ نہیں ہے مگر مرثیہ کا جزو لاینفک ہے۔ اگر صرف واقعہ کربلا پڑھا جائے جو اصل مرثیہ ہے تو کسی چند منٹ کی مجلس ہوگی جس کو نہ بانیٔ مجلس پسند کرے گا نہ کوئی [illegible] مرثیہ سننے آنے والا۔ اس لیے مرثیہ کی تمہید اس کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ جب شاعر نے

کمال سننے کے لیئے آتے ہیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی مجلس ہوتی ہے اور آخر میں واقعۂ کربلا سنتے ہیں جو حاصلِ مجلس ہے۔ تمہید میں دھوپ، گرمی اور پیاس کی شدت میں امام کی جنگ عرب کے اصولِ جنگ کے مطابق جس میں گھوڑوں کا دوڑنا، تلواروں کا چمکنا، نیزوں کا لچکنا، کمانوں کا کڑکنا، تیروں کا چلنا، کبھی انفرادی جنگ جس میں رجز بھی شامل ہے اور کبھی جنگِ مغلوبہ اور اس کے بعد شہادت اور بین۔ اس مختصر بیان کی تفصیل مرثیہ میں ہوتی ہے جسے ہم اصل مرثیہ سمجھتے ہیں۔ آج کل جو جدید مرثیہ کے نام سے مرثیے کہے جاتے ہیں ان میں تمہید ہے، مرثیہ نہیں ہے، اس لیئے ہم انھیں مرثیہ نہیں سمجھتے کیونکہ واقعہ کربلا کی طرف محض چند اشارے سے مرثیہ نہیں بن سکتے۔ ان واقعات کی تفصیل مرثیہ ہے۔

جدید مرثیہ کی سب سے اہم اور سب سے بڑی مثال حضرت جوش ملیح آبادی کے مسدس ہیں جن کو نہ صرف نقادانِ سخن مرثیہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ خود جوش صاحب بھی ان کو مرثیے نہیں کہتے تھے، مسدس کہتے تھے کیونکہ وہ خود جانتے تھے اور اس کا اعتراف بھی کرتے تھے کہ ان کے مرثیے مرثیہ کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اب جو جدید مرثیوں کو مسدس کا نام دیا گیا ہے جس پر جدید مرثیہ نگاروں اور ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی صاحب جیسے بعض جدیدیت پرست نقادوں کو شدید اعتراض ہے یہ خود حضرت جوش ملیح آبادی کا دیا ہوا نام ہے۔ ان کو جدید مرثیہ کا موجد اور جدید مرثیہ نگاروں کا میر کارواں تسلیم کرنا مگر جدید مرثیہ کو ان کے دیئے ہوئے نام "مسدس" پر چراغ پا ہونا جیسا کہ ڈاکٹر عقیل رضوی صاحب کے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ "طلوعِ افکار" کراچی سے ظاہر ہے، عجب تضادِ فکر ہے۔

اس دور کے جتنے معروف مرثیہ نگار ہیں ان میں سے دو تین معتدل

مزاج شعراء کو چھوڑ کر جن کے مرثیوں میں کربلا کے واقعات بیان مصائب کی
حد تک ذرا کچھ تفصیل سے ملتے ہیں، دوسرے چھوٹے بڑے جدیدیت کے مدعی
شعرا کے مرثیے ان سے تقریباً خالی ہوتے ہیں۔ ساٹھ ستر بندوں کی تمہید کے
بعد دو چار بند آخر میں کربلا کے متعلق بھی اشارۃً آجاتے ہیں جن کو مرثیہ نہیں
کہا جا سکتا، کیونکہ واقعہ کربلا کی طرف چند اشارے مرثیہ نہیں بن سکتے۔
تفصیل مرثیہ ہے۔

جناب ساحر لکھنوی کے مرثیے تمہید میں تو جدید مرثیوں کی طرح ہیں
لیکن انھوں نے اپنے مرثیوں کو مرثیہ باقی رکھا ہے اور ان میں وہ تمام باتیں
موجود ہیں جو واقعہ کربلا کے متعلق ایک مرثیہ میں ہونا چاہئیں، مثلاً گھوڑے کی
تعریف، تلوار کی تعریف، جنگ، شہادت اور بین۔ مرثیے کے یہ تمام اجزا
پورے طور پر موجود ہیں۔ خاص طور پر بین جو ترکے لحاظ سے رقت آفریں اور
شاعری کے اعتبار سے وجد آفریں ہیں۔ ان کے مرثیوں کے بارے میں
میری رائے یہ ہے کہ ہر صنف سخن کی طرح ان کا یہ مرثیہ بھی [illegible] میں
نہیں ہے۔ یہی بات میں اپنی کتاب "تاریخ لکھنؤ" کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن
مطبوعہ ۱۹۹۱ء میں اور اس کے بعد ساحر صاحب کے مجموعہ مراثی "آیات درد"
میں شامل اپنے تبصرہ میں لکھ چکا ہوں جس پر بعض حضرات چیں بہ جبیں بھی
ہوئے مگر میں اپنی رائے پر قائم ہوں۔ جناب حسین انجم مدیر اعلیٰ ماہنامہ
"طلوع افکار" کراچی نے اپنے جریدے کے شمارہ بابت ماہ مئی ۱۹۹۸ء میں
جناب ڈاکٹر سردار زیدی کا ایک مضمون اردو شاعری میں رثائی ادب کا مرتبہ و
مقام کے موضوع پر شائع کیا۔ ڈاکٹر سردار زیدی نے اس مضمون میں
ساحر صاحب کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔
"ساحر صاحب بعد از تقسیم برصغیر میں پروان چڑھنے والی نسل سے تعلق رکھتے

ہیں۔ مرثیہ ان کو وراثت میں ملا ہے۔ وہ علوم حاضرہ سے باخبر ایک پڑھے لکھے اور قادر الکلام شاعر ہیں (ص ۱۳)۔ ساحر لکھنوی کے ہاں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج ملتا ہے (ص ۷)۔ ساحر صاحب کا انداز مرثیہ گوئی اور طریق خواندگی میر انیس سے قریب ہے۔ مرثیہ خوانی میں وہ میر انیس کی طرح آنکھوں کی جنبش اور آواز کے زیر و بم سے کام لیتے ہیں اور مفہوم کی وضاحت کے لیے حسب ضرورت ہاتھ کے اشاروں سے بھی بتاتے جاتے ہیں البتہ ان کی آواز اور لہجہ میں ایک دھیما پن ہے جو ان کی شستعلیق و مرنجان مرنج شخصیت کا غماز ہے۔ جدید مرثیہ گویوں میں وہ ایک قادر الکلام مرثیہ گو ہیں۔ ان کی زبان اور محاورہ پر مکمل گرفت ہے۔ مرثیہ کی زبان کے سلسلے میں وہ میر انیس کے قائم کردہ معیار پر پورے اترتے ہیں

روزمرہ شرفا کا ہو ، سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو ، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا ، عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں ، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

کولرج نے مرثیہ (Elegy) کو شاعری کی ایک صنف قرار دیتے ہوئے تفکر کرنے والے ذہن کے لیے فطری عمل ہے۔ یونانیوں میں بھی اس صنف کا مقبول استعمال مرنے والے کے لیے پروقار حزن کا اظہار تھا۔ اسی طرح رومی اور انگریزی ادب میں بھی مرثیہ سنجیدہ شاعری کا قابل قدر حصہ ہے۔ اردو شاعری میں سب سے پہلے سودا نے مرثیے کی حرمت و شاعرانہ اہمیت پر اصرار کیا اور کہا کہ مرثیہ محض عوام کے بین و بکا کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ

شاعر کو اپنے ممدوح کے رفعِ مرتبے کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ ان حوالوں سے بھی ساحر صاحب کا مرثیہ کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بحیثیت ایک جدید مرثیہ گو ان کے مرثیوں میں موضوعاتی تسلسل، اخلاقی، مابعد الطبیعاتی، عصری اور سیاسی مضامین اور ایک فکر امیز حزن کا اظہار بھی ملتا ہے (ص ۱۰۹)۔

ساحر صاحب کے مرثیوں کے مختلف مقامات سے چند مثالیں ملاحظہ کیجیے

**منظر نگاری:** قدیم مرثیوں کے چہرے میں مناظرِ قدرت کا بیان ہوتا تھا۔ مثلاً صبح کا سماں، رات کی تاریکی اور گرمی کی شدت وغیرہ۔ جدید مرثیوں میں منظر نگاری ختم ہو چکی ہے۔ ساحر صاحب نے اس کمی کو میدانِ جنگ کی منظر نگاری سے پورا کیا اور اپنے ہنر سے یہ منظر آنکھوں سے دکھا دیے۔

اجتماعی جنگ کے منظر دیکھیے۔ شہزادہ علی اکبر کی اجتماعی جنگ کے ان تین بندوں میں تیسرے بند کی بیت کا بیان خاص طور سے توجہ طلب ہے۔ جناب علی اکبر فوجِ یزید پر حملے کرتے ہیں۔ حملوں کی شدت سے

ہلچل یہ تھی کہ تیغ کہیں تھی سپر کہیں
رہرو کہیں تھے، راہ کہیں، راہبر کہیں
بھائی کہیں تھا، باپ کہیں اور پسر کہیں
بھگدڑ مچی تھی، پاؤں کہیں تھے نظر کہیں
پیدل تو کیا، سوار گرے اضطراب میں
سرخاک پر تھے، پاؤں معلق رکاب میں
محشر سے ہم کنار تھا میدانِ کارزار

نقارہ و دہل کی گرج ، شورِ گیر و دار
چیخیں وہ زخمیوں کی ، وہ ترکیت کی پکار
گھوڑوں کی جست و خیز سے اڑتا ہوا غبار
لاشے نظر کی آخری حد تک پڑے ہوئے
اکبر کی تیغ تیز کے جھنڈے گڑے ہوئے

بکھرے پڑے تھے دشت وغا میں ادھر ادھر
ہتھیار ، چار آئینے ، زرہیں ، جھلم ، سپر
دل ، ہاتھ ، پاؤں ، سینہ ، جگر ، سب تتر بتر
گھوڑوں کی ٹھوکروں میں تھے خیرہ سروں کے سر
جھکتے نہ تھے جو کبر سے اک آن کے لیے
گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لیے

(مرثیہ مرثیہ قطب شاہ سے ماتمہ)

## مرثیہ میں حمد:

ایک مرثیہ سے حمد خدا کے چند بند ملاحظہ ہوں

خدا کی حمد ہے سر نامۂ کتابِ سخن
یہی ہے مطلعِ دیوانِ انتخابِ سخن
یہ حرف وہ ہے ، زباں جس سے کامیاب سخن
اس ایک حرف سے کھلتے ہیں لاکھ باب سخن
وہ جس کے لب پہ یہ حرف جلیل ہوتا ہے
وہ شخص ہم سخنِ جبرئیل ہوتا ہے

خدا کی حمد یمِ معرفت کا موتی ہے
یہ تہہ کی چیز ہے ، گہرائیوں میں ہوتی ہے

اسی کی چاہ میں فکر آبرو بھی کھوتی ہے
بڑے منجھے ہوئے پیراک کو ڈبوتی ہے

جو ہچکچائے وہ کب اس گہر کو پاتا ہے
جو ڈوب جائے، یہ بس اس کے ہاتھ آتا ہے

یہ بحرِ معرفتِ حق ہے وہ خدا کی قسم
کہ جس کی تھہ نہ پائیں کبھی خیال، قلم
ابھرنے لگتا ہے سن کے عمق کو دیکھ کے دم
بڑے بڑوں کا یہاں کھل گیا ہے مان بھرم

وہ پار کیا ہو جو حق کا ولی نہیں ہوتا
ہر اک ولی بھی جہاں میں علی نہیں ہوتا

یہ وہ ہے جس کا لقب ذوالجلال و الاکرام
وہ حیّ و مومن و قیوم و مستعان و سلام
ودود و باری و معبود سب اسی کے ہیں نام
اسی کی ذات کو کل کائنات میں ہے دوام

اسی سے عالم ایجاد ہے، بدیع ہے وہ
تمام رفعتیں ہیں پست، بس رفیع ہے وہ

وہی ہے مدرک و ہادی، وہی وکیل و کفیل
بصیر و عادل و فرد و احد، مقیل و نبیل
شکور و محسن و ذی عزت و مثیل و دلیل
لطیف و نور و خبیر و قوی، جلیل و جمیل

بعید و مقتدر و قادر و حسیب ہے وہ
نظر سے دور، رگ جاں سے بھی قریب ہے وہ

وہی ہے برتر و بالا ، وہی علی و عظیم
وہی ہے قاضی و عادل ، وہی رحیم و کریم
وہی ہے عالم و حاکم ، وہی علیم و حکیم
وہی ابد سے بھی آخر ، وہی ازل سے قدیم

اسی نے عقل و حواس و نظر کو خلق کیا
محمدؐ عربی سے بشر کو خلق کیا

کسی کا وہ نہیں محتاج ، اس کے سب ، وہ صمد
نہیں ہے کفو کوئی اس کا خلق میں ، وہ احد
نہ کوئی اس کے جد و اب ، نہ والدہ نہ ولد
اسی کی شان میں ہے "لم یلد ولم یولد"

اسی کو مرتبہ خلاقیت کا سجتا ہے
اسی کے نام کا ڈنکا جہاں میں بجتا ہے

بغیر معرفت اس کی کہاں ثنا ممکن
حق اس کی حمد کا ہم سے ادا ہو ، کیا ممکن
وہ ذاتِ واجب و ہر بندۂ خدا ممکن
میانِ واجب و ممکن یہ امر ناممکن

جو مدحِ جنت و حور و قصور ہوتی ہے
اسی کی حمد یہ بین السطور ہوتی ہے

(مرثیہ مداحی اور پیروی)

## مرثیہ میں نعت:

باقر صاحب کے ایک مرثیہ سے علم کے حوالے سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدح میں نعت کے چند بند ملاحظہ ہوں:

بعد عیسیٰ کے ہوئے اور بھی دنیا میں ولی
جن کی پیشانی سے علم کے جلوے تھے جلی
یہ خصوصی جو [illegible] کے [illegible] میں جلی
پھر صحیفوں میں بھی آیا یہی نورِ ازلی

سب سے آخر میں یہ قرآنِ مبیں میں چمکا
ایک پیغمبرؐ اُمّی کی جبیں میں چمکا

کون پیغمبرؐ اُمّی ؟ وہ محمدؐ سا بشر
جس کا دل علمِ لدنّی کا چھلکتا کوثر
جس کو کعبہ سے ملا علم کا جب اک پیکر
گود میں لے کے، زباں اس کے دہن میں دے کر

نطق میں شہد فصاحت کا مزا گھول دیا
لب ذرا سے جو کھلے، علم کا در کھول دیا

جس کو استادِ ازل سے ہو تلمذ، وہ بشر
لوحِ محفوظ کی ہر لفظ پہ رکھتا ہے نظر
اس کو اس طرح کا اُمّی نہ کہیں اہلِ خبر
جس نے دنیا میں پڑھا کچھ نہ کتابیں رٹ کر

مکتبِ قدس سے جو عرش مقام آتا ہے
ایسے اُمّی پہ صحیفوں کا سلام آتا ہے

ایک بیت ہے:

اے زہے بانیِ اسلام کہ ذوالعلم ہیں یہ
وہ ابوجہل اگر ہے تو ابو العلم ہیں یہ
فطرسِ فکر ترا شہپرِ پرواز ہے علم

دینِ احمدؐ ، ترا سرمایۂ صد ناز ہے علم
اے بشر تیرے لیئے باعثِ اعزاز ہے علم
اے رسولِؐ عربی آپ کا اعجاز ہے علم
شکلِ قرآں میں جو آیا ہے وہ علم آپ کا ہے
خود جو خالق نے سکھایا ہے وہ علم آپ کا ہے

علم کے نور کا مظہر ہیں نبیؐ اور قرآں
علم کا گنج نہاں قلبِ شہِ کون و مکاں
علم کا مرکزِ اول ہے رسولِؐ دو جہاں
علم کا منبعِ اصلی ہے محمدؐ کی زباں
علم کو پیکرِ انوار میں ڈھالا جس نے
اپنی آغوش میں خود علم کو پالا جس نے

علم خالق کی امانت ہے ، امیں پیغمبرؐ
علم دولت ہے ، خزانہ ہے دلِ خیرِ بشرؐ
شجرِ علم ہے "کُن" اور محمدؐ ہیں ثمر
عالمِ علم عرض ہے تو نبیؐ ہیں جوہر
کس نے اُس کے شرفِ علم کو پہچانا ہے
جس نے نائب کو نصیری نے خدا مانا ہے

علم کی بادِ صبا آپؐ کی ہر موجِ نفس
رہروِ علم کو قدموں کی صدا بانگِ جرس
راہِ معراج میں علم آپ کا رفرف سا فرس
آپؐ کے علم کا عالم میں وہ شہرہ ہے کہ بس
علم کے مشرق و مغرب میں وہ نام آپؐ کا ہے

حامل وحی الٰہی بھی غلام آپؐ کا ہے

علم کا نور محمدؐ کی جبیں سے ہے عیاں
علم کے نور سے روشن ہے چراغ قرآں
اہرمن جس سے ہر اک دور کا لرزاں لرزاں
علم وہ نور ہے جس نور کا خالق یزداں
علم کے نور کو نور ازلی کہتے ہیں
علم کے مصدر اعلیٰ کو علی کہتے ہیں

(مرثیہ نقد شمشیر)

## مرثیہ میں منقبت:

اسی سلسلہ میں منقبت کے چند بند ملاحظہ ہوں:

وہ علی علم نے جس ذات سے عزت پائی
علم کی شمع نے جس نور سے طاقت پائی
علم نے جس کی جبیں چوم کے رفعت پائی
علم نے جس کے قدم چھو کے فضیلت پائی
اس کی مدحت میں کوئی حرف جنوں خیز لکھوں
بات لکھوں تو کوئی ولولہ انگیز لکھوں

علم اک رتبۂ عالی ہے اور اعلیٰ ہیں علی
علم اذہان کی صحت ہے، مسیحا ہیں علی
علم آباد ہے جس میں وہی دنیا ہیں علی
علم مولائی ہے اور علم کے مولا ہیں علی
آپ کے در پہ ملک شاد بھی آباد بھی ہیں
آپ جبریلؑ کے مولا بھی ہیں، استاد بھی ہیں

اوج مولاؑ کا شہنشاہِ امم سے پوچھو
علم کی شان ہے کیا، لوح و قلم سے پوچھو
علم و مولاؑ کا حشم ربطِ بہم سے پوچھو
ابن عباسؓ پکاریں گے کہ ہم سے پوچھو
علم پھیلے تو یہ قرآن جلی ہوتا ہے
ایک نقطہ میں جو سمٹے تو علیؑ ہوتا ہے

علم اک حرف جلی، علم کا دفتر ہیں علیؑ
علم اک روح ہے جس روح کا پیکر ہیں علیؑ
علم آئینہ ہے جس کا وہ سکندر ہیں علیؑ
علم اک موج ہے جس کی وہ سمندر ہیں علیؑ
اس کی گہرائی میں اتریں نہ زمانے والے
ڈوب جاتے ہیں یہاں تھاہ لگانے والے

(مرثیہ فقط شمشیر)

ایک اور مرثیہ سے جناب علیؑ کی مدح کے چند بند ملاحظہ ہوں

علیؑ، یہ نام حلاوت ہے قلب و جاں کے لیے
یہی تو قند ہے نطقِ شکر فشاں کے لیے
یہی تو شہد ہے شیرینیِ بیاں کے لیے
جبھی تو "نطق نے بوسے مری زباں کے لیے"

([illegible])

مزے ذرا بھی جو اس کے زباں پہ رہ جائیں
لبوں سے شہدِ فصاحت کی ندیاں بہہ جائیں
علیؑ کہا تو نظر اٹھی آسماں کی طرف

اٹھا کے ذروں نے سر دیکھا کہکشاں کی طرف
نگاہ مڑ گئی پھولوں کی باغباں کی طرف
ہوائے فکر چلی اپنے گلستاں کی طرف
چمن میں مدح کے غنچے علی الحساب کھلے
نظر کی رحل پہ آیات کے گلاب کھلے

علیؑ وہی ہیں ہوئے جو خدا کے گھر پیدا
کہ جیسے برج سعادت سے ہو قمر پیدا
ہوا صدف سے جو کعبہ کے یہ گہر پیدا
خدا کے جلوؤں کو انساں نے کی نظر پیدا
نگاہ والوں نے ان پر بتوں کو وار دیا
نصیریوں کو قصور نظر نے مار دیا

جری ہیں، شیر ہیں، کرار ہیں، دلاور ہیں
اسد ہیں، ببر ہیں، ضرغام ہیں، [illegible] ہیں
نبیؐ کی تیغ ہیں، تیغ نبیؐ کا [illegible] ہیں
صنم شکار ہیں، اژدر فگن ہیں، حیدر ہیں
نبیؐ سے قوت [illegible] ہیں [illegible]
خدا کا قہر ہیں [illegible]

شباب دین محمدؐ کا بانکپن ہیں علیؑ
جبین احمد مختار کی شکن ہیں علیؑ
رسول پاک کا بازوئے تیغ زن ہیں علیؑ
بتان کعبہ جو توڑے وہ بت شکن ہیں علیؑ
انھیں سے [illegible]

انھیں کے خوف سے خیبر کا در لرزتا ہے
(مرثیہ عروسِ کربلا)

## رخصت:

رخصت مرثیہ میں ایک بہت اہم مقام ہے۔ اپنے بیٹے بھائی یا بھتیجے وغیرہ کو میدان میں جانے اور مرنے کی اجازت دیتے ہوئے اعزا و اقربا کے دلوں پر کیا گزرتی ہے اور ان کا کیا حال ہوتا ہے، اس صورت حال کا پر تاثیر بیان صرف اسی طرح ممکن ہے کہ شاعر خود اپنے اوپر وہ کیفیات طاری کرلے اور اس منظر کا خود ایک حصہ بن جائے۔ یہ آسان بات نہیں ہے مگر ساحر صاحب اس منزل سے بھی بڑی کامیابیوں سے گزرے ہیں۔ ایک مرثیہ سے چھ ماہ کے بچے جناب علی اصغرؑ کی رخصت کے منظر ملاحظہ ہوں

بس اب جہاں میں تازہ مصیبت کا وقت ہے
مظلومیت کے حق میں قیامت کا وقت ہے
مولاؑ کے امتحان میں شدت کا وقت ہے
بانوؑ کے نونہال کی رخصت کا وقت ہے
اس کی خبر ہوئی ہے جو ہر طفل و پیر کو
اہلِ حرم نے گھیر لیا ہے صغیر کو

زینبؑ بلائیں لیتی ہیں، کلثومؑ ہیں نثار
کرتی ہیں بھتیجے سے کبری بھی ان کو پیار
بھائی کے واسطے جو سکینہؑ ہے بے قرار
ضد کر رہی ہے گود میں لینے کو بار بار
شاید یہ بھی سمجھتے ہیں اب جو یہ جائیں گے
پھر تو پلٹ کے دشت سے گھر میں نہ آئیں گے

خیمے کے در تک آئے جو مظلوم کربلا
اہلِ حرم میں اور بھی شورِ بکا ہوا

قرآن رکھ کے سر پہ جو رخصت انھیں کیا
اصغرؑ کو لے کے خیمہ سے نکلے شہِ ہدیٰ
جاتے ہی ان کے گھر کی فضا ہی بدل گئی
گلشن سے پھول، پھول سے خوشبو نکل گئی

رخصت ہر اک سے ہو کے جو شاہِ امم چلے
اصغرؑ زبانِ حال سے بولے کہ ہم چلے
بچے کو لے کے جیسے ہی کچھ دو قدم بڑھے
ماں کے دلِ حزیں پہ وہ تیرِ ستم چلے
قرآن کو بھی ظلم کی یاد آ کے رہ گئی
لاشِ حسنؑ بھی قبر میں تھرا کے رہ گئی

(مرثیہ قرآن اور وارثانِ قرآن)

آمد:

نہیں. بندوں کے تسلسل میں بیان میں بات کی روانی [illegible]۔

بانوؑ کے مہ لقا کی سواری جو رن میں آئی
خوشبو کی ایک لہر فضا کی گھٹن میں آئی
موجِ تبسم ایک دیارِ محن میں آئی
گویا زباں، کتابِ خدا کے دہن میں آئی

بچپن کا نور دشت کی زیبائی ہو گیا
گھر میں کھلا جو پھول وہ صحرائی ہو گیا

اصغرؑ کو لے کے گھر سے بہ حسرت حسینؑ آئے
رن میں لیے بچی ہوئی دولت حسینؑ آئے
مقتل میں لے کے آخری حجت حسینؑ آئے

ہاتھوں پہ لے کے تاجِ شہادت حسینؑ آئے

بچے کو جو عبا میں شہِ دیں چھپائے ہیں
اعدائے دیں یہ سمجھے کہ قرآن لائے ہیں

روکے قدم جو اپنے شہ خاص و عام نے
دامن عبا کا اپنی ہٹایا امام نے
منظر عجیب دیکھا یہ افواجِ شام نے
قرآں نہیں ہے، آیتِ قرآں ہے سامنے

بچہ ہے، عام بچوں کا جس میں چلن نہیں
گو تشنہ لب ہے پھر بھی جبیں پر شکن نہیں

''والشمس'' جس کی شان میں وہ روئے دلنشیں
''والفجر'' جس کو چوم لے پر نور وہ جبیں
''والیل'' جن کا حسن ہے آنکھیں وہ سرمگیں
''والعصر'' جس کی کھائے قسم وہ رخِ حسیں

دیکھا تو غیر قائلِ قرآن ہوگئے
حیران اک نظر میں مسلمان ہوگئے

(مرثیہ قرآن اور وارثانِ قرآن)

ایک مرثیہ سے جناب عونؑ و محمدؑ کی میدان میں آمد سے چند بند

ادھر یہ غل تھا کہ اب دو سوار آتے ہیں
عجب حسین، عجب گل عذار آتے ہیں
بسانِ جعفرِ ضیغم شکار آتے ہیں
علیؑ کی طرح سے مردانہ وار آتے ہیں

ہیں تیغیں قد میں تو چھوٹی مگر چمک دیکھو

زمین ہلتی ہے ، ٹاپوں کی یہ دھمک دیکھو

وہ ہٹ کے گرد نے جلوے عجب دکھائے دو
افق تھا ایک مگر چاند جگمگائے دو
اڑے دو اسپ وہ یا تیر سنسنائے دو
وہ حبس ٹوٹا ، وہ جھونکے ہوا کے آئے دو

چلے جو دشت میں جھونکے ہواؤں کے سن سے
سب اڑ گئے خس و خاشاک کی طرح رن سے

عدو یہ دیکھ کے حیراں ہوئے ہٹا جو غبار
عیاں تھا یہ کہ ہیں دو شیر مرکبوں پہ سوار
یہ غل تھا آگئے میداں میں حیدرِ کرار
کوئی پکارا کہ جعفرؑ ہیں جنگ کو تیار

غضب میں آئے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں دشت وغا میں قدم جمائے ہوئے

رکے ہوا کے یہ جھونکے جو دشت میں آکر
حواس کرنے لگا جمع شام کا لشکر
بکھر گئے تھے جو تنکوں کی طرح بانی شر
سمٹ کے آگئے پھر اپنی اپنی منزل پر

تنی تنی جو تیغیں تھیں [illegible]
وہ جوش تھا ، زرہیں تن پہ چست ہونے لگیں

(مرثیہ کعبہ سے کربلا تک)

رجز:

آمد کے بعد ایک مرثیہ سے امام حسینؑ کے رجز کے بند دیکھئے

پہنچے قریب لشکرِ اعدا جو شہسوار
دیکھا نگاہ غور سے دشمن کو ایک بار
پھر یوں کیا خطاب بصد جاہ و افتخار
اے دشمنانِ آدم و انسانیت شکار
پہلے تعارف نسبی فرضِ عین ہے
سب جانتے ہیں نام ہمارا حسینؑ ہے

ہم کون ہیں، یہ اچھی طرح جانتے ہو تم
آنکھیں تمھارے منھ پہ ہیں، پہچانتے ہو تم
اس کے پسر ہیں جس کو نبیؐ مانتے ہو تم
کلمہ اسی کے نام کا گردانتے ہو تم
دنیا میں آج نائبِ احمدؐ ہمیں تو ہیں
قولِ نبیؐ سے چوتھے محمدؐ ہمیں تو ہیں

ہم نے یہ قدر پائی ہے اقدار کے سبب
رفعت ملی بلندیٔ کردار کے سبب
تہذیبِ فکر و جذبۂ ایثار کے سبب
حق گوئی اور جرأتِ اظہار کے سبب
ثابت قدم ہیں حق پہ خدا کے کرم سے ہم
دبتے نہیں ہیں جور و جفا و ستم سے ہم

کلمہ خدا کا پڑھ کے مکرتے نہیں ہیں ہم
انسانیت سے خوں سے نکھرتے نہیں ہیں ہم
دنیا کے اقتدار پہ مرتے نہیں ہیں ہم
راہِ خدا میں موت سے ڈرتے نہیں ہیں ہم

حق کا ہوا جو ہم کو اشارا تو آئے ہیں
تم نے کہا کہ آؤ خدارا، تو آئے ہیں
اب جنگ پر تلے ہو تو اب جنگ ہی سہی
مرنا ہی چاہتے ہو تو اچھا، یہی سہی
تلوار اب اٹھاتے ہیں ناچار دیکھنا
خیبر کشا کے لعل کی پیکار دیکھنا
دھڑکن دلوں کی، خون کی رفتار دیکھنا
اب زورِ دستِ حیدرؑ کرار دیکھنا
تکمیل پائے آج جو فرضِ امامؑ ہو
وہ معجزہ دکھاؤں کہ حجت تمام ہو

(مرثیہ انسانیت اور حسینیت)

## ساقی نامہ:

ساحر صاحب نے بعض مرثیوں میں ساقی نامے بھی کہے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو:

خدا کا شکر کہ پھر موسم بہار آیا
نبیؐ کے گلشنِ بے خار پر نکھار آیا
اب اپنی خوبیِ قسمت کا اعتبار آیا
کہ میکشانِ تولاّ کو بھی قرار آیا
پرے جمائے ہیں، پہلو ملا کے بیٹھے ہیں
سب انتظار میں جامِ و[illegible] سے بیٹھے ہیں
پلا دے جام تولاّ وہ آج اے ساقی
کہ قطرہ بھر بھی نہ اب تشنگی رہے باقی

ہو ختم آج سے جام و سبو کی ناچاقی
تری شراب، ترا میکدہ ہے آفاقی
یہاں تو آ کے خدا کے خلیل پیتے ہیں
یہاں سے مانگ کے خود جبرئیل پیتے ہیں
ترے نثار شراب طہور دے ساقی
خمار جس سے مٹے وہ سرور دے ساقی
ولا کا نشہ، ثنا کا شعور دے ساقی
تجھے قسم ہے مجھے تو ضرور دے ساقی
تری ثنا میں زباں اس سے دھو کے لکھوں گا
اسی میں اپنے قلم کو ڈبو کے لکھوں گا

ایک اور مرثیہ سے ساقی نامہ کے تین بند

ساقیا دے آج وہ جام تولائے حسینؑ
جس میں دھو دھو کر چھپیں نقش کف پائے حسینؑ
پی کے جو مدحت کرے گا مجھ سا شیدائے حسینؑ
میکدہ بن جائے گا طور تجلائے حسینؑ
ہاتھ منبر پر جو اک جام ولا آ جائے گا
مرثیہ میں بھی قصیدہ کا مزا آ جائے گا

ہاں پلا، جو تیرے ساغر میں چھلکتی ہے وہ مے
دل کے خم سے جوش کھا کر جو ابلتی ہے وہ مے
کوزۂ چشم تمنا میں جو ڈھلتی ہے وہ مے
محتسب کو جس کی بوئے خوش بھی کھلتی ہے وہ مے

دے سرورِ بادۂ غم جوشِ ایمانی کے ساتھ
دل کا خوں آنکھوں سے ٹپکے اشک افشانی کے ساتھ

ساقیا دے مجھ کو دُردِ جامِ عرفانِ حسینؑ
آنکھ میں دل کھنچ کے پی لوں بہ فیضانِ حسینؑ
ڈوب جاؤں جب میں اس میں ہوکے قربانِ حسینؑ
پھر حدِ امکاں میں لکھوں مدحِ شایانِ حسینؑ

پی کے اک اک گھونٹ پر ان کی صفت کرتا رہوں
میں حسینؑ ابنِ علیؑ کی منقبت لکھتا رہوں

(مرثیہ نردازِ حسینؑ کی تحصیل اور اسلاف)

ایک اور مرثیہ سے ساقی نامہ کے دو بند ملاحظہ ہوں

بس اب وہ ذکر چھڑے دل کہے شراب شراب
ہوں تشنہ لب تو دکھاتا ہے ہر سراب شراب
ملے جو ساقیِ کوثر سے تو ہر آب شراب
ہٹا لے پیرِ مغاں اپنی یہ خراب شراب

پیوں گا میں تو نجف کی زمین کے ساتھ
چھنے گی آج مصلے پہ جبرئیلؑ کے ساتھ

یہ وہ شراب ہے صہبائے الفتِ حیدرؑ
لیے جو بیٹھا ہے رضوان بابِ جنت پر
کیے ہیں اس سے فرشتوں نے اپنے دامن تر
یہ مجھ سے کہتا ہے واعظ کہ اس سے توبہ کر!

مئے ولائے علیؑ سے عدو کرے توبہ
میں اس شراب سے توبہ کروں، ارے توبہ

(مرثیہ [illegible])

گویا پرند اڑ گئے پنجروں کو توڑ کے
(مرثیہ واپسی)

خیبر میں جب یہ میان سے نکلی پئے سفر
پہلے پڑاؤ کے لیئے مرحب کی تھی سپر
پھر خود و فرق و گردن و سینہ، دل و جگر
پھر زین و زیر بند کے ساتھ اسپ کی کمر
یہ اسپ پر رکی نہ کسی فیل پر رکی
اب جو چلی تو شہپرِ جبریلؑ پر رکی
(مرثیہ سفر)

جب یوں کیا کلام امامِ انامؑ نے
حملہ کیا حضورؑ پہ افواجِ شام نے
کھینچی کمر سے تیغ شہِ تشنہ کامؑ نے
اب کس میں ہے یہ تاب کے آجائے سامنے
سن کر ملوکیت یہ خبر، تھرتھرا گئی
مظلومیت کے ہاتھ میں تلوار آ گئی

دستِ امامِ وقت میں جو ذوالفقار ہے
انسانیت نواز و عدالت شعار ہے
حق بیں ہے، حق پناہ ہے، باطل شکار ہے
اس پر خدا کے دین کا دار و مدار ہے
آئی ہے حفظِ حق کو شہِ انس و جاں کے پاس
رہتی ہے رات دن یہ امامِ زماں کے پاس
(مرثیہ انسانیت اور حسینیت)

نیام میں تھی تو مشغول یہ درود میں تھی

شوکت لشکر اسلام تھا اس کا دم خم
یہی تلوار تھی تسکین دل اہل حرم
اک تحفظ کا سا احساس تھا سب کو ہر دم
اس کے دم سے تھا قوی قلب جناب زینب
اسی تلوار کا سایہ تھا نقاب زینب

([illegible])

## حضرت علی اکبرؑ کی تلوار

تلوار شیر کی تھی کہ قتال دہر تھی
اس کو چھوؤ تو آگ تھی، چکھو تو زہر تھی
دریائے خوں کی موج تھی طوفاں کی لہر تھی
بھونچال تھی، بلا تھی، قیامت تھی، قہر تھی
کھنچ کر مقابلہ پہ جو باطل کے تن گئی
چین جبین حیدر کرار بن گئی

## جناب عونؑ و محمدؑ کی تلواریں

یہ کہہ کے دونوں نے کھینچے جو تیغے یک بار
صدا وہ کھنچنے میں نکلی کہ سانپ کی پھنکار
بڑھیں جو ناگنیں لہرا کے دو سوئے کفار
فرار کر گیا اک اک عدو کے دل سے قرار
عدو کو یاد جو اژدر فگن کی آئی تھی

## حضرتِ حرؑ کی تلوار

امامِ عدل پہ دیکھا جو یوں فدا اس کو
خدا نے بخش دیا عہدۂ قضا اس کو
جو کرتے دیکھتی تھی ٹھیک فیصلہ اس کو
تو داد دیتی تھی خود تیغِ لافتیٰ اس کو

جب اس کی مدح حسامِ امامؑ کرتی تھی
یہ ذوالفقار کو جھک کر سلام کرتی تھی

(مرثیہ فیصلہ)

مثال میں درج کیے گئے تلوار کی تعریف کے مندرجہ بالا بندوں سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ساحرؔ نے کہیں تو متقدمین کے انداز میں تلوار کی تعریف کی ہے مگر وہاں بھی نئی نئی تشبیہیں استعارے اور نئے مضامین پیدا کیے ہیں اور کہیں جدید انداز سے تلوار کی تعریف کرکے عصرِ حاضر کے رجحانات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ میرے خیال کی تائید میں درجِ ذیل مصرعے دوبارہ ملاحظہ کیجیے۔ پہلے قدیم انداز میں نئی تشبیہیں اور مضامین

کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی
چینِ جبینِ حیدرِ کرار بن گئی

(حضرت علی اکبرؑ کی تلوار)

فلک کی گردشیں کیا انقلاب لاتی ہیں
زمیں سے بجلیاں اب آسماں پہ آتی ہیں

(جناب عون و محمد کی تلوار)

مزاج میں تھی بڑی ہٹ، بلا کی تھی ضد بس
یہ اس کی عمر تھی یا ذوالفقار کا بچپن

(جناب قاسمؑ کی تلوار)

جیسا سوار ویسا ہی رہوارِ خوش خصال
سرعت کو اس کی پائے، تخیل کی کیا مجال
اسپِ فلک نورد کی رفتار کی مثال
رف رف، براق، برق، تجلی، نظر، خیال
اک جست میں زمیں سے خلا تک سفر کرے
اک ثانیہ میں چاند کی منزل کو سر کرے

(مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک)

اس بند کی بیت عصر حاضر میں چاند کی تسخیر کے حوالے سے بالکل نئی بات ہے۔ رشید امروہوی مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ یہ بالکل عہد جدید کی بات ہے اور خلائی سفر کے دور میں ہی کہی جا سکتی تھی۔ ایک بند اور ملاحظہ کیجیے

رہ رفتاری سے اس مرکب کی جلتی تھی ہوا!
ادھر تیزی پر بھی اس سے دب کے چلتی تھی ہوا!
اس سے آگے جب نکلنے کو مچلتی تھی ہوا!
ٹھوکریں کھاتی تھی، گرتی تھی، سنبھلتی تھی ہوا!
وہ ہوا باندھی فرس نے رن میں اپنی چال کی
ایک کر دیں سرحدیں ماضی و استقبال کی

(مرثیہ کردار حسینؑ کی تشکیل اور اسلاف)

## مصائب:

اب مصائب کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل بندوں میں امام حسینؑ کی شہادت کے بعد شاعر ان کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے۔ ان میں بین نظم نہیں کیے گئے ہیں مگر اثر آفرینی کے اعتبار سے بے حد مبکی اور گریہ خیز بند ہیں

اے سرِ نوکِ سناں مظلوم کے سر السلام

اے محمدؐ کے پسر اے جانِ حیدرؑ السلام
عظمتِ اسلاف کے مہرِ منور السلام
کہہ رہی ہے روحِ اسمٰعیل جھک کر اسلام
جس نے زیرِ تیغ بھی سجدہ کیا اس پر سلام
جس نے مقتل کو مصلا کردیا اس پر سلام

وارثِ آدمؑ ، تجھے کل آدمیت کا سلام
وارثِ کل انبیاؑ ، تجھ کو نبوت کا سلام
وارثِ پیغمبرِؐ اسلام ، امت کا سلام
والیِ زین العباؑ ، روحِ عبادت کا سلام
سجدہ و سجدہ گزارِ ارضِ مقتل السلام
سلام اے بستۂ جورِ مسلسل السلام

کارواں سالارِ حق سجادِؑ مضطر کا سلام
کشتۂ غم کشتگانِ تیغ و خنجر کا سلام
حاملِ شانِ حرم جلتے ہوئے گھر کا سلام
غیرتِ اسلاف ، زینبؑ کے کھلے سر کا سلام
ظلم کے دربار سے اہلِ مدینہ کا سلام
شام کے زندان سے قبرِ سکینہؑ کا سلام

(کردارِ حسینؑ کی تشکیل اور اسلاف)

جنابِ قاسمؑ کی شہادت پر مصائب کے یہ دو بند اپنی اثر آفرینی میں بے مثال ہیں

پکاری مادرِ قاسمؑ ، خدا کا شکر کہ آج
حسنؑ کے شیر نے رکھ لی ہمارے شیر کی لاج
بتاؤ جلد ، ہے کیسا مرے جری کا مزاج

دعائیں دے گی تمھیں تا حیات یہ محتاج
کہاں ہے چاند مرا کچھ تو اب بتاؤ مجھے
خدا کے واسطے صورت تو اب دکھاؤ مجھے
یہ کس نے آمد قاسمؑ کی مجھ کو دی تھی خبر
کہاں ہے وہ مرا دولھا، وہ میرا لختِ جگر
یہ کیا ہوا، مجھے آتا نہیں ہے کچھ بھی نظر
تڑپ کے بولیں یہ بھاوج سے زینبؑ مضطر
وہ جو عبا میں تن پاش پاش ہے بھابھی
وہی تو آپ کے بیٹے کی لاش ہے بھابھی

(عروسِ کربلا)

کربلا سے واپسی پر جناب زینبؑ قبر رسولؐ اور مرقد زہراؑ پر آ کر فریاد کر رہی ہیں۔

فریاد کر رہی تھیں یہ دونوں کی قبر پر
آئے ہیں چھٹ کے قید سے ہم سوختہ جگر
آتے ہیں جب پلٹ کے مسافر خود اپنے گھر
تحفے بھی ساتھ لاتے ہیں اپنی بساط بھر
نانا، میں خالی ہاتھ سفر سے کب آئی ہوں
اماں، یہ تحفے دیکھیے کیا کیا میں لائی ہوں
یہ دیکھیے، چھنی تھی مرے سر سے جو ردا
بازو پہ نیل، پشت پہ دُروں کی ابتلا
دامن پہ خاکِ قبرِ سکینہؑ کی جا بجا
صغراؑ کے ننھے بھائی کا جھولا جلا ہوا
نانا، یہ خوں بھرا ہوا کُرتا قبول ہو

## اماں ، تمھیں حسینؑ کا پرسہ قبول ہو

جناب عونؑ و محمدؑ کی شہادت کے بعد مصائب کے چار بند جن میں جناب زینبؑ کے صبر و استقلال کی تصویر کشی بھی ہے اور دلخراش مصائب بھی

جب آئے خیمے میں لاشے تو اک قیامت تھی
تمام اہلِ حرم میں بپا تھی سینہ زنی
مگر جو ماں کا تھا عالم وہ کیا کہے کوئی
جنابِ زینبِؑ کبریٰ نے آہ بھی تو نہ کی
خدا کا شکر کیا سر جھکا کے سجدے میں
تھے اشک آنکھوں میں اور سر خدا کے سجدے میں

جب آئے پرسہ کو زینبؑ کے پاس اہلِ حرم
ہوا کچھ اور بھی شدت کا گریہ و ماتم
کہا یہ ثانیِ زہراؑ نے ضبط کر کے الم
نہ اتنا غم کرو تم سب ، مجھے نہیں کوئی غم
بلا حسینؑ سے رد ہوگئی ، الم کیسا
یہ میرے بھائی پہ صدقے ہوئے ہیں ، غم کیسا

کہا حسینؑ سے پھر ، آپ خوب ہیں آگاہ
بتائیں کس طرح دونوں نے جنگ کی ، واللہ
کہا حسینؑ نے ، کیا خوب یہ لڑے ہیں ، واہ
عدو بھی دیکھ کے کہتے تھے ، اے جزاک اللہ
یہ دونوں جعفرؑ و حیدرؑ کے شیر تھے ، زینبؑ
تمھارے لعل بہت ہی دلیر تھے ، زینبؑ

یہ سن کے ماں نے کیئے پھر سے شکر کے سجدے
پھر آ کے بیٹوں کے سر اپنی گود میں رکھے
جبینیں چوم کے کہنے لگیں یہ خوش ہو کے
کہاں یہ عمر اور اس پر وغا کے یہ چرچے
خموش کیوں ہو، اٹھو، فخر سے کلام کرو
امامؑ وقت نے تعریف کی، سلام کرو

(کعبہ سے کربلا تک)

حضرت عباسؑ کی شہادت کے بعد بیان مصائب۔ آخری بند کی بیت تو قیامت ہے:

دیکھو، جلتے ہوئے خیمہ میں وہ بیمار کے پاس
پوچھنے آئی ہیں زینبؑ یہ بصد حسرت و یاس
اے مرے لعل، امام دو جہاں، شرع اساس
فقہ کی رو سے ہے کیا حکم کہ ہے وقت ہراس
پردہ رکھنے کو انھیں خیموں میں جل جائیں ہم
یا کھلے سر یونہی بلوہ میں نکل جائیں ہم

لو وہ خیمہ سے نکل آئے سب از حکم امامؑ
بے ردا زینبؑ و کلثومؑ ہیں اور مجمع عام
اس مصیبت سے ہے آفاق میں ہر سو کہرام
کوئی دیتا ہے صدا لے کے یہ عباسؑ کا نام
آگ پانی کو لگاؤ، یہاں آؤ عباسؑ
شمر آتا ہے، سکینہؑ کو بچاؤ عباسؑ

کیا کرے آہ جو فریاد پہ جا بھی نہ سکے

تیغ کو دستِ بریدہ سے اٹھا بھی نہ سکے
پنجۂ ظلم سے بچی کو چھڑا بھی نہ سکے
سیلیوں سے جو سکینہؑ کو بچا بھی نہ سکے
تھی عجب کرب میں اس پیکرِ احساس کی لاش
ہر طمانچہ پہ تڑپ جاتی تھی [illegible] کی لاش

(احمد شمیم)

جنابِ فاطمہ زہراؑ کی وفات کے بعد مصائب کا بیان

اٹھ تو گئیں جہاں سے پدر کی یہ سوگوار
مرنے پہ بھی اٹھائیں گی لیکن ستم ہزار
جنت میں بھی ملے گا نہ دم بھر انھیں قرار
لاشِ علیؑ پہ خلد سے آئیں گی اشک بار
ٹکڑے دلِ حسنؑ کے چنیں گی یہ طشت سے
بکھرا ہوا حسینؑ سمیٹیں گی دشت سے

دنیا سے خلد کا یہ سفر آخری نہیں
آئیں گی کربلا میں یہ اک بار بالیقیں
بالوں سے جھاڑ کے یہ دشت کی زمیں
بیٹے کی قتل گاہ سجائیں گی خود وہیں
ان کی بھی مہر ہے جو سرِ محضرِ حسینؑ
یہ وقتِ ذبح گود میں لیں گی سرِ حسینؑ

چن چن کے قتل گاہ سے کانٹے ہٹائیں گی
مقتل سے اپنے لعل کا لاشہ اٹھائیں گی
کلثومؑ قید ہوں گی تو ہمت بندھائیں گی

زینبؑ کو راہِ شام میں ڈھارس دلائیں گی
اس کو اماں ملے گی انھیں کی پناہ میں
ناقہ سے گر پڑے گی سکینہؑ جو راہ میں
ساحرؔ جہاں بھی ہو گی عزائے شہِ امم
اس مجلسِ حسینؑ میں ہوں گی شریکِ غم
آنسو گریں گے آنکھ سے شہ پر جو دم بدم
رومال میں سمیٹیں گی ان سب کو یہ بہم
لوگو، یہاں بھی خلد سے تشریف لائی ہیں
پرسہ تو دو، حسینؑ کے پُرسے کو آئی ہیں

(الزہرا)

مصائب کے یہ سارے بند جو درج کیے گئے ہیں ان سے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ساحرؔ صاحب اس طرح کے بین نظم نہیں کرتے جن سے شہدائے ورثاؑ کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہوں جو ان کے وقار کے منافی اور صبر و شکر کی منزل سے گرے ہوئے ہوں یا کسی طرح ان سے خدا سے شکوہ کا پہلو نکلتا ہو جو حقیقتاً منافیِ صبر ہوتا ہے، ورنہ مصائب پر گریہ تو انسانی فطرت ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبروں نے بھی مصائب پر گریہ کیا ہے۔ گریۂ یعقوبؑ مشہور ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔

## ساحرؔ اور شخصی مرثیہ:

ساحرؔ صاحب نے شخصی مرثیے بھی کہے ہیں۔ ایک مرثیہ جو "فقہ و شمشیر" کے موضوع پر ہے اس میں آقائے شریعت صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب اعلی اللہ مقامہ کے اوصاف بھی نظم کیے اور ان کے انتقال پر حزن و ملال کے بند بھی کہے۔ مگر اس میں اس سلسلہ کے صرف گیارہ بند ہیں۔ یہ مرثیہ انھوں نے لکھنؤ میں آقائے شریعت کی پہلی برسی

ے موقع پر پیش کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ اس مرثیہ میں آقائے خمینی ـــ ذ ... میں
ی چند بند شامل ہیں۔

ان کا دوسرا مرثیہ ''علم اور علما'' ہے جس کا ذیلی عنوان ''رثا سید العلما'' ہے۔ یہ
یہ انھوں نے سید العلما جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ عرف مولوی نقن صاحب کے
ل پر کہا۔ یہ ایک بھرپور شخصی مرثیہ ہے۔ انھوں نے لکھنؤ میں یہ مرثیہ سید العلما اعلی اللہ
مہ کی پہلی برسی پر پیش کیا۔ مجلس میں ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر آفاق حسین اور دیگر علمی وادبی
میتوں نے شرکت کی۔ مرثیہ بہت مقبول ہوا۔ ڈاکٹر شارب ردولوی (جواہر لعل یونی
ی دہلی) نے ایک تبصرہ میں اس مرثیہ کو شخصی مرثیوں میں اضافہ قرار دیا ہے۔ اور ڈاکٹر
سعود نے بھی اپنے مختصر تبصرہ میں جو مطبوعہ مرثیہ کے ساتھ شامل ہے اس کی تعریف کی
ہے۔

## سلام نگاری:

اس کی موجودہ شکل لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کی ساختہ ہے، جس کا ہر شعر غزل کے شعر کی
ح مستقل ہے اور دوسرے شعر سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ مضامین کے لحاظ سے بھی کسی ایک
ممون کی پابندی نہیں ہے بلکہ پند وموعظت، اخلاق، تعلی، غم انگیز مضامین اور بعض میں
غزل تک موجود ہے۔ میر انیس کا سلام:

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

حظہ فرمایئے۔ اس میں آپ کو مضامین کا تنوع نظر آئے گا۔ جناب ساجد کے سلام بھی اسی
ح کے ہیں جن میں اساتذۂ لکھنؤ کا تتبع کیا گیا ہے جو حسن کلام اور زور بیان میں اسی حد
ک بلند پایہ ہیں جتنا ان کا اور کلام ہے۔ مثال میں چند شعر ملاحظہ کیجیے

نظر میں نور جو آنکھوں پہ ہر حسینؑ کا ہے
ہماری آنکھ کی پتلی میں گھر حسینؑ کا ہے

یہ حریت کا جو چرچا ہے آج دنیا میں
بشر کی فکر پہ یہ سب اثر حسینؑ کا ہے
کہے جو حاکمِ جابر کے منھ پہ کلمۂ حق
کسی بھی دین کا ہو، وہ مگر حسینؑ کا ہے
خدا کا ڈر بھی نہیں ہے یزید بے دیں کو
جو ڈر کسی کا اسے ہے تو ڈر حسینؑ کا ہے
تم کو جنگ پہ راضی ہو کیوں سپاہِ خدا
ابھی تو ایک سپاہی اُدھر حسینؑ کا ہے
نہ دیکھو ساحرؔ بے علم کو حقارت سے
وہ بے ہنر سہی شاعر مگر حسینؑ کا ہے

☆☆☆

ظلم کی فطرت کبھی درد آشنا ہوتی نہیں
آدمیت ظلمِ ظالم سے فنا ہوتی نہیں
زندگی صبر و رضا کے فرش پر خنجر تلے
صرف اک کروٹ بدلتی ہے، فنا ہوتی نہیں

☆☆☆

تھا علومِ آلِ پیغمبرؐ کا سرچشمہ کبھی
اب تو دنیا نے بدل ڈالا ہے منبر کا مزاج
مسکراہٹ دیکھ کر اصغرؑ کی، روئے سنگ دل
یوں بدل دیتے ہیں آئینے بھی پتھر کا مزاج
کس قدر سوکھی ہوئی ہیں حلق سرورؑ کی رگیں
ورنہ یوں رک رک کے چلتا کب ہے خنجر کا مزاج

اے خدا مولاؑ کے صدقہ میں ہو ساحرؔ کو عطا
حرّ کی قسمت، جونؑ کی سیرت، ابوذرؑ کا مزاج

☆☆☆

سانس لینا تک یزیدیت کو اب دشوار ہے
پاؤں رکھے اس کے سینہ پر کھڑی ہے کربلا
یہ نہ ہوتی گر تو اردو شاعری بے جان تھی
جانِ اردو، آبروئے شاعری ہے کربلا

☆☆☆

ہو فقط نعتِ نبیؐ مدحِ علیؑ، ذکرِ حسینؑ
یا خدا جتنی مری سانسوں کی مدت اور ہے

☆☆☆

کس قدر شوق ہے مرنے کا علی اکبرؑ کو
لوگ اس عمر میں جینے کی دعا مانگتے ہیں

☆☆☆

کیا کریں گے اتنا سونا جمع کر کے اہلِ زر
یہ وہ سکہ ہی نہیں ہے جو سرِ محشر چلے
کہہ رہا ہے یہ زمیں والوں سے جھک کر آسماں
جس قدر بھی جو بڑا ہو اس قدر جھک کر چلے
جب علیؑ نے بے نیازی سے اسے ٹھکرا دیا
ہم بھی اس دنیا کو ساحرؔ مار کر ٹھوکر چلے

☆☆☆

میری نگاہِ شوق میں آٹھوں پہر حسینؑ ہے

حدِ نظر ہے کربلا ، مدِ نظر حسینؑ ہے
خالقِ کائنات وہ ، بندۂ رب ہے یہ ، مگر
ہے نہ کوئی دگر خدا اور نہ دگر حسینؑ ہے
علم کا شہر ہیں نبیؐ ، صلح و جہاد کا علیؑ
شہر کا ایک در حسنؑ ، دوسرا در حسینؑ ہے
سمتِ سفر بھی ٹھیک ہے ، عزمِ سفر بھی معتبر
حُرؑ کا سفر ہے سوئے حق ، حدِ سفر حسینؑ ہے
اس کے شعور پر درود ، اس کی نگاہ کو سلام
کتنی عظیم ہے وہ ماں جس کا پسر حسینؑ ہے

☆☆☆

اذنِ شہؑ سے گئے حُرؑ خلد میں سب سے پہلے
یہ تو بچپن کے رفیقوں سے مقدم نکلے
زندگی اس کے سوا اور بھی ہے کیا اے حُرؑ
زانوئے شہؑ پہ ہو سر اور ترا دم نکلے
زندگی کو ہے فنا ، سچ ہے یہ ساحرؔ لیکن
میں تو جی اٹھوں جو منبر پہ مرا دم نکلے

☆☆☆

ذکرِ شبیرؑ کو کاغذ پہ قلم رکھا ہے
آسمانوں کی بلندی پہ قدم رکھا ہے
اس کے محبوب کی جب بن گئی تصویر اکبرؑ
تب کہیں جا کے مصور نے قلم رکھا ہے
پہلے عباسؑ نے ہر رخ سے وفا کو پرکھا

پھر کہیں گھاٹ پہ دریا کے قدم رکھا ہے

## ساحر کی قصیدہ نگاری:

تمام اصناف سخن میں قصیدہ سب سے مشکل صنف ہے۔ اساتذہ نے جو اس کے حدود و قیود معین کیے ہیں انھوں نے اس کو بڑا سنگلاخ بنا دیا ہے۔ تخئیل کی بلندی، مضمون آفرینی، تشبیہات و استعارات کے ساتھ جدید الفاظ میں لکھنا اس صنف کا تقاضہ ہے اور اس کا نباہنا بہت ہی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں بھی ایسے قصیدہ گو صرف چار پیدا ہوئے ہیں جو صحیح معنوں میں قصیدہ کہہ سکے ہیں۔ ان میں انوری و خاقانی، عرفی و قاآنی کے قصائد سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ اردو میں تو کوئی بھی انوری و خاقانی جیسا قصیدہ نہ کہہ سکا۔ منشی اسمعیل حسین منیر نے مولوی فضل حق خیر آبادی کی فرمائش سے ایک قصیدہ کہا جو اردو میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے مگر ایک ہی قصیدہ ہے۔ اس کے علاوہ سودا، ذوق اور غالب دہلی میں اور لکھنؤ میں منشی اسمعیل حسین منیر [illegible] صفی، عزیز اور محشر نے قصیدہ گوئی کا جو حق ادا کیا ہے وہ کوئی نہ کر سکا۔ ان کے بعد جو قصیدے کہے گئے ہیں تو جناب ساحر نے کہے ہیں، لیکن ان کے بعد کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے قصیدے ان شعراء سے کمتر ہیں بعد ان کی عمر سے ہیں۔ بعد کی لفظ میں نے زمانے کے اعتبار سے استعمال کی۔ میں نے ساحر صاحب کے مجموعہ قصائد ''صحیفۂ مدحت'' کی اشاعت پر قطعۂ تاریخ کہا تھا جو کتاب میں شامل ہے۔ میں نے اس میں ساحر صاحب کی قصیدہ گوئی پر مختصر منظوم تبصرہ میں ان کی بعض خوبیوں کا ذکر کیا ہے جس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ قطعہ درج ذیل ہے

کمال فن سخن ہیں قصائدِ ساحر
جزالت ان میں ہے سودا کی، ذوق کی شوکت
منیر کی ہے سلاست، زبان محشر کی
صفی کا اوجِ مضامیں، عزیز کی جدت
نظیر ان کا نہیں کوئی دورِ حاضر میں

خدا کی دین ہے ان کے کلام کی رفعت
لکھی یہ شمس نے تاریخ طبع برجستہ
"ہے گلِ ریاضِ ہنر کا صحیفۂ مدحت"

۱۹۹۷ء

ساحرؔ لکھنوی کے قصیدے اتنے بلند پایہ ہیں کہ طلوعِ افکار میں عنبر چغتائی صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ساحرؔ صاحب کے "شہر آشوب" مطبوعہ طلوعِ افکار نے جو ایک قصیدہ کی تشبیب ہے، ذوقؔ کی یاد تازہ کر دی۔ خود جناب حسین انجم ایڈیٹر "طلوعِ افکار" نے یہ لکھا تھا کہ بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ ان کے قصیدے عزیزؔ لکھنوی کے قصیدوں سے ٹکر لیتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر حسین جعفر حلیم صاحب نے ساحرؔ صاحب کے قصیدوں پر جو تبصرہ کیا ہے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے

"ساحرؔ صاحب کے قصیدوں کے اکثر و بیشتر اشعار پرشکوہ الفاظ اور ان کی دلکش ترکیبوں سے آراستہ، حشو و زوائد سے پاک، برمحل پر لطف صنائع، بدائع سے مرصع، برجستہ محاوروں اور بے ساختہ روزمرہ کے استعمال سے بامزہ، جابجا تلمیحات اور نادر تشبیہات و استعارات سے مزین، ساتھ ہی شستہ و شائستہ زبان کی شیرینی و چاشنی باعث لطف و لذت سخن۔ پھر ایسے میں کیوں نہ یاد آنے لگیں میرزا سودا ایسے استادانِ سخن اور عزیزؔ لکھنوی جیسے صاحبانِ فن"۔

میں ان اقوال کی تائید میں ساحرؔ صاحب کے مختلف قصیدوں سے قصائد کے اہم جز کا انتخاب ذیل میں پیش کرتا ہوں جس کے ملاحظہ سے آپ کو بھی ان اقوال سے اتفاق ہوگا مگر پہلے یہاں یہ بات لکھنا ضروری ہے کہ قصیدوں پر عموماً اور اب ساحرؔ صاحب کے قصیدوں پر خصوصاً یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ان کی زبان قدیم اور بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس اعتراض کا سبب بظاہر صرف یہی ہے کہ آج کل علم کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ لوگ نہ

زبان سے واقف ہیں نہ اصنافِ سخن کے مزاج سے آشنا۔ حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ کے مزاج کا بنیادی تقاضہ جزالت ہے جو پرشکوہ عربی فارسی الفاظ و تراکیب ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بغیر قصیدہ قصیدہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے قصیدے ہر دور میں صرف صاحبانِ ذوق اور اہلِ علم کے لیے دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔ جن کی علمی سطح پست ہو ان کے لیے یقیناً قصیدہ کا سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ دیکھا جائے تو ساحر صاحب کے قصیدوں کی زبان متقدمین کے مقابلہ میں بہت آسان ہے۔

یہ بات کہنا بھی ضروری ہے کہ ساحر لکھنوی ابتداً غزل گوئی سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر قصیدہ و مرثیہ وغیرہ کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی۔ اس کو وہ اپنے لیے ایک طرح سے اعزاز سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ مطلع اسی فکر کا آئینہ دار ہے

آئے ہم سوئے غزل، توفیقِ مدحت مل گئی
آگ لینے آئے گویا اور نبوت مل گئی

قصیدہ کے کم از کم اشعار کی تعداد کے معاملے میں اختلاف ہے۔ صاحبِ منتخب اللغات کے نزدیک کم سے کم تین اشعار پر بھی قصیدہ کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تین اشعار میں قصیدہ کے تمام اجزائے ترکیبی کو برتا نہیں جا سکتا۔ خطابیہ قصیدہ کی صورت میں صرف مدح میں تین اشعار کہے جا سکتے ہیں مگر ساحر نے ان لوگوں کو جواب دینے کے لیے جو ان کے قصیدوں پر طولانی ہونے کا اعتراض کرتے ہیں صرف تین اشعار کا ایک مشبب قصیدہ کہا جس میں تشبیب بھی ہے، گریز بھی اور مدح بھی۔ ان کا خیال ہے کہ اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ کا یہ مختصر ترین مگر مکمل قصیدہ ہے۔ یہ خیال بظاہر غلط بھی نہیں ہے۔ قصیدہ ملاحظہ کیجیے جو حضرت عباسؑ کی مدح میں ہے

چمن کے لب پہ جو فصلِ بہاراں کی دعا آئی
تو اک غنچے نے لی اک شاخ کی گودی میں انگڑائی
اسی مطلع کی ضو سے مطلعِ نو ہو گیا روشن

اسی تشبیب نے کی ذوقِ مدحت کی پذیرائی
جو تاریخ وفا خونِ بنی ہاشم نے دہرائی
"ابوطالبؑ نے لی عباسؑ کے پیکر میں انگڑائی"

(مصرعِ طرح)

تین اشعار کا ایک اور مکمل قصیدہ:

دعا بلب تھے جو بادہ کشانِ خوش تدبیر
تو دشتِ غم کو چلا جھوم کر اک ابر مطیر
دکھائی جو اسی تشبیب نے رہِ مدحت
ملا یہ مطلعِ ثانی بہ فیضِ رب قدیر
ہوئے ہیں آج سے مولائے کل جناب امیرؑ
مبارک اہلِ تولا کو جشنِ عید غدیر

تین تین اشعار کے مندرجہ بالا مکمل مشبب قصیدے لکھ کر جناب ساحر نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ مختصر قصیدہ کہنا چاہیں تو ان کے لیئے کچھ مشکل نہیں ہے، مگر قصیدہ وہ صنف سخن ہے جس کے سارے اجزائے ترکیبی کو برتنے اور طبیعت کا زور دکھانے کے لیئے قصیدے کو چند اشعار میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ سودا سے عزیز اور عشقی تک سارے اساتذہ نے اوسطاً سو سے ڈیڑھ سو تک اشعار کے قصیدے لکھے ہیں۔ قصیدہ نگار کی طبیعت گویا یہ تقاضہ کرتی ہے کہ:

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیئے

جناب ساحر کے قصیدے عموماً پچاس ساٹھ اشعار سے لے کر ڈیڑھ سو اشعار تک کے ہوتے ہیں۔ قصیدہ گوئی میں ان کا رنگِ سخن قدیم ہے مگر ان کے موضوعات جدید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نزاکتِ خیال اور جدتِ مضامین ان کا امتیازِ خاص ہے۔ ان کی زبان قصیدہ کی کلاسیکی زبان ہے لیکن تشبیہات استعارات، تعبیریں نئی ہیں۔ مضمون آفرینی میں

بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ انھوں نے اساتذہ کے مضامین دہرائے نہیں ہیں بلکہ اپنی ذاتی ذہنی اختراع اور فکر انگیزی سے نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں۔ اب چند قصیدوں سے مختلف مقامات سے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کراچی کے خونیں واقعات سے متعلق ایک قصیدہ کی تشبیب "شہر آشوب" ہے اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

عجب دکھائی ہے اب کی بہار نے تاثیر
ہوئے ہیں ہوش و خرد وحشت و جنوں کے اسیر

بڑھی ہوئی ہے مزاجوں میں اس قدر حدت
کہ جیسے آگ سے اٹھا ہو آدمی کا خمیر

یہ ڈر ہے لکھوں جو شعلہ مزاجی انساں
ورق میں آگ لگا دے نہ گرمی تحریر

گریں قلم سے ٹپک کر شرر جو کاغذ پر
وہ بن کے نقطے بنا دیں سریر کو بھی شریر

ہے شاہدانِ چمن کا مزاج یوں برہم
نظر ہے تیر تو ابرو کھنچی ہوئی شمشیر

گھلی ہوئی ہیں مزاجوں میں تلخیاں اتنی
کہ زہر ہو گئے قند و نبات و شکر و شیر

لہو لہو ہیں نہالانِ سبز پوشِ چمن
مثالِ سرخ لباسانِ خطۂ کشمیر

ہیں شاخِ گل میں یہ کانٹے تنے ہوئے، جیسے
گلوئے غنچہ و دستِ شجر میں ظلم کے تیر

پہن لیے ہیں انھوں نے لباس شعلوں کے

گراں تھی جن کو کبھی گرمیِ لباسِ حریر
بدن سے ان کے بھی جاری ہیں خوں کے فوارے
کہ جن کی زیست میں پھوٹی نہ تھی کبھی نکسیر
لبِ چنار پہ "یا نارُ کونی بردا" ہے
ہے برگِ گل پہ رگِ گل سے "الاماں" تحریر

یہ مختصر سا اقتباس تھا۔

ایک قصیدہ کی تشبیب گرانی کے موضوع پر ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ کیجئے

لگی ہے آگ وہ بازار میں کہ اب پیہم
زباں پہ ہے "وقنا ربنا عذاب النار"
مجال کیا کہ کسی چیز کو لگائیں ہاتھ
نگاہِ شوق ہے اور دور دور سے دیدار
ذرا جو برف کو چھولیں تو ہاتھ جل جائیں
حریر سے جو کریں مس تو انگلیاں ہوں فگار
یہ دور وہ ہے کہ سردے کا بھی مزاج ہے گرم
بدل گیا ہے کچھ ایسا مزاجِ لیل و نہار
مجال کیا کہ خریدار کو لگائیں منھ
انار ہیں کہ لبِ سرخِ شاہدِ قندھار
کسے یہ تاب کہ ان کو نظر سے بھی چھولے
یہ سیب سیبِ ذقن ہیں کہ لالۂ رخسار
مثالِ لعل و گہر اب نظر میں تلتا ہے
ہوا ہے دانۂ انگور بھی دُرِ شہوار
ہوئی لوازمِ مشاطگی سے یوں محروم

اجڑ کے رہ گیا سلمائے زندگی کا سنگار
نہ چشمِ حسن میں کاجل نہ ہاتھ میں مہندی
نہ سرخیِ لبِ لعلیں نہ غازۂ رخسار
یہ حال دیکھ لے گلشن کا موسمِ گل میں
تو پھوٹ پھوٹ کے روئے چمن میں ابرِ بہار

عرفی کے مشہور لامیہ قصیدہ میں بہاریہ تشبیب کا ایک شعر ہے

عرق از شبنمِ گل داغ شود بر رخِ حور
اخگر از فیضِ ہوا سبز شود در منقل

ساحر کو منقل کے قافیہ میں یہ تخئیل بہت پسند تھی۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اس قافیہ سے بہاریہ تشبیب میں کوئی نیا مضمون پیدا کریں۔ حضرت ابوالفضل العباس کی مدح میں ایک لامیہ قصیدے میں انھوں نے یہی قافیہ نظم کیا۔ وہ شعر اور اس کے بعد کا شعر ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ وہ عرفی جیسے عظیم شاعر سے مقابلے میں کہاں تک کامیاب ہوئے

اثرِ بادِ بہاری سے ہے آتش گلزار
آگ پھولوں کی طرح رکھتی ہے سر پر منقل
اس ترنم سے چٹختے ہیں انگیٹھی میں زغال
سامعہ کہتا ہے، لو چھیڑ دی آتش نے غزل

اردو کے کسی لامیہ قصیدہ میں سودا سے لے کر جرأت، عشقی، محشر اور محسن کاکوروی تک بشمول مصحفی کسی نے بھی منقل کا قافیہ بہار میں نظم نہیں کیا۔ سودا نے تو "بقول عرفی" کہہ کے پورا مصرع تضمین کر دیا۔ اس پس منظر میں بھی ساحر کا شعر داد طلب ہے۔ دوسرا شعر ان کے مشاہدہ کا کمال ہے۔ انھوں نے کبھی بچپن میں دیکھا تھا کہ انگیٹھی میں جب نئے کوئلے جلائے جاتے ہیں تو وہ چٹختے ہیں۔ ان سے چٹ چٹ کی آواز نکلتی ہے اور چنگاریاں اڑتی

ہے۔ حقہ پینے والے آج بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ کوئلوں کے چٹخنے کی اس آواز سے انھوں نے قصیدہ میں کیسا مضمون پیدا کیا ہے۔ پورا قصیدہ پڑھنے کے قابل ہے۔ تشبیب سے چند شعر اور:

قوتِ نامیہ سے یوں ہیں شجر بار آور
پھول آنے نہیں پاتے کہ نکل آتے ہیں پھل

اس قدر جوشِ نمو ہے کہ عجب کیا جو ابھی
پھول ہوں سرو میں پیدا تو صنوبر میں ہوں پھل

بادِ گلشن میں ہے ایسا دمِ عیسیٰ کا اثر
نخل تصویر میں بھی پھوٹ رہی ہے کونپل

یوں معطر ہے فضائے چمنستانِ جہاں
بید بھی دیتا ہے خوشبوئے گلاب و صندل

یہ ہوا میں یہ فضا میں یہ گھٹا میں یہ نال
عالمِ وجد میں ہے عالمِ اسباب و علل

ایسا لہراتا ہوا جھوم رہا ہے سبزہ
جیسے میخوار چلیں سیرِ چمن کو پیدل

عکسِ انجم ہے سرِ آبِ رواں یوں جیسے
لیلیٔ شب سے سنبھلتا نہ ہو بھاری آنچل

بوجھ سے برگ و ثمر کے جو شجر ہو گئے خم
معذرت کے لیے قدموں میں گرے پڑتے ہیں پھل

دھوم ہے قاف سے تا قاف جو اس موسم کی
سیرِ گلشن کو چلے آتے ہیں اڑ کر بادل

ہو گئی فصلِ جنوں بھی خرد افروز ایسی

نہ مزاجوں میں ہے سودا نہ دماغوں میں خلل

آب شمشیر میں بھی ہے اثرِ آبِ حیات

زندگی بخشِ وفا اب ہے قضائے مقتل

جناب ساحر کے قصیدوں سے مضمون آفرینی کی چند مثالیں۔ [illegible]

حضرت علی کی مدح

نصیب ہو اسد اللہ کی مدد جس کو

تو منھ کو پھیر دے شیروں کے وہ نحیف و نزار

نظر جو مہر صفت تیرگی پہ یہ ڈالیں

حجابِ شب سے بھی پیدا ہوں صبح کے آثار

ہوں داد خواہ اگر ان سے یوسفانِ چمن

تو چاک دامنِ گل خود سیئے گی سوزنِ خار

سنے جو آپ سے وہ حکم "قم باذنی" کا

تو ابر مردہ ہو اٹھ کر چمن میں گوہر بار

جو بخش دے لبِ جاں بخش ان کا گویائی

گلوں سے بلبلِ تصویر بھی کرے گفتار

جو پائے ان کی نگاہِ کرم سے شادابی

تو عطر کھینچ لیں کاغذ کے پھول سے عطار

شفا کریں جو عطا آپ چشمِ نرگس کو

تو پھر کوئی نہ کہے اس کو نرگسِ بیمار

جو حکم "نہی عن المنکر" آپ دیں اس کو

صدائے قلقلِ مینا ہو حرفِ استغفار

جوان کے نطق سے لے درسِ بے نیازی دہر

تو اک فقیر بھی شاہوں کا توڑ دے پندار
وہ رنگ بدلے کہ زنگی کا نام ہو کافور
جو اڑ کے رخ پہ جمے ان کی کفش پا کا غبار
رہا کریں جیسے صدقہ اتار کر ان پر
نہ شیر کر سکے اس آہوئے ختن کو شکار

جناب فاطمہ زہراؑ کی مدح میں ایک قصیدہ سے کچھ اشعار ایسے ملاحظہ کیجیے جن سے جناب ساحر کی مضموں آفرینی کی قوت کا پتہ چلتا ہے

سنی جو آمدِ زہراؑ کی اب نوید عظیم
پئے سلام اٹھے خفتگانِ کہف و رقیم
چلی ہے بادِ نفس ان کی دہر میں جب سے
ہیں وجد میں گل و گلزار، جھومتی ہے نسیم
جو ڈالتی ہیں یہ آنچل روا کا شانوں پر
تو اس سے آتی ہے جنبش میں بادِ خلد نعیم
جو دیکھیں آسیہ سائی سے ہاتھ پر چھالے
عجب نہیں ید بیضا کو کر چھپا لیں کلیم
جبین پاک پہ دیکھے جو قطرہ ہائے عرق
صدف میں شرم سے منھ کو چھپائے دُرِ یتیم
جو حکم دیں یہ اسے "نارکونی برداً" کا
تو بجھ کے آتشِ سوزاں ہو باغِ ابراہیمؑ
اگر وہ آپ کے آبِ وضو سے سینچا جائے
ثمر ہوں اس کے بھی شیریں اگرچہ تخم ہو نیم
مریض کو تپِ عصیاں جو ہو تو بہرِ شفا

دعائے نور کا نسخہ لکھیں طبیب و حکیم
نہ پائے چشمِ مشیت میں رتبۂ قنبرؓ
نہ ہو گر ان کی غلامی میں شاہِ ہفت اقلیم
ہے ان کا لعل جو ذبحِ عظیم کا مصداق
منی سے کرتے ہیں ان کو سلام ابراہیمؑ
یقیں ہے ایک بھی عاصی رہے نہ دنیا میں
جو ان کی ایک بھی نیکی جہاں پہ ہو تقسیم

جنابِ رسالت مآبؐ کے ایک قصیدہ سے مدح کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

خُلق، انصاف، عطا، علم، عمل، صدق، کرم
سارے اوصافِ حسن چومتے ہیں ان کے قدم
منبعِ جود و سخا، مظہرِ افضالِ خدا
ابرِ رحمت، یمِ الطاف و عطا، بحرِ کرم
زینتِ محفل "کن" شاہدِ اقرارِ "الست"
کاشفِ سِرِّ نہاں، محرمِ اسرارِ حرم
جلوۂ نورِ ازل، پرتوِ انوارِ خدا
شمعِ ایوانِ حدوث، آئینہ بردارِ قدم
شاہِ شاہانِ جہاں، خسروِ دین و ایماں
خواجۂ ارض و سما، ختمِ رسل، شاہِ امم

اس قصیدہ میں حضورؐ کا سراپا نظم کیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ کا سراپا اور لوگوں نے بھی لکھا ہے، مگر بیشتر نے ان کو مجازی محبوب بنا دیا۔ مثلاً امیر مینائی نے یہاں تک کہا

سنجیدہ سنجیدہ ادا میں شوخی شوخی نگاہیں
فخرِ حیا و نازِ غیرت صلی اللہ علیہ وسلم

یہ بات ایک نئی نویلی دلھن کے لیے تو کہی جا سکتی ہے مگر سرکار رسالت مآبؐ کی مقدس
کا ذکر ایسے لفظوں میں کرنا سخت قابل اعتراض ہے۔ جناب ... کے لکھے ہوئے
میں یہ عیب نہیں ہے بلکہ حضورؐ کے شایان شان مدح میں تقدس بھی ہے اور الفاظ میں ...
شکوہ اور جزالت بھی۔ ... کے اس پہلو سے کامیاب گزر جاتا ہے ایک ... کا ...
ہے۔ اب سراپا ملاحظہ کیجیے:

حسن ، جو قصۂ یوسف کو کہانی کردے
نور ، جس سے یدِ بیضا کی تجلی کم کم
وہ حسیں نور کے شانے وہ کتابی چہرہ
وحی کی رحل پہ جس طرح کتاب محکم
آنکھیں حلقوں میں ہیں یا حق میں سجدے چراغ
خم ابرو ہے کہ سجدہ میں ہے محراب حرم
بینیِ پاک ہے توحیدِ الٰہی کا الف
مصحف رخ بھی یہی ایک ہے وحدت کی قسم
نطق وہ ، نغمۂ داؤدؑ کے جس میں شعبے
لب ، کہ جیسے خط صغریٰ میں ہو اسم اعظم
عارض پاک کو چھوتی ہوئی زلفیں ، جیسے
دے رہا ہو کوئی قرآن کو بوسے پیہم

جناب فاطمہ زہراؑ کی مدح میں ایک شعر بھی ایک قصیدہ کی تشبیب سے چند اشعار

یہ مرتبۂ دامنِ زہراؑ ہے کہ جس پر
سجدہ وہ کرے گا جو نصیری کا خدا ہے

تشبیب:

مرحبا صلِ علیٰ موسم گل ، حسن زمیں

تختۂ ارض ہے یا گلشنِ فردوسِ بریں
یہ طہارت کی فضائیں یہ تقدس کا سماں
رنگِ تطہیر میں ڈوبی ہے گلستاں کی زمیں
دھل گئے سب خس و خاشاک جہاں پاک ہوا
آج معصوم گھٹائیں وہ جھما جھم برسیں
دستِ مشاطۂ قدرت نے سجایا جو چمن
آنکھیں جنت سے ملانے لگی اٹھ اٹھ کے زمیں
بوذرِ باغِ مودت نے لٹایا زرِ گل
فضۂ صبح نے ہر شاخ پہ کلیاں چن دیں
لالہ و گل نے تقدس کے عمامے باندھے
نونہالوں نے مودت کی قبائیں پہنیں
سجدۂ شکر میں ہر شاخِ ثمردار جھکی
نخوت و کبر سے جو جھک نہ سکیں، ٹوٹ گئیں
حسنِ ذکاریِ صناعِ ازل کیا کہنا
پھول شاخوں پہ کھلے ہیں کہ انگوٹھی پہ نگیں
یہ دھنک رنگ تھرکتی ہوئی بوندیں، جیسے
رقص کرتی ہوئی فردوس سے حوریں اتریں
جو زمیں کا ہے وہی ساری فضا کا عالم
عرش سے فرش تک انوار کا سیل رنگیں
ہوگیا عقدِ مواخات جو دونوں میں بہم
مل گئے سلسلۂ نور سے افلاک و زمیں
جلوے بکھراتے ہوئے نغمۂ حق گاتے ہوئے

جانبِ ارض چلے آتے ہیں جنت کے مکیں
منزلِ شوق میں شہپر سے ملائے شہپر
یہ سرافیل، وہ رضوان، یہ جبرئیلِ امیںؑ
اس طرف نور کے پردوں میں نظر سے چھپ کر
خلد سے ہاجرہؑ و مریمؑ و سارہؑ بھی چلیں
با ادب ان کے عقب سیکڑوں حوروں کے پرے
ماہ تمثال و درخشندہ رخ و زہرہ جبیں
دل میں ہے صلِ علیٰ، لب پہ مبارک بادشد
سب کا رخ جانبِ مکہ ہے، کہیں اور نہیں

امام حسینؑ کے قصیدہ کی تشبیب میں موت و زندگی کا تقابل ملاحظہ کیجیے

جہاں رنگِ خزاں میں موت کی ہے کارفرمائی
وہیں دیکھی بہارِ زندگی کی بزم آرائی
دلوں پر موت کی ہیبت بھی آفاقی حقیقت ہے
جنونِ زندگی بھی ایک عالمگیر سچائی
جلالِ موت، جیسے دوزخی سانپوں کی پھنکاریں
جمالِ زندگی کھلتے ہوئے پھولوں کی رعنائی
وہ شب کوری، سیاہی، گھپ اندھیرا، رات، تاریکی
یہ جلوہ، روشنی، پرتو، اجالا، نور، بینائی
وہ یکسر ناتوانی، بے بسی، بے چارگی، حسرت
یہ طاقت، زور، دم خم، حوصلہ، ہمت، توانائی
وہ ماتم، سوگواری، رنج، وحشت، خانہ ویرانی
یہ نغمہ، لے، ترنم، رنگ، نکہت، حسن، زیبائی

وہ نوحہ ، سوز ، نالہ ، غم ، الم ، فریاد ، بیتابی
یہ پائل ، چنگ دف ، پازیب ، گھنگھرو ، طبل ، شہنائی
وہ بے ہوشی ، سکوتِ عقل ، غفلت ، خود فراموشی
یہ بینائی ، بصیرت ، فہم ، دانش ، علم ، دانائی
مگر اک موت وہ جس نے سند پائی شہادت کی
بہارِ زندگی بھی اس کے ہر جلوہ سے شرمائی
نہ اس کے گرد پر ہیبت سکوتِ شب کا سناٹا
نہ اس کی منزلِ دشوار میں احساسِ تنہائی
نہ اس کے عشق میں دیوانگی شوق [illegible]
نہ اس دیوانگیِ شوق کا انجام رسوائی
نہ اس میں [illegible]
نہ اس میں سب ہوتی [illegible]
یہ ایسی موت ہے جس پر بہارِ زندگی صدقے
یہ ایسی زندگی جس نے بہارِ جاوداں پائی

اور اب شہر آشوب والے قصیدہ سے حضرت علی کی مدح میں چند شعر

یہ کہہ رہی ہے سماعت کو چوم کر تکبیر
مبارک اہلِ ولا آمدِ جنابِ امیرؑ
خدا کے گھر میں ہے مہمان [illegible]
نصیریوں کا خدا ، بندۂ خدائے قدیر
شہِ شہانِ جہاں ، شہریارِ کشورِ دیں
امیرِ عرش حشم ، خسروِ سپہر سریر
خدیوِ مملکتِ علم ، تاجدارِ نجف

امامِ اہلِ ولا ، صدرِ بزمِ خمِ غدیر
ہژبرِ بنتِ اسد ، ضیغمِ ابوطالبؑ
اسد جلالت و اژدر شکار و خیبر گیر
نثار حسن جو رخ پرتو رعب چتون پر
یہ لعل ہے کہ جلال و جمال کی تصویر
زباں دہن میں نہیں ، ورنہ دیکھ کر یہ جمال
لگاتے لات وہبل خود بھی نعرۂ تکبیر
علیؑ کو دیکھ کے کعبہ میں ، سوچتے ہیں خلیلؑ
کہ کس قدر تھا مبارک وہ جذبۂ تعمیر
رسولؐ حق کی نیابت انھیں کو زیبا ہے
یہ بے نظیر بصیر اور نبیؐ نذیر و بشیر
عطا کریں جو اسے آپؑ قوتِ پرواز
قفس کو توڑ کے اڑ جائے طائرِ تصویر
مسیحؑ سے جو نہ اچھا ہو اس کو دے یہ شفا
دکھائے آپ کی بادِ نفس اگر تاثیر
جو مانگے ان کی نگاہ کرم سے وہ تریاق
تو پیالہ زہر کا سقراط کو ہو کاسۂ شیر
ملے جو اس کو نصیبوں سے ایک جامِ ولا
تو پی کے پیرِ خرابات بھی ہو مرشد و پیر
ہو داد خواہ جو نوشیراں سا عادل بھی
انھیں کے در پہ ہلائے وہ عدل کی زنجیر
جو فیض چاہیں "سلونی" صفت بصیرت سے

خدمت ہیں۔

## غمِ حسینؑ:

دامن دل صد چاک کا سیتے نہ بنے
تلخابۂ زندگی بھی پیتے نہ بنے
جیتے ہیں غمِ شہؑ کے سہارے ساحر
یہ غم نہ میسر ہو تو جیتے نہ بنے

☆☆☆

گھبرائیں گے دنیا میں جو رہتے رہتے
اٹھ جائیں گے یا حسینؑ کہتے کہتے
ڈوبیں گے جو بحرِ غمِ شبیرؑ میں ہم
کوثر پہ پہنچ جائیں گے بہتے بہتے

## حسد:

اوروں کا سخن حسد کی میزاں میں نہ تول
ممکن ہو تو خود اپنے ہی عیبوں کو ٹٹول
زد پر ہو سر اپنا بھی تو پتھر نہ اچھال
کچھ خاک بھی تہ میں ہو تو پانی نہ ڈھنگول

## تکبر:

ابلیسِ تکبر سے خدا کی ہے پناہ
کرتا ہے بڑے بڑوں کو ظالم گمراہ
ساحر یہ تری بے ہنری اور یہ غرور
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

دعائیہ رباعی:

بوذرؓ کو حق انتساب کرنے والے
قنبرؓ کو فلک جناب کرنے والے
ساحر بھی ہے ذرہ تری خاکِ پا کا
اے ذروں کو آفتاب کرنے والے

فیضِ منبر:

ساحر پہ جو مولاؑ کا کرم عام ہوا
ہر مرثیہ ہم رتبۂ الہام ہوا
اللہ رے نصیب آتے ہی منبر پہ قدم
توقیر بڑھی ، اوج ملا ، نام ہوا

عزادارانِ حسینؑ:

شبیرؑ کے غم خوار سدا شاد رہیں
دنیا کے غم و رنج سے آزاد رہیں
یہ بزمِ غم آباد ہے ان کے دم سے
اس غم کے تصدق میں یہ آباد رہیں

عزادارانِ حسینؑ:

دنیا کے الم خوشی سے سہنے والے
مصروف غمِ شاہؑ میں رہنے والے
دیتی ہیں دعا ان کو یہ زہراؑ دل سے
جیتے رہیں یا حسینؑ کہنے والے

جدید مرثیہ سے ذکر مصائب خارج کرنے کی تحریک چلانے والوں کے لیے

ظالم کے مظالم کو چھپانے والے

مظلوم کے ماتم کو دبانے والے
کیا دیں گے سرِ حشر وہ زہراؑ کو جواب
مجلس کو مشاعرہ بنانے والے

## تاریخ گوئی:

تاریخ گوئی بھی ساحر صاحب کا خاص حصہ ہے اور اس فن میں ان کو خاصی دستگاہ ہے۔ وہ اب تک کوئی ڈیڑھ سو تاریخیں کہہ چکے ہیں۔ ان کی تاریخ گوئی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ مصرعہ تاریخ میں نہ صرف ایسی لفظیں لانا ضروری سمجھتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ تاریخ کس واقعہ یا کس موقع کی مناسبت سے کہی گئی ہے بلکہ اگر تاریخ کسی کی وفات کے سلسلہ میں کہی جاتا ہے تو مرنے والے کے نام یا صفات کی مناسبت سے وہ مصرعہ تاریخ میں ایسی لفظیں لاتے ہیں جن سے اس میں بڑا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اساتذہ قدیم نے بھی اپنے آپ کو ان قیود کا پابند نہیں کیا۔ آج کل کے شعراء کا تو ذکر ہی کیا جن میں سے بیشتر ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اکثر تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مصرعہ تاریخ کسی کی پیدائش پر کہا گیا ہے یا انتقال پر۔ ذیل کی چند تاریخ ہائے وفات ملاحظہ کیجیے۔ میری بات واضح ہو جائے گی۔ تاریخ کے مصرعوں کی برجستگی اور روانی بھی دیکھنے کے قابل ہے

۱۔ پروفیسر منظور حسین شور مرحوم کی تاریخ وفات

بزم ادب میں خاموشی ہے شور جواب مجلس میں نہیں

۱۹۹۳ء

۲۔ ثمر ہوشنگ آبادی مرحوم کی تاریخ ہائے وفات

یہ لحد ہے یا ثمر باغِ جناں کا اک جواب

۱۹۹۳ء

ثمر کو مدحِ پیمبرؐ کا پھل جناں میں ملا

۱۳۰۵ھ

## جناب مولوی سید علی نقی نقوی

۹۵۸

۱۹۸۸ء

ان کی تاریخ گوئی کے ایسے بہت سے نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں مگر اختصار کے پیش نظر اتنے ہی پر اکتفا کی گئی۔

تاریخ گوئی کے فن پر ان کی کتاب "فن تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ" اس موضوع پر ایک بے مثل کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے اصول و قواعد پر ان کی نظر کتنی گہری اور کتنی وسیع ہے۔

### تجنیع گوئی:

آج کل کے بہت سے شاعر تو تجنیع گوئی کے فن سے واقف ہی نہیں بلکہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ تجنیع کا مطلب کیا ہے۔ علم معانی و بیان کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا نام کلام میں اس طرح لایا جائے یا نظم کیا جائے کہ اس سے کچھ معنی بھی پیدا ہوں یا ایسے خاص معنی پیدا ہوں جو اصل نام کا مقصود نہیں۔ مثلاً کسی شخص کا نام محمد مکھن تھا۔ شاعر نے اس کا تجنیع کہا:

عالم ہمہ دوغ است محمد مکھن

یہاں شاعر نے مکھن کے لفظ کو نام محمد کی صفت کے طور پر استعمال کر کے اس میں معنویت پیدا کر دی۔ اس کو تجنیع کہتے ہیں۔ ساحر صاحب کو تجنیع گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ انھوں نے بعض بہت خوب صورت تجنیعے کہے ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

اپنے خسر معظم جناب سید مختار احمد صاحب مرحوم کے انتقال پر ان کے نام کا تجنیع یوں کہا:

کہہ دو ساحر کہ یہی تجنیع ہے ایماں کی دلیل
"مالک خلد تو اللہ ہے مختار احمد"

جتنی غزلیں کہیں وہ بلند پایہ ہیں اور کسی استادِ فن سے کم نہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے جن سے آپ کو میرے قول کی صحت معلوم ہوگی:

جو تیر آئے وہ افلاک کی کماں سے نہ تھے
ہمیں زمیں سے شکوے تھے، آسماں سے نہ تھے

نجانے کیا مرے اظہارِ شوق کو سمجھے
جو ہمنشیں مرے واقف مری زباں سے نہ تھے

میں جب کسی کے تصور محل میں رہتا تھا
مکاں کسی کے بھی اچھے مرے مکاں سے نہ تھے

اتر گئے مری آنکھوں میں حسن کے جلوے
ابھی حجاب تو اٹھے بھی درمیاں سے نہ تھے

فقط تمھاری ہی رسوائیوں کا ڈر تھا ہمیں
وگرنہ عشق میں خائف ہم امتحاں سے نہ تھے

تمھاری چشمِ عنایت سے خوف آتا ہے
تم اب سے پہلے کبھی اتنے مہرباں سے نہ تھے

قفس کو توڑ کے آئے تھے ہم گلستاں میں
وہ وقت بھی تھا کہ ہم ایسے ناتواں سے نہ تھے

رہیں کسی کی نہ آتش مزاجیاں ساحرؔ
"زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے"
(آتش)

☆☆☆

جنون سر میں رہا اشک چشمِ تر میں رہے
یہ میہمان ہمیشہ ہمارے گھر میں رہے

ہم اس طرح سے تمناؤں کے سفر میں رہے
کہ گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ اپنے گھر میں رہے

حرم میں، دیر میں، گلشن میں، دشت و در میں رہے
کہاں کہاں نہ ہم اس عمرِ مختصر میں رہے

ہوں زخم زخم سراپا میں جن سے، وہ نشتر
کف عدو میں نہیں، دست چارہ گر میں رہے

خود اپنی ذات کی منزل بھی مل سکی نہ ہمیں
تمام عمر اگرچہ اسی سفر میں رہے

یہ عدل ہے کہ رہے تیغ دستِ منصف میں
یہ ظلم ہے کہ قلم دستِ بے ہنر میں رہے

☆☆☆

میں خشک آنکھوں کو پُرنم کر رہا ہوں
چراغوں میں اجالے بھر رہا ہوں

کسی کے دل میں گھر کرنا نہ آیا
میں ساری زندگی بے گھر رہا ہوں

کسی کی آرزو کو دل بنا کر
وجود اپنا مکمل کر رہا ہوں

انھیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے
میں اس دھوکے میں تو اکثر رہا ہوں

مرے حق میں دعائے خیر کرنا
محبت کی مہم سر کر رہا ہوں

بڑا ہی سخت پتھر کاٹنا ہے

## کسی کے دل میں اب گھر کر رہا ہوں

☆☆☆

شکایت ہم کریں کیسے جفائے چرخ دوراں کی
کہ ہم نے خود ہی کھینچی ہے یہاں دیوار زنداں کی

جلاتی بھی ہے پروانوں کو، آنسو بھی بہاتی ہے
طبیعت تو کوئی دیکھے ذرا شمع شبستاں کی

نشیمن کیا بنایا سارے گلشن سے ہوں شرمندہ
خطا میری تھی اور کاٹی گئیں شاخیں گلستاں کی

ہے دل میں وہ صنم اور مصحف رخ اس کا نظروں میں
ہمیں دیکھو کہ دل کافر کا ہے، تقدیر مسلماں کی

سفینہ میں نے ساحر کر دیا غرق آب دریا میں
نہ جب بے چارگی دیکھی گئی خود مجھ سے طوفاں کی

## ایک تنقیدی نظر:

میں جوش صاحب کے مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ زیادہ مشاقی یا کہنہ مشق شاعر بھی بعض اوقات موزونی و روانی طبع میں وہ مناسب لفظ کے انتخاب میں چوک جاتا ہے۔ لیکن اس سے بہتر لفظ وہاں آ سکتی ہے۔ ناقد کی نظر اس تک پہنچتی ہے اور وہ اس لفظ کی جگہ اس سے بہتر لفظ وہاں تجویز کر کے مصرع کو چست اور بلند کر دیتا ہے۔ فن کا تعلق تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی، طرز ادا میں جدت، محاورہ اور روزمرہ کی پابندی، تشبیہات و استعارات کی ندرت صنائع و بدائع کا حسن استعمال، عروض و قافیہ کے لحاظ سے کلام کی درستی، لطف زبان اور حسن بیان سے ہے۔ جس حد تک کسی کے کلام میں یہ باتیں پائی جائیں گی اسی حد تک وہ کامیاب ہے۔ کسی لفظ کے انتخاب میں چوک جانے سے اس کا کلام بے معنی نہیں بن سکتا۔ غالب

ایک قصیدہ کا ایک مصرع یوں تھا:

مشتری ناچ رہی ہو سر محفل جیسے

''ناچ رہی'' کی لفظ میں جزالت نہ تھی۔ اس کی جگہ میں نے ''رقص کناں'' کی بنا تجویز کردی جس سے مصرع میں جزالت پیدا ہوگئی۔

اسی طرح ایک مصرع ان کا یوں تھا

''یہی زمین ہے جو آسماں سے ملتی ہے''

میں نے اس میں تھوڑی تبدیلی اس طرح تجویز کی

''یہ وہ زمین ہے جو آسماں سے ملتی ہے''

اس طرح مصرع اور چست ہوگیا۔

ان کے کلام میں اس طرح کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں مگر زیادہ نہیں ہیں اور ان سے ان کا شاعرانہ کمال بے کمالی نہیں بن سکتا۔

# مختصر حالات

خاندانِ اجتہاد کے کئی مرثیہ گو شعراء کے نہ ذاتی کوائف دستیاب ہیں نہ نمونہ کلام۔ ان کے مختصر تذکرے یہاں درج کیے جا رہے ہیں تاکہ کم از کم ان کا نام باقی رہ جائے اور رثائی ادب کے شائقین سے کچھ تعارف بھی ہو جائے۔

کہتے تھے۔

اس سے زیادہ ان کے کوائف کا علم نہیں اور نہ نمونۂ کلام دستیاب ہے۔

ان کے علاوہ میر افضل حسین ثابت مرحوم نے خاندان اجتہاد کے دو اور حضرات کا ذکر مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ کے شاگردوں میں کیا ہے۔ ان میں ایک

''۱۔ مولوی میر سید علی صاحب محدث لکھنوی صاحب ''مجالس علویہ'' تھا۔ یہ بزرگوار بھی مثل اپنے بھانجے حضرت تاج العلما موصوف کے حضرت دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ عجیب منکسر، کامل فن، نیک نیت محدث تھے''۔

(دربار حسین۔ ص ۹۲)

''۲۔ دوسرے میر کلب حسین صاحب خلف مولانا سید علی صاحب مفسر قرآن ابن غفران مآب علیہ الرحمۃ''۔ (دربار حسین۔ ص ۹۲)

مگر چونکہ حضرت ثابت نے یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ دونوں بزرگوار مرثیہ گو تھے نہ یہ لکھا ہے کہ کس صنفِ سخن میں وہ مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ کے شاگرد تھے اس لیئے میں نے تذکرہ نویسی کی ذمہ داری کے پیش نظر ان کا شمار خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعرا میں نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی شاگردی مرثیہ گوئی ہی میں ہو سکتی تھی۔ غزل ان کی فکر کا محور نہیں تھی نہ غزل گوئی میں مرزا صاحب سے تلمذ کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے بظاہر وہ مرثیہ نگار ہی ہوں گے اور اسی میں مرزا صاحب کی شاگردی قبول کی ہوگی۔ مگر صراحت نہ ہونے کی وجہ سے محض قیاس کی بنا پر ان کو مرثیہ گو کہہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔

ان کے علاوہ حضرت ثابت نے حضرت تاج العلما کا اسم اقدس بھی مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ کے شاگردوں میں لکھا ہے۔ (دربار حسین، ص ۱۹۲) حضرت تاج العلما خاندان اجتہاد کے عظیم ترین مجتہدین میں شامل تھے۔ مگر نہ وہ مرثیہ گو تھے نہ کسی اور صنف سخن میں شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ اپنی شاگردی کا حال خود لکھا ہے جس کی رو سے کسی وقتی ضرورت سے وہ مرزا صاحب کے شاگرد بن گئے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# حضرت اختر لکھنوی

## نام ونسب:

اسم گرامی: سید وقار آغا عرفیت، بے صاحب، تخلص اختر۔

## نسب:

سید وقار آغا خلف مولانا سید محمد مصطفیٰ صاحب عرف مولوی لڈن صاحب خورشید اعلی اللہ مقامہ ابن خلاصۃ العلما مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب اعلی اللہ مقامہ، ابن سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ رضواں مآب طاب ثراہ ابن مولانا سید دلدار علی صاحب غفراں مآب علیہ الرحمۃ۔

## تاریخ ولادت:

نامعلوم۔

## مرثیہ گوئی:

لسان الشعرا مولوی سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے ہفت روزہ "سحاب" لکھنؤ کی ۸ ۱۵ جون ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعرا میں حضرت اختر کا اسم گرامی بھی درج کیا ہے۔ مرقومی نمونۂ کلام

دستیاب نہیں ہے۔

حضرت اختر جناب مولوی لڈن صاحب خورشید کے ایسے بلند پایہ مرثیہ گو اور استاد شاعر کے بیٹے تھے جن کا فیصلہ شعر و سخن کے مسائل میں حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔

حضرت اختر بھی اپنے باقی دو بھائیوں کی طرح حضرت خورشید کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ نے اپنی ''تاریخ لکھنؤ'' میں لکھا ہے کہ اختر مرحوم ادھیڑ عمر کی حد تک پہنچے تھے۔ (ص۔١٦٢)

## کمالِ فن:

یقین ہے کہ اپنے باکمال والد علامہ حضرت خورشید سے فنِ شعر کی تعلیم حاصل کی ہوگی اور پھر اس میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ اس عمر میں ہی استادی کے درجہ پر فائز ہوئے۔ جناب محترم مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے ''دیوان جاوید'' میں جناب مولوی محمد کاظم صاحب جاوید کے حالات میں ان کے کوئی پونے دو سو شاگردوں کی فہرست دی ہے۔ حضرت جاوید نے ان میں سے تقریباً چالیس شاگردوں کو حضرت اختر کے سپرد کر دیا تھا۔ انھیں فنِ شعر کی تعلیم دیں اور ان کے کلام پر اصلاح بھی دیا کریں۔ (ص۔ ن) اس سے حضرت اختر کی فنِ شعر میں مہارت اور استادی کا پتہ چلتا ہے۔

## غزل گوئی:

حضرت اختر نہایت خوش فکر اور خوش گو شاعر تھے۔ غزل میں ان کا ایک خاص رنگ تھا جس میں رنگینی بھی تھی اور کیف بھی۔ حضرت مہذب لکھنوی نے ''اذکارِ سخن'' میں جناب مولوی لڈن صاحب خورشید کے حالات میں جناب جنت صاحب اختر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شعر جو آج لوگوں کی زبان پر ہے

حنا دستِ نازک میں ملتے ہوئے
چلے رنگِ عالم بدلتے ہوئے

ہی تو وہ انتہا سے مرثیہ گوئی [illegible] ہے
یہ تذکرہ الصدر [illegible] صاحب اختر ہی کا ہے۔ (ص ۶۲)

زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ صاحب زادہ نے "تاریخ لکھنو" (ج ۱، ص ۱۶۲) پر حضرت اختر کی ایک غزل کا یہ شعر درج کیا ہے

آگ بھڑکی عشق کی [illegible] دوست
جل رہی ہیں ہڈیاں اور آ رہی ہے بوئے دوست

یہ شعر غالباً کسی طرحی غزل کا ہے اس لیے کہ اسی زمین میں حضرت ماہر کی بھی ایک غزل ہے، دو شعر ان کے نمونہ کلام میں درج کیے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں

کون بڑھ سکتا، قیامت تھا قد دلجوئے دوست
پڑ گیا [illegible] دوست

اف رے جذب دل، اتر آئی شبیہ روئے دوست
میری نظروں سے جو آئینہ نے دیکھا سوئے دوست

## قصیدہ گوئی

جناب اختر مرحوم قصیدے بھی کہتے تھے۔ مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ نے لکھا ہے:

"ایک قصیدہ نواب باقر مرزا صاحب متخلص بہ حسین آباد مبارک کی مدح میں میرے علم میں ہے"۔ ("تاریخ لکھنو" ج ۱، ص ۱۶۲)

افسوس کہ ایسے بلند پایہ مرثیہ گو شاعر کا کلام تلف ہو گیا اور آغا صاحب [illegible] کی نذر کرنے مندرجہ بالا دو اشعار [illegible] نمونہ کلام میں سے یہی بھی دستیاب نہیں ہے۔

## وفات:

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان کی وفات ان کے والد ماجد کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ انتقال لکھنو میں ہوا مگر تاریخ وفات کی تحقیق نہ ہو سکی۔

# برِصغیر میں نمازِ جمعہ و جماعت کی ابتداء

حضرت غفرانمآب سے پہلے برِصغیر پاک و ہند کے شیعوں میں نہ نماز جمعہ ہوتی تھی نہ نماز جماعت جبکہ اہلسنت حضرات اس کے پابند تھے۔ شیعہ ان عبادتوں کو اہلسنت سے مخصوص سمجھتے تھے۔ حضرت غفرانمآبؒ نے یہ صورت حال دیکھ کر نواب حسن رضا خاں کو آمادہ کیا کہ شیعوں کی نماز جمعہ و جماعت شروع کی جائے۔ یہ بڑی جرأت کی بات تھی اس لئے کہ شیعہ حضرات اسے مذہب میں نئی بات پیدا کرنے کے مترادف سمجھتے تھے مگر حضرت غفرانمآب نے اس کی پروا نہیں کی اور ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کی مبارک تاریخ کو نواب کے گھر میں ملا محمد علی فیض آبادی اور شیخ اکبر علی چشتی مودودی اور چند مخصوصین نے حضرت غفرانمآبؒ کی اقتداء میں پہلی نماز جماعت پڑھی اور ۲۷ رجب کو جمعہ کی نماز قائم کی۔ اس طرح شیعوں میں نماز جمعہ و جماعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس بارے میں قدسی جائسی نے کچھ اشعار کہے جن میں سے ایک شعر یہ ہے

شیعیانِ ہند کی پہلی جماعت کی نماز
جس سے عہدِ آصف الدولہ کو ہے خاص امتیاز

(ماخوذ از "ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ" ص ۱۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حضرت ناظم لکھنوی

## نام ونسب:

اسم گرامی: مولوی سید وجاہت حسین صاحب تخلص ناظم

## نسب:

سید وجاہت حسین صاحب ناظم ابن مولانا سید سخاوت حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ۔ جناب سلطان العلماء ابن مولانا سید محمد رضی صاحب غفران مآب علیہ الرحمۃ کے نواسے تھے۔

مولانا سید سخاوت حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ اپنے وقت میں بزرگ خاندان اجتہاد تھے۔

## ولادت:

۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء بمقام لکھنؤ۔

## تعلیم اور علمی استعداد:

حضرت ناظم نے بحر العلوم جناب مولانا محسن صاحب قبلہ سے معقولات اور جناب قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ سے ہیئت اور اعلم العلماء مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ سے فقہ واصول کا درس لیا۔ ممتاز الافاضل اور صدر الافاضل کی سندیں حاصل

کیں۔ سلطان المدارس لکھنؤ میں مدرس مقرر ہوئے۔ مختلف علوم میں ان کی استعداد بہت بلند تھی اور درجۂ کمال پر فائز تھے۔

## حلیہ و اخلاق:

خوش پوشاک و جامہ زیب تھے۔ ہنس مکھ، ظریف الطبع، فقیہ، ذاکر، شاعر، فلسفی، منطقی سبھی کچھ تھے۔ کوئی بات لطیفہ سے خالی نہ تھی۔

ذہانت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی: حضرت ناظم بچپن ہی سے بڑے ذہین، حاضر جواب تھے۔ جناب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ طاب ثراہ نے ان کے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا جو درج ذیل ہے:

"ان کی کمسنی کا واقعہ ہے۔ دونوں بھائی (مولوی کاظم حسین مرحوم اور مولوی وجاہت حسین ناظم مرحوم) قبا میں پہنے ہوئے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ متعصب راہ سے کسی نے پھبتی کہی، "فرزندان مسلم"۔ مولوی ناظم صاحب مرحوم نے فوراً جواب دیا "حارث تو قبا میں ہے"۔ (تاریخ لکھنؤ ج ۲، ص ۱۳۷)

اس جواب میں تلمیح جس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ کوفہ میں جناب مسلم کی شہادت کے بعد ان کے کمسن فرزندوں کو بھی ابن زیاد کے حکم سے حارث نامی ظالم نے شہید کر کے دونوں کی لاشیں دریا میں پھینک دی تھیں۔ کمسنی میں تاریخی حوالے سے اتنا خوب صورت جواب دینا ان کی ذہانت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی دلیل ہے۔

## ایک انکشاف:

مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے "تاریخ لکھنؤ" میں لکھا ہے کہ اس وقت کے معروف مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" میں جو مزاحیہ اشعار چھپتے تھے وہ سب حضرت ناظم کے لکھے ہوتے تھے۔ اکثر مضامین بھی اس میں لکھتے تھے مگر اپنے نام سے نہیں لکھتے تھے۔ سب "اودھ پنچ" کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ سنجیدہ اشعار بھی بے مثل کہتے تھے۔ (ص۔۴۰)

## قصیدہ گوئی:

وہ بہت اعلیٰ درجہ کے قصیدہ گو بھی تھے۔ ان کا مشہور قصیدہ ’’آبشار صفا‘‘ چھپ چکا ہے جس کا مطلع ہے:

بہار آتے ہی ہم ایسی خزاں کی گت بنا دیں گے
کہ جس پر ہنس پڑیں گے پھول، غنچے مسکرا دیں گے

اسی میں یہ شعر بھی ہے:

یہ کیوں گھبرا کے سوتے سوتے پوچھا، یا نبی ہوگا
مری جاں سو رہو، ہم خود اندھیرے منھ جگا دیں گے

## حضرت ناظم و حضرت قدیم:

حضرت ناظم کے متعلق جناب مخدومی سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا کہ ’’حکیم باقر حسین صاحب یہاں مجلسیں پڑھواتے تھے۔ وہ [illegible] حکیم باقر حسین کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے یہاں حضرت عارف مرثیہ پڑھتے تھے۔ ایک سال ناظم صاحب مولوی محمد رضا صاحب اور مولوی [illegible] حسین صاحب اس مجلس میں زیر منبر بیٹھے تھے۔ عارف صاحب جب منبر پر گئے تو انھوں نے کہا ’’صاحب مجلس کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ علما کو منبر کے سامنے بٹھایا۔‘‘ ناظم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ انھوں نے قدیم صاحب کو جو خاندان انیس سے تھے مرثیہ لکھ دیا اور عارف صاحب سے مقابلہ پر پڑھوایا۔ اس کے بعد آٹھ دس مرثیے اور کہہ دیے۔ قدیم صاحب بہت کامیاب ہوئے۔ قدیم صاحب کے سارے مرثیے ناظم صاحب کے کہے ہوئے ہیں۔ قدیم صاحب تعلیم یافتہ نہ تھے۔ کامدانی کا کام کرتے تھے۔ ایک مرثیہ کا ایک مشہور مصرع ہے

یہ لال لال بھبوکا ہے ارغوانی پھول

جہاں تک مجھے (ساحر) معلوم ہے خاندان میں اس بات سے انکار تھا۔ لیکن

یہ بھی سنا ہے کہ عارف صاحب قدیم صاحب کی زبان پر اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ہماری زبان نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم صاحب خود مرثیے نہیں کہتے تھے ورنہ حضرت عارف اپنے ہی گھر کی ایک فرد کی زبان پر اعتراض نہ کرتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## ذاکری:

وہ نہایت اعلیٰ پایے کے ذاکر اور خطیب بھی تھے۔ مولوی مرتضیٰ حسین صاحب فاضل نے "مطلع انوار" میں ان کی ذاکری کے متعلق لکھا ہے:

"خطابت میں ان کے آغاز ہی سے جوہر فن ظاہر ہوتا تھا۔ لطیف نکات قرآنیہ علمی مباحث شگفتہ پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ سامعین پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ سورہ دہر کی تین آیتیں ہونے پر اپنے پرلطف انداز میں بیان فرمایا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے "[illegible] واسیرا" چونکہ سیدۂ عالم نے تین روٹیاں تین دن میں تین سائلوں کو دیں لہٰذا خدا نے ہر روٹی پر دس گنا اجر دیا۔ اس نکتے نے سننے والوں پر ایک عجیب اثر چھوڑا۔ ان کی ہر مجلس میں اسی قسم کی باریکیاں عام فہم انداز میں ہوتی تھیں۔ اسی طرح ان کے قصیدے اور شعر زبان زد ہو جایا کرتے تھے۔"

(مطلع انوار، ص [illegible])

فقہ و اصول میں بھی ان کو بڑا درک حاصل تھا۔ وجوب نماز جمعہ پر ایک استدلالی رسالہ لکھا جس کو دیکھ کر افضل العلماء مولانا سید سبط حسین صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے ان کو اجازۂ اجتہاد دیا مگر انھوں نے کبھی دعوائے اجتہاد نہیں کیا۔

## شاگرد:

ان کے شاگرد بہت تھے جن میں مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اور مولانا مرزا یوسف حسین

صاحب وغیرہ مشہور ہیں۔

اولاد کوئی نہیں تھی۔

افسوس کہ ان کے مرثیوں کے متعلق نہ تو کوئی تفصیلات دستیاب ہیں نہ کوئی نمونہ کلام۔

**وفات:**

۱۹۲۵ء میں چوبیس سال کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مرزا محمد ہادی عزیز نے یہ مشکل تاریخ کہی:

"عازمِ ملکِ ارم شد ناظمِ ملکِ کمال"

۱۹۲۵ء

# حضرت غفرانمآبؒ اور حکومتِ اودھ

مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی ''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''غفرانمآب نے حکومت سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ ان کا خیال تھا نائب امام کا حکومت کے سامنے جھکنا اور اس کی دربارداری کرنا منصب نیابت کی توہین اور ان مشاغل میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے جو اس عہدہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ ان کی اس علیحدگی اور بے نیازی کی وجہ سے آصف الدولہ ان سے اور ان کی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی لیکن ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی بلکہ خود بھی تعزیہ داری وغیرہ بڑے انہماک سے کرتے رہے''۔

(''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ''، ص ۱۸)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# حضرت عقیل

## نام ونسب:

اسم گرامی میر صادق حسین تخلص عقیلؔ

## نسب:

میر صادق حسین ابن سید احمد [illegible] ابن سید علی حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ ابن سید العلماء مولانا سید حسین صاحب قبلہ [illegible] ابن مولانا سید دلدار علی صاحب غفران مآب علیہ الرحمۃ۔

## مختصر حالات:

حضرت عقیلؔ کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہیں۔ نہ تاریخ ولادت و وفات کا علم ہے۔

میر افضل حسین ثابتؔ لکھنوی، صاحب حیات دبیرؔ نے اپنی معروف کتاب "دربار حسینؑ" میں تحریر کیا ہے:

"میر صادق حسین صاحب خاندان اجتہاد میں سے ایک بزرگ تھے۔ یہ اور ان کے برادر حقیقی نواب میر مہدی حسین صاحب مرحوم ابتدا میں مرزا صاحب (مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ) کے شاگرد ہوئے تھے۔ پھر انھوں

(میر صادق حسین صاحب) نے کم توجہی کی۔ ماہر برابر کہتے رہے"۔

(ص ۵۶)

حضرت ثابت کے اس بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ میر صادق حسین صاحب بھی اپنے برادر حقیقی میر مہدی حسین صاحب ماہر کی طرح مرثیہ نگار تھے مگر بعد میں انھوں نے اس طرف توجہ کم کردی تھی۔

میر افضل حسین ثابت کے اس بیان میں دو باتیں محل نظر ہیں۔ ایک تو مرزا دبیر کی شاگردی دوسرے مرثیہ کی طرف کم توجہی۔

جہاں تک مرزا صاحب کی شاگردی کا تعلق ہے حضرت ثابت نے آگے چل کر خود اس کی تردید کردی۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں

"مگر لکھنؤ میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب (حضرت ماہر اور حضرت عقیل) صرف ابتدا میں مرزا صاحب مرحوم کا کلام پڑھتے تھے۔ کسی کلام پر اصلاح نہ لی تھی"۔

(ص ۵۷)

جہاں تک مرثیہ کی طرف حضرت عقیل کی کم توجہی کا تعلق ہے ایک روایت کے مطابق یہ بات بھی درست نہیں معلوم ہوتی۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عقیل مرثیے تو برابر کہتے رہے مگر انھیں منظر عام پر نہیں لائے جس کی ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حقیقی بھائی حضرت ماہر کے مقابلہ پر نہیں آنا چاہتے تھے۔ دوسرے غالباً انھیں یہ خیال تھا کہ حضرت ماہر کی شہرت کے پیش نظر وہ شاید اپنا رنگ نہ جما سکیں۔ چنانچہ وہ نہ صرف اپنے مرثیوں کو منظر عام پر نہیں لائے بلکہ یہ وصیت بھی کردی کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے مرثیے ان کے ساتھ قبر میں دفن کردیے جائیں۔ اس بارے میں زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ اپنی کتاب "سوانح حیات حضرت غفران مآب" کے تیسرے ایڈیشن میں تحریر فرماتے ہیں:

"....حضرت ماہر لکھنوی کے بھائی مولوی سید صادق حسین عقیل لکھنوی

# رواسمِ عزاداری کی اصلاح اور فروغ

غفراںمآبؒ نے روشن چوکی اور شہنائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام اور طبل تاشہ کو جنگی باجا ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا، جھنڈیوں، ماہی مراتب کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیے اور بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے بجائے سینہ زنی اور حسین حسین کو رواج دیا۔ حاضری مہندی اور نذر و نیاز ایسے رواسم قائم کیئے، محرم کے دس دن میں ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی جس میں اہلبیت علیہم السلام کے فضائل میں حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں، اس طرح مجلس کی افادیت بڑھ گئی اور اس میں تبلیغی پہلو پیدا ہو گیا اور ان رواسم کو اتنا عام کر دیا کہ گھر گھر مجلس اور گلی گلی تعزیے اٹھنے لگے اس طرح انھوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی شکل دے کر عام مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور شیعی تمدن کی تشکیل کی۔

("ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ" ص ۱۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مولوی سید زاہد حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ

## نام ونسب:

اسمِ گرامی مولانا سید زاہد حسن صاحب، تخلص معصوم

نسب:

مولانا سید زاہد حسن صاحب قبلہ خلف مولانا سید [illegible] حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ ابن ممتاز العلماء مولانا سید محمد تقی صاحب قبلہ طاب ثراہ ابن سید العلماء مولانا سید حسین صاحب علیین مکان ابن مولانا سید دلدار علی صاحب غفرانمآب علیہ الرحمۃ

مولانا زاہد حسن صاحب قبلہ صاحب [illegible] تھے [illegible] کی بھی [illegible] کرتے تھے۔ آپ [illegible] مسجد کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ چھوٹی رانی صاحبہ (محمود آباد) کے بچوں کے اتالیق (استاد) تھے۔ پیش نماز بھی تھے۔ بقول مولانا محمد باقر صاحب شمس قبلہ اپنے مرثیے خود نہیں پڑھتے تھے نہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔

زبدۃ العلما مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ نے میرے نام اپنے ایک مکتوب [illegible] مورخہ ۱۸ اپریل (سنہ نامعلوم) میں مولوی زاہد حسن صاحب مرحوم کے متعلق لکھا ہے:

"خوشگو شاعر تھے۔ ان کے مراثی قلمی [illegible] محمود آباد اور رانی پور ضلع الہ آباد میں ہیں۔ کچھ اشعار میرے پاس بھی قلم بند ہیں۔"

قبل [illegible] لکھنؤ وغیرہ کے کتب خانوں میں ان کے مرثیوں کا [illegible]

اپنے وقت کے اہم مرثیہ نگار تھے۔

افسوس کہ میری پہنچ اب لکھنؤ تک ممکن نہیں ورنہ ان کا کوئی نہ کوئی مرثیہ حاصل کر کے قارئین کے لیے پیش کرتا۔ مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں ورنہ ان کے پاس جو اشعار تھے کم از کم وہی درج کر دیتا۔

## اولاد:

ان کے ایک بیٹے سید باقر حسین صاحب کراچی میں رہتے ہیں لیکن ان کے پاس ان کے پدر بزرگوار کا کوئی کلام وغیرہ نہیں ہے۔

## وفات:

ان کی وفات لکھنؤ میں جمادی الاول ۱۳۷۰ھ میں ہوئی جو عیسوی تقویم کے اعتبار سے فروری ۱۹۵۱ء ہے (حوالہ مکتوب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ)

فہیمؔ کے تعارف میں یہ حوالہ دیا ہے۔

لسان الشعرا مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للّن صاحب شاعر اعلی اللہ مقامہ نے بھی ہفت روزہ ''سحاب'' لکھنؤ کی ۸/۱۵ جون ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو شعرا میں حضرت فہیمؔ کا اسم گرامی شامل کیا ہے۔

تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں۔

کسی صنف سخن میں نمونہ کلام دستیاب نہیں ہے۔

العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ

۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اعلم العلماء مولانا سید سبطِ حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ

## نام و نسب:

اسم گرامی: مولوی سید سبط حسین۔ خطاب: اعلم العلماء، سلطان العلماء (دوم)

## نسب:

آپ جناب سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ رضوان مآب خلف حضرت غفراں مآب علیہ الرحمۃ کے نواسے اور خاندان اجتہاد کے ایک اور جید مجتہد و فقیہ جناب ملاذ العلماء مولوی سید ابوالحسن صاحب عرف مولوی بچھن صاحب قبلہ طاب ثراہ کے خویش تھے۔

## ولادت:

لکھنؤ میں ۱۴ شعبان المعظم ۱۲۸۵ھ کو آپ کی ولادت ہوئی جو عیسوی تقویم کے اعتبار سے ۳۰ نومبر ۱۸۶۸ء کے مطابق ہے۔

## تعلیم:

مولانا سبط حسین صاحب قبلہ نے نہایت اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ میں اپنے ماموں جناب مولانا بچھن صاحب قبلہ اور بحر العلوم مولانا علن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہم سے معقولات اور اپنے رشتے کے نانا جناب تاج العلماء علیہ الرحمۃ سے فقہ و اصول کا درس لیا۔ اوائل عمر میں لکھنؤ میں تعلیم مکمل کر کے عراق تشریف لے گئے۔ سرکار مرزا اس وقت

ان کے ساتھ کئی اولادیں جاں بحق ہو گئیں۔ اب ان کی اولاد میں کون باقی ہے اس کا علم نہیں۔

دوسرے صاحب زادے مولوی غلام عباس صاحب بستی میں پیش نماز تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے حسن عباس بی۔ اے جونپور میں ہیں۔

تیسرا میں ننگ خاندان ہوں۔ میرے چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے محمد مرتضیٰ نے اس سال انتقال کیا۔ دوسرے بیٹے محمد موسیٰ ایم۔ اے ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس ہیں۔ تیسرے بیٹے محمد تقی ایم۔ اے۔ ایل ایل بی مجسٹریٹ ہیں۔ چوتھے بیٹے محمد فاخر دائم المرض ہیں۔

جناب کے چوتھے بیٹے مولوی محمد زماں علم نجوم میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب "نجوم السما" لکھی جو چھپ گئی ہے۔ اس علم کے جاننے والے کہتے ہیں کہ کتاب بلند پایہ ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔

پانچویں بیٹے محمد رضا بی۔ اے اسسٹنٹ مختار کار ہیں۔ ان کے دو بیٹے حیدر رضا اور صفدر رضا ہیں۔ صفدر رضا بی۔ اے ہیں اور انکم ٹیکس میں ملازم ہیں۔

ان کے نواسوں میں مولانا محمد محسن صاحب نے درجہ اجتہاد پر فائز ہو کے ان کی مسند کو آباد کیا"۔ (ص ۷۱۲)

جناب محسن مدظلہ العالی نے گو کہ مسند اجتہاد نہیں سنبھالی لیکن دیے علم و ادب میں اپنے تمام ناعلمند دیا۔ شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں ان کے قلم نے دامن قرطاس پر رنگ رنگ کے پھول کھلائے۔ ادب میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں انھوں نے قلم فرسائی نہ کی ہو اور نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف و تالیف نہ کی ہوں۔ ان میں ایک کتاب اسلامی تاریخ سے متعلق ہے جس کا نام ہے "اسلام پر کیا گزری" اس موضوع پر یہ بڑی وقیع اور معتبر

کتاب ہے۔

"تاریخ لکھنؤ" ان کا ایک کارنامہ ہے جس میں انھوں نے محض لکھنؤ کے سماجی حالات پر روشنی نہیں ڈالی ہے بلکہ نوابین اودھ کے دور سے لے کر جنگ آزادی کے بعد تک کے سیاسی حالات، سماجیات، علم و ادب، تہذیب و تمدن، ہر دور کے علما و شعرا کے تذکرے، ایجادات، ہنرمندی کے کمالات، لکھنؤ کے لوگوں کی مزاجی کیفیات غرض کہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں ہے جسے انھوں نے اس کتاب کا موضوع نہ بنایا ہو۔ اس طرح یہ کتاب لکھنؤ کے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کر گئی۔ حضرت شمس نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ نویسی کا حق ادا کر دیا۔

ان کی کتاب "شعور و شاعری" ایک لاجواب تنقیدی کتاب ہے جس میں انھوں نے بڑے شعرا کے کلام پر تنقید کر کے اصلاح کی ہے۔

"لکھنؤ کی زبان" کے موضوع پر ان کی یہ کتاب بھی بے مثل ہے۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ کی زبان کا دہلی کی زبان سے تقابل کر کے لکھنؤ کی زبان کی برتری ثابت کی اور دہلی کی زبان اور اس کے محاوروں وغیرہ کا دہلی کے اس وقت کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں جائزہ لے کر اس کے معیار کی پستی اور تبدیلی وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

"لکھنؤ کی شاعری" میں انھوں نے تقریباً تمام مشاہیر شعرائے لکھنؤ کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام کو یکجا کر دیا ہے۔

اسی طرح ان کی متعدد دوسری کتابیں اپنے اپنے موضوع پر نہایت مکمل، مدلل اور قابل قدر ہیں۔ اتنے متنوع موضوعات پر شاید کسی نے اس معیار سے موضوع کا حق ادا کر دیا ہو۔

ان کی تحریروں سے ثابت ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، نقاد بھی ہیں اور تاریخ نویس بھی، محقق بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی، عالم دین بھی ہیں اور ادب پرور بھی۔ مختصر یہ کہ ان کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں جن میں سے ہر ایک ان کے علم و ادب اور زبان و بیان عمدہ

نظر نے سراہا ہے۔ ان کی اسی ہمہ جہتی کو میں نے ایک رباعی میں اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا:۔

قصرِ ادب و علم کے در روشن ہیں
آفاقِ ہنر شام و سحر روشن ہیں
تحقیق و تواریخ و زبان و تنقید
اک شمس سے کتنے ہی قمر روشن ہیں

## جناب اعلم العلماء کا حلیہ:

جناب اعلم العلماء مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ دراز قامت اور گندم گوں تھے۔ چہرے سے علمی وقار اور خاندانی وجاہت و شرافت عیاں تھی۔

## مزاج و اخلاق:

نہایت خوش اخلاق و نرم مزاج تھے۔ ذاتی نام و نمود اور شہرت سے ہمیشہ دامن کش رہے۔ نواب واجد علی شاہ کے عہد تک علماء کو خطابات دربار شاہی سے عطا کیے جاتے تھے سلطنت اودھ کے خاتمہ کے بعد خطابات یا تو علمائے عوام کی طرف سے دیے جانے لگے۔ بعض علماء نے اپنے لیے خود خطابات تجویز کیے جو آج کل ہندوستان میں ایک عام روایہ بن گیا ہے اور ہر کس و ناکس اپنے آپ کو بقلم خود علامہ لکھتا ہے۔ حضرت اعلم العلماء نے اپنے لیے کبھی کوئی خطاب تجویز نہیں کیا۔ ان کی اہلیت کے پیش نظر بزرگان خاندان اجتہاد نے ان کو اعلم العلماء کا نہایت موزوں و مناسب خطاب دیا۔

## شاعری:

جناب اعلم العلماء نہایت بلند پایہ شاعر تھے۔ سخن فہمی و سخن سنجی دونوں میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ ان کی شاعری کا اصل محور قصیدہ نگاری تھی اور انھوں نے بڑے زبردست قصیدے کہے جن کی دھوم تھی۔ اکثر لوگوں کو شعر بہت دے دیتے تھے مگر لوگ سمجھ جاتے

نازک موضوع تھا جس کو پورے ادب و احترام کے ساتھ نباہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی اسی وجہ سے کسی اور قصیدہ گو کے یہاں مجھ کو یہ انداز قصیدہ گوئی نہیں ملا۔

ایک قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ کیجیے جن میں امام حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے سامنے اپنے شرف کا اظہار فرما رہے ہیں۔ پہلے حضرت علیؑ کا ارشاد سنیے

میں ہوں کونین میں شیرازہ بند عالم امکاں ۔ مرے ہاتھوں میں نظم عالم خلاق عادل ہے
ابو طالبؑ کا پیارا مفخر اولاد ہاشم ہوں ۔ میں ابن فاطمہ بنت اسد ہوں، شیر کا دل ہے

اب امام حسینؑ کا جواب ملاحظہ ہو:

پدر ہیں آپ کے گر شہریار کشور بطحا ۔ پدر میرا جہاں میں آپ سا سلطان عادل ہے
محمدؐ کا جگر ہے شاہ خیبر گیر کا دل ہے ۔ مری دریا دلی ہم صورت دامان ساحل ہے
اگر ماں آپ کی مسند نشین بزم عفت، میں ۔ تو صدر محفل تطہیر مری ماں کی منزل ہے
اگر بیت الولادۃ آپ کا مسجود عالم ہے ۔ تو میری ماں کا دامن آپ کے سجدے کے قابل ہے

ایک اور قصیدہ میں ایسی ہی گفتگو امام حسینؑ اور حضرت علیؑ کے درمیان نظم کی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

سوار دوش پیغمبرؐ ہیں بابا آپ بھی، لیکن
مرے ہاتھوں میں بالیں بن گئیں زلفیں پیمبرؐ کی

ایک قصیدہ سے جناب فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ کے تقابل میں دو شعر ملاحظہ کیجیے

منظور نظر حق کو از بسکہ تقابل تھا
دونوں کی زمانہ پر یوں فرض مودت کی

گر نام جپا جائے دنیا میں ید اللہ کا
تسبیح پڑھی جائے خاتون قیامت کی

میرے پیش نظر اس وقت قبلہ و کعبہ جناب اعلم العلماء کے دو قصیدوں کے کچھ اشعار ہیں جو ان کے فرزند ارجمند جناب محترم مولانا محمد باقر صاحب شمس مدظلہ العالی نے

مجھ کو عنایت فرمائے۔ دونوں قصیدے بڑی حد تک نامکمل ہیں پھر بھی ایک میں کوئی بہتر (۷۲) اشعار ہیں اور دوسرے میں کوئی ساٹھ اشعار ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے ان کا کوئی قصیدہ بھی پورے کا پورا نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے ایک قصیدہ کی تشبیب سے صرف پانچ سات اشعار اور دوسرے کی تشبیب کے چند اشعار علاوہ مدح مولاؑ میں بھی صرف چھ سات اشعار یہاں درج کروں گا۔ ان اشعار کے مطالعہ ہی سے حضرت اعلم العلماء کی قصیدہ گوئی کے نہایت بلند معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو قصیدہ کے خصوصیات، شکوہِ الفاظ، خلاقی مضامین، فکر کی بلندی اور قوتِ تخیل کا نیا پن اور جزالت وغیرہ سے عبارت ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تغزل کا حسن خاص طور پر قابلِ داد ہے:

نگاہوں میں کھپے یا خاک ساقی رنگ مستانہ　　کہ چشمِ بے مروت کی طرح خالی ہے پیمانہ
نیاز و ناز میں ڈوبا ہوا ہے رنگ مستانہ　　سوالی [illegible] جھکائے ہاتھ پھیلائے ہے پیمانہ
ترے دستِ حنائی نے بنایا کیا دیوانہ　　ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے اپنی جان پروانہ
پلا رندانِ تشنہ کام کو بھر بھر کے پیمانہ　　یہ کیسا بخل ساقی، پھول وہ [illegible] میں [illegible]
[illegible] کر جا چکی جب لیلیٰ شبِ تار جانانہ　　عروسِ [illegible] نے گھونگٹ اٹھایا بے حجابانہ
صدا الحمد کی آتی ہے اوراقِ گلِ تر سے　　بنا ہے غنچہ [illegible] باغ کا تسبیح کا دانہ

پوری تشبیب حسنِ تغزل کا نہایت خوشنما اور شعریت سے بھرپور مرقع ہے۔ ابتدا کے ان چند اشعار میں بھی تخیل کی جدت، مضمون آفرینی اور نزاکتِ خیال کے بہترین نمونے دیکھے جا سکتے ہیں جن میں کیف و سرور کی ایک دنیا آباد ہے۔

اب دوسرے قصیدے کی تشبیب کے چند شعر جو اسی طرح حسنِ تغزل سے مالا مال اور اعلیٰ شاعری کی مثال بے مثال ہیں۔ ملاحظہ ہوں

بہار آتے ہی تازہ ہو گیا پھر داغِ تنہائی　　جگر میں درد [illegible] چوٹ مدت کی ابھر آئی
[illegible] یوسف کی بیٹھے بیٹھے ہم کو یاد آئی　　[illegible] دامان شیبانی

بس اتنا یاد ہے جب لی تھی اس نے ہنس کے انگڑائی      تو دل تھامے ہوئے منہ تک مری آہ رسا آئی

کوئی کہہ دے کریں گلشن میں گل بھی جلوہ آرائی      قدم دھلوائے شبنم سے عروس نو بہار آئی

جسے دیکھو گلستاں میں سبق آموز الفت ہے      ادھر سبزے نے کروٹ لی ادھر بیلوں نے انگڑائی

صدا الحمد کی آتی ہے اوراق گل تر سے      لب جو اتفاقاً گر کسی غنچے کو چھینک آئی

عرق آیا کسی غنچے کے ماتھے پر جو گلشن میں      پسینہ پونچھنے پھولوں کے دامن سے ہوا آئی

نسیم صبح گلشن آج سر پر ہر گل تر کے      دوپٹے چنٹ چنٹ جالے شبنم کے اوڑھا آئی

ملک بھی دیکھتا رہتا ہے رنگ محفل خوباں      ادھر زلف سیہ بکھری ادھر کالی گھٹا آئی

آپ نے ان اشعار کی شعریت، رنگینی تغزل، حسن بیان اور لطف زبان ملاحظہ فرمایا۔ پورا قصیدہ ایسے ہی خوب صورت اشعار کا گلدستہ ہے اور اس قابل ہے کہ پورا قصیدہ یہاں پیش کیا جائے مگر خوف طوالت ہاتھ روکتا ہے۔

اب اسی قصیدہ سے مدح کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے، دو تین اشعار میں ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔ قصیدہ میں مدح کا خاص انداز ہوتا ہے۔ اردو کے شعرائے متقدمین کے علاوہ فارسی کے قصیدہ گو شعرا کے یہاں بھی اسی انداز کے شعر ملیں گے۔ یعنی ممدوح کے صفات کو القاب کی صورت میں شاعرانہ تراکیب سے نظم کرنا۔ مثلاً چراغ بزم قدم، شہ سپہر سریر اور کاشف اسرار حرم وغیرہ۔ آج کل ایسی مدح کی داد نہیں ملتی۔ مل ہی نہیں سکتی۔ میں اپنے قصیدوں میں اس طرح مدح نظم کر کے کئی بار تجربہ کر چکا ہوں۔ غالباً اس کی وجہ زبان کا انحطاط، علم کی کمی اور سخن شناسی کے جوہر کا فقدان ہے مگر اہل علم اور باذوق سخن شناس حضرات کے لیے یہ انداز مدح اب بھی انتہائی پسندیدہ ہے۔ اب آپ مولائے کائنات کی مدح میں اعلم العلما کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

موقع ہے جنگ خیبر کا۔ سالاران لشکر اسلام یہودیوں کے ہاتھوں مسلسل شکست کھا رہے ہیں۔ حضرت علی شریک جنگ نہیں ہیں بلکہ مدینہ منورہ میں ہیں اور آشوب چشم میں مبتلا ہیں۔ اس واقعہ کے متعلق اختصار کے ساتھ کچھ شعر درج کرتا ہوں

پلا دے بادۂ گل رنگ ساقی آج رندوں کو
کہ ہر چھینٹے میں خیبر کی نظر آئے صف آرائی

بہت کیں کوششیں لڑنے میں اصحاب پیمبرؐ نے
کسی صورت سے فتح خیبری نہ جب آئی

ہزیمت پر ہزیمت لشکر اسلام نے پائی
سپہ سالار لشکر کی شکایت متصل آئی

ہوئے لڑنے سے سرداران لشکر بھی ادھر عاجز
تو حضرتؐ نے زبان حق سے یہ بات فرمائی

کہ کل بھیجوں گا اس کرار کو میدان خیبر میں
محمدؐ جس کا عاشق ہے، خدا ہے جس کا شیدائی

رسول اللہؐ اٹھ بیٹھے بس اتنا کہہ کے محفل سے
کسی سے نام تک کی نہیں تصریح فرمائی

مگر سمجھے وہ جو حیدرؑ کے تھے دل سے تولائی
نبیؐ کو ایک مجبور وطن کی یاد آج آئی

اب مدح کے وہ شعر جن کے متعلق میں نے اوپر کی سطور میں گفتگو کی ہے۔

شہن پیرائے قدرت، مظہر اسرار ربانی
شہنشاہ نجف، مہر سپہر مسند آرائی

[illegible] الاتقیاء [illegible] بلند عالم امکان
[illegible] آرائے قدرت، صاحب اکلیل دارائی

[illegible] حیدر، فاتح خیبر
ابوطالب کا پیارا، صاحب معراج کا بھائی

ناسوط حسین صاحب قبلہ طاب اللہ مقامہ کے قصائد سے یہ چند اشعار جو آپ نے ملاحظہ فرمائے ان سے آپ نے یقیناً ان کے قصائد کے نہایت اعلیٰ معیار اور ان میں قصیدہ کے تمام خصوصیات یعنی شوکت الفاظ، جدت مضامین، بلندی فکر، تغزل اور جزالت وغیرہ کے نہایت خوب صورت مرقعے دیکھ کر یقیناً ایک بہترین رائے قائم کی ہوگی اور میرے اس خیال سے اتفاق فرمائیں گے کہ وہ ایک نہایت بلند پایہ قصیدہ گو اور زبردست شاعر تھے۔

## غزل گوئی

آپ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ ایک غزل کے تین شعر درج ہیں

بت بھی اس حسن خداساز پہ قرباں ہو جائے
کافر آنکھوں سے جو دیکھے تو مسلماں ہو جائے

کھولے وہ زلف کو بکھرائے کسی کا کہنا
جس کو دیکھے وہ پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

جان لینا کہ ہوا ختم اسیر گیسو
آپ سے آپ اگر زلف پریشاں ہو جائے

ان کی ایک غزل کا مندرجہ ذیل شعر حضرت عزیز لکھنوی نے سنا تو کہا کہ یہ شعراے

حال کی فکر سے باہر ہے۔

دل تھام لیا اپنا صحرا میں بگولوں نے اف کہہ کے جو گرد اٹھی بیٹھی ہوئی تربت سے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس پر خطیب اعظم مولانا سبط حسن صاحب قاطر وجد فرماتے تھے،
کہتے تھے کہ دوسرا مصرع الہامی ہے۔

یہ کون انگڑائیاں لے لے کے گزرا طور سے موسیٰ
بقدرِ قوتِ دیدار دیکھا اور نہ پہچانا

## ذوقِ سلیم اور سخن فہمی:

حضرت شمس مدظلہ نے لکھا ہے کہ خدا نے ان کو عجیب ذوق سلیم اور شاعرانہ صلاحیت
عطا کی تھی۔ کسی نے میر نفیس اعلی اللہ مقامہ کا یہ مصرع پڑھا

زیادہ چلنے میں بلبل ہوا سے لڑتی ہے

مولانا سبط حسین صاحب قبلہ نے مصرع کو یوں بنا دیا

تنک مزاج ہے بلبل، ہوا سے لڑتی ہے

اس تبدیلی سے شعر کس قدر بلند ہو گیا۔

کسی نے میر نفیس کا ایک اور مصرع پڑھا جو گھوڑے کی تعریف میں ہے

منھ پہ تلواروں کے جاتا ہے، بھڑکنا کیسا

آپ نے مصرع کو یوں بدل دیا۔

آتشِ حرب کا خوگر ہے، بھڑکنا کیسا

بھڑکنے کی لفظ کے ساتھ آتشِ حرب کہنا کس قدر موزوں اور مناسب ہے۔ اسی طرح غالب
کا مشہور شعر ہے:

نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

آپ نے فرمایا کیسی الجھی ہوئی زبان ہے۔ شعر یوں پڑھیے

نکالے جاتے نہ جنت سے حضرت آدمؑ
عوض گیہوں کے جو کھاتے یہ بیسنی روٹی

غالب کے شعر کے مقابلہ میں اس بندش سے کیسی سلاست اور روانی پیدا ہوئی۔ حکیم شفقت نے ایک رباعی پڑھی جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے

اے مالک کائنات جلوے برسیں
اس بزم کو بزمِ نور کرنا ہے مجھے

آپ نے فرمایا پہلے مصرعے کو یوں بدل دو

اے ابرِ کرم فلک سے جلوے برسیں

یہ ساری مثالیں ان کی نہایت اعلیٰ شعری صلاحیت [illegible] کی بہترین مثالیں ہیں

## طبابت:

طبابت میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ [illegible] مرض [illegible] سے دوسرے اطباء کو حیران کر دیتے تھے۔ حضرت شمس [illegible] تفصیل میں کئی واقعات "تاریخ لکھنؤ" میں درج کیے ہیں جو [illegible]

## وفات:

آخر عمر میں آپ نے جونپور میں مستقل طور پر [illegible] ۱۳۷۱ھ مطابق مارچ ۱۹۵۲ء میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال [illegible]
حضرت شمس تحریر فرماتے ہیں کہ رات کو تین بجے [illegible]
پکار [illegible] اس کے سہارے سے اٹھ کر [illegible]
پڑھنے لگے۔ دفعتاً ہاتھ بڑھا کر [illegible]

گئی ۔ وہاں کی صدر امام باڑگاہ میں ضریح امام حسین کے پاس یہ علم دین کا عظیم خزانہ سپرد خاک کیا گیا۔

ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب عرف مولوی کبن صاحب قبلہ طاب ثراہ نے دفن سے پہلے مجلس پڑھی جس میں انھوں نے فرمایا کہ خاندان اجتہاد میں پانچ عالم سب سے بڑے ہوئے۔ حضرت غفراں مآب، سلطان العلماء، ان کے چھوٹے بھائی سید العلماء اور تاج العلماء پانچویں یہ سبط حسین صاحب قبلہ تھے۔ ان کی ذات پر خمسۂ نجبہ کا خاتمہ ہو گیا۔

جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ کچھ لوگوں نے کہا اس شان سے آج تک کسی کا جنازہ نہیں اٹھا۔ علم و ادب کا یہ آفتاب عالم تاب آخرکار جونپوری ایک قبر کے گوشہ میں غروب ہو گیا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

حضرت آشفتہ اجتہادی

کی نگرانی میں ہوئی اور انتہائی تعلیم بحر العلوم شمس العلماء مولانا سید محمد حسین صاحب عرف مولوی علن صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ سے حاصل کی۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ اہل سنت شیعوں سے پڑھیں اور شیعہ اہلِ سنت سے۔ اگر یہ دستور باقی رہتا تو شاید مسلمانوں کے اتحاد باہمی میں رخنے نہ پڑتے۔

چونکہ حکیم آشفتہ صاحب کو فلسفہ سے زیادہ لگاؤ تھا اس لیئے آپ نے اہل سنت کے مشہور عالم شمس العلماء مولانا عبدالمجید صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب (فرنگی محلی) سے مدتوں پڑھا اور اسنادِ فضل حاصل کیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں۔ مولانا عبدالمجید صاحب کی دی ہوئی عربی میں سند کی عکسی نقل میرے پاس ہے۔

## علم ہیئت:

فلسفہ کے علاوہ علم ہیئت میں بھی انھیں کمال حاصل تھا جس کا اظہار ان کی ایک نظم "ہفت قمر یعنی سبع سیارہ" سے بخوبی ہوتا ہے۔ اس نظم پر جناب شوکت تھانوی نے پیش لفظ لکھا ہے جس میں علم ہیئت میں ان کے کمال اور نظم کی شعری وادبی حیثیت سے گفتگو کی ہے۔ اس کو میں من وعن یہاں درج کر رہا ہوں۔ نظم میں ساتوں سیاروں کے متعلق مجموعی طور پر پچاس اشعار ہیں اس لیئے اختصار کے پیش نظر ان کو نقل نہیں کر رہا ہوں۔ صرف "ہفت قمر" کے متعلق دو اشعار لکھ رہا ہوں جس سے نظم کے بارے میں کچھ اندازہ قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

عقل ہے حیرت سے بکِ دہک ہوش ہیں حیرت سے دنگ
ہے نظامِ عالمِ افلاک میں مضمر وہ رنگ

تھا کبھی دور فضا میں شوفشاں زریں سحاب
جس کے ٹکڑوں نے بنا ڈالے ہزاروں آفتاب

"تعارف"

"آسمان کی باتوں میں زمین کا رہنے والا کیا دخل دے سکتا ہے، اور اگر

دخل دے تو آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

مگر اشرف الحکما سید علی صاحب آشفتہ نے آسمان سے تارے توڑنے کے بعد زمین کے ایک ذرے پر بھی اپنی نظرِ انتخاب ڈالی اور اپنی اس نظم پر مقدمہ لکھنے کی خدمت میرے سپرد فرما کر ایک مشتِ خاک کی صلاحیت پرواز کا تماشہ دیکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ وہ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور میں ہوں کہ حیرت نے بجائے خود مجھ کو تماشہ بنا رکھا ہے۔ لکھوں تو کیا لکھوں اور نہ لکھوں تو کیوں کر۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔

اشرف الحکما نے تو اپنی دشوار پسندی کا ایک معجزہ دکھایا ہے۔ ہیئت ایسے خشک اور قطعاً غیر شاعرانہ فن کو اپنا موضوعِ شعر بنا کر جس سبک رفتاری سے ساتھ وہ اس ناقابلِ عبور راستے کو طے کر گئے ہیں وہ اگر ان کا معجزہ نہیں تو شاعری کی کرامت ضرور ہے مگر میرے لیے اب [illegible] دشواری ہے کہ میں یہ کہہ دوں کہ اس موضوع پر [illegible] روانی، سلاست [illegible] آسانی سے ساتھ شعر کہنا کوئی سمجھ میں آنے [illegible] بات ہے۔ اب تو [illegible] ہے۔ میں مشکل کو آسان ہونے سے بعد دیکھ رہا ہوں [illegible] سمجھ میں آ رہا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے ورنہ میں آپ سے [illegible] کہتا ہوں کہ [illegible] سے پہلے حکیم صاحب اپنے اس ارادے کا اظہار کرتے تو میں شاید ان سے یہی کہتا کہ نظامِ شمسی کو نظم کرنے سے پہلے آپ اقلیدس کو نظم [illegible] یا [illegible] کو منظوم بنا دیجیے اور تعزیرات ہند کو نثر میں [illegible] ہیں۔ [illegible] علم ہیئت پر نظم کہنا میرے نزدیک ایک ایسی ہی غیر متعلق سی بات ہوتی کہ میں شاید اپنی حیرت کو قہقہوں میں چھپا دیتا مگر حکیم آشفتہ نے میرے قہقہوں کو حیرت میں گم کر دیا ہے۔ اور مجھ کو اعتراف ہے کہ بیشک شاعری [illegible] [illegible] [illegible] شی

میں اپنے لیئے ترقی پیدا کر لینے کی قوت رکھتا ہے۔

"ہفت قمر" کے مطالعہ سے یہ حقیقت ہر ایک پر روشن ہو جائے گی کہ حکیم آشفتہ نے کہیں پر بھی ضرورتِ شعری یا حسنِ بیان کے لیئے خلاف واقعہ کسی غیر متعلق چیز سے مدد نہیں لی ہے بلکہ علم ہیئت سے دلچسپی رکھنے والے ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ شاعر نے ان ہی کے تمام اصول اور ان ہی کے تمام نظریے من و عن ترتیب اور موزونیت کے بعد بھی باقی رہنے دیئے ہیں۔ گویا اس نظم میں آشفتہ کی لائی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے۔ شاعر نے اپنی خلاقی کا مظاہرہ قطعاً نہیں کیا مگر اس کے بعد بھی حیرت تو یہ ہے کہ اس موضوع کو اپنا کر چھوڑ دیا ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاعر ہی علم ہیئت کا موجد اور محقق تھا اور وہی آج سب سے پہلے دنیا کے سامنے اپنے نظریئے پیش کر رہا ہے۔ دراصل اس قسم کے موضوع پر نظم کہنے کے دو ہی نتائج ہو سکتے تھے کہ یا تو شاعرانہ تخیلات اصل واقعات کو ایک حد تک نظر انداز کر دیں ورنہ اصل واقعات شعر کی رنگینی اور نظم کی لطافت کو ختم کر دیں مگر اس نظم میں آپ کو ان دونوں امکانات کا شاید کوئی نمونہ بھی نہ ملے اور محض اسی اعتبار سے میں اس نظم کو اپنی قسم کی پہلی اور کامیاب ترین نظم سمجھتا ہوں۔ واقعاتی صحت کا جہاں تک تعلق ہے اس کا اندازہ آپ ان حواشی سے کر سکیں گے جو اس نظم کے کم و بیش تمام اشعار پر روشنی ڈالنے کے لیئے نظم کے ساتھ ہی آپ کے پیش نظر ہیں اور شاعرانہ اسلوب بیان کی دلکشی کے لیئے آپ اس نظم کا کوئی شعر دیکھ لیجیئے یقیناً آپ اس کو ہیئت ایسے خشک موضوع کا شعر نہیں کہہ سکتے۔ مثال کے طور پر سیارہ۔ زحل کے متعلق شاعر کی قدرت کلام کا ایک منظر ملاحظہ فرمایئے۔

چرخِ ہفتم کو زحل کی دلکشی پر ناز ہے    دیج قیامت کی، بلا کی گرمیِ انداز ہے
حلقہ ہائے حسنِ رنگیں گرد ہیں دیوانہ وار    دائرہ در دائرہ یعنی بہار اندر بہار

کسی سے سمجھائے آسانی کے ساتھ سمجھ لیں۔ دراصل نصاب تعلیم میں اس قسم کے لٹریچر کا شامل ہونا ازبس ضروری ہے اور میں تو حکیم آشفتہ صاحب سے اصرار کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ اپنی اسی نظم پر اپنی ادبی خدمات کو ختم نہ کریں بلکہ اس سلسلے کو جاری رکھیں جو یقیناً شاعری کے دیگر اصناف سے کہیں گراں قدر اور غیر فانی ہے۔ اردو شاعری کے جسد مردہ میں روح پھونکنے والی چیزیں یہی ہیں اور مسیحائی کا حق بھی اشرف الحکماء ہی کو پہنچتا ہے پھر کیوں اردو کی طرف سے کوئی مایوس ہو اور حکیم آشفتہ کسی کو مایوسی کا موقع ہی کیوں دیں''۔

نوٹ

''درصل یہ نظم اشرف الحکماء نے انجمن بہار ادب لکھنؤ کے سالانہ مناظمہ کے لیے ارشاد فرمائی تھی مگر خود ان کو بھی نظم کی تکمیل سے قبل شاید اس کا خیال نہ تھا کہ یہ کیا چیز بن جائے گی۔ بہرحال نظم کی تکمیل کے بعد میرے عزیز دوست حضرت سراج لکھنوی کی اور خود میری رائے یہ ہوئی کہ اس نظم کے ساتھ حواشی کا بھی سامعین تک پہنچنا ضروری ہے اور اس کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو مطبوعہ صورت میں پیش کر دیا جائے تاکہ سامعین ناظرین بن کر اس ٹھوس چیز کو اپنے عمیق مطالعہ میں لا سکیں''۔

اب سبعہ سیارہ کی ابتدا میں ''ہفت قمر'' کے عنوان سے دو شعر ملاحظہ کیجیے۔ اس نظم میں علم ہیئت کی اصطلاحوں کی تشریح ذیلی نگارشات (فٹ نوٹس) میں کی گئی ہے تاکہ نہ جاننے والوں کو بھی سمجھنے میں آسانی ہو۔

''یہ نظم سبعہ سیارہ کے خصوصیات علمی یعنی رموز و نکات فن ہیئت پر مشتمل ہیں، اصطلاحات فنی کے تصرفات قابل ملاحظہ ہیں''۔

## ہفت قمر (1)

عقل ہے حیرت سے یک دم ہوش ہیں حیرت سے دنگ
ہے نظام(2) عالم افلاک میں مضمر وہ رنگ
تھا کبھی دور فضا میں ضوفشاں زریں سحاب(3)
جس کے ٹکڑوں نے بنا ڈالے ہزاروں آفتاب

### علم طب:

حکیم آشفتہ صاحب کی شہرت بحیثیت طبیب بے مثال تھی اور واقعی آپ حکیم حاذق تھے۔ علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد آپ نے طب کی تعلیم ابتدا میں حکیم محمد نواب صاحب اور حکیم احمد دین صاحب سے حاصل کی اور شیخ محمد صاحب ہردوئی شاگرد بحر رموز تقدیت حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی سے پڑھا۔ اس کے بعد شمس العلما مولانا عبدالمجید صاحب فرنگی محلی اور شمس العلما مولوی نجم الحسن صاحب قبلہ مجتہد کی تعریف و تعارف کے ساتھ دہلی جا کر حاذق الملک مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے علم طب کی تکمیل کی اور اجازات و اسناد حاصل فرمائے۔ حکیم اجمل خان مرحوم کے دیے ہوئے اجازہ کی ایک نقل میرے پاس ہے جو عربی میں ہے۔

حکیم اجمل خاں صاحب حضرت آشفتہ کو اپنا ممتاز ترین شاگرد جانتے تھے اور بہت عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ سفر و حضر میں آپ ان کے ساتھ رہتے تھے۔

---

(1) سبعہ سیارہ کو اصطلاح میں ہفت قمر بھی کہتے ہیں۔

(2) کائنات کے تمام جمادات نباتات میں آسمان کا رنگ [illegible] حیثیت ہے

(3) فضائے آسمانی میں کبھی گول چکردار دھواں دکھائی دیتے ہیں جو [illegible] سیارات بن جاتے ہیں۔ علمائے ہیئت کا [illegible] اسی [illegible] میں مضمر ہے۔ علم ریاضی علم ہیئت [illegible] شہادت [illegible] [illegible] کہکشاں [illegible]

جب آپ دہلی سے لکھنؤ واپس آئے تو یہاں معرکہ آرا علاج فرمائے۔ علمی وعملی شہرت حیدر آباد دکن تک پہنچی تو آپ وہاں طلب کیئے گئے اور نظام طبیہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں آپ کے مریضوں کا انبوہ کوئی دو ہزار تھا۔

## طبی تصانیف:

حکیم آشفتہ صاحب نے علم طب پر کم سے کم دو کتابیں لکھیں۔

(۱) ''کتاب عجیب المعروف بہ عملیۂ جالینوس''۔

اس کتاب کی تعریف میں حکیم مقصود علی خاں، ناظم سررشتہ طبابت، سرکار عالی دکن نے لکھا ہے:

''عملیۂ جالینوس'' گو مختصر ہے مگر مطالب کے اعتبار سے بہت بلند اور ندرت کی حامل ہے۔ ہر مرض کی کیفیت، طبیعت، اس مرض کی حالت نبض اور اس کے قارورہ کا حال اور احکام فصد و استفراغ اور غذا وغیرہ اور جن ادویہ سے اس مرض کا ازالہ ہوسکتا ہے اس کو ایک نقشہ کی صورت میں جو خود جالینوس کا مرتبہ ہے اس طرح واضح بتایا گیا ہے کہ اگر ایک طالب علم اس اجوزہ کو حفظ کرلے تو طب کی بڑی بڑی کتابوں سے بے نیاز ہو جائے''۔

(۲) ''جواہر کدۂ طب یونانی المعروف بہ مفردات ثمانی''

اس کے متعلق خود آشفتہ صاحب نے لکھا ہے

''انشاء اللہ ذخیرۂ طب یونانی میں آپ ایک ایسا قیمتی اضافہ پائیں گے جس کی مثال مشکل سے ملے گی جو مفردات کے حقائق وخواص کے متعلق ایک بہترین چیز ثابت ہوگی۔ اس سے آپ کو اطبائے متقدمین کی انتھک کوششوں اور محنتوں کا حال بھی معلوم ہوگا اور ان کے قیمتی تجربوں سے طب یونانی میں چار چاند بھی لگ جائیں گے''۔

لکھنوی وغیرہ نے ایک ینگ پارٹی بنائی تو آشفتہ لکھنوی اس کے بھی سربراہ تھے۔ ان کے مطب میں تمام دن شعرا و ادبا کا مجمع رہتا تھا اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود شعری محفلیں سجتی تھیں۔

آشفتہ مرحوم بنیادی طور پر غزل گو تھے لیکن انھوں نے نظمیں بھی لکھیں، قصائد بھی کہے اور دیگر اصناف سخن پر بھی زور طبع دکھایا۔ ان کے کلام میں فکر و فن کی ہم آہنگی، فصاحت و بلاغت، برجستگی و دل پذیری اور زبان و بیان کی دلکشی کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں"۔

## اصنافِ سخن:

### مرثیہ گوئی:

حضرت آشفتہ مرثیہ کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے میرے نام اپنے مکتوب گرامی میں خاندانِ اجتہاد کے بعض مرثیہ گو شعرا کے مرثیے شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس میں جناب حکیم سید علی آشفتہ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کے مرثیے بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کے پاس تھے مگر ان کے انتقال کے بعد معلوم نہیں کہ ان کا شعری و ادبی ذخیرہ کس کے ہاتھ لگا اور وہ مرثیے کہاں گئے۔

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ نے مجھ کو بتایا کہ آشفتہ صاحب مرثیہ خود پڑھتے تھے۔ ان کی دو مجلسوں میں حضرت شمس بذات خود شریک ہوئے تھے۔ ایک مجلس افضل محل، لکھنؤ میں ہوئی جس میں انھوں نے مرثیہ پڑھا اور یک مجلس نواب علی دوشالہ فروش کے یہاں ہوئی جس میں انھوں نے ذاکری کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ذاکری بھی کرتے تھے۔

افسوس ہے کہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہے۔ ان کے پس ماندگان حیدر آباد دکن میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں جن سے رابطہ نہیں ہو سکا۔

میرے برادر خورد سید ثابت حسین صاحب عرف حضور نواب سلمہ نے مجھ کو بذریعہ

مکتوب یہ اطلاع دی کہ بہت تلاش و جستجو کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ شمالی ناظم آباد کراچی میں رہنے والے ایک صاحب ڈاکٹر مرزا اظہر حسین صاحب سابق صدر شعبہ ارضیات، جامعہ کراچی کے پاس آشفتہ صاحب کے مرثیے ہیں جو انھوں نے وہاں سے منتقل ہوتے وقت فرنگی محل لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب وکیل احمد نامی کو یہ دے دیے تھے۔

میں نے جناب محترم ڈاکٹر شیخ انصار حسین صاحب قبلہ سے مرزا اظہر حسین مرحوم کے بیٹیوں کے فون نمبر لیے جو ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں رہتے ہیں۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود نہ ٹیلیفون پر ان سے رابطہ ہو سکا نہ ان کا پتہ معلوم ہو سکا۔ شاید وہ اب وہاں نہیں رہتے۔ اسی طرح کوشش بسیار کے باوجود وکیل احمد صاحب کا بھی پتہ نہیں معلوم ہو سکا۔

## دیگر رثائی اصنافِ سخن:

حضرت آشفتہ نے سلام، نوحے اور رباعیات وغیرہ بھی کہے مگر ان اصناف سخن میں بھی کوئی نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہے۔

## قصیدہ نگاری:

آشفتہ صاحب نے قصیدے بھی کہے ہیں۔ ان کے ایک قصیدے کے چند اشعار "تذکرہ شعرائے اتر پردیش" سے نقل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہوں

شعاعِ مہر جس سے مشرق و مغرب چمک اٹھے ذرا اس کی روش تیز رفتاروں سے تو پوچھو
ازل سے آج تک ایسا کبھی جلوہ نظر آیا فلک سے اور فلک کے تیز سیاروں سے تو پوچھو
تصور میں بھی ایسی دلربا صورت کبھی آئی دمکتے چاند سے اور چمکتے تاروں سے تو پوچھو
قلم نے لوح پر ایسا کبھی نقشہ نہیں کھینچا جناب قدس کے نقش شہکاروں سے تو پوچھو
کبھی اس روپ اس رس باس کا دل (گل) بھی نہیں مہکا قسم ہے ذرا جنت کے گلزاروں سے تو پوچھو
یہ سب تو خیر اپنے ہیں خدائی تک بتا دیں گے ذرا دشمن سے اس کے انکاروں سے تو پوچھو
دھنک اتنے کہاں سے جلوۂ رنگیں اڑا لائی یہ نقطہ بحث ہے چل کے مددیوں سے تو پوچھو

لبِ قدرت نے جنبش دی کہ تم کو خود ہنسی آئی علی والو! ذرا کعبہ کی دیواروں سے تو پوچھو

جناب فاطمہ بنت اسد کیا لے کے نکلی ہیں ہوائے گل سے اور پھولوں کے انباروں سے تو پوچھو

خدا نے کیسی نعمت دی۔ وصی کس شان کا پایا رسول اللہ کی رنگین گفتاروں سے تو پوچھو

مصیبت جب کوئی پڑتی ہے آڑے کون آتا ہے کرم کے یہ مزے ہم سے وفاداروں سے تو پوچھو

نصیری خاک سمجھا تھا یہ تو دیوانہ خدا سمجھا
حقیقت کو علی کی ہم نمک خواروں سے تو پوچھو

## غزل گوئی:

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں حضرت آشفتہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں ندرت بھی تھی رنگینی بھی اور کیف بھی۔ دو غزلیں نمونہ کلام کے طور پر ملاحظہ ہوں:

### غزل نمبر ۱:

میری وحشت کے لیئے ان کا پشیماں ہونا آ گیا راس مجھے چاک گریباں ہونا

میں نے مانا کہ مجھے درد کو سونپا دل نے پھر بھی لازم تھا تمھیں درد کا درماں ہونا

اک نئے جور کی تحریک ہے احساسِ ستم تم نہ بیداد پہ للہ پشیماں ہونا

ضبط سے نالۂ دل تجھ کو گلے تھے لاکھوں آج دیکھیں گے ترا حشر بداماں ہونا

عشق کو دعوتِ صد مرگ ہے یہ حسنِ نیاز ان کی آراستہ زلفوں کا پریشاں ہونا

چاک پیراہن یوسف کی قسم عصمت عشق حسن رسوا نہ ہو یوں چاک گریباں ہونا

ان کی مدہوش نگاہوں سے نہ ٹوٹے رشتے ہائے کم بخت رگ جاں کا رگ جاں ہونا

سر رہے گا تری بیداد کا سہرا کب تک دیکھ ہی لیں گے کسی روز پشیماں ہونا

زلزلے دیکھ کے آشفتہ وہ پھرتے ہیں ابھی
ابھی دیکھا ہی نہیں دل کا پریشاں ہونا

غزل نمبر۲:

دعا مانگتے ہیں اثر دیکھتے ہیں تری بے مروت نظر دیکھتے ہیں
سلگتا ہے دل وہ جگر دیکھتے ہیں کہاں آگ ہے اور کدھر دیکھتے ہیں
لہو سے یہ بھیگی ہوئی آستینیں وہ ہنس ہنس کے اے چشم تر دیکھتے ہیں
لبِ زخم جنبش سے ہے دل میں پیدا یہ باتیں کہیں چارہ گر دیکھتے ہیں
یہ کس در پہ قسمت نے پہنچا دیا ہے کہ اک اک کے قدموں پہ سر دیکھتے ہیں
فریب تماشا ہے نیرنگِ عالم نظر کے ہیں دھوکے جدھر دیکھتے ہیں
بھڑکتی ہوئی آگ پھنکتا ہوا دل محبت میں کیا کیا اثر دیکھتے ہیں
خدا ہی کرے خیر اب زخم دل کی بڑے غور سے چارہ گر دیکھتے ہیں
جوانی کا عالم مرادوں بھرا دل انھیں کی ہے دنیا جدھر دیکھتے ہیں
مزے ہیں مزے چارہ گر وہ بنے ہیں تجھے آج زخم جگر دیکھتے ہیں

اب آشفتہ بیگانگی سب سے اچھی
زمانہ برا ہے جدھر دیکھتے ہیں

## نظم گوئی:

نظم گوئی میں بھی حضرت آشفتہ کو کمال حاصل تھا۔ اس وقت ان کی چار نظمیں میرے پیش نظر ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے "دل بیچنے والا"۔ یہ نظم اخبار "جدید نظم" لکھنؤ مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہوئی تھی۔ باقی تین نظمیں جناب عرفان عباسی نے "تذکرہ شعرائے اترپردیش" جلد چہارم میں ص ۵۳ سے درج کی ہیں۔ نظم "دل بیچنے والا" ملاحظہ کیجیے:

سسکتا ہوا دل کا مارا ہوا دل
حسینوں کی نظروں پہ وارا ہوا دل
نگاہوں سے دل سے اتارا ہوا دل

تھکا ماندہ منزل کا ہارا ہوا دل
کوئی لے گا دل، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

حسینوں کی جھرمٹ بھری جلوہ گاہیں
رسیلی نگہباز چوکھی نگاہیں
چوٹیلا سا دل اور خوں پاش آہیں
نہ نکلیں گی کیا پھر بھی بکنے کی راہیں
کوئی لے گا دل، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

بلائیں نچھاور ہوئیں جس پہ وہ دل
غمِ دو جہاں جس پہ نازاں وہ بسمل
تڑپ جس کی فطرت سکوں جس کو مشکل
زمیں دشمنِ جاں فلک جس کا قاتل
کوئی لے گا دل، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

حسیں کر کے مشقِ ستم آزمالیں
جفائیں کریں اور دادِ جفا لیں
جنھیں ذوقِ بیداد ہو وہ ستالیں
کٹیلی نظر والے سرمہ بنالیں
کوئی لے گا دل، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

محبت کی آنچوں میں جس کو تپایا

جفاؤں کے طوفاں میں بھی آزمایا
وفا کی قسم جس کو کندن بنایا
ستم سہنے کا ڈھنگ اک اک سکھایا
کوئی لے گا دل ، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

یہ میلے حسینوں کے ، رنگیں نظارے
یہ بھگدر ، شباب اور اٹھتے شرارے
قیامت اٹھادیں جدھر دیں اشارے
ادھر لا ادھر ، کاش کوئی پکارے
کوئی لے گا دل ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

یہ متنِ جنوں بھی ہے تفسیرِ غم بھی
یہ خوابِ پریشاں بھی تعبیرِ غم بھی
وفاؤں کا مرکز بھی تعمیرِ غم بھی
سراپا الم بھی ہے تفسیرِ غم بھی
کوئی لے گا دل ، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

اے حسن والو کھلونا بنالو
یہ بربادِ الفت ہے اس کی دعا لو
اسے پیار کر لو گلے سے لگا لو
تڑپنے نہ پائے یہ بیکل غریب
کوئی لے گا دل ، ہے کوئی لینے والا

میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

گلوں میں یہ رس بس کے پھر کھل اٹھے گا
نظر کی پرکھ پر یہ سودا چکے گا
بڑے چاؤ اور پیار سے یہ بکے گا
جو لے گا اسے وہ وفا مول لے گا

کوئی لے گا دل ، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

اسے ٹھیس لگنے نہ پائے حسد سے
درک جائے گا یہ کنول چشم بد سے
اسے موہ لے پیار کی جو مدد سے
گذر جائے گا وہ وفاؤں کی حد سے

کوئی لے گا دل ، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

اِکتا بکتا رہے یہ جہاں ہو
زمیں راس آئے فلک مہرباں ہو
چمن در چمن گلستاں گلستاں ہو
یہ آشفتہ الفت کی روحِ رواں ہو

کوئی لے گا دل ، ہے کوئی لینے والا
میں دل بیچتا ہوں میں دل بیچتا ہوں

نظر لے اڑی یا پَوَن کوئی آئی
مرا دل مرا دل دہائی دہائی
جلی جیوت کس نے یہ آکر بجھائی

نہ سودا چکا اور نہ طے بات پائی

ہے اک ہاتھ خالی صدا دینے والا
تخیل میں اب روح دل بیچتا ہوں

## وفات:

[illegible] اور زندگی کا [illegible]
[illegible] میں زندگی کی آخری سانسیں [illegible]
اجعون ۔

[illegible] سید آغا مہدی [illegible]
[illegible]
کے حساب سے ۵۶-۱۹۵۵ء کے مطابق ہے۔

[illegible]
ایک بند درج ذیل ہے۔

ادا شناس وہ رنگیں مزاج آشفتہ
سخن کی بزم میں تھا اک سراج آشفتہ
سخن پرستوں کے تھا سر کا تاج آشفتہ
نہیں ہے محفل یاراں میں آج آشفتہ

نہ شاعروں کا ہے مجمع نہ انجمن باقی
بہار اب وہ کہاں ، رہ گیا چمن باقی

# اولادِ غفرانمآب کا رعب و دبدبہ

علامہ سید محمد حسین صاحب تذکرہ بے بہائی تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں

''ان میں (سلطان العلماء'' اور سید العلماء) میں تین تہی قیام و قعود میں وہ (رعب و دبدبہ) ہے جو بادشاہوں کو فوج و لشکر کے ساتھ میسر نہیں۔ وہ جناب باوجود قوت قلب کے رحم دل اور بندوں پر مہربان ہیں۔ شجاعت میں شیران کے سامنے سے فرار کرتا ہے۔ موعظہ کے وقت پتھر اگر احساس کرے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، بالخصوص جب وہ جناب منبر پر موت اور قبر کا تذکرہ کرتے اور ابر بارندہ کی طرح روتے ہیں۔ خدا کے راستے میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔ خدا کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

(بحوالہ ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ'' ص ۴۹۔ ۵۰)

# ماخذ

(باعتبارِ حروفِ تہجی)


۱۔ افادات: مولوی لڈن صاحب خورشید لکھنوی

۲۔ ارمغان: حضرت مہذب لکھنوی

۳۔ [illegible] تاج العلماء مولانا سید علی محمد صاحب [illegible]

۴۔ ارمغان: حضرت مہذب لکھنوی

۵۔ اردو مرثیہ انیس کے بعد ڈاکٹر طاہر کاظمی

۶۔ [illegible]

۷۔ [illegible]

۸۔ آب بقا جناب عبدالرؤف عشرت لکھنوی

۹۔ انتخاب دیوان جاوید: مولانا محمد باقر صاحب شمس

۱۰۔ آفتاب عزاداری حضرت ذاکر لکھنوی

۱۱۔ اردو کے ان پڑھ شاعر، مرزا فدا علی خنجر

۱۲۔ آیات [illegible] لکھنوی

۱۳۔ انتقادیات، حصہ دوم: جناب نیاز فتح پوری

۱۴۔ آیات حق جناب تاثیر لکھنوی

۱۵۔ ارغواں جناب تاثیر لکھنوی

۱۶۔ اوراق [illegible] مفتی سید محمد عباس [illegible]

۱۷۔ اردو مرثیہ مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی

۱۸۔ [illegible]

۱۹۔ بازارِ سخن: حضرت مہذب لکھنوی

۲۰۔ بزمِ خیال: جناب صفدر مرزا پوری

۲۱۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ڈاکٹر ہلال نقوی

۲۲۔ پنج آہنگ مولانا سید محمد باقر صاحب شمس

۲۳۔ پیامِ زندگی: تاجور نجیب آبادی

۲۴۔ تاریخ العلماء، مولانا محمد حسن

۲۵۔ تاریخ لکھنؤ (ج۔۱) زبدۃ العلماء مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ

۲۶۔ تاریخ لکھنؤ (ج۔۲) زبدۃ العلماء مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ

۲۷۔ تاریخ لکھنؤ مولانا سید محمد باقر صاحب شمس

۲۸۔ تاریخ الشعراء، حضرت ذاکر لکھنوی

۲۹۔ تاریخ سلطان العلماء، مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ

۳۰۔ تحفۂ عوام (قدیم نسخہ)

۳۱۔ تذکرۂ شعرائے اتر پردیش (ج۔۳) جناب عرفان عباسی

۳۲۔ تاریخ شیعہ کا ایک خوں چکاں ورق مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ

۳۳۔ تذکرۂ بے بہائی تاریخ العلماء، علامہ سید محمد حسین

۳۴۔ جوشِ ماتم جناب مجاور حسین تمنا لکھنوی

۳۵۔ جناب غفراں مآب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب طاب ثراہ

۳۶۔ جدید اردو مرثیہ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

۳۷۔ جواہر الکلام شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی (بحوالہ ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ)

۳۸۔ جواہر دبیر مولوی مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

۳۹۔ حسینؑ پر سلام: سید علی رضوی

۴۰۔ خمخانۂ جاوید: لالہ سری رام

۴۱۔ دورِ شاعری، حصہ دوم حضرت مہذب لکھنوی

۶۵۔ عکس کربلا جناب اثر جیلی

۶۶۔ علم اور علماء: ساحر لکھنوی

۶۷۔ غزل غزل: مہدی نظمی

۶۸۔ غزل گل: مہدی نظمی

۶۹۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار جناب مرزا جعفر حسین

۷۰۔ کائنات ذاکر: مرتبہ حضرت فضل نقوی

۷۱۔ کلیات منیر شکوہ آبادی

۷۲۔ گزشتہ لکھنؤ جناب عبدالحلیم شرر لکھنوی

۷۳۔ گلشن منظوم دیوان فاخر، ج۔۱

۷۴۔ گلشن منظوم: دیوان فاخر، ج۔۲

۷۵۔ لکھنؤ کی شاعری: مولانا محمد باقر صاحب شمس

۷۶۔ لب جبرئیل: جناب تاثیر نقوی

۷۷۔ مرزا محمد جعفر اوج فن اور شخصیت ڈاکٹر سکندر آغا

۷۸۔ مضامین عزیز مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی (ردولوی)

۷۹۔ مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک، تعارف شعراء ڈاکٹر ہلال نقوی

۸۰۔ مولائے کائنات: تاثیر نقوی

۸۱۔ مثنوی نان و نمک، مرزا جعفر علی فصیح

۸۲۔ معاصرین مرزا دبیر، ڈاکٹر طاہر کاظمی

۸۳۔ معراج الکلام مرزا محمد جعفر اوج

۸۴۔ مجمع التواریخ: حضرت فضل نقوی

۸۵۔ مظلوم کربلا جناب مہدی نظمی

۸۶۔ ملتان میں اردو شاعری جناب طاہر تونسوی

۸۷۔ مطلع انوار، جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

۱۰۹۔ رسالۂ تہذیب الاخلاق (سرسید احمد خاں)، مورخہ ۱۰ محرم ۱۲۸۹ھ

۱۱۰۔ اودھ اخبار

۱۱۱۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۵۰ء

۱۱۲۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ یکم مارچ ۱۹۵۰ء

۱۱۳۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ یکم اپریل ۱۹۵۰ء

۱۱۴۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵۔۸ جون ۱۹۵۰ء

۱۱۵۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵۔۸ جون ۱۹۵۰ء

۱۱۶۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ یکم ستمبر ۱۹۵۰ء

۱۱۷۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۵۰ء

۱۱۸۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، تاریخ نامعلوم، ۱۹۵۰ء

۱۱۹۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، تاریخ نامعلوم، ۱۹۵۰ء

۱۲۰۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، تاریخ نامعلوم، ۱۹۵۰ء

۱۲۱۔ ہفتہ وار "سحاب" لکھنؤ، تاریخ نامعلوم، ۱۹۵۰ء

۱۲۲۔ اخبار جدید سنگم، مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء

۱۲۳۔ ماہنامہ "خیر العمل" لاہور، شمارہ ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۲۴۔ ماہنامہ "خیر العمل" لاہور، شمارہ نومبر ۲۰۰۱ء

۱۲۵۔ ماہنامہ "خیر العمل" لاہور، شمارہ فروری ۲۰۰۲ء

۱۲۶۔ ماہنامہ "طلوع افکار" شمارہ مئی ۱۹۹۸ء

۱۲۷۔ پندرہ روزہ "ذوالفقار" پشاور

۱۲۸۔ پندرہ روزہ "ذوالفقار" پشاور

۱۲۹۔ پندرہ روزہ "ذوالفقار" پشاور

۱۳۰۔ مبلغ لکھنؤ، غفران مآب نمبر ۱۹۸۸ء

۱۳۱۔ مجلہ "خراج خلوص، بیاد مہدی نظمی" مطبوعہ دہلی ۱۹۸۷ء

۱۳۱۔ مجلہ "تراث" علوم دینیہ مہدی قمی مطبوعہ دہلی ۱۹۸۸ء

## مکتوبات

۱۳۳۔ مکتوب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ بنام ساحر لکھنوی

۱۳۴۔ مکتوب حضرت نسیم امروہوی بنام ساحر لکھنوی

۱۳۵۔ مکتوب بیگم شمس الحسن تاج بنام ساحر لکھنوی

۱۳[illegible]۔ مکتوب ڈاکٹر صفدر حسین بنام ساحر لکھنوی مورخہ ۲۴/۱۰ اگست ۸ے۹۱ء

۱۳۷۔ مکتوب جناب علی احمد دانش بنام ساحر لکھنوی

۱۳۸۔ مکتوب جناب علی احمد دانش بنام ساحر لکھنوی مورخہ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۰ء

۱۳۹۔ مکتوب جناب سبط محمد نقوی، مورخہ ۴ ستمبر ۲۰۰۰ء

۱۴۰۔ مکتوب سید ثابت حسین صاحب، مورخہ ۴ ستمبر ۲۰۰۰ء

## مزید مآخذ

۱۴۱۔ "وحدت اسلامی" شمارہ نمبر ۱۱۲، ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۴ء

۱۴۲۔ تاریخ علماء السادات غلام علی

۱۴۳۔ تاریخ اودھ نجم الغنی

۱۴۴۔ "تذکرۃ المحققین" شاہ حسین مرزا صفوی طوسی

۱۴۵۔ "روح ادب" گھاسی رام

۱۴۶۔ "ضیاء الابصار"

A SOCIO INTELLECTUAL HISTORY OF THE ISNA'ASHARI SHIIS IN INDIA by Dr Saiyed Ather Abbas Rizvi, Ph D D Litt, F A H (Australia) (۱۹۹۶) مطبوعہ معرفت پبلشنگ ہاؤس، [illegible]

# مسلمانانِ وشیعیانِ برِ صغیر پر غفرانمآبؒ کے احسانات

''یہی کافی ہے کہ ہندوستان میں دینِ اسلام آپ ہی کے وجود سے پایا جاتا ہے........ اہلِ علم پر کیا جہلاء پر بھی آپ کا احسان ہے۔ جیسے حضرتِ علی کی تلوارِ آبدار نے سرکشانِ عرب کو زیر کر دیا اور لات، عزیٰ، منات تینوں کو طاق ہائے حرم سے منھ کے بل گرا دیا۔ ایسے ہی ہندوستان میں اگر چہ برائے نام تشیّع تھا مگر کہیں نقشہ بھنگ نوشی، کہیں احمد کبیر کی گائے، کہیں........ یہاں بھی دلدارِ علی کے سیف قلم نے ہندوستان کو جو کفرستان تھا دار الایمان بنا دیا۔ یہ آپ کے خلوص کا اثر ہے جو جا بجا اس زمانۂ پُر آشوب میں پھر کر، دشمنوں میں رہ کر، عرب و عجم کا سفرِ دور دراز کر کے، علومِ دینیہ حاصل کر کے تحت قبہ ابی عبداللہ الحسین جو دعا مانگی تھی کہ میری اولاد میں تا قیامت علمِ دین باقی رہے سو بحمد للہ اب تک ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا اور آپ کا خاندان خاندانِ اجتہاد کے نام سے قائم ہو گیا۔ (''تاریخ العلماء''، ص ۱۴۷)

ید اللہؑ
مولاؑ
فاتح خیبرؑ
مولائے کائنات
شاہ نجفؑ
زوج بتولؑ
شہنشاہ بت شکن
مرتضیٰؑ
حیدر کرارؑ
شہنشاہ نجف
ساقی کوثرؑ
ولایت مآب
شہ [illegible]
فاتح خندق و خیبر
دلدل سوار
شیر خدا
اسد اللہ
نائب احمدؐ
قتال عرب
شہ مردانؑ
مشکل کشاؑ
مظہر العجائب
کل ایمانؑ
بازوئے احمدؐ
ضیغم احمدؐ

(۴)

جناب فاطمہ زہراؑ

جناب سیدہؑ
بتولؑ
دختر رسولؑ
خاتون قیامت
سیدۂ کونینؑ
بنت رسول اللہؐ
زہراؑ۔ جناب

(۵)

دیگر ائمہ اطہارؑ

امام حسنؑ
حضرت شبرؑ
حسن مجتبیٰؑ
علی ابن موسیٰ الرضاؑ
(شاہ خراساں)
عابد بیمار۔ جناب سید سجادؑ
پنجتن پاکؑ

(۶)

امام زمانہؑ

قائم آل محمدؐ
امام زمانؑ
مہدی آخر الزمانؑ۔ امام
امام عصرؑ
سلطان زمانؑ
صاحب الزمانؑ
قائم آل عباؑ

(۷)

خاندان رسالت کے دیگر افراد

حضرت ابو طالبؑ
جناب فاطمہؑ بنت اسد
حضرت ابو عبیدہؑ
جناب امیر حمزہؑ
حضرت جعفر طیار
حضرت مسلمؑ ابن عقیل
فرزندان مسلمؑ
معصومۂ قمؑ

(۸)

امام حسینؑ

سید الشہداءؑ
ابو عبداللہ الحسینؑ
امام مظلومؑ
شبیرؑ۔ حضرت
سبط رسولؐ
شہ مشرقینؑ
شہ گردوں مقامؑ
شاہ اممؑ
شاہ انامؑ
شہ ذی جاہ
امام ہداؑ
شاہ انس و جاںؑ
شہ و[illegible]
سرور دینؑ
شہ دیںؑ
شہ خوش خو
شہ زمنؑ
فرزند پیغمبرؐ
شاہ کربلا
شہ خوش ذاتؑ
یوسف فاطمہؑ
خامس آل عباؑ

(۹)

شہدائے کربلا

جناب قاسمؑ
ابن حسنؑ
شہزادہ علی اکبرؑ
ہمشکل پیمبرؐ
ہمشبیہ رسولؐ
عباسؑ حضرت ابوالفضل العباس
ابن شہ ذوالفقارؑ
شیر بیشۂ حیدرؑ
علمدار شہ دینؑ
شہزادہ علی اصغرؑ

(۱۰)

اہل حرم

اہلبیت رسولؐ
آل عباؑ
آل رسولؐ
حرم پاک مصطفیٰؐ
جناب زینب کبریٰؑ
جناب ام لیلاؑ
جناب شہر بانوؑ
جناب [illegible]ؑ
جناب سکینہؑ
بنت مرتضیٰؑ

## (الف)

A SOCID INTELLECTUAL HISTORY
OF ISN ASHARI SHI'IS IN INDIA

## (ب)

## (چ)

(ح)

(خ)

(ز)



(س)

## (ص)

خانوادۂ اجتہاد کے ان علماء وفقہاء ومجتہدین عظام کے

اسمائے گرامی جن کا ذکر اس مقالہ میں آیا ہے

(القابات کی ترتیب کے اعتبار سے)

انتخاب العلماء مولانا سید سبط محمد ہادی صاحب قبلہ
اعلم العلماء مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ
بحر العلوم شمس العلماء مولانا سید محمد حسین عرف مولوی
علن صاحب قبلہ
باقر العلوم مولانا سید محمد باقر صاحب قبلہ
تاج العلماء مولانا سید علی محمد صاحب قبلہ
جواد الملت مولانا سید کلب جواد صاحب قبلہ
رئیس العلماء مولانا سید محمد کاظم صاحب قبلہ
زبدۃ العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ
زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ
خلاصۃ العلماء مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب قبلہ
زین العلماء عضد الدین مولانا سید علی حسین صاحب قبلہ
سلطان العلماء مولانا سید محمد رضوان مآب صاحب قبلہ
سید العلماء مولانا سید حسین صاحب قبلہ علیین مکان
سید العلماء مولانا سید علی نقی عرف مولوی نقن صاحب قبلہ
سید المفسرین مولانا سید علی صاحب قبلہ
شمس العلماء مولانا سید ابراہیم صاحب قبلہ
شمس العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ
صفوۃ العلماء منصف الدولہ شریف الملک مولانا سید محمد
باقر صاحب قبلہ
صفوۃ العلماء آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ
صادق الملت مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب قبلہ
عمادالعلماء فقیہ اہلبیتؑ مولانا سید مصطفیٰ عرف میر آغا
صاحب قبلہ
عمادالعلماء علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ
عمادالعلماء مولانا ڈاکٹر سید علی محمد صاحب قبلہ
علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب قبلہ
عمدۃ العلماء مولانا سید محمد ہادی صاحب قبلہ
عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین عرف کبن صاحب قبلہ

(غ)



(ف)

## (ن)

ساحر لکھنوی

(سید قائم مہدی نقوی اجتہادی)

مصنف: (۱) ''مرثیہ'' قطب شاہ سے ساحر تک'' (۲) ''آیات درد'' (مجموعہ مراثی) (۳) ''احساس غم'' (مجموعہ مراثی) (۴) ''علم اور علماء'' (شخصی مرثیہ) (۵) ''علم اور علماء'' (مطبوعہ دہلی) (۶) ''فقہ و شمشیر'' (مرثیہ مطبوعہ دہلی) (۷) ''صحیفہ مدحت'' (مجموعہ قصائد) (۸) ''یقین کامل'' (دینی موضوع) (۹) ''فن تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ'' (۱۰) ''ایمانی شہ پارے'' (مرتب کردہ) (۱۱) ''باتیں ہماری رہ گئیں'' (مرتب کردہ) (۱۲) ''خانوادہ اجتہاد کے مرثیہ گو (ماہر سے ساحر تک)''۔